دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء

المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ

دریافت - تحقیق - تدوین - گم شدگی - بازیابی

سیّد سلیمان ندوی
مفتی محمد انوار الحق
جناب سید محمد صاحب
سید ہاشمی فرید آبادی
قاضی عبدالودود
ڈاکٹر سید عبداللطیف
ڈاکٹر سید حامد حسین
حبیب احمد صدیقی
امتیاز علی عرشی
ڈاکٹر گیان چند
ڈاکٹر ابو محمد سحر
وجاہت علی سندیلوی
غلام رسول مہر
سید احتشام حسین
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
نادم سیتاپوری
سید صباح الدین عبدالرحمٰن
عبدالقوی دسنوی
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
پروفیسر حمید احمد خاں
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
ڈاکٹر احمر لاری
ڈاکٹر اکبر حیدری
مہر افشاں فاروقی
ظفر احمد صدیقی



ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر داؤد عثمانی

دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء

المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ

دریافت - تحقیق - تدوین - گم شدگی - بازیابی

ترتیب وتہذیب

ڈاکٹر داؤد عثمانی

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شیرازی شاعر
0300-2054154

کتاب : **دیوانِ غالب قلمی** ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء
المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ
دریافت - تحقیق - تدوین - گم شدگی - بازیابی

ترتیب و تہذیب : ڈاکٹر داؤد عثمانی

اشاعت : 2024ء

ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
0345-2610434
rangeadab@yahoo.com
www.facebook.com/rangeadab

ISBN # 978-969-745-161-6

انتساب

والدین کے نام

جن کی دعاؤں کے سائے تلے آج بھی آسودہ ہوں

فہرست

◆◆◆

ڈاکٹر داؤد عثمانی

مقدمہ

اُردو شاعری میں جو قبولیت اور مقبولیت کلامِ غالب کو حاصل ہے، ایسی اقبال کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں۔ غالب اپنے عہد میں غالب تھے اور آج بھی غالب ہیں۔ بقول آلِ احمد سرور صاحب:

''جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، غالب کے کلام کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ غالب کی زندگی، اُن کی شخصیت اور شاعری اُن کے خطوط اور دیگر تحریروں کے متعلق تلاش و تحقیق اور تحسین و تنقید کا سلسلہ برابر جاری ہے اور شخصیت کی رنگینی اور تصانیف کی جامعیت کے پیشِ نظر یقین ہے کہ جاری ہی رہے گا۔'' [۱]

نئے زمانے میں کلامِ غالب کی بابت ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا کہنا ہے:

''جدید دور میں غالب کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہی ہے کہ اس کے اشعار آج کے قاری کی احساسی طلب کو پورا کرتے ہیں اور دم بہ دم پھیلتے ہوئے آفاق میں نہ صرف اس کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ اُسے آنے والے زمانے کو پہچاننے اور پھر اس تک پہنچنے پر مائل کرتے ہیں۔ جدید دور سے قبل کا کوئی دوسرا شاعر آج کے ذہن کو اس انداز میں تسکین مہیا نہیں کر سکا۔'' [۲]

لیکن غالب نے اپنے ۱۸۲۱ء کے قلمی نسخے میں یہ شعر درج کر کے اپنے کلام کی ناقدری اور ناسخن فہمی کا گلہ اس انداز میں کیا تھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی [۳]

اور کہا کہ:

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور ۴

(۱۸۵۲ء)

ساتھ ہی مرزا اپنے فن کی عظمت اور برتری سے بھی خوب واقف تھے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور ۵

(۱۸۵۲ء)

اور وہ یہ بھی کہہ گئے کہ میرے اندازِ بیان کو شہرت اور پذیرائی میرے اس جہاں سے جانے کے بعد ہی ملے گی:

کوکبم را درِ عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن ۶

غالب اپنے عہد کے واحد شاعر ہیں جنھیں جیتے جی اپنے کلام کی پانچ اشاعتیں دیکھنی نصیب ہوئیں۔ان میں پہلی اشاعت مطبع سید الاخبار، دہلی سے اکتوبر ۱۸۴۱ء کی تھی۔اس وقت غالب چوالیس (۴۴) برس کے تھے اور دیوان میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۶ تھی۔ ۷ دوسری اشاعت مطبع دارالسلام، دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔یعنی پہلی اشاعت کے چھے سال بعد۔اس وقت غالب پچاس (۵۰) برس کے تھے۔دیوانِ غالب کی اس دوسری اشاعت میں امتیاز علی عرشی صاحب اور مالک رام کے مطابق سولہ اشعار کا اضافہ ہے، جس میں چودہ اشعار کی ایک غزل اور دو شعر بیسنی روٹی پر بطور قطعہ کے شامل ہیں۔گویا غالب نے چھے برسوں میں صرف سولہ شعر کہے۔ لیکن کالی داس گپتا رضا کے مطابق دوسری اشاعت میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۳ میں ۶۵، اشعار کے اضافے کے ساتھ ۱۱۵۸، ہے، جو ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب کے خیال میں ان کی پیش کردہ تفصیلات کی روشنی میں دوسری اشاعت میں اشعار کی تعداد ۱۱۸۵، بظاہر درست معلوم ہوتی ہے۔ ۸ تیسری اشاعت مطبع احمدی، دہلی سے جولائی ۱۸۶۱ء میں اس وقت منظر عام پر آئی جب غالب کی

عمر چونسٹھ (۶۴) سال تھی۔ یعنی دوسری اشاعت کے چودہ سال بعد۔ اس عرصے میں غالب نے ۶۳۸ شعر کہے۔ یوں مجموعی طور پر تیسری اشاعت میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ رہی۔ [۹] چوتھی اشاعت جون/ جولائی ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ اس وقت غالب پینسٹھ (۶۵) سال کے تھے۔ اس اشاعت میں تین اشعار کے اضافے کے ساتھ اشعار کی تعداد ۱۷۹۹ تھی۔ [۱۰] اور پانچویں اشاعت ۷، اشعار کی کمی کے ساتھ ۱۸۶۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس زمانے میں مرزا کی عمر کے چھیاسٹھ (۶۶) مرحلے پورے ہو رہے تھے۔ زندگی کی اس آخری اشاعت میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۵، رہی۔ [۱۱] ان دواوین کے علاوہ ۱۸۶۲ء میں ''نگارستانِ سخن'' کے نام سے غالب کے ایک شاگرد اموجان ولی دہلوی نے ایک انتخاب شائع کیا تھا جس میں غالب کے ساتھ ذوق اور مومن کا کلام بھی شامل تھا۔ [۱۲]

ان کے علاوہ مرزا غالب نے اپنے کلام کے مختلف اوقات میں قلمی نسخے بھی ترتیب دیے تھے۔ جو گزرتے وقت کی دھول میں کہیں دب گئے تھے۔ ان نسخوں کو غالب شناسوں نے ان کے وصال کے بعد دریافت کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔

غالباً انھیں کو دیکھ کر غلام رسول مہر صاحب کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ:

> ''فارسی اور اردو میں جتنے عظیم القدر شاعر گزرے ہیں ان میں سے میرے علم کی حد تک کسی کا ابتدائی کلام محفوظ نہیں رہا جسے سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکے کہ شعر گوئی کے آغاز میں اس کے رنگ اور آہنگ کی کیا کیفیت تھی اور ارتقائے فکر و نظر کے بلند ترین زینوں پر پہنچ کر اس نے کیسے شعر کہے۔'' [۱۳]

مرزا کے قلمی دواوین میں زمانی لحاظ سے پہلا نسخہ ۱۸۱۶ء کا ہے۔ غالب نے یہ نسخہ ۱۹ سال کی عمر میں تیار کیا تھا۔ جو ۱۹۶۹ء میں بھوپال سے دریافت ہوا۔ [۱۴] یہ پہلے ہندوستان میں ''نسخہ عرشی زادہ'' کے نام سے ستمبر ۱۹۶۹ میں ادارۂ یادگارِ غالب، دہلی سے شائع ہوا۔ پھر اگلے مہینے اکتوبر ۱۹۶۹ء میں رسالہ ''نقوش'' (غالب نمبر) حصہ دوم، لاہور میں شائع ہوا۔ اس نسخے کو مختلف ناموں سے جیسے ''نسخۂ امروہہ''، ''بیاضِ غالب'' اور ''نسخہ بھوپال ثانی'' یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل صاحب اسے نسخۂ لاہور کا نام دینا چاہتے تھے۔

اس بارے میں اُن کا کہنا تھا کہ:

''چوں کہ یہ بیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ اُسے نسخۂ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے۔'' ۱۵

اس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۶۹۵ تھی۔ ۱۶ اسی سال (۱۸۱۶ء) بقول عرشی صاحب کے غالب نے ایک اور نسخہ بھی ترتیب دیا تھا، جس کا ذکر ان کے ایک فارسی خط میں ''دیوانِ رومی'' کے نام سے موجود ہے لیکن ابھی وہ دریافت نہیں ہوا۔ ۱۷ ''نسخہ فوجدار محمد خان'' یا ''نسخۂ بھوپال'' یہ دیوان ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا، اور اس میں اشعار کی تعداد ۲۴۱۶ ہے ۱۸ اور اس وقت غالب کی عمر چوبیس (۲۴) برس تھی۔ ''نسخۂ شیرانی'' یہ نسخہ ۱۸۲۶ء میں ترتیب دیا گیا جس میں ۲۰۶۸، شعر درج ہیں۔ ۱۹ اُس وقت غالب اُنتیس (۲۹) سال کے تھے۔ ''گلِ رعنا'' یہ ۱۸۲۸ء کا ہے جس میں مرزا غالب نے اپنے اردو اور فارسی اشعار کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں مرزا نے ۴۴۵، اشعار اپنے کلام سے منتخب کیے۔ ۲۰ جس وقت ''گلِ رعنا'' ترتیب پایا اس زمانے میں مرزا اکتیس (۳۱) برس کے تھے۔ ''نسخہ رام پور'' مسلم ضیائی کے بیان کے مطابق یہ نسخہ ۱۸۳۲ء کا تیار کردہ ہے۔ ۲۱ اور امتیاز علی عرشی صاحب کے خیال میں اس کا سن ۱۸۳۳ء ہے۔ ۲۲ اس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے۔ ۲۳ اس کی ترتیب کے وقت غالب ۳۵ یا پھر ۳۶ برس کے تھے۔ ''نسخہ بدایوں'' اس نسخے کی کتابت ۱۸۳۸ء میں ہوئی تھی۔ ۲۴ اس وقت مرزا انتالیس (۳۹) برس کے تھے۔ اس میں اشعار کی تعداد ۱۱۰۲ ہے۔ ۲۵ ''نسخۂ کراچی'' اس نسخے کی تیاری کا سن ۱۸۳۸ء کا ہے۔ اُس وقت مرزا اکتالیس (۴۱) برس کے تھے۔ ''نسخۂ دیسنہ'' اس میں اشعار کی تعداد ۱۹۰۸ تھی ۲۶ اور ''نسخۂ کریم الدین'' میں ۱۱۰۷ تھی، ۲۷ یہ دونوں نسخے ۱۸۴۵ء میں لکھے گئے تھے۔ اس وقت غالب عمر کے اڑتالیس، ۴۸ ویں سال میں تھے۔ ''نسخۂ لاہور'' کی کتابت ۱۸۵۲ء میں ہوئی، اس میں ۱۵۴۷، اشعار تھے ۲۸ اور اس وقت غالب پچپن (۵۵) برس کے تھے۔ ''نسخہ رام پور جدید'' مسلم ضیائی صاحب کے خیال میں یہ نسخہ ۱۸۵۵ء کا ہے۔ ۲۹ اس کے سنِ کتابت کے مطابق جب یہ نسخہ ترتیب دیا گیا تھا، اُس زمانے میں غالب اٹھاون (۵۸) برس کے تھے اور نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۵ ہے ۳۰ ''انتخاب

غالب'' اس قلمی انتخاب کی بابت مسلم ضیائی صاحب کا خیال ہے کہ یہ ۱۸۶۳ء کا ہوسکتا ہے۔ ۳۱
اس قیاسی تاریخ کی روشنی میں اُس وقت غالب کی عمر پینسٹھ (۶۵) برس ٹھہرتی ہے۔

ان تمام قلمی نسخوں میں غالب کے ۱۸۲۱ء کے مخطوطے ''نسخۂ بھوپال'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس نسخے میں ان کا تقریباً وہ تمام کلام موجود ہے جو انھوں نے متداول دیوان میں شامل نہیں کیا تھا۔ چناں چہ ''نسخۂ بھوپال'' کے ذریعے سے نہ صرف ان کا ابتدائی کلام منظر عام پر آیا ۳۲ بلکہ اس سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ متداول دیوان کی کون کون سی غزلیں اور اشعار، ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی یادگاریں ہیں اور ساتھ میں یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ انھوں نے اپنے کلام میں کیا کیا ترامیم اور اصلاحات کی ہیں۔ ۳۳ اور اس نسخے کے ذریعے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ غالب کے ابتدائی کلام کا انداز و اسلوب کیا تھا۔ اور یہ اسلوب اختیار کرنے کے اسباب کیا ہوسکتے تھے۔ نیز اس نسخے نے مرزا کی شاعری کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لینے کے لیے خاصا سامان بہم فراہم کردیا۔ ۳۴

''نسخہ بھوپال'' نواب فوجدار محمد خاں (۱۸۱۱ء۔۱۸۶۵ء) کے ذاتی کتب خانے کی زینت تھا۔ جو ریاست بھوپال کی حکمراں نواب سکندر جہاں بیگم کے سب سے چھوٹے ماموں تھے۔ نواب صاحب خود صاحب علم تھے۔ انھیں مختلف علم وفن کی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ نواب صاحب کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکت کے مطابق وہ علمِ نحو و صرف و منطق، فقہ و ہیئت و جغرافیہ و علمِ طب میں ذی استعداد اور علمِ موسیقی میں استاد تھے۔ ۳۵ (یاد رہے غالب کا پہلا قلمی دیوان جسے انھوں نے انیس (۱۹) سال کی عمر میں ۱۸۱۶ء میں ترتیب دیا تھا وہ بھی ۱۹۶۹ء میں بھوپال ہی سے دریافت ہوا تھا)

نسخہ بھوپال سوا سو سال تک بھوپال میں محفوظ رہا۔ جو غالب کے دنیا سے گزر جانے کے پچاس سال بعد ۱۹۱۸ء میں اُس وقت خبروں میں آیا جب مولانا عبدالسلام ندوی نے اُسے بھوپال کے کتب خانۂ حمیدیہ میں دیکھا اور اس کی اطلاع مولانا سید سلیمان ندوی کو پہنچائی اور انھوں نے ماہنامہ ''معارف'' کے ستمبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں غالب کے پرستاروں اور اربابِ علم و ادب کو یہ نوید یوں سنائی:

''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی صاحب ''شعرالہند'' کی خاطر آج

کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا، یعنی مرزا غالب کا اصلی اردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مُطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ میں پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔ یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری صاحب مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے۔ ۳۶ موصوف آج کل دیوانِ غالب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب ان کے نتائج فکر انجمن ترقی اردو کے ذریعے سے منظر عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔" (ص ۱۱۶)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس نسخے کی ترتیب و تدوین کا خاکہ اور اس کی اشاعت کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ جس پر کام کا آغاز بھی ہو چکا تھا لیکن زندگی نے ان سے وفا نہ کی اور ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو انھیں پیامِ اجل آ گیا اور وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کلامِ غالب کی اشاعت جس شان سے کرنا چاہتے تھے اس بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا کہ:

"جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا، مرحوم کی نظر پڑی تو مارے خوشی کے بے تاب ہو گئے اور اس اصل نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے بلاکوں کا خاص اہتمام کیا، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابک دست مصور سے تصویروں کی فرمائش کی۔ ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔

وہ دیوان بعد میں "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا، جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شائع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے، وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔" ۳۷

اور یوسف قیصر صاحب نے دیوانِ غالب کو پاکر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے جذبات کا ذکر ان لفظوں میں کیا:

''ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے غالب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ مکمل دیوان دیکھ کر اچھل پڑے، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور اپنے بنگلے پر لے آئے۔ ۳۸ ایک کاتب نوکر رکھا اور اس سے دیوان کی کتابت کرائی۔'' ۳۹

نسخہ حمیدیہ پر جب بھی کسی نے لکھا، اُن میں سے اکثر نے انجمن ترقی اردو کے دیوانِ غالب کی اشاعت کے ارادے کا ذکر ضرور کیا ہے۔ یہاں بھی معلومات اور دلچسپی کے لیے اس کا ذکر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اردو ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک نفیس، معیاری اور صحیح متن کے ساتھ دیوان شائع کرنا چاہتی تھی اور ساتھ میں غالب کی حیات اور فکر و فن پر نامور انشا پردازوں سے مضامین لکھوا کر دیوان میں شامل کرنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔ جس کی اطلاع مولوی عبدالحق نے ماہنامہ ''الناظر'' کے مئی ۱۹۱۴ء کے شمارے میں انجمن ترقی اردو کی جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۴ء کی مختصر رپورٹ پیش کرتے ہوئے یوں دی کہ:

''۴۔ انجمن نے یہ بھی ارادہ کیا ہے کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن طبع کیا جائے اور اس میں یہ جدت ملحوظ رکھی جائے گی کہ اردو کے موجودہ نامور انشا پردازوں سے مرزا کی شاعری کی بعض خصوصیات پر مضامین لکھوا کر دیوان کے شروع میں درج کیے جائیں۔ چناں چہ اس کے متعلق ان حضرات کی خدمت میں جو مراسلہ جاری کیا گیا ہے اس کی نقل آخر میں بغرض اطلاع شائع کی جاتی ہے۔''

(نقل مراسلہ جس کا حوالہ دفعہ ۴ میں دیا گیا ہے)

جنابِ مخدومی۔ تسلیم

انجمن ترقی اردو نے ارادہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اپنی نگرانی میں دیوانِ غالب اردو کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ چھپوا کر شائع کرے۔ جناب کو یہ معلوم ہے کہ ''غالب'' کی قبولیت اور فلسفیانہ شاعری کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مرحوم کا کلام پسند

کرنے والے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ پس بالکل برمحل ہے کہ ایک جماعت کثیر کی خواہش پوری کرنے کا سامان کیا جائے اور پرانے نسخوں کے بجائے، جن میں ناقص کاغذ اور غلط کتابت سے زیادہ کوئی شے نمایاں نہیں، ایک پاکیزہ اور خوبصورت مجلد بازار میں آجائے۔ آج جبکہ طوطا کہانی اور دلفروش ناٹک تک سفید کاغذوں پر چھپ رہے ہیں، باعث حجاب ہونا چاہیے کہ اردو علم ادب کے مایۂ ناز اور انقلاب افگن شاعر کا پرتاثیر ترانہ ٹمیالے اور بے نور کاغذوں پر شکوہ گزار کسمپرسی ہو!

لیکن اس عریضے سے محض یہ اطلاع دینا مقصود نہیں اور نہ نیاز مند کی رائے میں کسی علمی انجمن کا یہ معمول کچھ زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ مطبوعہ کتب کے صرف اچھے نسخے چھاپا کرے بلکہ اصل غرض اس تحریر کی یہ ہے کہ جناب سے درخواست کی جائے کہ مرزا غالب مرحوم کی شاعری پر ایک واضح تبصرہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں!

یہ ایمانی مجالس علمی کی تقلید میں ہے کہ انجمن اساتذۂ ماضیہ پر موجودہ اربابِ ذوق سے اُن کی رائے لکھوانے کی خواہاں ہے تا کہ اس کے شائع کردہ نسخے میں خصوصیت بھی پیدا ہو جائے اور مستند ادبائے وقت کا مجموعہ آراء، اردو علم وادب میں ایک دلکش اضافہ ہو اور اردو کی شاعری کے طلباء کو مفید اعانت بھی اس سے مل سکے۔

اسی غرض سے میں نے ذیل میں چند عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر مبحث کے مقابل اُن حضرات کے نام درج ہیں جنھیں اس بارے میں زحمت دی گئی ہے۔ جناب کا اسم گرامی بھی اس میں شریک ہے:

۱۔ مرزا صاحب کے خاندانی حالات۔ تعلقات احباب و اقربا کے ساتھ، عوام و خواص کے ساتھ ان کا برتاؤ اور عام گفتار، کردار، نشست و برخاست، معاشرت کا طریقہ ..... نواب سعید الدین احمد خان صاحب طالب دہلوی

۲۔ مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات۔ ان کی زبان اور طرز بیان کی جدت ... مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی ... مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ، کلکتہ

۳۔ مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور اساتذۂ فارسی سے اس کا تاثر ...... مولانا شبلی نعمانی

۴۔ مرزا صاحب کا فلسفۂ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعراء سے ...... ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبالؔ، لاہور

۵۔ مرزا صاحب کی شاعری کا اثر اردو زبان پر ...... مولانا عبدالحلیم صاحب شررؔ لکھنوی، مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی

۶۔ مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات ... مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی، راقم الحروف عبدالحق

(جناب مولانا حالیؔ کی خدمت میں بھی عرض کیا گیا ہے کہ اگر وہ کچھ تکلیف لکھنے کی فرمائیں تو انجمن کے لیے اس سے بڑھ کر قابل رشک کوئی اعزاز نہیں)

مجھے پوری امید ہے کہ میری درخواست پر جناب بالضرور توجہ فرمائیں گے اور دو ایک مہینے میں مطلوبہ تبصرہ ارسال فرما کر انجمن کو بچی احسان مندی کا موقع دیں گے۔ حقیقت میں یہ کام جناب کی معمولی التفات سے نہایت دلچسپ اور ممتاز اور عام پسند ہو سکتا ہے۔ یہ لکھنا شاید غیر ضروری ہے کہ اس تحریر میں مرزا غالب مرحوم کے وہ واقعات زندگی جو پہلے سے عام ہو چکے ہیں دہرانے سے زیادہ کارآمد نہ ہوں گے۔

فقط

عبدالحق

آنریری سیکریٹری، انجمن ترقی اردو ۱۴ء

دیوانِ غالب کی اس اشاعت کے لیے سب سے پہلے چندے کا اعلان نواب عماد الملک صاحب نے کیا۔ جس کی خوش خبری سناتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی جون اور جولائی ۱۹۱۴ء کی مختصر رپورٹ میں لکھا کہ:

''عالی جناب نواب عماد الملک بہادر نے مبلغ (صار) ۱۴ء کلامِ غالب اردو جمع کرنے کے اور صحیح اور نفیس ایڈیشن کے طبع کرنے کے لیے عنایت فرمانے کا

وعدہ کیا ہے۔ اور یہ رقم ہماری طلب پر فوراً ہمارے حوالے کردی جائے گی۔'' ۴۲

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرزا کے کلام کو اُن کے شایانِ شان شائع کرنے کے لیے کس حد تک سوچتے تھے، اس کا اندازہ انجمن ترقی اردو کی مختصر رپورٹ بابت ماہ اپریل ۱۹۱۴ء کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے متعلق لکھی:

''گزشتہ رپورٹ میں دیوانِ غالب کے ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن کے طبع کے متعلق مسٹر محمد علی بی۔اے (آکسن) ایڈیٹر کامریڈ، ہمدرد کی خدمت میں یہ استدعا پیش کی گئی ہے کہ جو فنڈ انھوں نے مرزا صاحب کے مقبرہ کی ترمیم و تعمیر کے لیے جمع کیا تھا اور اب وہ کسی وجہ سے کام میں صرف نہیں ہوسکتا، اگر وہ رقم اس ایڈیشن کے طبع کے لیے بہ اجازت معطیان عنایت فرمائی جائے تو مرحوم کی ایک عمدہ یادگار ہوگی۔ ابھی اس کے متعلق موصوف کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔'' ۴۳

اس استدعا کا جواب مولانا محمد علی جوہر نے انجمن ترقی اُردو کے ۱۹۱۴ء میں راولپنڈی میں ہونے والی کانفرنس کے تیسرے اجلاس، منعقدہ ۲۷ دسمبر، جس کی صدارت مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی کررہے تھے، اس میں دیا۔ رقم کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں جو کہا اُسے ماہنامہ ''الناظر'' کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی نے اپنے رسالے میں کانفرنس کی روداد لکھتے ہوئے یوں لکھا کہ:

''غالب کا مقبرہ بنانے کے لیے جو روپیہ کامریڈ کے ذریعہ سے طلب کیا گیا تھا اور اس بارے میں کئی مراسلات آئے جن کا وہ جواب نہ دے سکے اور اُس روپیہ کو اس غرض کے لیے وہ دینا بھی نہیں چاہتے بلکہ غالب کا مقبرہ بنانے ہی میں اس کو صرف کریں گے۔ البتہ اپنی طرف سے مبلغ یک صد روپیہ عنایت فرمائیں گے۔'' ۴۴

انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۱۴ء میں مولوی صاحب نے دیوانِ غالب کے نئے نسخے کی سال بھر کی کارگزاری کے بارے میں لکھا کہ:

''مرزا غالب اردو کے ایسے باکمال اور بلند خیال شاعر گزرے ہیں کہ جن کا

شمار دنیا کے اعلیٰ شاعروں میں ہوسکتا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ان کے کلام کی روز بروز قدر بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا کلام ایسا غلط اور خراب چھپا ہے جسے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے۔ انجمن نے اس کا ایک صحیح اور عمدہ ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور اس خیال کو اکثر احباب واصحاب نے پسند فرمایا ہے۔ اُس کے ساتھ یہ جدت بھی کرنی چاہی ہے کہ اردو زبان کے نامور اہل قلم سے مرزا صاحب کی خصوصیاتِ شاعری پر مضامین لکھوا کر ان کے کلام کے ساتھ شائع کیے جائیں۔ چناں چہ ملک کے مشہور اور نامور انشاء پردازوں سے استدعا کی گئی۔ لیکن سوائے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر اور مولوی رضا علی وحشت کے کسی نے ہامی نہ بھری۔ لیکن اب تک ان صاحبوں سے مضامین وصول نہیں ہوئے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب کے دیوان کا ایک صحیح قلمی نسخہ بھی دستیاب ہوگیا ہے۔ یہ نسخہ نواب ضیاء الدین خاں نیر نے لکھوایا تھا اور مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب نے کمال عنایت ولطف وہ نسخہ انجمن کو مستعار فرمایا اور انجمن نے اس پر ایک نسخہ تیار کیا ہے لیکن چوں کہ مرزا صاحب کا کلام مشکل اور دقیق ہے، اس لیے خیال کیا گیا کہ بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی لکھ دی جائے۔ یہ ایڈیشن تیار ہو رہا ہے اور آئندہ سال طبع ہوجائے گا۔ جناب نواب عماد الملک بہادر نے جو بڑے ادیب اور صاحب ذوق ہیں۔ ازراہِ قدردانی پانچ سو روپیہ اس کے اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے ہیں۔'' ۴۵

دیوان غالب کے اس نفیس، صحیح، معیاری اور تاریخی نسخے کی ترتیب وتدوین کا کام سید ہاشمی فرید آبادی کے سپرد کیا گیا جسے انھوں نے بڑی محنت اور توجہ سے ایک سال کے اندر اندر مکمل کرلیا۔ جس کی ابتدائی خبر مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی ماہِ جون ۱۹۱۵ء کی مختصر رپورٹ میں یہ لکھ کردی کہ:

''۴۔ مرزا غالب کے دیوان کا صحیح ایڈیشن مرتب ہو چکا اور صاف کیا جارہا ہے۔ عنقریب مطبع میں بھیج دیا جائے گا۔'' ۴۶

اس بابت دوسری اطلاع مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی ۱۹۱۵ء کی سالانہ رپورٹ میں غالب کے پرستاروں کو اس خوش خبری کی صورت میں پہنچائی کہ:

''مرزا غالب کے اردو کلام کا صحیح نسخہ مرتب ہو گیا ہے۔ اس میں مرزا صاحب کا وہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی ترتیب اور جمع کرنے میں بہت وقت لگا۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کام کے انجام دینے میں بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کیا اور اس لیے ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ اب ہر نہج سے مکمل ہو گیا ہے اور طبع کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ نیز یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن نہایت صحت اور نفاست کے ساتھ طبع کیا جائے اس کے لیے انجمن مولوی ظفر الملک علوی صاحب ایڈیٹر الناظر کی ممنون ہے۔'' ۴۷

اتنی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد اس تاریخی نسخے کی اشاعت میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ اُس کے متعلق سید ہاشمی صاحب ہی کی زبانی سنیے:

''تجویز کے اسی آخری حصے کی بدولت کتاب کی تیاری میں بہت دیر ہوئی۔ صرف رضا علی وحشت (کلکتہ) نے تو انجمن کی درخواست پر ایک دلچسپ مضمون ارسال فرمایا۔ لیکن دیگر حضرات نے یا تو یہ درخواست قبول ہی نہ کی اور یا تو قبول کی تو ایفائے وعدہ نہ کر سکے۔

انجمن کی تجویز اسی منزل میں تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ ۴۸ صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی، لیکن مروجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اُسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ مگر اُن مرحوم کو کلام غالب سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے بڑی خوشی سے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔'' ۴۹

اور مولوی عبدالحق صاحب نے اس دیوان کی اشاعت اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے متعلق انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء میں لکھا کہ:

''مرزا غالب کے اردو دیوان کے جدید و نفیس ایڈیشن کے متعلق گزشتہ رپورٹ میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہ ایڈیشن بہمہ وجوہ مکمل و مرتب ہو چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بی۔اے، ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء، مشیر تعلیم ریاست بھوپال اس کے لیے ایک عالمانہ مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ ۵۰ جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرؔر نے بھی اس ایڈیشن کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب تک بعض وجوہ سے طبع میں تاخیر ہوتی رہی۔ ایک تو بوجہ جنگ، اعلیٰ درجے کا کاغذ دستیاب ہونے میں دشواری ہے۔ دوسرے اب تک لیتھو کا کوئی مطبع ایسا نہیں ملا جو اسے اعلیٰ درجے کی نفاست کے ساتھ چھاپ سکے جو انجمن کا منشا ہے۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ فوٹوگراف کے ذریعے طبع کرایا جائے۔ اس کے متعلق بھی خط و کتابت جاری ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ سال یہ طبع ہو جائے۔'' ۵۱

ہاشمی صاحب کا تیار نسخہ جب ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا تو انھوں نے بڑے انہماک کے ساتھ اُسے از سرِ نو دیکھنا شروع کیا جس کا ذکر انھوں نے اپنے دوست کو لکھے گئے ایک خط میں یوں کیا کہ:

''ڈیئرسٹ شعیب!

اب آپ بھوپال آجائیے۔

۱۔ غالب کے خط کی مجھے ضرورت ہے۔ اگر آپ نے تیغ کے صفحہ کا فوٹو لے لیا ہے تو کافی ہے۔

۲۔ نواب احمد سعید خاں صاحب کے (دیوان کے) حاشیہ میں درج ہے۔ حاشیہ پر جو غزلیں غالب کی دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں وہ کون کون سی ہیں (کذا) نوٹ کر لیجیے گا اور اگر متداولہ نسخہ سے کہیں اختلاف ہو تو وہ اختلاف نوٹ کر لیجیے گا۔ چند اشعار اور ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ، جن کا خط میں ذکر کیا ہے، وہ

ضرور لکھ لائیے گا۔ اور نسخہ کے لکھنے کا سن، کاتب کا نام وغیرہ اگر کوئی مہر کہیں سے اس کا پتہ نشان، کسی شخص کے خط میں اضافی غزلیں اور چند اشعار ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ تحریر ہیں (شاید نواب صاحب کو معلوم ہو) وغیرہ وغیرہ بھی یادداشت کے طور پر درج کر لیجیے گا۔

۳۔ واسوخت کے متعلق میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ہاشمی کے ایڈٹ کیے ہوئے دیوان سے (جو انھوں نے مجھ کو دے دیا ہے) اس کو کاٹ دوں گا......

۴۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ ''تکیہ'' والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں۔ ۵۲؎ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں لیکن یہ ان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ دوسرے نواب صاحب کی اس بارے میں رائے کیا ہے۔

طائر دل جو قطعہ ہے ۵۳؎ وہ بھی مرزا کا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے نوٹ کر لیجیے گا۔'' ۵۴؎

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس دیوان کو بڑے ہی خوبصورت اور نفیس انداز سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ اس بات کا پتا ان کے ان دو خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کے نام لکھے تھے۔ ایک ۱۵، اکتوبر ۱۹۱۶ء کا بھوپال سے، جس میں ڈاکٹر صاحب سید ہاشمی صاحب سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا ہاشمی صاحب کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوانِ غالب کو لکھنؤ الناظر پریس میں ہی طبع کرالیا جائے۔ گو مجھ کو اس بات کا باور نہیں ہوتا لیکن اس خبر نے مجھ کو نہایت مشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمایئے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے لیکن اگر اس کی چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجہ

کے کلوں کے پریس میں انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگایا جائے حروف پھیل جائیں گے۔سطریں غیر متوازی ہوجائیں گی اور تمام صورت اور نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اول لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسودہ (کاپی) کو فوٹو کرانے کی کوشش کی جائے۔ یو۔اے، کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت ہی بڑھ جائے گی۔بہرحال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص حیَ نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا جاتا ہے۔حیَ نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔اس کا پتا لگا کر اس سے طبع کرالیا جائے۔جو دیوان آپ طبع کرارہے ہیں، وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہاشمی صاحب کا خیال غلط ہے اور میں خواہ مخواہ یہ لکھ رہا ہوں لیکن دل نہ مانا اور جب تک لکھ نہ دیا دل کا وسوسہ نہ رہا۔" ۵۵

اور جو دوسرا خط ہے وہ نو ماہ بارہ دن بعد کا ہے جو بھوپال سے ۲۷، جولائی ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا۔جس میں ایک جگہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"(۲) دیوانِ غالب کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ایک نمونہ تیار ہورہا ہے۔جب تیار ہوجائے گا روانہ ہوگا۔علاوہ اس کے زنک پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کررہا ہوں، کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے۔اوروں کے جواب ابھی نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔اگر آپ پانچ ہزار صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو زنک پلیٹ بہترین جلد کے ساتھ بہترین کاغذ سمیت ممکن ہے۔

(۳) کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔فوٹو ٹائپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔

(۴) چند تصاویر متعلق مضامین (دیوان) کا بھی بندوبست کررہا ہوں۔ دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوائی ہے۔" ۵۶

ان خطوں کے علاوہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا وہ خط بھی

نظر سے گزرا جو انھوں نے ۲۰، اگست 1918ء کو لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے بھوپال سے دریافت ہونے والے دیوان غالب کے ۱۸۲۱ء کے قلمی نسخے کا ذکر کیا تھا۔ وہ خط ملاحظہ ہو:

''محترمی و معظمی سلامت۔ تسلیم بعد تعظیم

آپ کا والا نامہ عین انتظار میں شرف صدور لایا۔ جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالب میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقہ میں ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔

مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک جملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے۔ اب نسخہ نہیں جاتا۔ ان شاء اللہ۔ جتنا جھوٹ آج کل بول رہا ہوں، عمر بھر موقع نہ ہوا تھا۔

جب ہاشمی صاحب آویں گے، اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔ آپ ان کے ہمراہ جو تصاویر آرائش کی چیزیں وغیرہ آپ نے جمع کی ہیں اور جو کچھ مصالحہ یا خط و کتابت وغیرہ ہے، سب بھیج دیجیے گا۔ شعیب میری ہدایت کے مطابق چند چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہیں اور سراپا سعی ہو رہے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا ہے۔ آپ علی گڑھ لکھیے، اگر بچ رہا یا خدانخواستہ کام میں نہ رہا تو بک سکتا ہے۔ اگر اخبارات میں اعلان ابھی نہ دیا ہو تو اس میں چندے توقف کیجیے، ہاشمی صاحب سے گفتگو کروں۔

دیوان ایڈٹ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ جب ہاشمی صاحب تشریف لائیں گے تو کافی نمونہ پیش کر سکوں گا۔ فرمایئے کتنے روپے تک انجمن خرچ کر سکتی ہے۔ کاش اس وقت کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد پر آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہے، پانچ ہزار تو اس کام کے لیے ہوتا۔'' ۵۷

سید ہاشمی فرید آبادی صاحب مولوی صاحب کے کہنے پر اس گوہر نایاب کو دیکھنے اور اس کی ترتیب و تدوین کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی تجاویز سننے بھوپال پہنچے۔ اس بارے میں سید ہاشمی

صاحب لکھتے ہیں:

''اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جب کہ غالب کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا، لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام و کمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے تو خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے۔ لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا اور وہ سب امیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں۔'' ۵۸

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۱۸ء میں اس قلمی نسخے کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ مولوی صاحب نے بھی اس نسخے کی زیارت کی تھی۔ چناں چہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:

''۱۵۔ انجمن دو تین سال سے مرزا غالب کے اردو دیوان کا صحیح اور عمدہ

نسخہ تلاش کرنے کا اعلان کررہی ہے۔ اس کا مسودہ بڑی تلاش اور محنت سے مرتب کیا گیا تھا اور صرف طبع کی دیر تھی اور غالباً اس سال طبع بھی ہو جاتا، لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اگر چہ یہ تاخیر ناگوار ہوئی لیکن حکمت سے خالی نہ تھی، اس لیے کہ اب انجمن کو مرزا صاحب کے تمام (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) کلام کے جمع کرنے کا فخر نصیب ہوگا۔ اس کی مختصر کیفیت میں جناب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ مرزا صاحب نے اردو میں کچھ لکھا تھا اسے بعض سخن فہم دوستوں کے حوالہ کر دیا تھا اور انھوں نے بہت سے شعر غیر مانوس بندش یا ادق معانی کی بنا پر کاٹ دیے تھے۔ منتخب کلام جو باقی رہا وہ موجودہ دیوان غالب اردو کی شکل میں شائع ہوا۔ خارج شدہ اشعار کو مرزا صاحب نے خود تلف کر دیا اور وہ بالکل نایاب تھے۔

انجمن ترقی اردو کو تلاش سے بعض غیر مطبوعہ غزلیں اور خارج شدہ اشعار مل گئے تھے۔ لیکن اس بات کی کسی کو امید نہ تھی کہ مرزا صاحب کا پورا خارج شدہ کلام کبھی میسر آ جائے گا۔ یہ محض حسن اتفاق اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی سعی کا نتیجہ ہے کہ بھوپال کے ایک کتب خانہ سے یہ گنج گم شدہ برآمد ہو گیا۔ (بس اس امر کا اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سب سے پہلے کتب خانہ حمیدیہ (بھوپال) میں اس نسخہ پر مولوی عبدالسلام صاحب کی نظر پڑی) انجمن کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب مرحوم اُس کی تصحیح و ترتیب و طبع کا انتظام فرما رہے تھے کہ اُن کی بے وقت اور پُر الم موت نے اُس کے ساتھ بہت سی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔

یہ دیوان خاص نواب فوجدار محمد خاں صاحب برادر نواب قدسیہ بیگم کا ہے۔ دیوان کے شروع اور وسط میں مہریں موجود ہیں۔ کلاں مہر پر ۱۲۶۱ھ درج ہے۔ دیوان قلمی ہے، بہت خوش خط لکھا ہوا ہے اور ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت زیادہ اشعار ایسے ہر غزل میں موجود ہیں جو موجودہ دیوانوں میں نہیں پائے جاتے۔ بہت سی نئی غزلیں ہیں۔ بعض اشعار میں مرزا صاحب نے اپنے قلم سے خفیف یا زیادہ

الفاظ کا ردو بدل کیا ہے۔ گویا نظرِ ثانی کے بعد مروجہ دیوان طبع ہوا ہے۔ الفاظ کے اس ردو بدل اور اصلاح سے شاعر کے ذوقِ نظر کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

جناب صاحب زادہ نواب حمید اللہ خان بہادر، بی اے نے اپنی خاص عنایت اور علمی قدر دانی کی وجہ سے اس نسخہ کے استعمال کی اجازت انجمن کو عطا فرمائی۔ انجمن جناب ممدوح کی بے حد ممنون ہے۔'' ۵۹

خیر بھوروی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے ترتیب دیے گئے دیوانِ غالب کے مسودے کی خبر دیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

''مجھ کو امراض نے کسی کام کا نہیں رکھا، ورنہ ''شاعر'' کے ''غالب نمبر'' کے لیے ''غالب انسائیکلوپیڈیا'' کا ایک باب غالب کے اردو دواوین کا خلاصہ آپ کی نذر کرتا اور اُس دیوان پر ذرا تفصیل سے لکھتا جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے مرتب کرایا تھا۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ میرے ذخیرۂ نوادرات میں محفوظ ہے۔ اس میں متداول دواوین سے الگ پہلی غزل کے اشعار یہ ہیں:

بہ رہنِ شرم ہے با وصفِ شوخی اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا
مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اُس کا
بامیدِ نگاہِ خاص ہوں، محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل، لطفِ عام اُس کا

ان اشعار کے بعد ایک خط کھنچا ہوا ہے اور حسب ذیل دو شعر لکھے ہوئے ہیں:

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

ان پانچ شعروں کے بارے میں ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ پانچوں شعر مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے گلِ رعنا سے لیے ہیں۔ اپنی شرح دیوانِ غالب کے آخر میں انھیں بحوالہ مذکورہ درج کر دیا ہے۔ ہم نے یہ اور دیگر اشعار جو متداول دواوین میں موجود نہیں، اپنے اپنے موقع سے نقل کیے ہیں اور ان کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے دوسری جگہ بحث کی ہے۔ غزل (۲) کے خارج شدہ اور دو شعر بھی یادگارِ غالب صفحہ ۱۱۰ پر مولانا حالی مرحوم نے تحریر کیے ہیں۔ لیکن نہ وہ موجودہ دیوان میں ہیں نہ گلِ رعنا میں۔ لہٰذا انھیں داخلِ دیوان کرنا درست نہ ہوگا۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

موسمِ گل میں مئے گلگوں حلالِ میکشاں
عقدِ وصلِ دُختِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

ساتھ جنبش کے بہ یک برخاستن طے ہوگیا
تو کہے، صحرا غبارِ دامن دیوانہ تھا

بعض دوسرے اشعار پر بھی فریدآبادی مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشارے درج ہیں۔ یہ اشارے نواب علاؤ الدین احمد خان علائی مرحوم کے پاس مرزا غالب کا جو قلمی دیوان تھا اُس سے لیے گئے ہیں۔ جس دیوان کا یہ ذکر ہے اس کے سلسلے میں بجنوری مرحوم کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالب کا میرے پاس آیا ہے شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک حملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے، نسخہ اب نہیں جاتا، ان شاءاللہ۔

... جب ہاشمی صاحب آویں گے تو اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔

(بھوپال، ۲۰، اگست ۱۹۱۸ء، بنام بابائے اردو مرحوم)'' ۶۰

خیر بھوروی صاحب اپنی تحریر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری صاحب کا ایک خط پیش کرتے ہوئے اُس کے ایک اقتباس کو اپنے ذخیرۂ نوادرات میں موجود دیوان غالب کے قلمی نسخے سے منسوب کرتے ہیں، وہ درست نہیں۔ بجنوری نے یہ بات بھوپال سے دریافت ہونے والے دیوانِ غالب کے ۱۸۲۱ء کے قلمی نسخے کی بابت، لکھی تھی۔

اس مخطوطے کو ڈاکٹر بجنوری نے حمیدیہ لائبریری سے ۴، اگست ۱۹۱۸ء کو مستعار لیا تھا۔ ان کے انتقال (۷، نومبر ۱۹۱۸ء) کے بعد سرکاری طور پر یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے لیے مفتی انوارالحق، ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس رہا۔ اور پھر ۹، مارچ ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر بجنوری ہی کے نام پر واپس کیا گیا۔ اس کے بعد ۳، نومبر ۱۹۲۷ء کو ماسٹر ولی محمد نے اس کو، جیسا کہ دیگر حوالوں سے معلوم ہے، ڈاکٹر عبداللطیف کو حیدر آباد بھیجنے کے لیے کتب خانے سے اخذ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد ۲۱، فروری ۱۹۲۸ء کو کتب خانے میں واپس کر دیا۔'' ۶۱

اس نسخے کو پا کر بجنوری صاحب کی دلچسپی اور مسرت کا اظہار یوسف قیصر صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے غالب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ مکمل دیوان دیکھ کر اچھل پڑے۔ بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا۔ سر پر رکھا اور اپنے بنگلے پر لے آئے۔ ایک کاتب کو نوکر رکھا اور اس سے دیوان کی کتابت کرائی۔'' ۶۲

سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے اس دنیا سے جانے کے بعد ریاست بھوپال کے ڈائریکٹر تعلیمات مفتی محمد انوارالحق صاحب نے اس قلمی نسخے کے ساتھ غالب کا مطبوعہ کلام شامل کر کے ۱۹۲۱ء میں دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے مفید عام پریس آگرہ سے شائع کرایا۔

افسوس کہ کتب خانہ حمیدیہ، جسے کلام غالب کے اس نادر مخطوطے کو محفوظ رکھنے کا کوئی ایک صدی پیشتر پچیس برس کا اعزاز حاصل تھا، وہ انضمامِ ریاست بھوپال کے وقت کہتے ہیں، جاتا رہا۔ اس بارے میں مختلف باتیں سننے کو ملیں، ان میں امتیاز علی عرشی صاحب کی یہ بات بھی شامل ہے کہ

انھوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے نواب حمید اللہ خاں سے اس نسخے کے بارے میں معلوم کروایا تھا تو انھوں نے اس نسخے کے اپنے پاس ہونے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ خود میرا علم بھی یہی مرجز کی افراتفری میں کسی نے وہاں سے پار کرلیا۔ اب اللہ جانے کہ وہاں سے کہاں گیا۔ جب کہ وہاں کے لائبریرین کا کہنا ہے کہ نواب صاحب نے منگوالیا تھا۔'' ۶۳

اور ڈاکٹر احمر لاری نے اپنے مضمون میں مولانا خیر بھوروی کا ایک خط پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بالآخر مفتی انوارالحق صاحب ''نسخہ بھوپال'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔'' ۶۴

جبکہ ڈاکٹر حامد حسین صاحب نے کتب خانہ حمیدیہ کے قدیم ریکارڈ کی چھان بین کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''اس مخطوطے کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے حمیدیہ لائبریری سے ۴، اگست ۱۹۱۸ء کو مستعار لیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد سرکاری طور پر یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے لیے مفتی محمد انوارالحق، ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس رہا اور پھر ۹، مارچ ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر بجنوری ہی کے نام پر واپس کیا گیا۔'' ۶۵

انضمامِ بھوپال کے وقت کتب خانہ حمیدیہ کے نوادرات کا یہ گوہر نایاب کوئی ستر برس کی گمشدگی کے بعد ۲۰۱۵ء میں بازیافت ہوا۔ جسے شہاب ستار نے لندن کے نایاب کتب فروش سے خریدا۔ اور یونیورسٹی آف ورجینیا کی مہر افشاں فاروقی نے مخطوطے پر مفصل تعارف لکھ کر ڈیجیٹل شکل میں دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ کی اشاعت نے کلامِ غالب کے فنی وفکری تفہیم میں ایک نئی فکر پیدا کردی۔ ماہرین غالبیات نے نہ صرف مفتی صاحب کے مرتب کردہ دیوان پر لکھا بلکہ قلمی نسخے کی کتابت سے لے کر اس کی گمشدگی تک متعدد مضامین لکھے۔ اس دوران ماہرین غالبیات کی جانب سے مخطوطے کے حوالے سے سوالات بھی اُٹھائے گئے اور ان کے جوابات بھی دیے گئے۔ اس کے باوجود کئی سوالات کے جوابات، جواب طلب ہی رہے۔ ادھر اُدھر بکھری ہوئی تحریروں کو اس خیال سے یکجا کرنے کا خیال آیا کہ اس نسخے کے متعلق کی گئی تحقیقات اور پیش کردہ خیالات کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔

آخر میں ان دوستوں کے حق میں مالک ارض وسما کے حضور خیر وعافیت کا طلب گار ہوں،

جنھوں نے ان مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا اور معاونت کی۔ ان میں برادرِ عزیز ڈاکٹر محمد طاہر قریشی، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، محمد فیصل، خرم سبزواری اور بیدل لائبریری کے بھائی محمد زبیر اور عمان جنھوں نے مضامین کی تلاش میں بڑی مدد کی۔ اور خاص طور پر ادارۂ رنگِ ادب کے روح رواں شاعر علی شاعر صاحب اور ان کے صاحب زادے شیرازی شاعر کا خصوصی شکریہ اور دعائیں کہ جنھوں نے ان مضامین کو کتابی صورت میں لانے کا اہتمام کیا۔ جو ان کی غالب دوستی کا مظہر ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ سرور، آل احمد، تقریب، دیوانِ غالب (نسخہ عرشی)، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔ ص ز۔

۲۔ آغا، ڈاکٹر وزیر، غالب اور جدید ذہن، مشمولہ: تنقیدات، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱۰۔

۳۔ رضا، کالی داس گپتا، تعارف، دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے، ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی، فروری ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۵۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔

۶۔ میرے ستارۂ بخت کو عدم میں اوج قبول حاصل تھا۔ میری شاعری کی شہرت بھی اس دنیا میں میرے بعد ہوگی۔ یعنی جب مر جاؤں گا اور عدم میں چلا جاؤں گا (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شرح غزلیاتِ غالب (فارسی)، جلد دوم، رہبن پرنٹنگ پریس، لیک روڈ، لاہور، ص ۶۹۸)۔

۷۔ رضا، کالی داس گپتا، محولۂ بالا، ص ۲۱۔

۸۔ پاریکھ، ڈاکٹر رؤف، تحقیقی مباحث، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۲۳ء، ص ۹۲۔

۹۔ عرشی، امتیاز علی، محولۂ بالا، ص ۱۰۲۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔
۱۲۔ پاریکھ، ڈاکٹر رؤف، محولۂ بالا، ص ۹۳۔
۱۳۔ مہر، غلام رسول، نسخۂ حمیدیہ، طباعت و تحقیق کی داستان، مشمولہ: سہ ماہی، اقبال، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۵۲۔
۱۴۔ فاروقی، نثار احمد، بیاضِ غالب، مشمولہ: ماہنامہ نقوش، غالب نمبر (حصہ سوم)، ۱۹۶۹ء، لاہور، ص ۹، ۱۶۔
۱۵۔ ماہنامہ نقوش، غالب نمبر (حصہ دوم)، اکتوبر ۱۹۶۹ء، لاہور، ص ۴۔
۱۶۔ عرشی، امتیاز علی خاں، محولۂ بالا، ص ۸۱۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۔
۱۸۔ فاروقی، مہر افشاں، تعارف، نسخۂ حمیدیہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نسخۂ حمیدیہ کی ڈیجیٹل شکل، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷۔
۱۹۔ عرشی، امتیاز علی خاں، محولۂ بالا، ص ۹۹۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔
۲۱۔ ضیائی، مسلم، مقدمہ، غالب کا منسوخ دیوان، ادارۂ یادگارِ غالب، طباعتِ ثانی ۲۰۱۴ء، کراچی، ص د۔
۲۲۔ عرشی، امتیاز علی خاں، محولۂ بالا، ص ۱۰۳۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۲۸۔ ایضاً،ص ۱۱۶۔

۲۹۔ ضیائی، مسلم، محولۂ بالا،ص د۔

۳۰۔ عرشی، امتیاز علی خاں، محولۂ بالا،ص ۱۱۹۔

۳۱۔ ضیائی، مسلم، محولۂ بالا،ص د۔

۳۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے مطابق مرزا غالب نے ساڑھے چار سو سے کچھ زائد اشعار نسخۂ حمیدیہ سے منتخب کر کے مروجہ دیوان میں شامل کیے ہیں (تعبیرات غالب، ادارۂ یادگارِ غالب ۲۰۰۲ء، ص ۲۱۱)۔

۳۳۔ سحر، ڈاکٹر ابو محمد، نسخہ حمیدیہ اور اُس کی اہمیت، مشمولہ: ماہنامہ، نگار، کراچی، جون ۱۹۶۹ء، ص ۳۳

۳۴۔ مہر، غلام رسول، محولۂ بالا،ص ۵۴۔

۳۵۔ فاطمہ، ڈاکٹر انیس، بھوپال میں اردو تحقیق وتنقید کا ارتقاء، ۲۰۰۸ء، مکتبہ شرقیہ بھوپال، ص ۸۷۔

۳۶۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا شمار اپنے وقت کی اہم علمی وادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش ۱۰، جون ۱۸۸۵ء میں سیوہارہ میں ہوئی اور وفات ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں۔ ڈاکٹر صاحب صرف ۳۳ برس کی عمر پا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ سے حاصل کی تھی۔ انٹر ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ سے ۱۹۰۴ء میں کیا، پھر ۱۹۰۶ء میں بی۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۰۹ء میں ایل۔ایل۔بی۔ کیا اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں سے بیرسٹری کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ پھر وطن واپس آ کر ایک دو سال مرادآباد میں وکالت کی، اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں ریاست بھوپال میں مشیر تعلیمات کے عہدے پر فائز ہوئے، ساتھ ہی وہ اُس وقت کے پرنس نواب حمیداللہ خاں کے لٹریری سیکریٹری اور حمیدیہ لائبریری کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی، ادبی اور تعلیمی میدان میں بڑے گہرے نقش

چھوڑے ہیں۔ تفہیم غالب کے باب میں ان کا یہ جملہ کہ:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب''

کلامِ غالب کی معراج ہے۔

اس نابغۂ روزگار شخصیت کی اس جہان فانی سے گزر جانے کی خبر جب علامہ اقبال تک پہنچی تو انھوں نے اگلے ہی روز یعنی ۸، نومبر ۱۹۱۸ء کو شعیب قریشی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ:

''افسوس گزشتہ پچاس ساٹھ سال کی تعلیمی کش مکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل و دماغ و سیرت کے اعتبار سے قدیم حکمائے اسلام کا نمونہ تھا۔ مگر مشیت ایزدی نے اسے ہم سے عین اس وقت جدا کرلیا جبکہ اس کی ضرورت تھی۔ شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا یا جس سوسائٹی میں اللہ نے اسے پیدا کیا تھا، وہ اس کی قدر نہ پہچان سکتی تھی۔ ہندوستان کی اسلامی دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کو بجنوری کی پوشیدہ قوتوں کا احساس نہ ہو۔'' (مقالات بجنوری، اشرف رشید صدیقی، ص ۹۔۱۰)۔

اور ڈاکٹر سید محمود صاحب نے لکھا تھا کہ ''آہ! عبدالرحمٰن عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام دے نہ سکا۔ غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے اور شاید تیرے ہی واسطے کہا ہو:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی ''رحمٰن''
کیا تیرا بگڑتا جو مرتا کوئی دن اور

(اصل شعر میں رحمٰن کے بجائے عارف ہے۔ یہاں رحمٰن سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مراد ہے)۔

(دیوانِ غالب مع شرح نظامی، ۱۹۲۷ء مقدمہ ڈاکٹر سید محمود صاحب، نظامی پریس، بدایوں، ص ۱۴)۔

۳۷۔ عبدالحق، مولوی، تعارف، یادگارِ بجنوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مرتبہ: محمد فاتح فرخ، سول اینڈ ملٹری پریس، کراچی، س ن، ص ۴، ۵۔

۳۸۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ مخطوطہ حمیدیہ لائبریری سے ۴، اگست ۱۹۱۸ء، کو مستعار لیا تھا۔ (ڈاکٹر ابو محمد سحر، غالبیات کے چند مباحث، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، مئی ۱۹۷۳ء، ص ۹۱)۔

۳۹۔ دسنوی، عبدالقوی، بھوپال اور غالب، مشمولہ: نیا دور (غالب نمبر)، لکھنؤ، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۹۔

۴۰۔ ضمیمہ، ص ب۔

۴۱۔ (صار) اس سے مراد پانچ سو (۵۰۰) روپے ہیں۔ (مولانا اشرف علی تھانوی، اشرفی بہشتی زیور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۲۷۹)۔

۴۲۔ ماہنامہ الناظر، لکھنؤ، یکم ستمبر ۱۹۱۴ء، ضمیمہ د۔

۴۳۔ ایضاً، جون ۱۹۱۴ء، ضمیمہ۔

۴۴۔ ''نظر سے خوش گزرے'' ماہنامہ، الناظر، لکھنو، یکم جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۵۷۔

۴۵۔ عبدالحق، مولوی، رپورٹ، شعبۂ علمیہ، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، یعنی انجمن ترقی اردو، بابت ۱۹۱۵ء، الناظر پریس واقع چوک، لکھنؤ میں طبع ہو کر صدر دفتر واقع اورنگ آباد، دکن سے شائع ہوئی۔ ص ۱۳۔۱۴۔

۴۶۔ ماہنامہ الناظر، لکھنؤ، یکم ستمبر ۱۹۱۵ء، لکھنؤ ص ۵۷۔

۴۷۔ عبدالحق، مولوی، رپورٹ، شعبۂ علمیہ، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، یعنی انجمن ترقی اردو، بابت ۱۹۱۵ء، الناظر پریس واقع چوک، لکھنؤ میں طبع ہو کر صدر دفتر واقع اورنگ آباد، دکن سے شائع ہوئی، ص ۷۔

۴۸۔ یہ دیوان نظامی بدایونی نے ۱۹۱۵ء میں اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی کے نام سے سید راس مسعود صاحب کی تحریک پر شائع کیا تھا۔ جس کا ذکر سید سلیمان ندوی صاحب نے ماہنامہ ''معارف'' کے اکتوبر ۱۹۱۹ء کے شمارے میں مولوی سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری صاحب کے تیار کردہ دیوانِ غالب پر جو تبصرہ کیا تھا، اس میں نظامی بدایونی کے نسخے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ساتھ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن

بجنوری صاحب کے زیرِ ترتیب دیوان غالب کا جو ذکر کیا ہے وہ ملاحظہ کیجیے:

''ہمارے ملک کے نوجوان اٹھارہ بیس برس سے غالب کی قدر پہچاننے لگے ہیں اور روز بروز ان کے دیوان کے عمدہ ایڈیشن کی مانگ ملک میں بڑھتی جاتی ہے، چند سال ہوئے کہ سید راس مسعود کے زیرِ ہدایت مطبع نظامی بدایوں سے اہتمام کے ساتھ اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا۔ کاغذ، کتابت کی عمدگی میں کلام نہیں، لیکن خط جلی اور تقطیع غیر موزوں رہی، مرحوم عبدالرحمٰن بجنوری، انجمن ترقی اردو کی طرف سے نہایت کوشش کے ساتھ اس کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ تیار کر رہے تھے، مرحوم نے اس کے لیے بڑی محنت اٹھائی تھی، ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں غالب کی شاعری اور فلسفہ پر عمدہ خیالات مرتب کیے تھے۔ اسی اثناء میں ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی اور بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں غالب کا پورا دیوان بلا انتخاب مل گیا۔ جس کو غالب نے بھوپال کے ایک رئیس کو شاید ہدیتاً بھیجا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا ارادہ تھا جیسا کہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ وہ اس دیوان کا فوٹو بعینہٖ اپنے نسخہ کے اخیر میں شائع کریں گے لیکن افسوس کہ ''آن قدح بشکست دان ساقی نماند'' امید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اردو، مرحوم کی یادگار میں اُس نسخہ کو چھاپ کر شائع کرے گی۔ لیکن مولوی عبدالحق سیکریٹری انجمن ترقی اردو کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہوا چاہتی ہے۔'' (۳۱۵۔۳۱۶)۔

۴۹۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ)، مشمولہ: سہ ماہی، اردو، اورنگ آباد، دکن، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۳۔۷۰۴۔

۵۰۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کے مقدمے کے متعلق اپنے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن کو مراد آباد سے ۱۷، جنوری ۱۹۱۶ء کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ ''میں ایک مضمون بحیثیت تقریظ کلام غالب پر لکھنا چاہتا ہوں، لیکن قلم یاری نہیں دیتا۔ ناکام کوشش کر کے رہ جاتا ہوں۔ اللہ اکبر۔ کیا بارگاہ ہے۔ جہاں قرب سے پر جلتے ہیں۔'' (ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، یادگارِ بجنوری، مرتبہ محمد فاتح فرخ، سول اینڈ ملٹری پریس، کراچی، ص ۱۳۲۔۱۳۳)۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہمیشہ ہی سے غالب کی شاعرانہ عظمت اور بلند خیالی کے معترف تھے۔ چناں چہ ۱۰، اپریل ۱۹۱۱ء کو لندن سے اپنے بھائی حبیب الرحمٰن کو مختلف موضوعات پر مطالعے کے لیے کتابیں تجویز کرتے ہوئے دیوانِ غالب کے بارے میں لکھا کہ ''دیوانِ غالب: یہ دنیا کی شاعری جدید اور قدیم میں ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کے تخیل کی پرواز اور اس کی شاعرانہ خوبی کو قدیم ہندوستان، ایران اور جدید یورپ کے شعرا بھی نہیں پا سکے۔''

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ''مقالاتِ بجنوری''، تدوین و تہذیب، اشرف رشید صدیقی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ، اسلام آباد، ص ۲۳۹۔۲۴۰)۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے سہ ماہی اردو کے ۱۹۲۱ء کے پہلے شمارے میں ''محاسن کلامِ غالب'' کے نام سے اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا:

> ''انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس صحیح جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چناں چہ بڑی کوشش اور تحقیق سے دیوان مرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثناء میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پتلا تھا، بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ مضمون جو زورِ بیان، جدتِ فکر اور بلندیٔ خیالات کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ مرحوم کی یادگار میں سب سے اول اسے رسالہ میں درج کیا جاتا ہے۔''
>
> (ایڈیٹر)

اس اشاعت کے بعد انجمن نے اسے ''محاسن کلامِ غالب'' ہی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا، اور آج بھی اسے مختلف ادارے شائع کر رہے ہیں۔

۵۱۔ عبدالحق، مولوی، رپورٹ، شعبۂ علمیہ، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، یعنی انجمن ترقی اردو، بابت ۱۹۱۶ء، الناظر پریس واقع چوک، لکھنؤ میں طبع ہو کر صدر دفتر واقع اورنگ آباد، دکن سے شائع ہوئی، ص ۱۱۔

۵۲۔ عرشی صاحب نے اپنے مرتب کردہ دیوانِ غالب میں اس غزل کو شامل کیا ہے۔ جس میں اشعار کی تعداد آٹھ (۸) ہے (ص ۴۲۴) اور کالی داس گپتا نے اپنے ''دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے'' میں اس غزل کے پندرہ (۱۵) اشعار پیش کیے ہیں۔ (ص ۳۶۴) اور مسلم ضیائی صاحب نے اپنے مرتب کردہ ''غالب کا منسوخ دیوان'' میں اس غزل کے چودہ (۱۴) اشعار درج کیے ہیں۔ (ص ۲۶۹۔۲۷۰) اس غزل کا مطلع اور مقطع ہے:

شبِ وصال میں، مونس گیا ہے، بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جاں و تن تکیہ
ہم اور تم، فلک پیر جس کو کہتے ہیں
فقیر غالبؔ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

۵۳۔ عرشی صاحب کے مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' میں یہ قطعہ درج ہے (ص ۲۶۱) جس کے ساتھ (۷) شعر ہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے بھی اپنے ترتیب دیے گئے ''دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے'' میں اس قطعے کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے بھی سات (۷) ہی شعر پیش کیے ہیں۔ (ص ۱۰۳) اور مسلم ضیائی صاحب نے بھی اتنے ہی اشعار اپنے مرتب کردہ دیوان غالب میں درج کیے ہیں (ص ۲۸۳۔۲۸۴)۔ اس قطعے کا پہلا اور آخری شعر ہے:

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ، میں، جوشِ وحشت میں
سر آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
بہ چشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک میری آہ سوزاں سے

۵۴۔ لاری، ڈاکٹر احمر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور تدوین غالب، مشمولہ: ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، فروری ۱۹۷۱ء، ص ۷۴۔۷۵۔

۵۵۔ بجنوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، مقالاتِ بجنوری، ترتیب وتدوین، اشرف رشید صدیقی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ، اسلام آباد، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۲۔۳۲۳۔

۵۶۔ بجنوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، محولۂ بالا، ص ۳۲۴۔۳۲۵۔

۵۷۔ لاری، ڈاکٹر احمر، محولۂ بالا، ص ۷۷، ۷۸۔

۵۸۔ فریدآبادی، سید ہاشمی، محولۂ بالا، ص ۷۰۴۔۷۰۵۔

۵۹۔ انجمن ترقی اردو، شعبہ علمیہ، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، سالانہ رپورٹ بابت سال تمام ۱۹۱۸ء، مرتبہ جناب مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے۔، آنریری سیکریٹری، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں طبع ہوئی۔ ۱۳۳۷ھ، (۱۹۱۹ء) اور صدر دفتر انجمن واقع اورنگ آباد، دکن سے شائع ہوئی۔ ص ۲۶۔۲۷۔

۶۰۔ بھوروی، خیر، کچھ رنگین تصویر کے بارے میں، مشمولہ: ماہنامہ شاعر، (غالب نمبر)، بمبئی، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۶۔۱۸۷۔

۶۱۔ سحر، ڈاکٹر ابومحمد، غالبیات کے چند مباحث، مئی ۱۹۷۳ء، عزیز الرحمٰن پرنٹر، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ص ۹۱۔۹۲۔

۶۲۔ دسنوی، عبدالقوی، بھوپال اور غالب، مشمولہ: نیا دور (غالب نمبر)، لکھنؤ، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۹۔

۶۳۔ سحر، ڈاکٹر ابومحمد، غالبیات کے چند مباحث، عزیز الرحمٰن پرنٹر، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، مئی ۱۹۷۳ء، ص ۶۳۔۶۴۔

۶۴۔ لاری، ڈاکٹر احمر، محولۂ بالا، ص ۸۱۔

۶۵۔ سحر، ڈاکٹر ابومحمد، محولۂ بالا، ص ۹۱۔

◆◆◆

دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء

المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ

دریافت - تحقیق - تدوین - گم شدگی - بازیابی

سیّد سلیمان ندوی

شذرات

[دریافت: دیوانِ غالب قلمی ۱۸۲۱ء]

ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے، وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا، یعنی مرزا غالب کا اصلی مکمل اُردو دیوان بلا حذف وانتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دُونا ہے، نہایت عمدہ مطلاً نسخہ ہے، کسی خوش مذاق کے ہاتھ وہ پڑا تھا، اُس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے، موصوف آج کل دیوان غالب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب اُن کے نتائج فکر ترقی اُردو کے ذریعے سے منظر عام پر آئیں گے، ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کی ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔

(ماہنامہ "معارف"۔ اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۱۸ء۔ ص ۱۱۶)

•••

سیّد سلیمان ندوی

دیوانِ غالب[1]

ہمارے ملک کے نوجوان اٹھارہ بیس برس سے غالب کی قدر پہچاننے لگے ہیں، اور روز بروز ان کے دیوان کے عمدہ ایڈیشن کی مانگ ملک میں بڑھتی جارہی ہے، چند سال ہوئے کہ سید راس مسعود کے زیرِ ہدایت مطبع نظامی بدایوں سے اہتمام کے ساتھ اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا، کاغذ اور کتابت کی عمدگی میں کلام نہیں، لیکن خط جلی اور تقطیع غیر موزوں رہی، مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، انجمن ترقی اُردو کی طرف سے نہایت کوشش کے ساتھ اس کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ تیار کررہے تھے، مرحوم نے اس کے لیے بڑی محنت اُٹھائی تھی، ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں غالب کی شاعری اور فلسفہ پر عمدہ خیالات مرتب کیے تھے۔ اسی اثناء میں ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی کو بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں غالب کا پورا دیوان بلا انتخاب مل گیا، جس کو غالب نے بھوپال کے ایک رئیس کو شاید ہدیۃً بھیجا تھا، مرحوم ڈاکٹر بجنوری کا ارادہ تھا جیسا کہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ وہ اس دیوان کا فوٹو بعینہٖ اپنے نسخہ کے اخیر میں شائع کریں گے لیکن افسوس کہ ''آن قدح بشکست وآن ساقی نماند''، امید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اُردو، مرحوم کی یادگار میں اس نسخہ کو چھاپ کر شائع کرے گی، لیکن مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت وکاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے۔

حواشی:

۱۔ سیّد صاحب کی یہ تحریر مولوی ابوالبیان سیّد حامد حسین صاحب بیدلؔ شاہجہانپوری کے پیش کردہ دیوان غالب پر ان کے تبصرے سے ماخوذ ہے۔

(ماہنامہ ''معارف''۔ اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ ص ۳۱۵ تا ۳۱۶)

•••

تمہید

[دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ]

تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یوں تو غالب مرحوم کی اس پیشین گوئی کو امتدادِ زمانہ نے بلا کم و کاست حرف بہ حرف سچ کر دکھایا ہے اور وہی کلام جس کی نسبت ان کے معاصر یہ کہتے تھے کہ:

کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اب ادبِ اردو کا بہترین سرمایہ اور عروسِ نظم کا بیش بہا ترین پیرایہ ہے لیکن شاید یہ بات ان کے وہم و قیاس میں بھی نہ گزری ہوگی کہ ایک دن ان کا وہ ابتدائی کلام بھی حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر اربابِ نظر کے سامنے جلوہ پیرا ہوگا جسے انھوں نے اپنے ہم چشموں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر خود ہی نظری کر دیا تھا اور جس کا بظاہر آثار نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ مگر زمانہ نے ابقائے اصلح کے اصول کو شعر و سخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا اور جس کے وجود کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔

یہ بات تو علی العموم سب کو معلوم ہی ہے کہ غالب نے اپنے چند سخن فہم احباب کے مشورہ سے اپنے اشعار کا ایک بڑا حصہ مشکل اور مغلق ہونے کی بنا پر قلم زد کر دیا تھا اور مروجہ اور مطبوعہ دیوان کی یہ سرو پا بریدہ غزلیں اُسی ضخیم دیوان کی بچی کھچی نشانیاں ہیں جو ابنائے زمانہ کی آسان پسندی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہو گیا چناں چہ آزاد مرحوم آب حیات میں لکھتے ہیں کہ:

''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر مرزا صاحب کے ولی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا کہ اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔''

(آب حیات، صفحہ ۵۱۷)

اس کے علاوہ خود غالب کے مکتوبات نظم ونثر سے بھی اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے، لیکن اب تو کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ اب تک جس دیوان کو معدوم ثابت کیا جاتا تھا محض حسن اتفاق سے وہ بجنسہٖ مکمل حالت میں مل گیا:

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر مے خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

امید ہے کہ شوق کے ہاتھ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں اور قدر دانی کی نگاہیں اسے دل میں جگہ دیں۔

اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا۔ لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالبًا رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب

کے لیے لکھا گیا تھا۔ چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے ''دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوش خط۔'' اور اس کے سامنے اُن کی مہر ہے۔ اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے۔ ''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت۔'' اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ شروع میں خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور اُن کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں کیوں کہ اگر چہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیوں کہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے۔ لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ کتاب غالب کا گمشدہ دیوان ہی ہے خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی اور یقینی دلیل خود اُس کے اشعار ہیں:

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

ناظرین جب اس کا مطالعہ کریں گے تو خود کہہ دیں گے کہ یہ غالب کا کلام ہے اور غالب کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مروجہ دیوان میں جتنی کٹی چھٹی غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں۔ جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے

اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں غرض دیوان دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ غالب کا وہی دیوان ہے جسے زمانہ کھو چکا تھا۔ اس لیے اس بارے میں مزید گفت وشنید کی ضرورت نہیں ہے۔

عام دیوانوں کی ترتیب کے برخلاف اس دیوان میں قصائد سے ابتدا کی گئی ہے اور اردو قصیدوں سے بھی پہلے ایک قطعہ فارسی کو فاتحہ الکتاب بنایا ہے یہ فاتحہ کلیات غالب فارسی مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ کے صفحہ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹ پر بہ اختلافِ خفیف موجود ہے۔ لیکن چوں کہ قلمی دیوان میں مطبوعہ اشعار کی نسبت پندرہ شعر زیادہ ہیں اور مشترک اشعار میں بھی کہیں کہیں کوئی لفظی ترمیم موجود ہے اس لیے گو اردو دیوان میں اس کی ضرورت نہ تھی لیکن ہم نے تبرکاً اسے بھی قصائد سے پہلے درج کر دیا ہے اس کے بعد میں قصیدے اردو کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک تفکراتِ زمانہ نے غالب کو اہل دول کی مدح سرائی پر مجبور نہیں کیا تھا کیوں کہ یہ تینوں قصیدے منقبت میں ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۱۰ شعروں کا ہے دوسرا ۶۷ کا اور تیسرا ۲۹۱ کا، لیکن مروجہ دیوان میں صرف پہلے اور دوسرے قصیدے کے ۲۸ اور ۲۳ شعر شائع ہوئے ہیں اور تیسرے قصیدے کے فقط دو شعر ہیں ان میں سے نصف کے قریب اشعار مروجہ دیوان میں موجود ہیں۔ آخر میں گیارہ رباعیاں ہیں قطعات وغیرہ کچھ نہیں۔ ناظرین کی دلچسپی اور آگاہی کے لیے میں یہاں ایک نقشہ پیش کرتا ہوں جس سے ردیف وار قلمی اور مطبوعہ دیوانوں کی غزلوں اور شعروں کی تعداد بالمقابل معلوم ہو جائے گی:

ردیف	قلمی دیوان		مطبوعہ دیوان	
	غزلیات	اشعار	غزلیات	اشعار
الف	۶۰	۴۰۵	۴۶	۳۰۴
ب	۲	۱۳	۱	۱۲
ت	۲	۱۱	۴	۱۹

ث	۲	۱۳	-	-
ج	۲	۱۴	۲	۴
چ	۳	۲۳	۱	۶
ح	۱	۵	-	-
د	۵	۴۰	۱	۹
ر	۸	۵۶	۹	۶۹
ز	۹	۵۹	۵	۲۳
س	۳	۱۶	۱	۷
ش	۲	۱۴	۱	۲
ع	۲	۱۳	۲	۸
غ	۲	۱۲	-	-
ف	۲	۱۱	۱	۲
ک	۴	۳۰	۲	۱۵
گ	-	-	۱	۲
ل	۵	۳۴	۱	۹
م	۵	۳۶	۳	۸
ن	۲۸	۱۸۹	۳۳	۲۲۵
و	۶	۴۷	۱۱	۸۱
ہ	۸	۵۴	۲	۳
ی	۱۱۴	۷۸۸	۱۰۴	۶۵۰
میزان	۲۷۵	۱۸۸۳	۲۳۰	۱۴۸۸

چوں کہ ارادہ یہ ہے کہ ناظرین کے سامنے غالب کے کلام کا ایک مکمل مجموعہ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی قلمی اور مروجہ دیوانوں کے شعر بھی پہلو بہ پہلو دکھائے جائیں تا کہ یہ بات آئینہ ہو جائے کہ اصل دیوان میں سے کون کون سے شعر حذف کر دیے گئے تھے اور پھر بعد میں غالب نے ان میں کیا کیا ردو بدل کیا، اس لیے اس کتاب میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہر ایک ردیف میں پہلے دونوں دیوانوں کی ہم طرح غزلوں کو لکھا ہے اور ان میں اول قلمی نسخے کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں اُن کے سامنے ''م'' لکھ دیا ہے تا کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ ابتداء یہ غزل اس طرح کہی گئی تھی اور اس میں فلاں فلاں اشعار (جن کے سامنے ''م'' لکھا ہوا ہے) مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں اس کے بعد اس طرح کے جو شعر قلمی دیوان کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کہے گئے ہیں اور اب مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں اُن کو لکھ دیا ہے تا کہ پوری غزل پیش نظر ہو جائے۔ مشترک شعر جو قلمی نسخے کی غزل میں اوپر درج ہو چکے ہیں اور جن کو ''م'' کے اشارہ سے ممتاز کر دیا ہے اُن کو اب دوبارہ مروجہ دیوان کے بقیہ شعروں کے ساتھ لکھنا غیر ضروری تھا ناظرین آسانی سے امتیاز کر سکتے ہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ شعر تو دونوں دیوانوں میں موجود ہے لیکن کسی مصرع میں کوئی خفیف سی لفظی ترمیم ہوئی ہے، وہاں ان مصرعوں کو اوپر نیچے لکھ کر سامنے ایک قوس بنا کر دوسرا مصرع لکھ دیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ ہر جگہ جو مصرع اوپر لکھا ہے وہ قلمی نسخے کا ہے اور جو اُس کے نیچے لکھا ہے وہ مروجہ دیوان کا۔ اس میں مصلحت یہ سمجھی ہے کہ تدریجی اصلاح کی کیفیت واضح ہو جائے۔ ہم طرح غزلوں کے بعد اس ردیف کی قلمی نسخے کی وہ غزلیں لکھ دی گئی ہیں جو بالکل نئی ہیں، یعنی جن کا کوئی شعر بھی مروجہ دیوان میں موجود نہیں اور پھر ان کے بعد مروجہ دیوان کی وہ غزلیں درج کی ہیں جو ۱۲۳۷ھ کے بعد بڑھائی گئی ہیں اور جن کا کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ یوں ہر ایک ردیف کے کل شعر ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں جن میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں غالب کے دیوان کی کیا شان تھی اور بعد میں کیا ہو گئی۔ اگر بوقتِ مطالعہ اس گزارش کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا تو یقین ہے کہ کتاب زیادہ مفید اور دلچسپ معلوم ہو۔ اس کی کتابت میں حتی المقدور صحتِ املائی کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور جا بجا علاماتِ اضافت و وقف بھی بنانے کی کوشش کی گئی

ہے تاکہ پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے، خدا کرے کہ یہ مساعی مشکور ہوں۔

رسمِ مستمر و متقاضی ہے کہ یہاں غالب کے کلام کی بھی تنقید کی جائے لیکن میں متعدد وجوہ سے اس کی جسارت کرنے سے قاصر ہوں۔ اوّل تو مجھے یہی عذر ہے کہ جس تفصیل لطافت اور بلاغت سے مولانا حالی مرحوم یادگارِ غالب میں اس فرض کو ادا کر چکے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا مبسوط مقدمہ شائع ہو رہا ہے جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر شخص کا مذاقِ سخن مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ ہر ایک شاعر کے کلام پر اپنے خاص نقطۂ خیال سے نکتہ چینی کرتا ہے اور اسی پر اس کے رد و قبول کا فیصلہ مبنی ہوتا ہے اور دوسروں کی تائید یا تردید اس فیصلہ پر کچھ بہت زیادہ اثر نہیں ڈال سکتی اس لیے خواہ مخواہ اپنی رائے پیش کرنا میرے نزدیک فضول ہے۔ دیوان حاضر ہے اور ہر شخص خود اُس کے حسن و قبح کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن بہرحال چوں کہ اس قلمی دیوان کے اشعار پر اب تک کوئی رائے زنی نہیں ہوئی اس لیے میں بہ پابندیٔ رسم صرف اس پر ایک سرسری اور اجمالی تبصرہ کرتا ہوں یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کلامِ غالب کے بالکل ابتدائی زمانے کا ہے اس کی تاریخ کتابت بتا رہی ہے کہ جب یہ نسخہ لکھا گیا تھا اُس وقت ان کی عمر صرف پچیس سال کی تھی اس لیے کلام میں اُس روانی اور پختگی کی توقع نہیں کی جا سکتی جو بعد کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے اور کہیں کہیں بندش کی چستی اور مضمون کی پستی مذاقِ سلیم کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ تاہم بحکم عموم ترکیبوں کی جدّت، تشبیہوں کی ندرت، خیالات کی بلند پروازی اور مضامین کی آسماں پیمائی اس میں بھی ویسی ہی نمایاں ہے جیسی بعد کے کلام میں۔ فرق فقط اتنا ہے کہ نشہ شباب کی ترنگ اور نازک کلامانِ ایران کے رنگ نے ان شعروں کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ابتدائے مشقِ سخن میں بیدل کا طرز غالب کا نصب العین تھا اور مضمون آفرینی اور خیال بندی پر تمام ہمت مصروف تھی۔ چناں چہ ناظرین کو غزلوں میں جا بجا اس کے حوالے ملیں گے۔ میں سند کے طور پر یہاں اُن کے صرف چند شعر پیش کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

اسدؔ ہر جا سخن میں طرح باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدلؔ پسند آیا

☆

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز بر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

☆

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

☆

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

☆

دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدلؔ ہے آئینہ

☆

اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے

☆

ہے خامہ فیض بیعتِ بیدلؔ بکف اسدؔ
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

☆

گر ملے حضرتِ بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ آئینہ پرواز معانی مانگے

☆

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ
شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غالب پر بیدل کا کتنا گہرا اثر تھا، یا اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا کہ اُس کی فارسی بھی پایۂ اعتبار سے گر گئی چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''ناصر علی بیدل اور غنیمت۔ ان کی فارسی کیا ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' یہ تغیر مشق کی پختگی، زبان کی قدرت اور نظر کی وسعت کا پیدا کردہ ہے اس عہد کی اکثر و بیشتر غزلوں میں تخلص اسدؔ ہے۔ یہی وہ دیوان ہے جس کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں ''قبلہ، ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چناں چہ ایک غزل کا مقطع تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔'' ظاہر ہے کہ جب بیدل کی فارسی تک قابلِ سند نہ رہی تو جو غزلیں اُس کے تتبع میں لکھی گئی تھیں اُن کی نسبت اس کے سوا کیا فتوٰی دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس خط سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ غالب کو اس زمانہ میں اپنے کلام کے اشکال کی خبر نہ تھی، بعد میں تمیز آئی نہیں! اس دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس وقت بھی خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ اُن کے اشعار کو عام طور پر کوئی نہیں سمجھتا کیوں کہ یہ مشہور رباعی بھی اس میں موجود ہے (اس لیے یقیناً پچیس برس کی عمر سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے):

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل

سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن طبیعت کی اُفتاد اور فارسی سے قدرتی مناسبت ایسی تھی کہ وہ کسی طرح پیش پا افتادہ مضامین اور آسان اور عام پسند الفاظ کا استعمال گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔ یہاں تک کہ جب اعتراضات کی بھرمار سے بہت مجبور ہو گئے تو

آخر (بقولِ آزاد مرحوم) ''اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیمِ سخن کا بھی بادشاہ تھا اپنی غزل کے ایک شعر میں سب کا جواب دے دیا اور سب کو ہمیشہ کے لیے لاجواب کر دیا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ غزل اور یہی شعر بھی اسی قلمی نسخے میں موجود ہے اور اسی عہد شباب کی یادگار ہے۔ اور اس سے اور اس زمانہ کے اور صدہا شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود دقت پسندی، جب صاف گوئی اور واقعہ نگاری پر آ جاتے تھے تو اس نومشقی میں بھی اُن کا کلام سہل ممتنع ہو جاتا تھا۔

بہرحال ان سب باتوں نے مل جل کر اس زمانہ کے کلام کے ایک معتد بہ حصہ میں غرابت اور دشواری پیدا کر دی ہے۔ اور یہ سقم بالخصوص ان اشعار میں نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے جو بوقتِ انتخاب حذف کر دیے گئے تھے اس لیے یقیناً غالب کے ان احباب پر کسی طرح اعتراض نہیں ہو سکتا جنھوں نے اُسے ان اشعار کے قلم زد کرنے کی رائے دی تھی اور جن کی سخن فہمی اور دقیقہ سنجی نے اس کی بے راہ رو طبیعت کو راہِ راست پر لانے میں سیلی استاد کا کام دیا۔ عرفی نے خوب کہا ہے:

مراد و خضر عناں گیر باید از چپ و راست
کہ کج روی نہ کنم ورنہ عزم راہِ خطاست

اس بنا پر ہمارے بعض احباب اب بھی اس دیوان کی اشاعت کے خلاف تھے کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ جس کلام کو شاعر کے ہم عصر دوستوں نے قابل حذف قرار دیا اور جسے خود شاعر نے اپنے دیوان میں سے خارج کر دیا اس کے اب شائع کرنے سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ شاعر اپنے پہلے درجہ سے بھی گر جائے اور بلحاظِ مجموعی اس کے کلام کی وقعت کم ہو جائے۔ اور ایک صاحب تو اس کے اتنے مخالف ہیں کہ انھوں نے اس کا نام ''مہملاتِ غالب'' رکھا ہے۔ ممکن نہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ جب یہ دیوان ملک میں شائع ہوگا تو اور بھی بہت سے حضرات ان کے ہم خیال ہوں گے۔ لیکن وہ اس میں معذور ہیں کیوں کہ یہ اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی سمجھ ہے، ہم کو ان سے کوئی شکایت نہیں، غالب نے سو برس پہلے کہا ہے:

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اس ابتدائی نظری کلام میں جو عیوب واسقام ہیں ان کی طرف تو ہم خود بھی اشارہ کر چکے ہیں اور یقیناً غالب کا بڑے سے بڑا طرفدار بھی انصاف کا خون کیے بغیر ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس احتمال سے ہم کو اتفاق نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے غالب کی موجودہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کمی ہو جائے گی اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہو۔ غالب کا وہ کلام جس کی گوناگوں خوبیوں نے سخن شناس دلوں پر اُس کی یکتائی کا سکہ بٹھا دیا ہے وہ بدستور موجود ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ پھر اگر اس کا کچھ اور نیا کلام مل جائے اور بالفرض وہ مروجہ کلام کی نسبت پست بھی ہو تو کیا اس سے وہ پہلے اشعار بھی پست ہو جائیں گے۔ کیا کسی کے بچپن کی کج مج زبانی سے اُس کی آئندہ کی فصاحت و بلاغت پر حرف آسکتا ہے کیا کسی مصور کی ابتدائی مساعی اس کے عہدِ کمال کی صناعی کی قدر و قیمت کم کر سکتی ہیں۔ ہر گز نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح یہاں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کلام جو موردِ اعتراض ہے غالب کے اوائل عمر کا کہا ہوا ہے اور اگر اس میں کچھ خامیاں ہوں تو اُن سے اُن کے کمال میں نقص نہیں آتا۔

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ پھر ان ابتدائی مشقوں کو شائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اس کا سب سے بہتر جواب وہ نوع انسان کے مایہ ناز فلسفی دے سکتے ہیں جنھوں نے اپنی عمریں مختلف اشیاء کے مدارجِ ارتقاء کے مطالعہ میں صرف کر دی ہیں اور جو اس تحقیق و تدقیق کو کشفِ حقائق کا ذریعہ اور آئندہ ترقی کا راز سمجھتے ہیں۔ دنیا کی تاریخی ادبیات میں ایسی مثالیں بہت شاذ ہیں کہ ہم کو کسی استادِ کامل کے کمال کے ابتدائی مراتب اور ارتقائی مدارج کا صحیح حال معلوم ہو سکے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس قلمی نسخے کے مل جانے سے ہم کو غالب جیسے مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد کی شاعری کے درجہ بدرجہ نمونے نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اس کے اشعار کا کیا انداز تھا اور پھر اس میں رفتہ رفتہ کیا کیا تغیر ہوا۔ چوں کہ ہم اس نسخے کی صحیح تاریخ کتابت بھی جانتے ہیں اس لیے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ پچیس برس کی عمر میں بھی اس کی شاعری کس قدر ترقی کر چکی تھی اور ابتدائی وقت اور غرابت کے مقابلہ میں کتنی روانی اور سلاست پیدا ہو گئی تھی۔ نیز چوں کہ نظر ثانی کے وقت اس میں غالباً غالب نے خود ترمیمیں کی ہیں اس لیے ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی طبع سلیم نے بلا امداد واستاد خود اپنی اصلاح کیوں کر کی ہے اس مصلحت کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اُن تمام مختلف اصلاحوں کو حاشیے پر درج کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان سے غالب کی شاعری کی تاریخ پر قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ نظری اشعار بھی اپنا ایک خاص انداز رکھتے ہیں اوران میں بھی حسنِ تخیل اور جدتِ مضمون کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔لیکن ان کا انتخاب میں ناظرین کی سخن فہمی پر چھوڑتا ہوں۔ان پر سب سے بڑا اعتراض جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔مگر یہ ایک ایسا اعتراض ہے جو غالب کے اور اشعار پر بھی وارد ہوتا ہے لیکن آخر فارسی کا مذاق کفر والحاد نہیں کہ آدمی مردود وازلی ہو جائے، غدر بغاوت نہیں کہ اُس کی سزا قتل قرار پائے۔ ہے تو فقط اتنا ہے کہ زمانہ کی بے اعتنائی نے اسے طبیعتوں پر گراں اور دلوں پر بار بنا دیا ہے۔اس لیے اب جو چاہے کہے، لیکن پھر بھی بقول مولانا حالی مرحوم ”مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو۔یا اُس کو اردو زبان کے دائرہ سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں ان کی اُرِجنلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت واستعداد پر شہادت دیتی ہیں۔معمولی قابلیت واستعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُس پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہولیں۔اور کھیت کے ادھر اُدھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ مو تجاوز نہ کریں اور اُن کے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے راستہ پر چلنا اُن کی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اُرِجنلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُن کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ان کو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں اور وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے اُن کی طبیعت ابا کرتی ہے۔یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو۔مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں عام راہگیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر ٹھہر جائیں۔مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی۔وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے اور عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔“(یادگارِ غالب، صفحہ ۱۰۳)

یہی جدت طرازی اور ندرت پسندی تھی جس نے اس وقت غالب کو اپنے اشعار کے حذف واسقاط پر مجبور کیا تھا اور یہی ہے جس نے اب اُس کے منتخب کلام کو اردو زبان کا مایہ ناز بنا دیا ہے۔

حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کے یہی نظری اشعار آئندہ کے لیے سینکڑوں نئے نئے خیالات کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں وہ بہترین اشعار میں شمار ہونے کے قابل نہ ہوں تاہم اُن میں ایسی نئی طرحیں اور تازہ روشیں ڈالی گئی ہیں کہ اُن کی داغ بیل پر صدہا طرح کی گلکاریاں اور بزم آرائیاں کی جاسکتی ہیں اور خواہ ان کو کوئی سخن فہم مہمل اور بے معنی ہی کہے پھر بھی ان میں ایسے گنجینہ ہائے معانی پنہاں ہیں کہ اُس سے ہزاروں نئے نئے مضمون پیدا ہو سکتے ہیں، سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی تشبیہیں ان میں جواہر ریزوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں اور یقیناً اس زمانہ میں جبکہ اردو زبان کی ترقی اور توسیع کا شور ہو رہا ہے ان کو رائیگاں چھوڑ دینا میرے نزدیک ایک نا قابل تلافی قصور ہے۔

اس دیوان کی اشاعت کے جو جوہ یہاں تک عرض کیے گئے وہ فقط اصولِ افادہ کے مطابق یعنی محض خود غرضی پر مبنی ہیں۔ کیوں کہ ان میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے ہم کو ذاتی طور پر کیا فائدہ ہونا ممکن ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے سوا ایک وجہ اور بھی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ غالب کو خود اپنے کلام کے حذف واخراج کا اختیار تھا۔ اس نے جس حصہ کو چاہا رہنے دیا اور جس کو چاہا نکال دیا لیکن ہم اس کے مجاز نہیں ہیں جب تک یہ قلمی نسخہ نہیں ملا تھا تب تک صورت حال دوسری تھی۔ مگر اس کے دستیاب ہو جانے کے بعد اس کی بجنسہٖ اشاعت ایک ادبی خدمت اور ایک قومی فرض ہے جس سے ہم اس کے ادا کیے بغیر کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ہم کو یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ غالب نے کیسی حسرت و مجبوری سے اپنے اُن لختِ ہائے دل کو کاٹنا گوارا کیا ہوگا۔

مولانا حالی مرحوم خود شاعر تھے اور شعر گوئی کی دقت اور محنت کو جانتے تھے اس لیے ان کا قول اس بارے میں مستند ہے وہ فرماتے ہیں ''ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دُکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دُکھا ہوگا۔'' (یادگارِ غالب، صفحہ ۱۰۰)

غالب نے خود بھی اپنے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب میں شاعر کی دماغ سوزی کو بڑے لطیف اسلوب سے بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

سخن دراصل ہما نابود سیہ خونے
کہ کاتبش زرگِ کلکِ مشکبار کشد
کشد چہ رنج سخنورکہ نقشہائے بدیع
زبہر آنکہ گذارد بہ یادگار کشد

تو کیا اب ان کا ہم پر (جو ان کے سخن فہم اور قدر دان ہونے کی مدعی ہیں) اتنا بھی حق نہیں ہے کہ ہم ان کے ان جگر پاروں کو جسے انھوں نے بادل ناخواستہ حذف کر دیا تھا اور کچھ نہیں تو ان کی یادگار ہی کے طور پر محفوظ رکھیں۔ فارسی کو جانے دیجیے انھوں نے اردو نظم و نثر کی جو بے بہا خدمت کی ہے اُس کے لحاظ سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی اس ابتدائی مشق سخن کو باقی رکھا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کی زندہ اور زندہ دل قومیں اپنے اسلاف کی ادنیٰ ترین چیزوں کو بھی کیسے ادب واحترام سے جمع کرتی ہیں اور اُن کی غلطیوں اور لغزشوں کو بھی کیسا کار آمد اور سبق آموز بنالیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ایک ایک مسودہ ہزاروں اشرفیوں میں بک جاتا ہے اور ایک ایک رڈی اور مستعمل ٹکٹ (جس کا ہمارے ذہن میں کوئی مصرف آتا ہی نہیں) جواہرات کا ہم قیمت ہو جاتا ہے حالاں کہ یہ تعلیم ہمارے ہی ایک بزرگ کی دی ہوئی ہے جس نے فرمایا ہے:

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکست یادگار

مجھے خیال ہے کہ شاید ایک بار غالب کے مزار پر ایک مقبرہ بنانے کی تحریک ہوئی تھی مگر ملک کی عام فرومائگی اور پست ہمتی سے جہاں اور صدہا تجویزیں ہو ہو کر رہ گئیں وہاں اس کا بھی کچھ عملی نتیجہ نہ نکلا۔ خیر، مقبرہ تو خواہ بنے یا نہ بنے لیکن اس دیوان کا شائع ہونا تو ہر حیثیت سے اتنا ضروری اور لازمی ہے کہ میں اس عنوان پر اس سے زیادہ زور دینا فضول سمجھتا ہوں اور قدر دانانِ غالب سے اس سے زیادہ بدگمان ہونا گناہ خیال کرتا ہوں۔ ہاں شرمساری مجھے خود اپنی ناقابلیت کی وجہ سے ہے کہ غالب جیسے شخص کا دیوان مجھ ایسے قلیل البضاعۃ اور ہیچ مدان کے ہاتھوں سے مرتب ہو۔

لیکن مرحوم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ:

چشمِ کور آئینہ دعویٰ بکف خواہد گرفت
دستِ شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

یہ ان کی ایک اور پیشین گوئی ہے جو اس طرح پوری ہوئی۔ بہرحال لوگوں کو دیوان سے مطلب ہے مدون سے کیا کام۔ ہاں سب سے زیادہ شکر گزاری کے قابل عالی جناب معلیٰ القاب افتخار الملک نواب زادہ حاجی کرنل محمد حمید اللہ خان صاحب بہادر بی اے، سی ایس آئی، چیف سیکریٹری ریاست بھوپال ہیں جن کی سچی قدردانی نے اس دیوان کو زیور طبع سے مزین کیا اور ملک و قوم کو اس سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا۔ میں کہ اُن کی بارگاہ فیض کا ایک ادنیٰ نمک پروردہ ہوں، میرا کیا منہ ہے کہ اُن کی تعریف و توصیف میں لب کشا ہوسکوں یا ان کی احسان مندی کا حق ادا کرسکوں۔ کاش غالب ہوتا کہ اُسے زمانہ کی ناسازگاری کا گلہ اور ممدوحین کی ناشکر گزاری کا شکوہ نہ رہتا اور وہ انوری کا ہم زبان ہوکر یہ نہ کہتا کہ:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست محبوبے سزاوارِ غزل

میں تو زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہوں کہ غالب کو اپنا ہمنوا بنا کر اپنی اور اُس کی تمام دنیا کی طرف سے یہ کہوں کہ:

برائے شاہِ یزداں طلب کنم شش چیز
بصد ہزار تضرع زروے عجز و نیاز
تن درست و دل شاد طالع فرخ
شکوہ وافر و ملکِ وسیع و عمرِ دراز

خاکسار
مفتی محمد انوار الحق عفی عنہ

(دیوانِ غالب جدید المعروف نسخۂ حمیدیہ۔ ۱۹۲۱ء۔ ص ۹ تا ۳۰)

•••

مفتی محمد انوار الحق

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور نسخۂ حمیدیہ

داغ بودم کہ چہ خواہم بہ غمت انشا کرد
نقطۂ اشک رواگشت و خطے پیدا کرد

(بیدل)

آہ۔ کیا انقلاب لیل ونہار، کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کرر ہے تھے آج ان کی یادگار کے طور پر شائع ہورہی ہے اور یہ ورق جواُن کے رُشحاتِ قلم سے روکشِ گلزار ہونے والا تھا اس وقت معناً ان کا کتابۂ مزار ہے۔

یوں تو دنیا میں آمدورفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بلاشبہ پیدا ہونا ہی مرنے کا پیش خیمہ ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری جیسے فاضل کی موت ہزاروں لاکھوں کی موت پر بھاری ہے۔ ایسے اربابِ کمال اس دارِ ناپائیدار میں روز روز نہیں آتے:

عمر ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اند خراساں یا اویس اندر قرن

(ابن یمین)

لیکن کیا کیا جائے فرمانِ الٰہی میں مجالِ دم زدن نہیں۔

خیال تھا کہ اس موقع پر مرحوم کے کچھ مختصر حالاتِ زندگی بھی ہدیہ ناظرین کیے جائیں لیکن افسوس ہے کہ تعلقاتِ ظاہری کی ناپائیداری اور محبت ابنائے زماں کی بے ثباتی نے مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کے احباب کو اُن کی طرف سے اتنا تغافل شعار اور فراموش کار بنا دیا کہ سخت سعی وکوشش اور پیہم تقاضے اور یاددہانیاں بھی ان کو مرحوم کے حالات قلم بند کرنے کی طرف مائل نہ کر سکیں۔

خود مجھ کو ان کے انتقال سے صرف دو سال پہلے ان کے بھوپال آنے پر اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس لیے میں اُن کے سوانح سابقہ سے بالکل بے خبر تھا لیکن اپنی اس کمی کی تلافی کے لیے میں نے حتی الامکان اُن کے اکثر بڑے بڑے دوستوں سے مراسلت کی۔ وعدے بھی ہوئے۔ امیدیں بھی دلائی گئیں چناں چہ انھیں توقعات پر مرحوم کے مقدمۂ دیوانِ غالب نے عرصہ تک ادھر اُدھر کی سیر کی اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک اُن کے بعض دلی دوستوں کی میز نسیاں کا زینت افروز رہا اور زیادہ تر اسی وجہ سے اس دیوان کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ لیکن افسوس کہ ان سب کوششوں کا انجام حسرت اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہ ہوا اور حالاتِ زندگی کا بہم پہنچنا کجا مرحوم کی ایک تصویر جس کو اس کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ تھا وہ بھی مجھ سے لے لی گئی۔ اور اسی سبب سے اس دیوان کو تصاویر سے مزین کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ بے اعتنائی کی انتہا تو یہ ہے کہ مرحوم کے والد ماجد نے بھی میری استدعا کو عدیم الفرصتی کے عذر سے ٹال دیا۔ اس کے بعد میں اس مقصد میں کامیابی سے بالکل مایوس ہو گیا:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ بھی ممکن ہے کہ مرحوم کے احباب نے اپنے عزیز دوست کے حالاتِ زندگی میرے سپرد کرنے میں دریغ کیا ہو۔ یا انھوں نے مجھے اس اہم خدمت کے قابل نہ سمجھا ہو۔ اس لحاظ سے وہ یقیناً اس خموشی میں حق بہ جانب ہیں، لیکن میرا عذر اس بارے میں یہی ہے کہ میں مامور تھا۔

مرحوم کی علمی قابلیت کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شاید ابنائے وطن کو یہ بات بالعموم معلوم نہ ہو کہ مرحوم کو اوائل عمری سے شعر وسخن کا بھی شوق تھا اور اگرچہ ان کی طبعی خاموشی اور فطری ذوقِ کتب بینی نے ان کو خود شعر گوئی کی بہت کم مہلت دی۔ تاہم نقادِ سخن کی حیثیت سے وہ

اپنی آپ ہی نظیر تھے زبان دانی سے اُن کو خاص مناسبت تھی اور انھوں نے اثنائے قیامِ یورپ میں اکثر السنۂ مشرقی و مغربی میں قابلیت بہم پہنچا کر ان کے مشہور اور مقبول شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے ان کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ میں وہ وسعت پیدا ہو گئی تھی جو فی زمانہ ابنائے ملک میں بہت شاذ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انجمن ترقی اردو نے دیوانِ غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور انھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیبِ خاطر قبول کیا۔ اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس کام کے لیے اُن سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوانِ غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی۔ اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا، اس میں انھوں نے من حیث الشاعر غالب کا مقابلہ اکابر شعرائے یورپ سے کیا اور دکھا دیا کہ فقط اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی بزمِ ادب میں اس دہلی کے خاک نشین کی شاعری کا کیا رتبہ ہے۔ انھوں نے اس کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے نہایت عمیق نظر ڈالی اور ان کے فلسفیانہ دماغ اور شاعرانہ طبیعت نے اس میں ایسے عجیب و غریب حقائق کا اظہار کیا جن سے غالب ایک فصیح البیان شاعر کے بجائے قدرت کا ایک رمز شناس فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم معلوم ہونے لگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلا چون و چرا تسلیم ہی کر لیا جائے۔ نہیں۔ بعض جگہ خود مجھ کو بھی اس سے ایک گونہ اختلاف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کا تخیل خود اتنا بلند پرواز اور آسماں پیما واقع ہوا تھا کہ غالب کے اشعار میں جن باریکیوں تک ان کی نظر پہنچتی تھی وہاں تک عام طور پر کسی کی رسائی ہی نہیں ہوتی یہی وجہ تھی کہ وہ غالب کے اتنے مداح اور معتقد تھے کہ وہ اس کی گوناگوں معنوی خوبیوں کے سامنے اس کے چند لفظی اسقام کی کچھ وقعت نہ کرتے تھے بلا شبہ انھوں نے ان کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ جوشِ عقیدت اور فرطِ محبت کی ایک مسلسل داستان ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑی کوشش و کاوش کے ساتھ لکھی گئی ہے جن اصحاب کو اس سے اختلاف ہو ان کی نسبت غالب نے خود ہی کہا ہے اور خوب کہا ہے:

فرق است نہ اندک زدلم تا بہ دل تو

معذوری اگر حرف مرا زو بینا بی

ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے کیوں کہ ابھی تک انھوں نے اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ ردوبدل ہوتا۔ کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلمزدہ کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہوگیا تھا۔ مقابلہ کے لیے نئے نئے مضمون ہاتھ آگئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے لیے نہایت وسیع جولان گاہ مہیا ہوگیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی مرگِ بے ہنگام نے بہت عجلت کی اور دست برد اجل نے ان کو اس کی اشاعت سے اور ہم کو ان کی افادت سے محروم کر دیا اور بقول غالبؔ:

خوں گشت و در دل و جگر دوستاں فتاد
آں بادہ ہائے ناب کز ناکشیدہ ماند

وہ حقائق آگاہ دماغ جو فلسفیانہ گتھیاں سلجھایا کرتا تھا اب قیامت کی نیند سو رہا ہے اور وہ گوہر فشاں قلم جو دریائے معانی بہایا کرتا تھا ہمیشہ کے لیے ساکن اور ساکت ہوگیا ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھ دیا ہے اب اُس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی کا امکان نہیں۔ تعویذ قبر ان کی تصنیفات کا حرز بازو بن گیا ہے اور رحمتِ حق نے ان کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر مخالفوں کی نکتہ چینی سے بالا اور موافقوں کی مدح سرائی سے بے نیاز کر دیا ہے۔

لیکن بہرحال اب ان کے مسودے کا ایک ایک نقطہ اور ایک ایک لفظ ان کے احباب کی نظروں میں گہر یکتا اور درِ بے بہا ہے۔ آہ وہ ایک بچھڑے ہوئے دوست کی تحریر ہے جس کی صدائے روح پرور اب کبھی کانوں میں نہیں آئے گی۔ جس کی آوازِ دل آویز کبھی سامعہ نواز نہ ہوگی۔ اس لیے یہ تبصرہ بلاکم وکاست اس دیوان کے مقدمہ کے طور پر اس کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے تاکہ علم دوست اصحاب اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں اور مرحوم کے تبحر علمی کی داد دیں۔ اور مرحوم کے کثیر التعداد احباب اسے پڑھیں اور اس کے الفاظ میں اس یارِ رفتہ کے لطفِ صحبت کی یاد سے لذت یاب ہوں۔ بیدل علیہ الرحمہ نے سچ کہا ہے:

مگو گذشتہ رفیقاں زدل فراموشند
کدام نالہ کہ در پردہ اش نے جوشند

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظر بو دند
کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموشند
نہ رفتہ اندازیں بزم تا سخن باقیست
زدیدہ رفتہ حریفاں ہنوز درگوشند

دعا ہے کہ خدا اس کو بھی غالب کے کلام کے ساتھ قبول عام اور بقائے دوام کا خلعت عطا فرمائے اور مرحوم کی روح پرفتوح پر اپنے اشفاقِ بے کراں اور الطافِ بے پایاں کے پھول برسائے۔ وَ یَرحَمُ اللهُ عَبداً قَالَ آمِیناً۔

خاکسار

مفتی محمد انوار الحق عفا اللہ عنہ

(دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ۔۱۹۲۱ء۔ص ۳۱ تا ۳۷)

◆◆◆

سید ہاشمی فرید آبادی

دیوانِ غالبؔ جدید (نسخۂ حمیدیہ[1])

اس دیوان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے مختصر طور پر یہ سرگزشت بیان کرنی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انجمن ترقی اردو نے اول ہی اول ۱۳ء یا ۱۴ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نیا نسخہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوانِ غالب کو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔ اسی کے ساتھ چند مشہور ادیبوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلامِ غالبؔ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر فرمائیں تاکہ انجمن کے نسخہ میں ایک علمی شان پیدا ہو جائے۔

تجویز کے اسی آخری حصے کی بدولت کتاب کی تیاری میں بہت دیر ہوئی۔ صرف جناب رضا علی صاحب وحشتؔ (کلکتہ) نے تو انجمن کی درخواست پر ایک دلچسپ مضمون ارسال فرمایا۔ لیکن دیگر حضرات نے یا تو یہ درخواست قبول ہی نہ کی اور یا تو قبول کی تو ایفائے وعدہ نہ کر سکے۔

دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت، راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۸ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہو گیا۔ نیز مختلف ذرائع سے جو کچھ غیر مطبوعہ کلام مل سکا اسے ہی حسب موقع داخل دیوان کر لیا گیا۔ یہ کلام (چند قصائد و غزلیات) بیشتر مرزا صاحب کے اخیر زمانہ کا ہے اور اسی لیے نہ مطبوعہ دیوان میں شائع ہوا تھا نہ بھوپال کے جدید نسخۂ حمیدیہ میں درج ہے۔ گویا اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

انجمن کی تجویز اسی منزل میں تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالبؔ کا نیا نسخہ چھپ کر

شائع ہوا۔صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی لیکن مروجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا، لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اُسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ مگر اُن مرحوم کو کلام غالبؔ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اس کے سپرد کر دیا۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کلامِ غالبؔ پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ رسالۂ اُردو میں شائع ہو چکا ہے اور ان کے علمی کمالات کی ممتاز یادگار رہے گا لیکن اسے ہی مرحوم کے شوق مخلصانہ کا منجانب اللہ انعام سمجھنا چاہیے کہ جس وقت وہ غالب کے متداول دیوان کی طبع کا انتظام کر رہے تھے، حسن اتفاق سے خود بھوپال میں مرزا صاحب مرحوم کا وہ گمشدہ کلام دستیاب ہو گیا جسے مرزا نے خود یا اپنے دوستوں کے مشورے سے تلف کر دیا تھا۔

اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالبؔ کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوحؔ اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالبؔ مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانہ میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے تو خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے، اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، اُن کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دِقت قدیم و جدید کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ اُن کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا اور وہ سب امیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں، خاک میں مل گئیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن ریاست بھوپال میں ''مشیر تعلیمات'' کا عہدہ رکھتے تھے۔ انتقال کے بعد اُن کا کام ریاست کی طرف سے مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے کے تفویض ہوا اور انھوں نے اس بناء پر کہ دیوانِ غالبؔ کی طبع کا کام بھی ڈاکٹر بجنوری ریاست کے ایما سے انجام دے رہے تھے، یہ ادبی خدمت اپنے ذمہ لے لی اور تقریباً ایک سال کے بعد متداول کلام کے ساتھ پہلی مرتبہ یہ غیر مطبوعہ کلام شائع کیا۔

اس نایاب و گم گشتہ کلام کے اس طرح دوبارہ روشناس کیے جانے پر اہل اردو سرکارِ عالیہ بھوپال دامت فیوضہا اور خاص کر صاحب زادہ نواب حمید اللہ خاں کا جس قدر شکر یہ ادا کریں بجا ہے کہ انھیں کی امانت و سرپرستی سے غالبؔ کا یہ دیوان جدید شائع ہوا اور اسے مفتی صاحب نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے مناسب عرف سے معروف کیا۔

دیوانِ غالبؔ جدید بڑی تقطیع کے ۲۴۵ صفحات پر چھپا ہے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے اور شروع میں مفتی انوار الحق صاحب نے خود ایک تمہید اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی مختصر سوانح تحریر فرمائی ہے۔ نیز کلامِ غالبؔ پر بجنوری مرحوم کا طویل تبصرہ بھی شامل کتاب کر دیا ہے حالاں کہ وہ رسالہ اردو میں اور پھر علیحدہ کتاب کی صورت میں انجمن ترقی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے اور یوں بھی مرزا غالب کے صرف متداول کلام پر لکھا گیا تھا۔ غرض ہمارے خیال میں اس تبصرے کو نسخۂ حمیدیہ میں شامل کرنا غیر ضروری بلکہ کسی قدر ناموزوں ہوا۔ اس سے تو بہتر یہ ہوتا کہ اتنے صفحات کی مزید ضخامت دیوان کو اس طریقے سے چھاپنے میں صرف کی جاتی جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے سوچا تھا۔ یا اس سے بھی آسان اور ارزاں صورت یہ تھی کہ صرف قلمی نسخے کو بجنسہٖ طبع کرا دیا جاتا کہ اصلی غرض (یعنی اس گمشدہ کلام کی اشاعت و حفاظت) پوری ہو جاتی اور اہل شوق و تحقیق اس نے کلام کا متداول کلام سے خود مقابلہ اور موازنہ کر لیتے۔

جناب مفتی صاحب نے اس کے بجائے نئے کلام کو مروجہ کلام کے ساتھ یکجا طبع کرایا ہے اور

اگر چہ ایسے نئے اشعار کو جو صرف قلمی نسخے میں ملے اور مروجہ دیوان میں موجود نہیں، ظاہر کرنے کے لیے بعض علامتیں مقرر کر دی ہیں لیکن جگہ جگہ علامت کے بنانے میں سہو ہوا ہے جس سے بہت مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ ۲۔ اس طرح کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں اور گوان کی تعداد کچھ غیر معمولی نہیں لیکن اشعار میں خاص کر مرزا غالبؔ کے ادق کلام میں جو اس اہتمام خاص کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ غلطی کا رہ جانا نہایت ناگوار ہے اور اسی لیے راقم الحروف کی بتاکید گزارش ہے کہ خود جناب مفتی صاحب یا انجمن ترقی اردو کی طرف سے کوئی اور صاحب نسخۂ حمیدیہ پر احتیاط سے نظر ثانی کریں اور اب بھی ایک غلط نامہ تیار کر کے اس نئے دیوان کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

اپنی تمہید میں (صفحہ ۹ پر) جناب مفتی صاحب نے ایک نقشہ کھینچ کر بتایا ہے کہ متداول دیوان میں مطبوعہ اشعار کی تعداد ۱۴۸۸ اور ۲۳۰ غزلیں ہیں۔ لیکن قلمی نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۸۸۳ اور ۲۷۵ غزلیں نکلیں گویا قلمی نسخے میں تقریباً چار سو شعر زیادہ ہیں۔ مگر چوں کہ بہت سے اشعار دونوں نسخوں میں مشترک ہیں لہٰذا اس نقشے سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ قلمی نسخے کے نئے شعر ملانے کے بعد مرزا غالب کے کل اشعار کی تعداد کیا ہے؟ راقم الحروف نے اس خدمت کو خود انجام دیا اور سرسری طور پر مطبوعہ دیوان کے صرف وہ شعر گنے جو قلمی نسخے میں نہیں۔ ان کی تعداد ۸۵۰ کے قریب ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ گو متداول و مطبوعہ دیوان میں اشعار کی تعداد پندرہ سو سے بھی کم ہے مگر حقیقت میں مرزا غالبؔ نے اردو میں کم وبیش ڈھائی ہزار اشعار نظم کیے تھے۔

مولانا حالیؔ مرحوم نے یادگارِ غالبؔ میں یہ سماعی روایت لکھی ہے کہ اول اول مرزا غالبؔ اردو ہی میں شعر کہتے تھے، اس بیان کی بھوپال کے قلمی نسخے سے بہت عمدہ شہادت ملتی ہے کیوں کہ یہ سب سے اول ۱۲۳۷ھ میں نقل ہوا تھا اور اس وقت مرزا غالب کی عمر (ولادت رجب ۱۲۱۲ھ) پوری پچیس برس کی بھی نہ تھی۔ پھر جیسا کہ مفتی انوار الحق صاحب نے لکھا ہے غالباً دو دفعہ یہ نسخہ بعد میں بھی دہلی بھیجا گیا اور ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۸۱ھ میں اس کی نظر ثانی اور بعض نئی غزلوں کا اضافہ ہوا لیکن افسوس ہے کہ مفتی صاحب موصوف نے ہمیں یہ کچھ نہیں بتایا کہ ابتدائی اور صرف ۱۲۳۷ھ تک کا کلام کتنا اور کون سا ہے حالاں کہ اس قلمی نسخے میں سب سے اہم اور غور طلب شے یہی تھی اور اگر

ہمیں ۱۲۳۷ھ تک کا کلام ٹھیک معلوم ہو جاتا کہ تو نہ صرف مرزا غالبؔ کی ابتدائی شاعری بلکہ خود اردو زبان کی تاریخ کے متعلق ہمیں یہ اندازہ کرنے کا موقع تھا کہ آج سے ڈیڑھ سو برس مسلمان شرفا (اور وہ بھی تازہ وارد ترکستانی) کس قسم کی اردو بولتے اور لکھتے تھے؟

خاکسار کے نزدیک اس قلمی نسخے کو شائع کرتے وقت بحث وگفتگو کا سب سے اہم عنوان یہی تھا لیکن مفتی صاحب نے اس پر توجہ نہیں فرمائی اور چوں کہ وہ قلمی نسخہ میرے سامنے نہیں ہے لہٰذا راقم الحروف اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔

آخر میں اس خارج شدہ کلام کے متعلق جواب پہلی مرتبہ شائع ہوتا ہے دو باتیں خاص طور پر بیان کرنے کے لائق ہے:

(۱) اس قلمی نسخے میں ایک مجموعہ تو ان غزلیات کا ہے جن کا ایک شعر بھی مطبوعہ دیوان میں نہ تھا اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۷ھ تک کا یہی وہ ابتدائی کلام ہے جسے مرزا صاحب نے بغیر کسی ترمیم وانتخاب کے تمام وکمال تلف کر دیا تھا جیسا کہ خود ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے۔''

(۲) دوسرا مجموعہ اُن غزلوں کا ہے جن کے کچھ اشعار تو متداول دیوان میں موجود ہیں اور بعض خارج کر دیے گئے تھے۔ روایت عام کی بموجب یہ انتخاب خود مرزا صاحب نے نہیں کیا بلکہ اُن کے بعض لائق احباب کی رائے سے ہوا تھا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان ہر دو قسم کے اشعار کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ عرض کریں:

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی غزلیں جن کا کوئی شعر بھی متداول دیوان میں نہیں لیا گیا۔ کسی علیحدہ بیاض میں درج تھیں اور اسے مرزا غالبؔ نے دیوان چھپوانے سے کچھ عرصے پہلے اول سے آخر تک پھاڑ کر پھینک دیا اور اس پر نظر ثانی یا ترمیم بعض اشعار کے انتخاب کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بے شبہ ان اشعار میں نہایت پیچیدگی اور

بعض مقامات پر نمایاں خامی پائی جاتی ہے اور اپنے بعد کے اشعار کے مقابلے میں یہ ابتدائی کلام ضرور مرزا کو ادنیٰ اور کم رتبہ معلوم ہوا ہوگا لیکن راقم الحروف کا گمان ہے کہ عجب نہیں اس تمام ابتدائی مجموعے کو تلف کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مرزا غالبؔ عام اردو داں طبقے کی علمیت اور دماغی قابلیت سے بدگمان و مایوس ہو گئے ہوں اور اسی لیے انھوں نے آئندہ اپنے تخیل کی کامل پرواز اور آزادانہ جولانی کے واسطے فارسی کا میدان مخصوص کر لیا ہو؟

مگر مرزا غالب کی شاعری پر مفصل بحث کرنے کے بجائے یہاں ہم ان کے تلف کردہ کلام کے بعض نمونے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

۱۔

خود آرا وحشتِ چشم پری سے، شب وہ بدخو تھا
کہ موم آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا
نہیں ہے بازگشت سیل، غیر از جانبِ دریا
ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا
اسدؔ خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جام لے کا تا بہ زانو تھا

۲۔

بسانِ جوہر آئینہ از ویرانی دل ہا
غبار کوچہ ہائے موج ہے خاشاکِ ساحل ہا
نہیں ہے باوجودِ ضعف اسیرِ بےخودی آساں
رہِ خوابیدہ میں افگند ہے طرح منازل ہا
تماشا کردنی ہے انتظار آبادِ حیرانی
نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں، فرشِ محمل ہا

۳۔

یاد روزے کو نفس در گردِ یارب تھا
نالۂ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا
بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار
دیدہ وخوں ہو، تماشا ہے چمن مطلب تھا
آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وابستۂ ہر مذہب تھا

یہ صرف ردیف الف کی بالکل ابتدائی اور سب سے مشکل غزلوں کے شعر ہیں انھیں میں بعض شعر نسبتاً زیادہ سہل اور قابل انتخاب موجود تھے لیکن اس ردیف میں آگے چل کر اور بھی صاف اور عمدہ شعر نظر آتے ہیں، مثلاً:

۴۔

وحشی بَن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتہ چاک جیب دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
مہر بجائے نامہ لگا ہے بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتل تمکین سنج یوں خاموشی کا پیغام کیا
شامِ فراقِ یار میں جوش خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ
ماہ کو وہ تسبیح کواکب جائے نشین امام کیا

۵۔

سیر آں سو ہے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
داد خواہِ تپش و مہر خموشی بر لب
کاغذِ سرمہ ہے جامہ تیرے بیماروں کا
اسدؔ اے ہرزو درا، نامہ بد غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

اسی غزل کا یہ شعر:

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

خود مرزا صاحب نے انتخاب کر کے گلِ رعنا میں درج کیا تھا اور مولانا حسرتؔ کے ہاں چھپ چکا ہے:

بہ مہر نامہ، جو بوسہ گلِ پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام ہوا
ہوا نہ مجھ سے بجز درد، حاصلِ صیاد
بسانِ رشک گرفتار چشمِ دام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

طوالت کے خوف سے یہاں ہم نے صرف ایک ہی ردیف کے نمونے پیش کیے ہیں۔ لیکن امید ہے انھیں کو دیکھ کر کلامِ غالبؔ سے لطف اندوز ہونے والے اعتراف کریں گے کہ اس ابتدائی کلام میں بھی جسے مرزا صاحب نے لوگوں کی طعن و تعریض سے تنگ آ کر تمام و کمال ضائع کر دیا تھا، ایسے اشعار موجود ہیں جو ہر طرح متداول دیوان کے انتخابی اشعار میں شامل کرنے کے لائق تھے۔

(۲) بھوپال کے قلمی نسخے میں وہ اشعار بھی محفوظ رہے جنھیں (بعد کے کلام میں سے) دیوان کے پہلی مرتبہ طبع ہوتے وقت خارج کر دیا گیا تھا۔ مشہور ہے اور قرائن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب کی یہ خدمت مرزا صاحب کے بعض خاص احباب نے انجام دی تھی۔ ان صاحبوں کی نیک نیتی یا علم و فضل میں ہمیں کوئی کلام نہیں لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے بہت ہی دشوار و نازک کام کا بیڑا اٹھایا اور ایسے چمن کی نلائی پر آمادہ ہوئے جس کی گھانس بھی خوشبو سے خالی نہ تھی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے بعد کے کلام میں قطع و بُرید اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ وہ اشعار بے معنی تھے یا اُن کے بعض مضامین ایسے پست اور رکیک تھے کہ ان کا شائع ہونا مناسب نہ تھا۔ بلکہ اس انتخاب کا اصلی سبب یہ تھا کہ بعض اشعار کا طرزِ بیان اس قدر پیچیدہ تھا کہ عام لوگ اس کا مفہوم نہ سمجھ سکتے تھے۔ لہٰذا انھیں دیوان سے نکال دینا ضروری سمجھا گیا!

لیکن اول تو ایک بلند خیال اور غیر معمولی شاعر کے کلام کو ذوق عامہ کا جو نہایت تغیر پذیر چیز ہے پابند بنانا بالکل ناروا اور علم ادب کی ترقی کے حق میں سخت مضر ہے دوسرے انتخاب کرنے والوں کے پاس اس بات کا قابل اطمینان معیار کیا تھا کہ فلاں شعر لوگوں کی سمجھ میں آ جائے گا اور فلاں نہ آئے گا، لہٰذا خارج کر دیا جائے؟ بہر حال اُن کی اس بے دردانہ جسارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایسے شعر جن کی نظیر اردو علم ادب میں مشکل ملے گی، دیوانِ غالبؔ سے خارج کر دیے گئے اور یہ اردو کی خوش نصیبی تھی کہ آج ستر برس کے بعد محض اتفاق سے دوبارہ ان کا سراغ مل گیا ورنہ مرزا صاحب اور ان کے دوستوں نے تو اپنے نزدیک انھیں ہمیشہ کے واسطے محو و بے نشان کر دیا تھا۔ ؂۳

ان ''بازیافتہ'' اشعار پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کرنے کا تو شاید پھر کبھی موقع ملے گا، سرِ دست نسخۂ حمیدیہ سے ان کے چند ایسے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو خاکسار کے خیال میں کسی طرح بھی دیوان سے خارج کرنے کے لائق نہ تھے۔

۱۔ انتخاب کرنے والوں نے ذیل کی غزل کا صرف مقطع رہنے دیا اور باقی سب شعر خارج کر دیے تھے حالاں کہ اس مقطع کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

(مطبوعہ مقطع)

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدا ہے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

(غیر مطبوعہ اشعار)

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری، انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا
اسیرِ بے زباں ہوں کاش کے صیاد بے پروا
بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہوجائے شکار اپنا
اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بیتابی
نثارِ گردشِ پیمانہ مے روزگار اپنا

۲۔

بہ صورت تکلف بہ معنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

۳۔ ''آشنا'' کی ردیف والی غزل سے دوسرے شعروں کے علاوہ اس لاجواب شعر کو بھی خارج کر دیا گیا تھا:

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

۴۔

رگِ گل جادۂ تارِ نگہ سے حد موافق ہے
ملیں گے منزلِ الفت میں ہم اور عندلیب آخر
غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بے قرارانہ
نیازِ بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

☆

اے آرزو شہید وفا خوں بہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
برہم ہے بزم غنچہ بہ یک جنبشِ نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

۵۔

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعوئ چمن نسبی ہے
خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے

اسی قسم کے اور بہت سے اعلیٰ درجے کے شعر ناظرین کو نسخہ حمیدیہ میں ملیں گے جنھیں انتخاب کرنے والوں نے دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ ہم نے صرف مذکورہ بالا مثالوں پر اکتفا کی۔ مگر مضمون کو ختم کرتے وقت ایک عجیب ''اعتراض'' کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا جو بعض صاحبوں نے اس گم گشتہ کلام کی اشاعت کے متعلق وارد کیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ جب خود مرزا غالبؔ نے اپنا یہ کلام ضائع کر دیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ مطبوعہ دیوان کے سوا میرا جو شعر کہیں ملے وہ میرا کلام نہ سمجھا جائے تو پھر اب کسی شخص کو اس کلام کے شائع کرنے کا کیا حق ہے؟

لیکن یہ حجت کسی قانونی عدالت میں قابل سماعت ہو تو ہو، علم ادب کی بارگاہ میں کوئی وزن و وقعت نہیں رکھتی۔ نامور شعراء یا مصنفین کی شہرت ہمیشہ اُن کے کسی ایک حصۂ کلام کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن ناموری کے بعد پھر اُن کی ہر یادگار کو نہایت محنت و جستجو کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے اور اگر خود وہ یا اُن کے معاصرین اس کام کو انجام نہ دیں (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو بعد کے لوگ اس کمی کو پورا کرتے ہیں کیوں کہ کسی بلند پایہ شاعر کا ادنیٰ سے ادنیٰ کلام بھی اس کے بہترین کلام کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور اس شاعر کے خیالات کا تدریجی ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔ نظر بریں مرزا غالبؔ کے تلف شدہ کلام کا اتنے عرصہ بعد دستیاب ہونا حقیقت میں ادیبوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور جو حضرات اس کلام کو ادنیٰ سمجھ کر بھی اس کی حفاظت و اشاعت کے خلاف ہیں وہ کچھ اسی قسم کی ظالمانہ ناقدری کے مجرم ہیں جیسے کوئی شخص روضۂ ممتاز محل کو دیکھنے کے بعد جائز رکھے کہ عہد شاہجہانی کی دوسری تمام عمارتیں مندرس ہو جائیں! فقط

حواشی:

۱۔ قیمت فی مجلد (۵) دفتر انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے پتے سے طلب کیا جائے

۲۔ مثلاً صفحہ ۳ کے کئی اشعار مطبوعہ اور متداول دیوان میں موجود ہیں مگر انھیں "قلمی" کی ذیل میں لکھ کر مطبوعہ اشعار کی مقررہ علامت (م) نہیں بنائی گئی۔

صفحہ ۵ کے دوسرے شعر پر بھی مطبوعہ کی علامت سہواً نہیں بنائی گئی اور دسویں شعر پر مطبوعہ اور قلمی دونوں لفظ لکھ دیے ہیں حالاں کہ وہ مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں۔

صفحہ ۶ کا دسواں اور صفحہ ۸ کا آخری شعر قلمی کی ذیل میں درج ہے حالاں کہ دونوں متداول دیوان میں موجود ہیں۔

اسی طرح صفحہ ۲۴ کے دسویں شعر کو مطبوعہ نہیں لکھا گیا۔ اور صفحہ ۲۳۳ پر ایک پوری غزل:

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے الخ

نئے اور غیر مطبوعہ کلام کے تحت میں درج کی گئی ہے حالاں کہ اس غزل کے آدھے شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں۔

مذکورہ بالا غلطیاں راقم الحروف نے محض سرسری نظر میں دیکھ کر یہاں بطور نمونہ لکھ دی ہیں پورے دیوان میں اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں مل جائیں گی اور میرا خیال ہے کہ اشعار کی کتابت میں بھی ایسی غلطیوں کا شمار جن سے صحیح معنی سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے پچیس تیس سے کم نہ ہوگا۔

۳۔ حیرت ہے کہ مفتی انوار الحق صاحب نے نواب فوجدار محمد خاں صاحب کے حالات (جن کے ذوقِ ادبی کی بدولت یہ نادر مجموعہ محفوظ رہا) کافی وضاحت کے ساتھ اپنی تمہید میں بیان نہیں کیے حالاں کہ وہ قریبی زمانے کے شخص ہیں اور ظاہراً بھوپال کے اُمرائے کبار میں داخل تھے۔

(سہ ماہی "اردو"۔ اورنگ آباد، دکن۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء۔ ص ۷۰۳ تا ۷۱۲)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد عبداللطیف

مترجمہ: جناب سید محمد صاحب (ایم اے مددگار سٹی کالج)

دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ ہجری

ادبستان ہند میں مرزا غالب اور ان کی اردو شاعری کے متعلق آج تک اتنا لکھا گیا کہ ان مضامین کے ہجوم سے کچھ اور نہیں تو نہیں کم سے کم منکرین پر اردو شاعری کی فضیلت نہایت آسانی کے ساتھ ثابت کردی جاسکتی ہے۔ ہمارے ملک کی ایک مستند ہستی ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ادبیات انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی نے غالبؔ پر غالبؔ کے نام سے انگریزی زبان میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کے ساتھ ہی غالب کے اردو کلام کی جدید طور پر ترتیب بھی شروع کردی ہے، مقالہ انگریزی میں ہونے کے باوجود غالب کے دیوان کو ہندوستان عشرت نشان کی ''الہامی'' کتاب سمجھنے والی جماعت اتنی ''برگشتہ'' معلوم ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ!

یہ مقالہ دیوان کے ساتھ ترجمہ ہوکر طبع ہوگا تو اس وقت کے اصلی جوہر کھلیں گے۔ مسلم ریویو میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) بھوپال پر ایک مختصر سا تنقیدی مضمون سپردقلم کیا ہے جس کی اہمیت آپ کو ''مترجم'' کے نوٹ سے معلوم ہوگی۔ نسخۂ حمیدیہ کے اضافات کلامی اور ان کے تعلیقات علمی پر اگر غور و توجہ سے کام لیا جائے تو بہت سی باتیں محل نظر بن جاتی ہیں کہ خود غالبؔ نے

اپنے احباب باصواب کے اصرار پر اپنے کلام کا جو انتخاب کیا تھا وہ کیا ہے؟

اس پر نوٹ لکھتے ہوئے ہماری نظر نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۳۶ پر پڑتی ہے، نشستن، گسستن کے قافیہ کے ساتھ رفتن کا بھی ایک قافیہ ہے۔ علامت مصدر ''تن'' کے پہلے نشس، گسس، رف، کیا غالبؔ کی شاعری کے آپس میں قافیے ہیں؟

''ہمارے ایک محترم دوست نے ہم سے بیان کیا کہ غالب نے اپنے دکنی شاگرد مولوی حبیب اللہ ذکاءؔ کے پاس تحفتہً اپنا اردو دیوان بھیجا تھا، شاگرد نے اس کا انتخاب کر کے فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیوان ان کے پاس آیا اور انھوں نے نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ بھی کیا، بعض بعض ردیفوں میں کئی کئی غزلیں زائد ہیں، اب ان کے پاس سے یہ دیوان واپس ہو گیا ہے۔ ہمارے اصرار پر پھر منگوانے کی کوشش میں ہیں، اگر یہ دیوان ہمارے قبضے میں آ جائے تو ممکن ہے کہ کچھ اور بھی حقیقت کھل جائے۔''

(مجلہ مکتبہ)

''مندرجہ ذیل مضمون میں جو کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی مسلم ریویو بابت جنوری ۱۹۲۹ء سے ترجمہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی اے، پی ایچ۔ ڈی پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ کی دقیقہ رس طبیعت اور فاضلانہ تحقیق و موشگافی کا نتیجہ ہے۔ مفتی انوار الحق صاحب مدیر نسخۂ حمیدیہ نے بھوپال کے مخطوطہ دیوان غالب کی نسبت اپنے نظریہ سے جو عجیب ادبی غلط فہمی پیدا کر دی تھی یقیناً اس کا اندفاع ڈاکٹر صاحب جیسے نکتہ رس محقق ہی کا کام تھا۔ کلامِ غالب کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے ڈاکٹر صاحب کی یہ سعی ان کی کتاب غالبؔ سے کچھ کم موجب تشکر نہیں البتہ ایسے پرستارانِ غالب جو ہر رطب و یابس کو مقدس سمجھتے ہیں، اس ہندی کی چندی کو بے مزا سمجھیں گے مگر طالبان تحقیق کے نزدیک یہ مختصر مضمون کئی بے خودانہ محاسن سے بہتر ہے۔''

(س۔م)

راقم الحروف جن دنوں غالب کی اردو نظموں کو تاریخی سلسلہ سے ترتیب دے رہا تھا مرزا غالبؔ کے اس مخطوطہ دیوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو ۱۲۳۷ھ م ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے اور حکومتِ بھوپال کی عنایت سے مجھے مستعار ملا تھا۔ ۱؎ جس وقت یہ دیوان قلمی ہوا، مرزا غالبؔ کی عمر (۲۴) برس کی تھی اور اگر ہم یہ باور کرلیں کہ مرزا نے (۱۵) برس کے سن سے ریختہ یا اردو غزل گوئی شروع کی تو اس مخطوطہ دیوان میں ان کی شاعرانہ زندگی کے دس برس کا سرمایہ مندرج ہونا چاہیے۔ ۲؎

یہ قلمی دیوان ریاست بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ میں اس عنایت پر کہ یہ نسخہ میرے مطالعہ کے لیے حیدرآباد بھیجا گیا اظہار امتنان کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کو اچھی حالت میں نہیں رکھا گیا۔ اس کی جلد اس قدر فرسودہ ہوگئی ہے کہ اوراق نہایت آسانی سے علیحدہ کرلیے جاسکتے ہیں۔ اس کی موجودہ جلد صرف یہ بتاتی ہے کہ کبھی یہ مجلد تھا۔

مفتی انوار الحق صاحب ساکن بھوپال کا جنھوں نے کلامِ غالب کے ایک جامع ایڈیشن میں اس نسخہ کی تمام نظمیں شریک کرلی ہیں، یہ بیان ہے کہ یہ نسخہ ابتداء میاں فوجدار محمد خاں رئیس بھوپال کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ بیان بظاہر مندرجہ ذیل عبارت پر مبنی ہے جو ایک سادہ ورق ۲؎ ب ۲ متن کے آغاز میں جلد بندی کے کچھ دن بعد لکھی گئی ہے:

"دیوان ہٰذا من تصنیف مرزا نوشہ، دہلوی المتخلص بہ اسدؔ، از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالیجاہ، عالم پناہ، میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ، قلمی خوش خط"

اس عبارت کے بالمقابل ایک اور ملحقہ ورق پر میاں فوجدار محمد خاں کی مہر مورخہ ۱۲۶۱ھ ثبت ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات اخذ کی جاسکتی ہے، یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ یہ نسخہ اس تاریخ سے کوئی (۲۴) برس پہلے ان کے لیے قلمی ہوا تھا۔

نسخہ کا متن (۷۵) اوراق (۷×۱۱/۲) پر مشتمل ہے اور اس کے ہر دو جانب چار چار ورق اسی قسم کے کاغذ کے جو متن کا ہے اور ہندوستان ہی میں ہاتھ کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے موجود ہیں۔ ان چار ورقوں کے علاوہ ہر ایک جانب دو دو ورق انگریزی کاغذ کے ہیں۔ ابتداء میں یہی ورق اوراق ۳؎ اور ۴؎ کے درمیان اور آخر میں اوراق ۲؎ اور ۳؎ کے درمیان ہیں۔ متن کے ہر صفحہ (۱۰) سے

(۱۱) تک ابیات صاف نستعلیق خط اور چینی روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے چار قصیدے ہیں پھر غزلیات ہیں جن کی تعداد (۲۷۶) ہے۔ آخر میں (۱۱) رباعیات درج ہیں۔ قصیدوں اور غزلوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دولوحیں ہیں جو سنہری کام سے مزین ہیں۔ سارا متن بھی سنہری حاشیہ کے خط سے آراستہ ہے۔ متن کے آخر میں کاتب نے اپنا اختتامی نوٹ اس طرح لکھا ہے:

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید
العبد المذنب حافظ معین الدین۔ بتاریخ شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ من الہجرہ النبویہ بہ
صورت انجام یافت۔''

متن کا حاشیہ گوناگوں اصلاحوں اور اضافوں سے مملو ہے۔ بعض جگہوں پر نئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں، درج کی گئی ہیں۔ چند جگہوں پر کئی غزلیں متن سے دوبارہ نقل کی گئی ہیں۔ حاشیہ کی تحریریں بعض خوشنما نستعلیق خط میں ہیں اور بعض شکستہ خط میں۔ حاشیہ پر متعدد جگہوں پر فوجدار محمد خاں کی ایک چھوٹی مہر مورخہ ۱۲۴۸ھ (۲ء۶ سم × ۸ء۸) ثبت ہے۔

متن کے ورق سے پہلے سادہ اوراق میں سے ورق ۱ کے بائیں گوشہ کے سرے پر ۶۶ء/ق درج ہے۔ اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے ۱۱ ادب اردو اور پھر کچھ نیچے ۵۸ء اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں (محمد حسین) لکھا ہوا ہے اوراق ۱ب، ۲الف اور ۲ب خالی ہیں۔

ورق ۳الف پر غالب کا ایک مکتوب (؟) بے نقط فارسی میں کسی قدر ناصاف شکستہ خط میں درج ہے۔ یہ مکتوب ورق ۳الف پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ورق ۶ب تک مسلسل ہے اور وہاں محمد اسد واللہ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ یہاں نام میں حرف و کا اضافہ قابل غور ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اوراق ۳، ۴ کے درمیان دو ملحقہ ورق ہیں۔ یہ جلد کے مستقل ورقوں سے چسپاں کر دیے گئے ہیں۔ یہ ورق کب شریک کیے گئے اور کس نے شریک کیے معلوم نہیں ہوسکتا ان ورقوں میں سے جو ۴ اور ۵ کہلائے جاسکتے ہیں ۴الف اور ۵ب بالکل خالی ہیں ۴ب پر صاف نستعلیق خط میں وہ عبارت درج ہے جو ہم نے ابتدا ہی میں نقل کی ہے۔

ورق ۵الف پر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر (۵ء۸ سم × ۴ء۵) ثبت ہے اور انگریزی کے چکنے کاغذ سے محفوظ کی گئی ہے۔ یہی مہر آخر کے ملحقہ ورقوں میں سے ایک پر بھی ثبت ہے۔ متن کے

بعد جو چار سادہ ورق شریک ہیں، ان پر غالبؔ کی کئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں اوران کے اختتام پر کاتب نے رسمی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا۔

نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوارالحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالبؔ کے ہاں ان نظموں کے اندراج کے لیے روانہ کیا جاتا تھا جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مگر مفتی صاحب اس استدلال کے لیے کوئی سنداور ثبوت پیش نہیں کرتے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیہ کے اضافے اور اصلاحیں خود مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے سرکار عالی کے محکمۂ اسنادات تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تنقیح کی اور غالب کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اوران اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں۔ یہ اغلاط غالبؔ جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ اس کے سوا کاتب نے حاشیہ پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں۔ نیز کئی ابیات کے آگے طفلانہ رائیں بھی درج ہیں۔

ان واقعات کے پیش نظر راقم ہرگز اس نظریہ کو باور کرنے پر تیار نہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے مدیر نے قائم کیا ہے۔ حاشیہ کے اضافے یقیناً غالبؔ کے خط میں نہیں بلکہ یہ دو مختلف ہاتھوں کے ہیں، بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں، اسی خط میں عبدالعلی کا نام لکھا ہوا ہے شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کے دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق ۱الف پر ثبت ہے، بہت ہی مشابہ ہیں۔

یہ دونوں کون تھے معلوم نہیں شاید میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار ہوں گے جنھوں نے غالبؔ کی تازہ غزلیں جیسے ہی وقتاً فوقتاً ملتی گئیں، حاشیہ پر درج کر دیں۔ یہ یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں جو فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے، غالب نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ ناممکن نہیں اگر حاشیہ کی غزلیں اسی انتخاب مرتبہ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخہ سے نقل کی گئی ہوں۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ یہ دیوان زیرِ طبع ہے عنقریب شائع ہوگا۔

۲۔ غالبؔ از مولوی سید عبداللطیف حیدرآباد دکن ۱۹۲۸ء نیز نسخۂ حمیدیہ ۱۴؎ یادگار غالب کریمی پریس، لاہور، ۹۷، ۹۸، ۱۹۲۴ء

(ماہنامہ ''مجلّہ مکتبہ''۔ حیدرآباد، دکن۔ مارچ ۱۹۲۹ء۔ ص ۵۳ تا ۵۷)

◆◆◆

حبیب احمد صدیقی

نسخۂ حمیدیہ

مفتی محمد انوار الحق صاحب مؤلف نسخہ حمیدیہ کے بیان کے مطابق اُن کے چند احباب نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے مخالف تھے، کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اس سے شاعر اپنے درجے سے گر جائے گا اور اس کی شاعرانہ عظمت کم ہو جائے گی۔ کسی انسان کی عظمت اس میں نہیں کہ وہ فرشتہ کی طرح معصوم اور بے عیب نظر آئے۔ اکثر ہوتا ہے کہ ہیرو پرستی میں ہیرو کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے جو درخشاں رنگوں سے مزین نظر آئے اور جس میں ایک دھبہ بھی دکھائی نہ دے۔ یہ تصویر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اصلیت سے دور ہونے کے سبب نہایت غیر دلچسپ ہوتی ہے۔ ممکن ہے نسخہ حمیدیہ شائع ہونے سے غالبؔ کی تصویر کے نقوش میں خفیف سا تغیر ہوا ہو مگر یہ تغیر ایسا نہیں جو تصویر کو بدنما کر دے۔ جس طرح غالبؔ کے نجی خطوط نے اُن کی صحیح شخصیت کو منظر عام پر لا کر اُن کی ذات سے دلچسپی میں اضافہ کیا، اسی طرح نسخہ حمیدیہ نے اُن کی شاعری کا مطالعہ زیادہ دلچسپ بنا دیا۔

غالبؔ کی زندگی کے جتنے پہلو سامنے آتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی شخصیت زیادہ دلکش ہوتی جاتی ہے، اس کا راز خود ان کی بے ریا کارانہ زندگی ہے۔ وہ اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کو ہنر نہیں سمجھتے۔ اُن کو اپنے دلی جذبات کے اظہار میں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ نواب شمس الدین سے پنشن کے مقدمہ کی وجہ سے اُن کی مخالفت تھی۔ اُن کے پھانسی پانے پر غالبؔ کے انتقامی جذبے کو جو تسکین ملی اُسے بے دریغ بیان کر دیا۔ وہ شراب خواری کو برا جانتے

تھے۔مگر اس کے جواز میں بہانے نہیں تراشتے تھے۔ وہ دین دار مسلمانوں کی طرح بہشت کے طالب اس لیے نہ تھے کہ وہاں دیدارِ الٰہی کی سب سے بڑی نعمت نصیب ہوگی، بلکہ انھیں بہشت کی تمنا اس لیے تھی کہ وہاں عمدہ اور خوش ذائقہ شراب ملے گی:

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

اُن کے خطوط اُن کی بے ریا زندگی کے آئینہ دار ہیں، جہاں دہلی کی بربادی اور دوستوں کی مفارقت پر غالبؔ کا دل خون کے آنسو روتا ہے، وہیں اپنی بہبودی، خلعت اور پنشن کے لیے وہ دہلی کو تباہ کرنے والوں کے آگے ناصیہ سا بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں احباب سے حد درجہ اخلاص و محبت ہے، وہیں قتیل واقف، ملاّ غیاث الدین، محمد حسین دکنی اور اُن کے حامیوں کے لیے اُن کے دل میں آتشِ نفرت بھی فروزاں ہے۔ ایک طرف اگر علمی بحثیں اور دقیقہ سنجیاں ہیں تو دوسری طرف ''ولد الزنا''، ''ولد الحرام''، ''قرم ساق''، ''احتلام الدولہ'' ایسے رکیک الفاظ بے تکلف استعمال کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے مکاتیب میں اپنی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ فرشتہ صفت ہوتے تو اُن کی شخصیت اتنی دلچسپ نہ ہوتی۔ اگر ان میں انسانی کمزوریاں نہ ملتیں تو ہمیں بجائے دلچسپی کے مغائرت کا احساس ہوتا۔ وہ بے دریغ ایک ''ستم پیشہ ڈومنی سے'' محبت کا ذکر کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ جس اصول پر ایسی محبت کرنا چاہیے وہ بھی بتا دیتے ہیں یعنی یہ کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ اسی طرح علمی بحث میں جو قاطع برہان کے سلسلے میں چھڑی، جب انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں مخالفین انھیں بے استادا نہ کہیں تو فوراً ایک خیال استاد ملا عبدالصمد کو وجود میں لے آتے ہیں اور اس کا ذکر اس شدّ و مد سے کرتے ہیں جیسے دراصل اس کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔ مگر پھر خود ہی اقرار کرتے ہیں کہ ملا عبدالصمد کا وجود ایجادِ بندہ تھا۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود غالب کی جو تصویر اُن کے خطوط کے پس پردہ نظر آتی ہے، وہ محض دلآویز ہی نہیں، باوقار بھی ہے۔ یہ تصویر ایسے شخص کو پیش کرتی ہے جس میں برائیوں پر اچھائیاں غالب ہیں، جس میں خوشامد اور تملّق کم اور خودداری اور رکھ رکھاؤ زیادہ ہے۔ جو جذبۂ نفرت سے مبرّا نہیں۔ مگر خلوص اس کا اصلی جوہر ہے جو باوجود سخت حاجت مند ہونے کے اگر دست سوال

دراز کرتا ہے تو صرف اُن کے آگے جن کو دینا بار نہ ہو، جو اپنے اور دوسروں کے مراتب سے واقف ہے، اور دوستوں کی دلجوئی کو سب سے بڑی سعادت جانتا ہے، غرضیکہ غالبؔ کی شخصیت نقاب اٹھنے کے بعد زیادہ جاذبِ نظر، زیادہ دلآویز اور زیادہ دلچسپ ہو جاتی ہے۔

مکاتیب کی طرح نسخۂ حمیدیہ نے بھی چند پردے اٹھا کر اس دلچسپی میں گراں قدر اضافہ کیا۔ رہی شاعرانہ عظمت، تو جہاں اس نسخہ میں صدہا الجھے ہوئے ''فارسی زدہ'' اشعار ملتے ہیں وہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالبؔ کی بہت سی مشہور غزلیں اُن کے اسی ''دورِ جہالت'' کی کہی ہوئی ہیں جو ۱۲۳۷ھ یعنی اُن کی عمر کے پچیسویں برس پر ختم ہوا۔ غالبؔ کا بیان تھا کہ ''پندرہ برس سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اور اوراقِ یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے، اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ سوائے دس پندرہ شعر کے پچیس برس تک کے کلام میں اور کچھ محفوظ رکھنے کے قابل نہ تھا۔ اگر نسخہ حمیدیہ شائع نہ ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اس عمر تک غالب کی شاعرانہ صلاحیتیں ایسی نہ تھیں کہ اُن کو صفِ اول کے شعراء کے زمرہ میں شامل کر سکتیں۔ خوش قسمتی سے وہی مجموعہ کلام جس کے اوراق غالب کے نزدیک یک قلم چاک کرنے کے قابل تھے، نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ہم تک پہنچا اور اس کے مطالعہ سے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت میں کئی حیثیتوں سے اضافہ ہوا۔ اول تو ہم کو معلوم ہوا کہ ۱۲۳۷ھ تک غالبؔ نے جو کچھ کہا تھا وہ یک قلم چاک کر دینے کے قابل نہ تھا بلکہ اس میں بہت سے اشعار ایسے تھے جو ان کے بہترین اشعار میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں غالبؔ کی شاعری کی ارتقائی منزلوں سے واقفیت حاصل ہوئی اور پتہ چلا کہ ایک بڑا شاعر اپنی خامیوں پر آگاہ ہو کر کس طرح خود اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ جو نسخۂ حمیدیہ کے شائع ہونے سے ہوا وہ یہ ہے کہ ایک کافی تعداد، عمدہ اور پاکیزہ اشعار کی جو انتخاب کے وقت نظر انداز کر دیے گئے تھے، ہم کو دستیاب ہوئی۔ کیا ستم ہے کہ مندرجہ ذیل شعر قابل انتخاب نہ ٹھہریں:

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

☆

بصورت تکلّف بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

☆

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

☆

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور

☆

اے چرخِ خاک برسرِ تعمیرِ کائنات
لیکن بنائے عہد وفا استوار کر

☆

اے اسدؔ ہم خود اسیر رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہراً صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

☆

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرین گنہگار ہیں ہم
اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

☆

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

☆

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

☆

ہے طلسم دہر میں صد حشرِ پاداش عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

☆

بے چشم دل نہ کر ہوسِ سیر لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورق انتخاب ہے

☆

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

☆

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

☆

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

☆

نہ حیرت چشم ساقی کی، نہ صحبت دور ساغر کی
میری محفل میں غالبؔ گردشِ ایام باقی ہے

(یہ پندرہ سولہ شعر یہاں بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں آخر سوسوا سو اشعار جو میں نے انتخاب کیے ہیں، درج کروں گا)

نسخۂ حمیدیہ میں کچھ اشعار اور غزلیں جو حاشیے پر درج ہیں یقیناً ۱۲۳۷ھ کے بعد کی ہیں مثلاً وہ غزل جس کا مقطع ہے:

مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

ایسے اشعار اور غزلوں سے قطع نظر صرف اس کلام کو جو ۱۲۳۷ھ میں رئیس بھوپال کے صاحب زادہ میاں فوجدار محمد خاں کے لیے مرتب کیا گیا تھا، اور جو غالبؔ کی پچیس برس کی عمر تک کا ہے، دیکھا جائے تو تیس چالیس ایسی غزلیں ملتی ہیں جو غالب کی مشہور غزلوں میں سے ہیں۔ ایسی کچھ غزلوں کے مطلع یہ ہیں:

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے، ہم نے مدعا پایا

☆

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

☆

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

☆

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

☆

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پر ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

☆

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

☆

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

☆

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

☆

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

☆

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

☆

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

☆

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

☆

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

☆

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

☆

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

☆

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

☆

درد سے میرے ہے تجھ کو قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

☆

آ کہ میری جاں کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

☆

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

☆

جب تک کہ وہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

☆

آئینہ کیوں دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ان غزلوں میں سے کچھ تو کافی ترمیم و تنسیخ کے بعد مروجہ دیوان میں آئی ہیں۔ مگر کافی ایسی بھی ہیں جن میں صرف ایک آدھ شعر گھٹایا بڑھایا گیا ہے اور بعض تو دونوں دیوانوں میں یکساں ہیں۔ جیسے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

☆

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

☆

غم دنیا سے پائی بھی جو فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

☆

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے
طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

☆

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

غالبؔ کی بہت مشہور غزل ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'' اسی ''دورِ جہالت'' کی کہی ہوئی ہے۔ صرف ایک شعر نکال دیا گیا ہے۔ مگر کسی شعر کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ ایک اور مشہور غزل ''آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے'' میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس میں سے ایک ایسا شعر بھی نظرانداز کر دیا گیا جس پر حیرت ہوتی ہے:

یارب مجھے تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

''جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی'' بھی غالبؔ کی مشہور غزلوں میں سے ہے۔ اس میں سے صرف ایک شعر کم کر کے پوری غزل مروجہ دیوان میں شامل کی گئی ہے۔ بعض بعض اشعار تو ایسی پختگی اور بالغ نظری کے حامل ہیں کہ اگر نسخۂ حمیدیہ کی شہادت نہ ہوتی تو کسی طرح یقین نہ آتا کہ بالکل ابتدائی دور میں کہے گئے ہوں گے۔ مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ یہ شعر کس بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہیں:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
ڈھانکا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

☆

سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

☆

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

☆

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

☆

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

☆

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

☆

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

☆

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

☆

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

☆

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

☆

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

☆

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

☆

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(پوری غزل)

☆

گر تجھ کو ہو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ

☆

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

☆

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

☆

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

☆

دیوار بار منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھایئے

☆

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

☆

مئے عشرت کہ خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے یک دو چار جام واژگوں وہ بھی

☆

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

☆

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

☆

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

☆

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزمائے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

☆

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

☆

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

☆

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

نسخۂ حمیدیہ شائع نہ ہوتا تو ان اشعار یا مندرجہ بالا غزلوں پر گمان بھی نہ گزرتا کہ غالبؔ کے ابتدائی دور کی ہیں، ان کو غالبؔ کے اور کلام میں ملا جلا کر پڑھیے تو بالکل احساس نہ ہوگا کہ ہم دو مختلف ادوار کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ جب نسخۂ حمیدیہ کے ذریعے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ایسے بہت سے اشعار غالب پچیس برس کی عمر تک کہہ چکے تھے تو یقیناً غالبؔ کی شاعرانہ عظمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ غالبؔ کے بیان سے جو دھوکا ہوتا تھا کہ پچیس برس تک انھوں نے جو کچھ کہا تھا، قابل اعتنا نہ تھا۔ وہ نسخۂ حمیدیہ کے توسط سے دور ہوگیا۔ اور یہ ثابت ہوا کہ غالبؔ میں ابتدا ہی سے شاعری کا وہ جوہر موجود تھا جس نے انھیں بقائے دوام عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرفیؔ اور کیٹسؔ کی طرح اُن کا شاعرانہ شعور بھی بہت جلد بالغ ہوگیا تھا اور اگر عرفیؔ اور کیٹسؔ کی طرح غالبؔ کی موت بھی عنفوانِ شباب میں واقع ہوتی (جو اردو ادب کے لیے ایک سانحہ عظیم ہوتا) تو بھی وہ ایک ایسا ادبی کارنامہ چھوڑ جاتے جو ہمیشہ رہنے والا ہوتا۔ انھوں نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو زندگی کے آخری دور میں لکھا تھا: ''نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نظم میں غالبؔ سوائے اس مجموعے کے جو ۱۲۳۷ھ میں مرتب ہوا تھا، اور کچھ نہ چھوڑ جاتے تو بھی قیامت تک اُن کا نام و نشان باقی و قائم رہتا۔

یہ ضرور ہے کہ نسخۂ حمیدیہ غالبؔ کی ابتدائی کج روی کی سینکڑوں مثالیں پیش کرتا ہے۔ بیشتر اشعار ایسے ہیں جو ''فارسی زدگی'' کے باعث اردو کے دائرہ سے خارج ہیں اور جن میں سے کچھ بعد میں غالبؔ نے اپنے فارسی دیوان میں شامل کر لیے۔ اُن کی طبیعت کورانہ تقلید سے منحرف تھی اور وہ

ہر بات کو بالکل نئے انداز سے کہنا چاہتے تھے۔اس افتادِ طبع نے اُن کے ابتدائی کلام میں اجنبیت پیدا کردی۔ بیدلؔ کا پیچیدہ طرز بیان ان کو اس قدر پسند آیا کہ اُسے شاعری کا خدا سمجھنے لگے۔ غالبؔ کو بیدلؔ سے کس قدر عقیدت تھی اس کا اظہار مروجہ دیوان میں بھی پایا جاتا ہے مگر نسخۂ حمیدیہ میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اُن کی والہانہ گرویدگی بہت نمایاں ہوجاتی ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

گر ملے حضرت بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ آئینۂ پرواز معانی مانگے

غالبؔ کی جدّت طرازی اور مشکل پسندی نے جہاں اُن کے کلام کو تازگی اور شگفتگی بخشی وہیں اُن سے ایسے اشعار بھی کہلوائے جو معمہ بن کر رہ گئے اور ان میں سے بعض نے تو حد درجہ مضحکہ خیز شکل اختیار کی مثلاً:

صبحِ قیامت ایک دُم گرگ تھی اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

☆

شیشۂ آتشیں رُخ پُر نور
عرق از خطِ چکیدہ روغنِ مور

☆

تیرے کوچے میں ہے مشاطۂ واماندگی قاصد
پر پرواز زلفِ باز ہے ہد ہد کے شانے میں

☆

یاں فلاخن باز کس کا نالۂ بے باک ہے
جادہ تا کہسار موئے چینیٔ افلاک ہے

☆

فنا کرتی ہے زائل سر نوشتِ کلفتِ ہستی
سحر از بہر شست و مشوئے داغ ماہ صابوں ہے

☆

غرورِ دستِ روئے شانہ توڑا فرقِ ہدہد پر
سلیمانی ہے ننگ بید ماغاںِ خود آرائی

☆

زخم دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

☆

ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیز نگاہ
پردۂ بادام یک غربالِ حسرت بیز ہے

☆

بیابانِ فنا ہے بادِ صحرائے طلب غالبؔ
پسینہ توسنِ ہمت کا سیل خانہ زیں ہے

ایسے اشعار کے ساتھ ساتھ جب ہم نہایت سلیس اور پاکیزہ اشعار (جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں) پاتے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ بیک وقت یہ کیسے ممکن ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کی طبیعت میں ابتدا ہی سے صحیح شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ جدت طرازی اور بیدلؔ کی پیروی میں وہ کچھ عرصہ دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتے رہے۔ مگر ان کے ذوقِ سلیم نے زیادہ بھٹکنے نہ دیا اور بالآخر وہ جلد ہی اچھے صحیح مقام پر پہنچ گئے۔

ابتدائی دور کے پیچیدہ کلام میں جو اصلاحیں غالبؔ نے بعد میں کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ کہیں کہیں تو صرف ایک آدھ لفظ کے ردوبدل سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اُن کی نکتہ رس طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

''جراحت تحفۂ الماس ارمغاں نادیدنی دعوت۔'' میں نادیدنی دعوت کے بجائے ''خونِ جگر ہدیہ'' رکھ دیا۔

''شور پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا۔'' میں ''صدمہ آواز سے قم کی'' نامناسب ترکیب تھی

اصلاح پا کر یہ مصرعہ یوں ہوا...... مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
''نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر''۔ یہ مصرعہ دوسرے مصرعہ سے زیادہ ربط نہ رکھتا تھا پورا مصرعہ بدل کر شعر یوں بنا دیا:

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

''حسد پیمانہ سے دل عالم آب تماشا ہو'' بہت الجھا ہوا مصرعہ تھا۔ اس کی جگہ ''حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو'' بنا دیا۔

''یاد ہے شادی میں عقدِ نالۂ یارب مجھے'' میں ''عقدۂ نالۂ یارب'' کی ترکیب اچھی نہ تھی۔ ''یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے'' کر دیا۔ ''عیادت بس کہ تجھ سے گرمی بازار بستر ہے''۔ کی جگہ ایک نہایت صاف مصرعہ رکھ دیا ''خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو''۔

''غم فراق میں تکلیفِ سیر گل مت دو'' کی جگہ ''غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو'' بنا دیا۔ جو نہایت عمدہ اصلاح ہے۔

''سیلاب گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج'' میں دشمن کی جگہ ''درپے'' رکھا جو یقیناً بہتر ہے۔

دل خوں شدۂ کشمکش کثرت اظہار۔ میں کثرت اظہار کی جگہ ''حسرت دیدار'' کی اصلاح خوب ہے۔

غالب کا مشہور شعر ہے ''بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل۔ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا'' اس کا پہلا مصرعہ ابتداء یوں تھا ''عشرتِ ایجاد چہ بوئے و گل کو دود چراغ'' ظاہر ہے کہ یہ اصلاح شعر کو کس قدر بلند کر دیتی ہے۔

غرض کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے یہ اندیشہ کہ غالبؔ اپنے درجے سے گر جائیں گے، بے بنیاد ثابت ہوا بلکہ یہ نسخہ کئی اعتبار سے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو بڑھانے میں مد ہوا۔ مزید برآں اس سے جہاں ایک طرف غالبؔ کے اس بیان کی تردید ہوئی کہ پچیس برس کی عمر تک جو کچھ کہا گیا تھا وہ یک قلم چاک کر دینے کے قابل تھا تو دوسری طرف مولانا محمد حسین آزادؔ کے بیان میں بھی ترمیم کی ضرورت لازم آئی۔ آزادؔ کے بیان سے گمان گزرتا تھا کہ مروجہ دیوان تمام تر منتخب کلام کا

مجموعہ ہے جسے غالبؔ کے دوعزیز دوستوں مولوی فضل حق اور مرزا خاں نے ان کے جملہ کلام سے منتخب کر کے مرتب کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔''

جو اشعار مروجہ دیوان اور نسخۂ حمیدیہ میں مشترک ہے، اُن کی تعداد (فاتحۂ فارسی کو چھوڑ کر) میرے شمار کے بموجب ۴۶۴ ہوتی ہے۔ (نسخہ حمیدیہ میں مشترک اشعار کے آگے ''م'' تحریر ہے۔ مگر کافی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے، جن پر ''م'' لکھنا غالباً سہواً چھوٹ گیا ہے۔ اس لیے محض ''م'' والے اشعار کو گننے سے مشترک اشعار کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکے گی۔ مروجہ دیوان میں اس سے چوگنے اشعار ہیں۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں کہ جو دیوان ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں، وہ تمام تر مولوی فضل حق اور مرزا خاں کا انتخاب کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے ۱۲۳۷ھ کے بعد بھی غالبؔ نے کچھ ایسی غزلیں کہی ہوں جن سے اشعار منتخب کیے گئے ہوں، مگر مروجہ دیوان کا بیشتر حصہ یقیناً غیر منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے مطالعے سے غالبؔ کے مذہبی عقیدہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، یوں تو ان کے خطوط میں ان کے عقیدہ کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ چناں چہ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔ ''صاحب بندہ اثنائے عشری ہوں ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو، ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔'' دوسری جگہ مرزا علاء الدین کو اپنے عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں ''محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح مہدی موعود علیہ السلام''۔ مگر غالباً وہ اپنے اصلی عقائد کا اعلان عام طور پر نہ کرتے تھے۔ چناں چہ نواب ضیاء الدین خاں نے جو اُن کے عزیز دوست ہونے کے علاوہ رشتہ دار بھی تھے، اُن کی تجہیز و تکفین اہل سنت کے طریقے پر کی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مخصوص دوستوں کے علاوہ وہ اوروں سے یہی کہتے تھے کہ ایک ماوراء النہری (یعنی غالبؔ) شیعہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جب اس الزام کی تردید میں کہ انھوں نے ترک مذہب آبائے نامدار کیا اور تشیع کو

سنن پر اختیار کیا۔'' کتاب لکھی تو تقریظ لکھنے کی خدمت غالبؔ کو سپرد کی گئی۔ اس تقریظ میں غالبؔ نے اپنے عقیدے کے اظہار سے نہایت خوبصورتی سے پہلوتہی کی، اور جو کچھ انھوں نے ''حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت پر نظم میں لکھا تھا اس کی توضیح اس طرح کر دی کہ مضامین ارشاد کیے ہوئے اعلیٰ حضرت کے بموجب ارشاد قالب نظم میں ڈھلے۔ ناگاہ جانب اجانب سے اس نظم کے جواب میں کچھ وار چلے۔ یہ گناہ گار بے گناہ بھی بہ ذم ممدوح ہوا اور خنجر زبان کے زخم سے مجروح ہوا۔''

مگر جس والہانہ انداز سے غالبؔ نے حضرت علی کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے اس سے ان کے شیعہ ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی...... میں نسخۂ حمیدیہ سے کچھ اشعار درج کرتا ہوں:

یا علی ایک نگاہ سوئے اسدؔ
میں غریب اور تو غریب نواز

☆

دھوئیں سے آگ کے ایک ابر دریا بار ہو پیدا
اسدؔ حیدر پرستوں سے اگر ہوئے دو چار آتش

☆

اسدؔ قدرت سے حیدر کے ہوئے، گبر و ترسا کو
شرارِ سنگ بت ہی بر بنائے اعتقاد آتش

☆

غالبؔ ہے رُتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

☆

اسدؔ گر نام والائے علی تعویذ بازو ہو
غریقِ بحر خوں تمثال در آئینہ رہتا ہے

☆

اسدؔ جہاں کہ علی برسر نوازش ہو
کشادِ عقدۂ دشوار کار آساں ہے

☆

کثرت اندوہ سے حیران مضطر ہے اسدؔ
یا علی وقت عنایات و دم تائید ہے

جو حیدر پرستی کا اقرار کرے اور علی کو خدا کہنا عجز بندگی جانے اس کے عقیدے میں شک وشبہ کی گنجائش کہاں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے سب سے بڑا فائدہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ ہوا کہ ایک کافی تعداد ایسے شعروں کی مل گئی جو نظری قرار دیے جانے کے باوجود گوناگوں لطافتوں کے حامل ہیں، اور ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کیوں انتخاب میں نہ آئے۔ مولوی فضل حق اور مرزا خاں (اگر انھوں نے انتخاب کی خدمت انجام دی) اس لحاظ سے بے شک لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے کنکریوں میں ملے ہوئے جواہر ریزوں میں سے بیشتر ڈھونڈ نکالے۔ نسخۂ حمیدیہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی جوہر شناس نگاہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی جواہر ریزوں کے ساتھ کچھ کنکریاں آگئیں اور کچھ جواہر ریزے چھوٹ گئے۔ معلوم نہیں مندرجہ ذیل اشعار جن میں زبان کی ثقالت کی تلافی کے لیے بلند پروازی یا معنی آفرینی بھی نہیں کیوں منتخب کیے گئے:

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا

☆

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

☆

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

☆

آمد خط سے ہُوا ہے سرد جو بازار دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسار دوست

☆

میرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دل سمندر کھینچ

☆

برنگ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھا ہے بالِ یک تپیدن پر

☆

میں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ کہتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

☆

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

☆

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

☆

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

☆

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

☆

میکدہ گر چشم مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

☆

سرشک سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
بہ طوفاں گاہ جوشِ اضطراب و شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

☆

لگد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کی ناز اٹھانے کی

اس قسم کے ثقیل اشعار تو منتخب کیے گئے، مگر ان سے کہیں زیادہ رواں اور بلند اشعار جن کی کچھ مثالیں شروع میں دی گئی ہیں نظر انداز کر دیے گئے۔ میں نے سوا سو اشعار اپنے مذاق کے مطابق انتخاب کیے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی اور اشعار بھی ایسے ہیں جو بہ لحاظ سلاست یا باعتبار معنی لیے جا سکتے ہیں۔ مروجہ دیوانِ غالب میں ایسے ثقیل اشعار کے علاوہ کچھ پست اشعار بھی ہیں، جیسے:

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

☆

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

☆

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

☆

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

اگر سب ثقیل اور پست اشعار جن کی تعداد سو سے زیادہ نہ ہوگی خارج کر دیے جائیں اور ان کی جگہ مندرجہ ذیل اشعار کا اضافہ کر دیا جائے اور ان غیر مطبوعہ اشعار کو بھی شامل کر لیا جائے جو غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں تو غالبؔ کا دیوان واقعی منتخب دیوان ہو جائے۔ جو اشعار میں نے منتخب کیے ہیں ان میں بیشتر تو ایسے ہیں کہ بلحاظ ندرت خیال، شوخی بیان یا بلندی مضمون ہرگز نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ دوسرے وہ ہیں کہ وہ اتنے اچھے نہیں مگر پھر بھی انتخاب کے قابل ہیں۔ تیسرے وہ اشعار ہیں جو زیادہ اچھے نہیں مگر قابل اعتنا ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی صاف اور رواں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں ملتے ہیں۔ مگر چوں کہ ان میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی اس لیے میں نے انھیں چھوڑ دیا۔

۱۔ وہ اشعار جو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے:

خود شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

☆

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☆

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

☆

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کر بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنون معاصی نہ ہوا

☆

اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نہ کھولی اُسے مشکل باندھا
ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں باندھا

☆

نہ پائی وسعتِ جولاں یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

☆

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگِ گل کے پردہ میں دل بے قرار تھا

اس شعر کی مروجہ دیوان میں شکل بدل گئی یعنی "بے پردہ سوئے وادی مجنوں گزر نہ کر":

بے پردہ سوئے وادی مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

☆

بہ صورت تکلف بہ معنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

☆

ہر رنگ میں ملا اسدؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلی شمع ظہور تھا

☆

ہوں قطرہ زن بوادیٔ حسرت شبانہ روز
جز تارِ اشک جادہ منزل نہیں رہا
اے آہ میری خاطر وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

☆

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا
آخر کار گرفتار سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

یہ دونوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں، یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کے کہے ہوئے ہیں۔

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا
اسدؔ اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

☆

دل وجگر تپ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا

☆

کس بات پر مغرور ہے اے عجزِ تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

☆

ہزار آفت و یک جان بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بے کساں فریاد

☆

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کی مذکور

☆

مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا زشت زدیوں کا عتاب آئینہ پر

یہ شعر حاشیہ پر درج ہے۔

اے چرخِ خاک بر سرِ تعمیر کائنات
لیکن بنائے عہد وفا استوار پر

☆

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

یہ شعر حاشیے پر درج ہے۔

اے اسد خود ہم اسیر رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہراً صیاد ناداں ہے گرفتار ہوس

☆

ہیں میری مشت خاک سے اس کو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبار حیف

☆

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید اک دست سوال

☆

بس کہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

☆

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم
اسدؔ شکوۂ کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

☆

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

☆

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

یہ شعر حاشیے پر درج ہے۔

میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں
سر پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بخت رمیدہ ہوں

☆

گر آتش ہمارا کوکب اقبال چمکادے
وگرنہ مثل خارِ خشک بردودِ گلستاں ہیں

☆

اسدؔ بزم تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویر عریاں ہیں

☆

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگ جادہ سر کوئے یار رکھتے ہیں

☆

ہے طلسم دہر میں صد حشر پاداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

☆

کوئی آگاہ نہیں باطنِ یک دیگر سے
ہے ہر یک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

☆

شکوہ و شکر کو اثر بیم و اُمید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

☆

گاہ نجلد اُمیدوار گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفت ما سوا سمجھ

☆

ہستی فریب نامۂ موج سراب ہے
یک عمرناز شوخی عنواں اٹھایئے

☆

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسم بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزق مدعا طلبی ہے

☆

بے چشم دل نہ کر ہوس سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

☆

اسدؔ اٹھنا قیامت تا نہ ہوگا وقتِ آرائش
لباس نظم میں بالیدنِ مضمون عالی ہے

☆

ہم مشقِ فکر وصل و غم ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

☆

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

☆

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہوگئی

☆

طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمکِ نگہ ناز ہے مجھے

☆

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

☆

تپش تو کیا نہ ہوئی عشق پر فشانی بھی
رہا میں ضعف سے شرمندۂ نو آموزی

☆

بس کہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بتِ خورشید طلعت آفتاب بام ہے

یہ شعر حاشیے پر درج ہے۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گل فام گو برسا کرے

☆

دام گاہ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پر فشاں بھی غریب خاطر آسودہ ہے

☆

شورشِ باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ آہ
شیونِ دل ایک سرود خانہ ہمسایہ ہے

☆

نوائے خفتۂ الفت اگر بے تاب ہوجائے
پرِ پروانہ تارِ شمع پر مضراب ہوجائے

☆

تاچند ناز مسجد بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے
گل سربسر اشارۂ جیب دریدہ ہے
ناز بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

☆

واماندۂ ذوقِ طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرت بسیار تمنا کی کمی ہے

☆

زندانِ تحمل میں مہمانِ تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

☆

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی
میری محفل میں غالبؔ گردش افلاک باقی ہے

۲۔ وہ اشعار جو اچھے خاصے اور انتخاب کے قابل ہیں:

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوال دل مگر
کس کو دماغ منتِ گفت و شنید تھا

☆

بازیٔ خود فریب ہے اہل نظر کا ذوق
ہنگامہ گرم، حیرت بودو نہ بود تھا

☆

کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

☆

شورِ رسوائی دل دیکھ کر یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا پھر وہی عریاں نکلا
شوخی رنگ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

☆

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
ایک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
درس تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے
وہ دل یہ ہے کہ جس کا تخلص صبور تھا

☆

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن ولے
آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

☆

اے خوشا ذوق تمنائے شہادت کہ اسدؔ
بے تکلف بہ سجودِ خم شمشیر آیا

☆

اسدؔ اربابِ فطرت قدر داں لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

☆

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنر مندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

☆

نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا غالبؔ
خیالِ زلف رُخِ دوست صبح شام رہا

☆

دو عالم کی ہستی پہ خط وفا کھینچ
دل دوست اربابِ ہمت سلامت
نہ فکر سلامت نہ بیم سلامت
زخود رفتگی ہائے حیرت سلامت
رہے غالبؔ خستہ مغلوب گردوں
یہ کیا بے نیاز نکلے حضرت سلامت

یہ اشعار حاشیہ پر درج ہیں۔

جب کہ نقش مدعا ہوئے نہ جز موج سراب
وادئ حسرت میں پھر آشفتہ سامانی عبث

☆

اے اسؔد بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالم تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

☆

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

☆

غرور ضبط وقتِ نزع ٹوٹا ہے قرارانہ
نیاز بال افشانی ہوا صبر شکیب آخر

☆

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوش خواب ہے، نرگس مخمور ہنوز

☆

کون آیا جو چمن بے تاب استقبال ہے
جنبش موجِ صبا ہے شوخی رفتار باغ

☆

نامہ بھی لکھتے ہو تو بخطِ غبار حیف
رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف
تھی میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز
گھر پر گرا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

☆

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک
رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشارپئے امتحانِ اشک

☆

مژگاں تلک رسائی لختِ جگر کہاں
اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

یہ اشعار حاشیے پر درج ہیں۔

نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے دامن
نگاہِ آشنائے گل و خار ہیں ہم

☆

کرنے پائے ضعف سے شور جنوں اسد
اب کے بہار کا یونہی گزرا برس تمام

☆

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

☆

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
وقت ہے گر بلبل مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گل جلوہ فرما ہے یہ بازارِ چمن

☆

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اُس سے ربط کروں جو بہت ستم گر ہو
صدف کی ہے تیرے نقش قدم میں کیفیت
سرشک چشم اسدؔ کیوں نہ اس میں گوہر ہو

☆

واسطے فکر فضا میں قیس کے غالبؔ
چاہیے خاطر جمع و دل آرامیدہ

☆

وحشتِ درد بے کسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمر خضر کو نالۂ نارسا سمجھ
نے سرو برگ آرزو نے رہ و رسم گفتگو
اے دل و جان خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

☆

کرتے ہو شکوہ کس کا تم اور بے وفائی!
سر پیٹتے ہیں اپنا ہم اور نیک نامی
ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن
ہے شرح شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

☆

کثرت جوروستم سے ہوگیا ہوں بے دماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبِ بدخو مجھے

☆

یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

☆

بیادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیوں کہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی

☆

اسدؔ جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

☆

پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
ساقی بہار موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

☆

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

☆

پرافشاں ہوگئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے

☆

بت خانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے

☆

یقیں ہے آدمی کو دست گاہ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

یہ شعر حاشیے پر درج ہے۔

جنوں فسردۂ تمکیں ہے، کاش عہد وفا
گداز حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے

☆

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر ایک ناچیز نوابی کرے

☆

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم پیمودہ ہے

☆

بہ رنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بے خودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہوجائے

☆

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائے اس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے

☆

چمن زار تمنا ہوگئی حرفِ خزاں لیکن
بہارِ نیم رنگ آہ حسرت ناک باقی ہے

☆

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

☆

وداع حوصلہ توفیقِ شکوہ عجز وفا
اسدؔ ہنوز گمانِ غرور دانائی

☆

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

☆

شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیے ہے دل و دماغ
عذر کی یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

نسخہ حمیدیہ کے کچھ اور اشعار جو زیادہ اچھے نہیں مگر قابل اعتنا ہیں:

فضائے خندۂ گل و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہِ آغوشِ وداع دل پسند آیا
اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادی بیدلؔ پسند آیا

☆

تنگی رفیق رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالع چشم حسود تھا

☆

کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقش ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

☆

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

☆

واں ہجوم نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا
دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا
آسماں سفلہ جس میں یک کفِ سیلاب تھا
بے خبر مت کہہ ہمیں بے درد، خود بینی سے پوچھ
قلزمِ ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

☆

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بے تابی
نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

☆

اسدؔ یہ عجز بے سامانیٔ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

☆

نگاہِ چشمِ حاسد دام لے اے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

☆

شاید کہ مرگیا ترا رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

☆

طاؤس در رکاب ہے، ہر ذرہ آہ کا
یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا
عزلت گزیں بزم ہیں واماندگانِ دید
مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

☆

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا
بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

☆

شمع رویوں کی سر انگشت حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پُرفشاں پروانہ آسا جل گیا

☆

بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسدؔ
دے نے برباد کیا پیر ہنستاں میرا

☆

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشاراتِ فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا؟

☆

دیکھ اس کی ساعد سیمیں و دستِ پُر نگار
شاخِ گل جلتی تھی مثل شمعِ گل پروانہ تھا

☆

دیوانگیِ اسدؔ کو حسرت کشِ طرب ہے
در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

☆

بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار
دامنِ آلودہ عصیاں گراں تر ہوگیا

☆

بسنگ شیشہ توڑوں ساقیا پیانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا
اسدؔ مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالبؔ ہے کہ بعد از زاریٔ بسیار ہو پیدا

☆

جاتا ہوں جدھر سب کی اُٹھی ہے اُدھر انگشت
یک دست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
ہر غنچۂ گل صورتِ یک قطرۂ خوں ہے
دیکھا ہے کسی کا جو حنا بستہ سر انگشت

☆

شاخِ گل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس
طفلِ شوخ غنچۂ گل بسکہ ہے وحشت مزاج

☆

خمار منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دل گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

☆

بے دل نہ ناز وحشت جیب دریدہ کھینچ
جوں بوئے غنچہ یک نفس آرمیدہ کھینچ
برقِ بہار سے ہوں میں پادر حنا ہنوز
اے خار دشت دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ

☆

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
تیغ درکف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالب مژدہ باد

☆

موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند
بالیدگی نیازِ قدِ جاں فزا اسدؔ
در ہر نفس، بقدر نفس ہے قبا بلند

☆

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ
برنگِ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد
ہلاکِ بے خبری نغمۂ وجود و عدم
جہان و اہل جہاں سے جہاں جہاں فریاد

☆

ہلال آسا تھی رہ گر کشادن ہائے دل چاہیے
ہوا منہ کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر

☆

کیجیے جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسد ہے ہنوز دلّی دور

☆

دل کو توڑا جوشِ بے تابی سے غالبؔ کیا کیا
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینہ پر

☆

جوں جادہ سر بکوئے تمنائے بے دلی
زنجیر پا ہے رشتۂ حب الوطن ہنوز

☆

فریب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہِ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

☆

آشنا غالبؔ نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ اُس کو میرے افسانے کی تابِ استماع

☆

ہوتے ہیں نیست جلوۂ خور سے سیارگاں
دیکھ اس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

☆

گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
گھبرا رہی ہے بیم خزاں سے بہار حیف

☆

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

☆

فلک سفلہ بے محابا ہے
اس ستم گر کو انفعال کہاں

☆

کسو کو زخود رستہ کم دیکھتے ہیں
کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں

☆

ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدر و منزلت
عزلت آباد صدف میں قیمت گوہر نہیں
کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقی کوثر نہیں

☆

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ افسردگاں

☆

واں پر فشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبح بہار بھی قفسِ رنگ و بو نہ ہو

☆

مجھے معلوم ہے جو تو نے مرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

☆

دہلی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت
بے چارہ چند روز کا یاں میہمان ہے

☆

پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے فلک
دل وقفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے

☆

نظر بہ نقصِ گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعوئ چمن نسبی ہے
امام ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشین نبیؐ ہے

☆

تا چند پستِ فطرتی طبع آرزو
یارب ملے بلندی دست دعا مجھے

☆

ہمیشہ مجھ کو طفل میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی

☆

ہوا ہے مانع عاشق نوازی ناز خود بینی
تکلف برطرف آئینۂ تمیز حائل ہے

☆

اسدؔ بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلاؤں کہ یک عالم گلستاں ہے

☆

دیوان گاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے

☆

آتش افروزیٔ یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

☆

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر
گرد صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے
اے سرشوریدہ، ناز عشق و پاسِ آبرو
یک طرف سودا و یک سو منت دستار ہے

☆

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
بے ستوں خوابِ گراں خسروِ پرویز ہے

☆

اسدؔ بہار تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

☆

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی
عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

☆

میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال
یہ فسوں نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے

☆

ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیر گلستاں کر
شرار آہ سے موجِ صبا دامانِ گل چیں ہے

☆

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے
دامانِ صد کفن تہِ سنگِ مزار ہے
خجلت کشِ وفا کو شکایت نہ چاہیے
اے مدعی، طلسم عرقِ بے غبار ہے

☆

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب
زخمِ فراق، خندۂ بے جا کہیں جسے

☆

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ وتابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

☆

موجِ تبسم لبِ آلودۂ مسی
میرے لیے تو تیغ سیہ تاب ہوگئی

☆

اسدؔ وارستگاں باوصف ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

☆

شوخی چشم حبیب، فتنہ ایام ہے
قسمتِ بختِ رقیب گردشِ صدجام ہے

☆

دیکھ لے جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

☆

طلسمِ آئینہ زانوئے فکر ہے غافل
ہنوز حسن کی ہے سعی جلوہ اندوزی

☆

دامانِ دل بہ وہم تماشا نہ کھینچیے
اے مدعی خجالتِ بے جانہ کھینچیے

☆

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے
حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے جلوۂ عمر
تہِ خاکستر صد آئینہ پایا ہے مجھے
جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

☆

خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گل
ہنوزِ دعوے تمکین و بیم رسوائی

☆

وہ تشنہ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

(سہ ماہی ''اُردو ادب'' ۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) ۔ علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۱ء ۔ ص ۵۴ تا ۷۷)

◆◆◆

امتیاز علی عرشی

غالبؔ کی اپنے کلام پر اصلاحیں

نسخۂ حمیدیہ نے پہلی بار ہمیں بتایا کہ مرزا غالبؔ نے اپنے قدیم اشعار میں سے نسبتاً آسان اور اچھے اشعار کا انتخاب کرنے سے پہلے ان میں اصلاح بھی کی تھی۔ اور موجودہ دیوان کے وہ شعر جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی موجود ہیں خاص قطع و بُرید کے بعد منظر عام پر آئے ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب کر لینے کے بعد بھی مرزا صاحب نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی یا نہیں، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتے رہے، اور خصوصاً جب کبھی انھوں نے کوئی نسخہ کسی کو تحفتہً دینے یا مطبع بھیجنے کے لیے تیار کرایا، تو نہ صرف ان کی صحت ہی کی، بلکہ اس میں مناسب ترمیم بھی کہیں نہ کہیں ضرور فرمائی۔ رضا لائبریری رام پور میں ان کے عہد کے لکھے اور چھپے ہوئے متعدد دیوان محفوظ ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے۔ میں آج کی صحبت میں انھیں ترمیموں اور اصلاحوں میں سے چند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

چوں کہ میں دیوانِ غالبؔ کے متعدد نسخوں کے حوالے دوں گا اس لیے پہلے ان کا آپ سے تعارف کرا دوں:

(۱) قاؔ سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے جسے نواب خلد آشیاں (والیِ رام پور) نے کسی معمولی کاتب سے نقل کرایا تھا۔ اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ ۱۸۳۸ء میں جو تقریظ دیوان لکھی تھی، اس میں کل تعدادِ اشعار ۱۰۹۰ بتائی ہے۔ تقریباً اتنے ہی شعر ۱۸۴۱ء کے مطبوعہ نسخے میں بھی ہیں۔ قاؔ اس تقریظ سے خالی اور تعدادِ

اشعار میں تقریظ والے نسخے سے کم ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یہ دیوانِ غالب قدیم کا پہلا انتخاب ہے۔

(۲) قب سے مراد وہ قلمی نسخہ ہے، جو یونیورسٹی لائبریری دہلی کے نسخے سے میں نے رضا لائبریری کے لیے نقل کرایا تھا۔ یونیورسٹی کا یہ نسخہ مئی ۱۸۴۷ء میں دہلی کے مطبع دارالسلام سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی جو ابتدائی ورقوں کے بعد خاصا ناقص ہے، سال گزشتہ لائبریری کے لیے خرید لیا گیا ہے۔

(۳) قج سے مراد وہ قلمی خوشخط نسخہ ہے جسے میرزا صاحب نے مئی ۱۸۵۷ء میں نواب فردوس مکان ناظم تخلص (والی رام پور) کی خدمت میں ڈاک کے ذریعے سے بھیجا تھا۔ یہ نسخہ ترتیبِ اصنافِ سخن میں غالب کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس میں فارسی دواوین کی مروجہ ترتیب کے مطابق پہلے دیباچہ، پھر قطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد، پھر غزلیات، پھر رباعیات اور پھر خاتمہ ہے۔

چوں کہ مرزا صاحب نے اس کی بڑی احتیاط سے تصحیح کی ہے۔ اس لیے تمام دوسرے نسخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور مستند ہے۔

(۴) ما سے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ہے جو شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں بہادر کے چھاپے خانہ دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کا ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اور اس ایڈیشن کی پرانی نقل رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ نیر کی تقریظ کے مطابق اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۹۸ ہے۔

(۵) مب سے وہ مطبوعہ نسخہ مراد ہے جو ۲۰، محرم ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو مطبع احمدی دہلی میں امو جان کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس کے آخر میں مرزا صاحب نے ''عبارتِ خاتمۂ دیوان'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص وداد آئین، میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد

حسین خان کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ اس جزو کارسانہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگر چہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے۔ اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جابجا یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی ''کسو'' بکاف مکسور وسین مضموم وواد معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں۔ ورنہ فصیح بلکہ افصح ''کسی'' ہے، واد کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ ''کسو'' بواد ہے۔ اور سب جگہ ''کسی'' بیای تحتانی ہے اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسویٰ ہوس۔''

(۶) قج سے مراد وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں کانپور کے مطبعِ نظامی سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ مب سے چھاپا گیا تھا۔ اس لیے اس کے مطابق ہے۔

(۷) مد سے وہ نسخۂ مطبوعہ مراد ہے جو منشی شیونرائن نے اپنے مطبع مفیدِ خلائق (آگرہ) میں ۱۸۶۳ء میں چھاپا تھا۔ یہ نسخہ نقل ہے قج کی۔ اس لیے ترتیبِ کلام وغیرہ میں اس کے مطابق ہے۔

اس تشریح وتعارف کے بعد میں آپ کے سامنے مرزا صاحب کے چند اشعار پیش کرتا ہوں، جن میں مختلف نسخوں کے اندر اختلافِ الفاظ پایا جاتا ہے۔ میری دانست میں یہ کاتبوں کی دست برد نہیں بلکہ خود مرزا صاحب کی ترمیمیں ہیں، اس لیے قابل غور وفکر ہیں:

(۱)

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار

قج اور مد میں ''تہائی'' کی جگہ ''چہارم'' ہے۔ حقیقت کیا تھی، اسے مرزا صاحب اور ان کا ساہوکار جانے۔ لیکن بظاہر ''چہارم'' بعد کی ترمیم ہے، اور اس سے مقصود موانع کو حقیقت حال کے قریب کرنا معلوم ہوتا ہے۔

(۲)

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا کے، قدرتِ جادہ بطاقِ گلزار

نسخۂ حمیدیہ اور عام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ لیکن قا اور ما میں ''بصحنِ گلزار'' ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اصل میں بھی ''بطاق'' ہی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ مرزا صاحب نے انتخاب کے وقت ''بصحن'' بنایا، جو پہلی اشاعت تک داخلِ دیوان رہا۔ بعدازاں پھر ''بطاق'' ہی بنادیا لیکن مجھے نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ متن پر اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے میری رائے میں پرانے دیوان کا لفظ بھی ''بصحن'' ہی ہے، جو اس لیے درست معلوم ہوتا ہے کہ گلزار میں طاق کہاں۔ وہاں تو صحن ہی صحن نظر آتا ہے لیکن ''طاقِ نسیاں'' کی شہرت نے مرزا صاحب کو مجبور کیا کہ وہ ''بھول جا'' کی رعایت سے ''صحنِ گلزار'' کو ''طاقِ گلزار'' سے بدل دیں اور ''طاقِ گلزار'' سے ''نفسِ گلزار'' مراد لیں۔ چناں چہ ۱۸۴۱ء کے بعد انھوں نے یہ تغیر کیا، مگر اس سے مضمون شعر میں کوئی معنوی اضافہ یا صوتی لطف میری دانست میں پیدا نہیں ہوا۔

(۳)

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

متداول نسخوں کے برخلاف قا اور ما میں ''عزا خانۂ یک شہر نگاہ'' ہے نسخۂ حمیدیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل میں بھی اسی طرح تھا، لیکن بعدازاں مرزا صاحب نے ترمیم کر کے ''عزا خانۂ اقبال'' بنادیا، جس سے مبالغے کی بے مزگی دور اور مضمون کی لطافت بڑھ گئی۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر شارحینِ غالب نے اس شعر کے پہلے مصرع میں ''ہو'' کا فاعل ''نگاہ'' کو قرار دیا ہے۔ لیکن میری حقیر رائے میں مصححِ نسخۂ حمیدیہ نے جو ''عزا خانہ اقبال نگاہ'' میں اقبال کو نگاہ کی طرف مضاف قرار دیا ہے، ان کی یہ رائے صحیح ہے۔ اس صورت میں شعر کی نثر یہ ہوگی کہ ''جو چشم تیرے خاکِ در کی آئینہ دار نہ ہو، (وہ) مردمک سے عزا خانۂ اقبال نگاہ ہو جائے'' اور مطلب یہ ہوگا کہ جس آنکھ میں تیرے در کی خاک کا سُرمہ نہ لگایا جائے، خدا کرے

اس کی کالی تپلی بجائے رونق اور خوبصورتی پیدا کرنے آنکھ کو نگاہ کی تاثیر اور رونق کے عزا خانے میں تبدیل کردے۔ یعنی اُسے بے رونق اور بے اثر بنادے۔

اور یہی صورت حال اس وقت بھی ماننا پڑے گی، جب کہ ''یک شہر نگاہ'' ہو۔ اور ''یک شہر نگاہ'' کا وہی مطلب ہوگا جو ''یک جہاں جمال'' یا ''یک شہر آرزو'' کا ہوتا ہے۔

(۴)

دیدہ تا دل اسدؔ، آئینہ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغر راقم سرشار

نسخۂ حمیدیہ میں یہ شعر پہلے اس طرح تھا:

دیدہ تا دل اسدؔ آئینہ یک سجدۂ شوق
فیضِ الفت سے رقم تا دل معنی سرشار

مرزا صاحب نے اس میں ترمیم کر کے قاؔ اور ماؔ میں یوں شائع کیا:

دیدہ تا دل اسدؔ، آئینہ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے رقم تا کف راقم سرشار

بعدازاں ''تا کف راقم'' کو ''خطِ ساغر'' میں تبدیل کردیا، جو آج زبان زد ہے۔ میری حقیر رائے میں یہ اصلاح بھی بہتر نہیں۔ رقم (تحریر مراد قصیدہ) کا فیضِ معنی (اوصاف مرتضوی) سے، راقم (شاعر) کے کفِ دست تک، جس میں وہ قلم اور کاغذ پکڑتا ہے۔ سرشار ہو جانا دلچسپ اور حقیقت کے قریب مبالغہ ہے۔ لیکن فیضِ معنی سے شاعر کے خطِ ساغر کا سرشار ہونا بہت دور کی بات ہے۔ اور کچھ بامزہ بھی نہیں۔

(۵)

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینہ حسنِ یقیں

نسخۂ حمیدیہ میں دوسرا مصرعہ تھا ''وصل، افسانۂ اطفالِ پریشاں بالیں'' مرزا صاحب نے پہلے انتخاب کے وقت اس میں تغیر کر کے بنایا ''وصل، زنگارِ رخِ روشنِ مراۃِ یقیں''۔ چناں چہ قاؔ اور ماؔ

میں اسی طرح نظر آتا ہے۔ اگر چہ اس اصلاح نے مضمونِ شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا، لیکن ابھی مصرعہ میں لفظی و معنوی دونوں طرح کی سستی اور جھول تھا۔ ۱۸۴۱ء کے بعد پھر مرزا صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کی اور ''روشن مراۃ'' کی جگہ ''آئینہ حسن'' رکھ کر مضمون میں لطف کا اضافہ بھی کر دیا اور بیکار لفظ کو حذف کر کے اور ثقیل کی جگہ ہلکا پھلکا لفظ رکھ کر لفظی ثقالت بھی دور کر دی۔

(۶)

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ

آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

قا میں ''شور مچایا'' ملتا ہے، لیکن ما میں ''اٹھایا'' ہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے اس شعر میں ۱۸۴۱ء سے قبل ہی اصلاح کر لی تھی۔ وجہ ترمیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''شور مچانا'' زیادہ تر بچوں کی چیخ و پکار کے لیے بولا جاتا ہے۔ مرزا صاحب جس تلاطم جذبات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس محاورہ کے بس کا نظر نہیں آتا۔ ''اُٹھانا'' میں لفظ اور معنی دونوں کے لحاظ سے ''طوفان'' کے ساتھ ہم آہنگی ہے۔ ادھر ایرانی مصدر ''انگیختن'' (بمعنی اٹھانا) بھی شور و شر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس لیے مرزا صاحب نے عام محاورہ ترک کر کے یہ نیا محاورہ انتخاب کیا۔

(۷)

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالبؔ

گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مبؔ، نجؔ اور بعد کے تمام نسخوں میں اس طرح ہے۔ لیکن قاؔ، قبؔ، نجؔ اور ماؔ۔ مدؔ میں ''تشنگی شوق'' ملتا ہے۔ میری حقیر رائے میں یہاں شوق کا لفظ ذوق سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس لیے ''ذوق'' اگر بعد کی ترمیم ہے، تو کچھ بہتر ترمیم نہیں۔

(۸)

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

قا اور ما میں پہلے مصرع کے اندر ''انداز'' کی جگہ ''پرواز'' ہے۔ میری دانست میں ''پرواز''

کی جگہ ''انداز'' نے نہ لفظی خوبی پیدا کی اور نہ معنوی بلکہ بنظر غائر دیکھا جائے، تو انداز کے معنی بھی یہاں ''پرواز'' ہی ہیں۔ اس لیے اگر اس لفظ کے حق میں کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ اس کا استعمال مقابلتاً عام ہے۔

(۹)

شوق ہے ساماں طراز نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

قا اور ما میں ''اربابِ عشق'' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء کے بعد یہ اصلاح کی ہے۔

(۱۰)

مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

قا، ما، مب اور بعد کے تمام مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ہے لیکن قب، مج اور ما میں ''بازو'' کی جگہ ''خنجر'' ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۷ء سے قبل یہ اصلاح کی تھی۔ چوں کہ مب ہی نے رواج پایا، اور یہ اس اصلاح سے خالی تھا۔ اس لیے اہل ادب اس اصلاح سے واقف نہ ہو سکے۔ رہا اس کا مقابلتاً بہتر ہونا تو وہ اس سے ظاہر ہے کہ لفظ ''خنجر'' سے مفہوم میں معقول اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۱۱)

مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

قا میں ''پھوڑ'' کی جگہ ''مار'' ہے۔ چوں کہ سر پھوڑنے میں وحشت کا اظہار ''مارنے'' کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ نیز ''سر مارنا'' کئی معنی کا احتمال رکھتا ہے۔ جن میں سے بعض وحشت کی ضد بھی ہیں۔ اس لیے ۱۸۴۱ء سے قبل ہی مرزا صاحب نے یہ اصلاح فرمائی۔

(۱۲)

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

قآ میں اس غزل کی ردیف میں ''بھی'' کی جگہ ''ہی'' ہے۔ مآ میں ''بھی'' کا وجود اس کی دلیل ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء سے قبل یہ ترمیم کردی تھی۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ ''ہی'' میں جو معنوی قوت اور وسعت ہے وہ ''بھی'' میں کسی طرح نہیں۔ ہاں صوتی زور اس سے ضرور پیدا ہو جاتا ہے، جو معنی کے مقابلہ میں خود مرزا صاحب کے نزدیک بھی چنداں قابل لحاظ نہیں۔

(۱۳)

وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

قآ اور مآ میں ''چوں رشتۂ شمع'' اور ''مغز جگر'' ہے اور قب میں متن کی طرح ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۷ء سے قبل ہی یہ اصلاح فرمائی تھی۔ لیکن اس اصلاح نے مضمونِ شعر پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ڈالا۔ چوں کہ مرزا صاحب پختگی کو پہنچ کر ''چوں'' اور ''جوں'' سے پرہیز کرنے لگے تھے اس لیے مصرع اول میں لفظ ''صورت'' لانا پڑا تا کہ تشبیہی معنی پیدا ہو جائیں ''مغز'' کی جگہ ''نبض'' لانا اس لیے مناسب تھا کہ ایک تو ''رشتۂ شمع'' میں سے ''رشتہ'' گرایا جا چکا تھا جو شمع کے جلنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ''نبض'' نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ دوسرے ''ریشہ دوانی'' کی مناسبت ''مغز کی جگہ'' ''نبض'' ہی کو چاہتی تھی۔

(۱۴)

میکدہ گر چشمِ مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

قآ، قب اور مآ میں ''ناز'' کی جگہ ''یار'' ہے۔ نیز قآ اور مآ میں ''موئی شیشہ'' کی جگہ ''موئے مینا'' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اصلاح ۱۸۴۷ء کے بعد اور دوسری اس سے پہلے کرلی تھی۔

(۱۵)

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

قا اور ما میں ہماری دید کی جگہ ''ہمارے ذوق'' ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۸۴۱ء کے بعد یہ اصلاح کی تھی۔ یہاں ''دید'' سے مراد ''دیدار'' نہیں، بلکہ رائے یا نظر ہے۔ اس لیے ''ذوق'' کی کوئی معنوی کمی اس سے پوری نہیں ہوتی، البتہ ''خواب'' کے ساتھ ''دید'' لانے میں لطفِ تضاد ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری حقیر رائے میں یہ تغیر بھی مرزا صاحب کی روش کے خلاف اور معنی میں غیر دلچسپ پیچیدگی پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس لیے مقابلتاً بہتر نہیں۔

(۱۶)

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

نسخۂ حمیدیہ قا اور ما میں ''جلوۂ گل'' ہے، جو اس کا ثبوت ہے کہ یہ تغیر ۱۸۴۱ء کے بعد کیا گیا ہے۔ یہاں بھی ''روئے یار'' کی مناسبت سے ''جلوہ'' کو ''عارض'' بنایا ہے۔ ورنہ از روئے معنی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۱۷)

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

قا، قب، نج اور ما اور مد میں ''شورشِ باطن'' ہے۔ غالباً کسی سہو سے مب میں پہلی بار۔ اور پھر اس کے تتبع میں بعد کے نسخوں کے اندر ''شورش'' نے ''سوزش'' کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جو مقابلتاً مضمون کے ساتھ ہم آہنگ بھی نہیں۔ اس لیے کہ دل کا ''محیطِ گریہ'' ہونا اندرونی سوزش کا نہیں، شورش و تلاطم کا متقاضی ہے۔

(۱۸)

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

قا، قب، مج اور ما اور مب میں ''داستانِ شوق'' ہے، جو ''داستانِ عشق'' کے مقابلے میں بہتر ہے۔ میری دانست میں یہاں بھی مب ہی کی وجہ سے یہ لفظ مشہور ہوا۔ ورنہ غالب کی پسندیدہ ترکیب مقدم الذکر ہی ہے۔

(۱۹)

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مج کے کاتب نے نادانی سے ''جو شامت آئے'' کو ''خوشامد سے'' بنایا تھا۔ اس کی تصحیح ہونے سے رہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مطبعِ چشمۂ فیض دہلی سے ۱۸۸۶ء میں۔ اور شاید اسی زمانے کے لگ بھگ منشی نول کشور کے مطبع سے اور ۱۹۰۸ء میں مطبعِ نامی لکھنؤ سے جو نسخے چھپ کر نکلے، ان میں بھی اس غلطی نے جگہ پالی۔

اسی طرح بعض نسخوں کے کاتبوں نے ''شامت آئے'' کو اپنی نظر میں غلط یا نامانوس سمجھا اور ''آئے'' کو ''آئی'' میں تبدیل کر کے شعر کو درست کر دیا۔ چناں چہ سر عبدالقادر مرحوم کے مقدمے کے ساتھ جو نسخہ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی یہ غلطی موجود ہے۔ اربابِ ذوق ان دونوں فعلوں کے محلِ استعمال اور اُن کے معانی کے نازک فرق کو اچھی طرح جانتے بوجھتے ہیں۔ اس لیے اس تغیر کو بزمِ ادباء میں قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔

(۲۰)

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

مد میں پہلا مصرع یوں ہے ''ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم'' میری دانست میں مروج مصرع زیادہ اچھا ہے۔ اس لیے کہ معشوق کے آنے کو بجلی کی کڑک۔ شعلے کی لپک اور پارے کی چلت پھرت کہنے میں شعریت ہے۔ اس کے لیے بھونچال کا آجانا۔ آندھی کا چلنا اور سیلاب اُمڈ آنا بولنا زیب نہیں دیتا۔ اندریں صورت اگر یہ ترمیم مرزا صاحب ہی کی ہے۔ تو بادل ناخواستہ قبول کرنے کی ہے۔

(۲۱)

یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع اس طرح تھا۔ ''مغرور وفاہ ہو کہ جوں کاغذِ باد'' اس میں ترمیم کر کے مرزا صاحب نے ''یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح'' بنایا۔ چناں چہ قا اور ما میں اس طرح ہے۔ لیکن قج اور مج میں ''صورتِ کاغذ باد'' ہے۔ چوں کہ مرزا صاحب خود اپنے بعض شاگردوں کی اصلاح میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ''طرح'' بسکون کا استعمال مثل و مانند کے معنی میں انھیں پسند نہیں۔ اس لیے میں اس ترمیم کو اصلاح مانتا ہوں اور چوں کہ یہی صورت قبؔ میں بھی ہے۔ اس لیے یہ اصلاح ۱۸۴۷ء کے بعد کی ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے اسی پر کہ مدؔ میں جو قجؔ کی نقل سے چھاپا گیا ہے یہ اصلاح کیوں نہیں نظر آتی۔ اور مجؔ میں جو مبؔ سے طبع ہوا ہے ''صورتِ کاغذِ باد'' کیوں ہے۔

(ماہنامہ ''آج کل'' (غالب نمبر)۔ دہلی۔ فروری ۱۹۵۲ء۔ ص ۴۷ تا ۵۱)

◆◆◆

حبیب احمد صدیقی

غالبؔ کی اصلاحیں خود اپنے کلام پر

مولانا حالیؔ ''آمد'' اور ''آورد'' سے بحث کرتے ہوئے مقدمۂ شعروشاعری میں لکھتے ہیں:

''مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غوروفکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ ... سچ یہ ہے کہ کوئی نظم جس نے کہ استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہو خواہ طویل ہو خواہ مختصر ایسی نہیں ہے جو بے تکلف لکھ کر پھینک دی گئی ہو۔ جس قدر کسی نظم میں زیادہ بے ساختگی اور آمد ہو اسی قدر جاننا چاہیے کہ اس پر محنت زیادہ غور اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہوگی۔''

شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو اس بیان کی تصدیق نہ کرے یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک نہایت چست اور اچھا مصرع زیادہ کاوش و کاہش کے بغیر بھی موضوع ہو جائے مگر عموماً اچھا مصرع موزوں کرنے میں کافی غوروفکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اول تو نادر اور بلند خیال کا ہر وقت صف بستہ رہنا ممکن نہیں، دوسرے مناسب الفاظ کی تلاش میں کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے، یوں تو ایک معنی کو کئی الفاظ ادا کر سکتے ہیں، مگر جو اہل ذوق الفاظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں وہ اس راز کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مترادف الفاظ میں سے صرف ایک لفظ ہی ایسا ہوتا ہے جو صحیح طور پر ادا کر سکے اور اس ایک لفظ کی تلاش میں کبھی کبھی تو گھنٹوں سر کھپانا پڑتا ہے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

اس خیال کی توضیح کرتے ہوئے مولانا حالیؔ تحریر کرتے ہیں:

''یہ ممکن ہے کہ شاعر کسی موقع پر پاکیزہ خیالات جو اُس کے حافظہ میں پہلے سے ترتیب وار محفوظ ہوں مناسب الفاظ میں جو حسن اتفاق سے فی الفور اس کے ذہن میں آجائیں ادا کردے۔ لیکن اول تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر ظہور میں آتے ہیں۔ والنّادِرُ کالمَعْدُوْم۔ دوسرے ان خیالات کو جو مدت سے انگور کے شیرہ کی طرح اس کے ذہن میں پک رہے تھے کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور و فکر کے سرانجام ہو گئے ہیں۔ شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک خیال دوسرے الفاظ۔ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے مگر اس کے لیے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی یہ ممکن ہے کہ ایک مستری مکان کا نہایت عمدہ اور نرالا نقشہ ذہن میں فوراً تجویز کر لے مگر یہ ممکن نہیں کہ اس نقشہ پر مکان بھی چشم زدن میں تیار ہو جائے۔''

اچھے شعر کے لیے عمدہ خیال اور مناسب الفاظ مل جانے کے بعد ان کی مناسب نشست یا ترتیب بھی نہایت ضروری ہے کوئی شعر اُس وقت تک دل نشیں نہ ہوگا جب تک یہ تینوں باتیں یعنی عمدہ خیال، مناسب الفاظ اور مناسب ترتیب جمع نہ ہو جائیں جیسے کان سے نکلے ہوئے ہیرے کو جوہری کی دوکان تک پہنچنے کے لیے کئی مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔ اسی طرح ایک شعر شاعر کے ذہن میں کئی مدارج طے کر کے اچھا شعر بنتا ہے خواجہ آتشؔ نے درست کہا ہے:

شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

مگر سوائے شاعر کے کسی اور کو یہ معلوم کرنے کے مواقع بہت ہی شاذ ملتے ہیں کہ شعر کن کن مدارج سے گزر کر اُس تک پہنچا۔ اردو شاعری میں استاد سے اصلاح لینے کے سلسلہ میں کبھی کبھی اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ شاگرد نے شعر یوں کہا تھا اور استاد نے اُسے ایسے بنا دیا۔ مثلاً ذوقؔ کے شعر میں ''بٹوے'' کے بجائے شاہ نصیر نے ''دونے'' کا لفظ رکھ دیا

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
مطلب یہ ہے کہ بھیج دو آنکھیں نکال کے

یا:

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل جاتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

اس شعر میں استاد نے ''جل جاتا ہے'' کی جگہ ''جل اٹھتا ہے'' کر دیا جو یقیناً بہت اچھی اصلاح ہے لیکن خود شاعر نے اپنے اشعار میں کیا کیا قطع برید کی اور شعر نے کس ہیئت سے کیا شکل نکالی اس کا علم شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ معارف کے اگست ۱۹۴۹ء و ستمبر ۱۹۴۹ء کے شماروں میں جناب محمد بشیر الحق صاحب نے ''اصلاحاتِ اقبال'' کے نام سے ایک مضمون شائع کر کے یہ دکھایا ہے کہ اقبال کے بہت سے اشعار کی ابتدائی شکل کیا تھی اور بعد میں کیا ہو گئی۔ شاعر کی ارتقائی ترقی کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون واقعی بہت دلچسپ ہے۔ میں اس مضمون سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

نقش اوّل ...... اصلاح کے بعد

(۱) شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی

تو ہے ہندوئے صنم خانہ ایام ابھی
تو ہے زناریِ بت خانۂ ایام ابھی

(۲) تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم ...... کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم

اپنی مٹی سے عیاں شعلہ سینائی کر
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

(۳) نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

میرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں
میرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

(۴) نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں

نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

(۵) ہائے کیا جوشِ مسرت میں چلا جاتا ہے تو

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے تو

فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے تو

(۶) تیری ہر چوٹی کا دامان فلک میں ہے وطن ...... چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن

چشمۂ دامن میں رہتی ہیں مگر پرتو فگن

تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

اصلاح شدہ اشعار یقیناً بلند تر ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر کا قدم روز بروز آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی طبیعت میں الفاظ کے نازک فرق کو سمجھنے کی استعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ دلچسپ معلومات ہم تک نہ پہنچتیں اگر اقبالؔ کا کلام ابتدا ہی سے جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوتا نہ رہتا۔ بشیر الحق صاحب نے بڑی عرق ریزی سے رسالوں میں چھپے ہوئے کلام کا ''بانگِ درا'' وغیرہ سے مقابلہ کیا اور دس پانچ نہیں بلکہ بیسیوں اصلاحیں فراہم کیں۔

خوش قسمتی سے غالبؔ کا ابتدائی کلام بھی ''نسخۂ حمیدیہ'' چھپنے سے ہم تک پہنچ سکا۔ ایسے اشعار کی تعداد جو ''نسخۂ حمیدیہ'' اور مروجہ دیوان میں مشترک ہیں ۴۶۴ ہے مگر ان میں سے تقریباً سو اشعار ایسے ہیں جو قطع برید کے بعد قابل قبول ٹھہرے تیس پینتیس اشعار میں تو کافی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے مگر باقی میں ایک آدھ لفظ کے ردو بدل پر اکتفا کیا گیا ہے مگر ایک آدھ لفظ کی تبدیلی ہی نے شعر کو وزنی بنا دیا ہے۔ چوں کہ نسخۂ حمیدیہ عام طور پر نہیں پڑھا جاتا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اصلاحوں کو پیش کیا جائے جو غالبؔ کی ارتقائی صلاحیتوں کو سمجھنے میں کافی مفید ہوں گی۔

ا۔ وہ اشعار جن میں کافی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔

نسخۂ حمیدیہ ...... مروجہ دیوان

(۱) جز قیس اور کو نہ ملا عرصہ طپش ...... جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

(''اور کوئی نہ آیا بروئے کار'' زیادہ خوشگوار ہے)

(۲) تھا خواب میں خیال کہ تجھ سے معاملہ

مژگاں جو وا ہوئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

(بہت اچھی اصلاح ہے ''آنکھ کھل جانا'' سمجھ آنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں ''جب آنکھ کھل گئی'' نے بہت لطف پیدا کر دیا ہے)

(۳) عشرت ایجاد چہ بوئے وگل وکود ودِ چراغ ...... بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(پہلا الجھا ہوا مصرع دوسرے صاف مصرع سے میل نہ کھاتا تھا۔ اصلاح شدہ مصرع نے شعر کو اعجاز بیاں بخشا ورنہ یہ شعر ہرگز مشہور نہ ہوتا)

(۴) اب میں ہوں اور خونِ دو عالم کا معاملہ ...... اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

(۵) قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے

ہاں اس معاملہ میں تو میرا قصور تھا

اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

(نہایت پاکیزہ اصلاح ہے)

(٦) نیم رنگی جلوہ ہے بزم تجلّی زار دوست ...... آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست

دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسار دوست

(اصلاح شدہ مصرع نے الجھے ہوئے معنی صاف کر دیے)

(۷) کیا ہے تو نے مئے جلوہ کس قدر ارزاں ...... ہوئی ہے کس قدر ارزانی مئے جلوہ

کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

(پہلے مصرع میں لفظ ''مئے'' مذکر بندھا تھا جو غلط تھا، اصلاح شدہ مصرع میں یہ سقم جاتا رہا)

(۸) نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر...... نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

(اصلاح شدہ مصرع نے دوسرے مصرع میں جان ڈال دی اور شعر عام فہم اور دل نشیں ہو گیا)

(۹) نگہِ التفات سوئے اسدؔ ...... مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

(پہلا مصرع بھی اچھا تھا مگر اصلاح شدہ مصرع کی شوخی اس میں نہ تھی)

(۱۰) ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اور...... ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو

ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمت مردانہ ہم

(دونوں مصرعوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، بہت اچھی اصلاح ہے)

(۱۱) جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

شعرِ اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

(۱۲) ریختہ کا وہ ظہوریؔ ہے بقول ناسخؔ ..... غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

(ناسخؔ کا قول دوسرے مصرع میں نقل کیا گیا تھا مگر پہلے مصرع کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بقول ناسخؔ میرؔ ریختہ کا ظہوریؔ ہے گویا یہی ناسخؔ کا قول تھا، اصلاح شدہ مصرع نے ابہام دور کر دیا)

(۱۳) ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں .... ہیں زوال آمادہ آجزا آفرینش کے تمام

مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد یاں

(اصلاح شدہ مصرع بہت بہتر اور صاف ہے)

(۱۴) ہوئی تقریب منع شوق دیدن خانہ ویرانی ..... ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی

کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

(''تقریب منع شوق دیدن'' کی ترکیب نہایت بھونڈی تھی جو اصلاح کے بعد شستہ ہوگئی)

(۱۵) حسد پیمانہ سے دل عالمِ آبِ تماشا ہو .... حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو

کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

(ابتدائی مصرع اردو زبان پر بار تھا۔ اصلاح شدہ مصرع بہت بلند ہے)

(۱۶) اگر وہ سروِ جاں بخش خرامِ اہتزاز آوے ...... اگر وہ سروقد گرم خرامِ ناز آجاوے

کفِ ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

(۱۷) لکد کوب حوادث سے نہ سربر ہو سکی آخر ...... لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی

مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

(۱۸) اسدؔ ہے دل میں دردِ اشتیاق و شکوۂ ہجراں ......

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں

خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۱۹) عالمِ بساطِ دعوت دیوانگی نہیں ...... وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

(۲۰) از بسکہ سکھاتا ہے غمِ ضبط کے اندازے ...... داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے

جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

(۲۱) اثر ابلہ کرتا ہے بیاباں روشن ...... اثر ابلہ سے جادۂ صحرائے جنوں

جادہ جوں رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بصورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

(۲۲) عیادت بسکہ تجھ سے گرمی بازار بستر ہے......خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو

فروغ بالیں طالع بیدار بستر ہے

(''گرمی بازار بستر'' سے ایک کریہہ نقش ذہن پر منعکس ہوتا ہے اصلاح شدہ مصرع نہایت پسندیدہ ہے)

(۲۳) اسدؔ جوشِ بہارِ دیدۂ بیدار کے صدقے ......

ابھی آتی ہے بو باس سے اس کی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عار بستر ہے

(زلفِ مشکیں کی خوشبو کے باعث بستر کو خواب زلیخا پر ترجیح کی وجہ فراہم کر لی جو ابتدائی مصرع میں نہ تھی)

(۲۴) تار و پودِ فرشِ تبسم بہ بزمِ عیش ...... درکار ہے شگفتن گلہائے ناز کو

صبحِ بہار پنبۂ دنیا کہیں جسے

(''تار و پودِ فرشِ تبسم'' کس قدر غیر مانوس چیز تھی جسے بدل دینا ضروری تھا)

(۲۵) سبزہ جوں جامِ زمرد نہ ہو گر داغ پلنگ ...... سبزہ ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ

نشۂ نشوونما کو سمجھ افسونِ بہار

تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

(۲۶) کف ہر خاک چمن آئینہ قمری صیقل ...... کف ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز

دام ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس بہار

(اوپر کے دونوں شعروں میں اصلاحیں کچھ زیادہ قابل قدر نہیں۔ یہ قصیدے کے اشعار ہیں فارسیت باوجود اصلاح کے برقرار رہی بلکہ ''ریشۂ نارنج صفت روئے شرار'' یا'' بگردوں شدہ قمری پرواز'' میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا)

(۲۷) دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک سجدۂ شوق ...... دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق

فیض اُلفت سے رقم تا دلِ معنی سرشار

فیض معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

(اس میں بھی اصلاح معمولی ہے فارسیت بدستور چھائی ہوئی ہے)

(۲۸) عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس

وصل افسانہ اطفال پریشاں بالیں

وصل زنگار رُخِ آئینۂ حسن یقین

(اصلاح شدہ مصرع میں وصل کی تعریف زیادہ بلیغ ہے)

(۲۹) جو ہر ناخن بریدہ بہ اندازِ ہلال ...... کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال

ریشۂ عجز کو کرتا ہے نمو سے سرشار

قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

(۳۰) کوہکن گرسنہ فرد و طرب گاہ رقیب

بیستوں سازِ گران باریٔ خوابِ شیریں

بیستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

(۳۱) کس نے دیکھا جگر اہل جنوں نالہ فروش ...... کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز

کس نے پایا اثر نالۂ دل ہائے حزیں

(۳۲) کس سے ہوسکتی ہے مدح اس کی بغیر از ہمہ او...... کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب

شعلۂ شمع مگر شمع پر باندھے آئیں

(۳۳) جاں پناہا، دل و جاں فیض رساں بادشہا ...... جاں پناہا، دل و جاں فیض رسانا ستانا

اے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں

وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

(پہلے مصرع میں ''فیض رساں بادشہا'' کی جگہ ''فیض رسانا شاہا'' بہتر ہے یہ شعر حضرت علی کی مدح میں ہے ان کو وصی ختم رسل کہنا ''بہار چمنستاں یقیں'' کہنے سے یقیناً لویاوہ موزوں ہے)

(۳۴) رباعی:

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے ...... وحشت کدہ تلاش کرنے کے لیے

مغرور وفانہ ہو کہ جوں کا غذ باد ...... یعنی ہر بار صورت کاغذ باد

ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

۲۔ وہ اشعار جن میں ایک آدھ لفظ بدلا گیا ہے:

(۱) جراحت تحفہ، الماس ارمغاں نادیدنی دعوت...... جراحت تحفہ الماس ارمغاں خونِ جگر ہدیہ

مبارکباد اسدؔ غم خوارِ جان درد مند آیا

(''نادیدنی دعوت'' کا کوئی محل نہ تھا ''خونِ جگر ہدیہ'' تحفہ اور ارمغاں کے ساتھ موزوں ہے)

(۲) حجاب سیر گل آئینہ بے مہری قاتل ...... ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل

کہ اندازِ بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

(۳) آشفتگی نے نقش سویدا کیا ہے عرض ...... آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست

ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دور تھا

(۴) شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا ...... شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(۵) تھی نو آموزِ فناہمت دشواریِ شوق ...... تھی نو آموزِ فناہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

(۶) مرگیا صدمۂ آوازسے قُم کی غالبؔ ...... مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(''صدمۂ آواز سے قُم کی'' نہایت بھونڈی ترکیب تھی اور غلط بھی کیوں کہ صدمہ کی اضافت کا تقاضا تھا کہ ''صدمۂ آوازِ قُم'' ہونا چاہیے نہ کہ ''صدمۂ آواز سے قُم کی'')

(۷) پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست پابند حنا رخسار رہن غازہ تھا
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

(۸) دیدۂ تر نے دئے اوراقِ لختِ دل پہ باد ......نالۂ دل نے دئے اورقِ لختِ دل پہ باد
یادگار نامہ ایک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۹) یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق ...... یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

(یہ اصلاح شاید زیادہ اچھی نہیں، اردو میں ''پاسخ مکتوب'' سے ''جواب نامۂ شوق'' زیادہ فصیح سمجھا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''اور'' میں ''ذ'' دبنے کی وجہ سے ''پاسخ مکتوب'' رکھا گیا)

(۱۰) غمِ فراق میں تکلیف سیر گل مت دو ...... غمِ فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

(۱۱) موجِ سراب دشتِ وفا کا بیاں نہ پوچھ ...... موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

(''بیاں نہ پوچھ'' سے ''نہ پوچھ حال'' زیادہ بامحاورہ ہے)

(۱۲) جاں درہوائے یک نگۂ گرم ہے اسدؔ ...... جاں درہوائے یک نفس گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

(۱۳) باغِ شگفتہ تیرا بساطِ ہوائے دل ...... باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل

ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

(۱۴) گر نہ احوالِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا...... گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

(۱۵) لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر ......

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

(اس کے ''بوسہ ہائے پا'' اردو زبان کی چیز نہ تھی)

(۱۶) گر نگاہ گرم فرمائی رہے تعلیم ضبط

شعلۂ حسن میں جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

شعلۂ حسن میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

(''در رگ'' کی جگہ ''رگ میں'' ضروری اور مناسب اصلاح ہے)

(۱۷) قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خطِ جامِ بادہ یکسر رشتۂ گوہر ہوا

خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

(۱۸) اُف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا ...... دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

(''اُف'' غالب کی شاعری کے لیے ہلکا لفظ تھا نکال دیا گیا)

(۱۹) آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں

دل کے پردے میں جگر یاد آیا

دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

(۲۰) پوچھ مت بیماری غم کی فراغت کا بیاں ...... کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں

جو کہ کھایا خوں دل بے منت کیموس تھا

(۲۱) نہیں گر سر و برگ سودائے معنی ...... نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی

تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(۲۲) گلشن میں بند و بست بہ ضبطِ دگر ہے آج...... گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج

قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

(۲۳) اے عافیت کنارہ کر اے انتظار چل

سیلاب گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج

سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

(''دشمن'' کی جگہ ''درپے'' بہت اچھی اصلاح ہے)

(۲۴) کمال گرمی سعی تلاش جلوہ نہ پوچھ ...... کمالِ گرمی سعی تلاشِ دید نہ پوچھ

برنگ خار میرے آئینہ سے جوہر کھینچ

(۲۵) بلا سے ہیں جو بہ پیش نظر در و دیوار ...... بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار

نگاہِ شوق ہیں بال و پر در و دیوار

(ممکن ہے ابتدا ہی میں ''یہ'' کہا ہو اور ایک نقطہ رہ جانے سے ''بہ'' پڑھا گیا ہو)

(۲۶) جنون اشک نے کاشانے کا یہ حال کیا ...... وفورِ اشک نے کاشانے کا یہ حال کیا

کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

(یہاں ''جنون'' کی جگہ ''وفور'' نہایت موزوں ہے)

(۲۷) اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

کہ مشق ناز کر خونِ تمنا میری گردن پر

کہ مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

(نہایت عمدہ اصلاح ہے ''خونِ تمنا'' اور ''خونِ دو عالم'' کا فرق ظاہر کرنا حاصل ہوگا، یہاں دو عالم کا محل تھا)

(۲۸) اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ... اے تیرا جلوہ یک قلم انگیز

اے ترا ظلم سر بسر انداز

(۲۹) جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو

اسدؔ ہے دل پہ میرے داغ بدگمانی شمع

نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع

(۳۰) زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک .....

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک

کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

(نمک باندھنے سے نمک چھڑکنا زیادہ فصیح ہے ایسی ہی ایک اصلاح اوپر درج کی جا چکی ہے)

(۳۱) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

("حساب بے گنہی" اچھی ترکیب نہ تھی اس کی جگہ "مرے گنہ کا حساب" بہت اچھی اصلاح ہے)

(۳۲) باوجود یک جہاں ہنگامہ پرموہوم ہیں ...... باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم

(۳۳) غزۂ رفعت بنائے عالمِ امکاں نہ ہو ...... غزۂ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

(۳۴) دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ

نہ کر بیباک اس کافر کو الفت آزمانے میں

نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

(۳۵) سادہ پرکار ہیں خوباں کہ اسدؔ ...... سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ

ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(۳۶) ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر

ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نامہرباں نہیں

غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں نہیں

(۳۷) تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے

دل وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

(۳۸) وہ تپِ عشقِ تمنا ہے کہ چوں رشتہ شمع ...... وہ تپِ عشقِ تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع

شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

(۳۹) اسدؔ یہ فرطِ غم نے کی تلف کیفیت شادی ...... ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیت شادی

کہ صبحِ عید مجھ کو برتر از چاکِ گریباں ہے

(۴۰) گم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں

آرزو خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

(۴۱) وحشتِ آتشِ دل سے شب تنہائی میں

درد کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

صورتِ درد رہا سایہ گریزاں مجھ سے

(۴۲) بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت مت پوچھ ...... بیکسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

(بے کسی کے ساتھ حسرت کا محل تھا نہ کہ وحشت کا)

(۴۳) سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین داماں ہا ...... سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے

دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

(۴۴) بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ وحشت شبہا ...... بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطراب و شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تار بستر ہے

(۴۵) جلوۂ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ ... عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ

جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

(۴۶) یاد ہے شادی میں عقد نالۂ یارب مجھے ...... یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

(۴۷) بہ پیچ وتاب ہوس سلک عافیت مت توڑ

نگاہِ خفتہ سر رشتۂ سلامت ہے

نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

(۴۸) شوخیِ اظہار دنداں ہابرائے خندہ ہے ...... عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے

دعوتِ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

(۴۹) ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کشِ انجام گر ...... ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

(۵۰) عیش بیتابی حرامِ کلفتِ افسردگی ...... کلفتِ افسردگی کو عیش بیتابی حرام

عرض دنداں در دل افزوں بنائے خندہ ہے

ورنہ دنداں در دل افشروں بنائے خندہ ہے

(پہلے مصرع میں الفاظ وہی ہیں مگر ترکیب بدل کر فارسیت کم کردی گئی ہے)

(۵۱) ہے لختِ دل سے جوں مژہ ہر خار شاخِ گل ...... لختِ جگہ سے ہے رگِ ہر خار شاخ گل

تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

(۵۲) ہے وحشتِ طبیعت ایجاد نالہ خیز ...... ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز

یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

(۵۳) پاتراب میل طوفاں صدائے آب ہے ...... آمد سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے

نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

(۵۴) غفلت کفیل عمر واسد ضامنِ وفا ...... غفلت کفیلِ عمر واسد ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۵۵) فشارِ تنگیٔ صحبت سے آتی ہے شبنم ...... فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم

صبا جو غنچہ کی خلوت میں جا نکلتی ہے

صبا جو غنچے کے پردہ میں جا نکلتی ہے

(۵۶) دل خوں شدۂ کشمکش کثرت دیدار ...... دل خوں شدۂ کشمکش حسرتِ دیدار

آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

(۵۷) مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت

دامن تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

(دامن کی جگہ دست اور احرام کی جگہ پیمان کر دینے سے شعر بہت بلند ہو گیا ہے)

(۵۸) موجِ گل ڈھونڈھ بہ طوفان کدۂ غنچۂ باغ...... موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ

گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

(۵۹) لعل سے کی ہے بمدح چمن آرائے بہار...... لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ

طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

(منقار کے ساتھ زمزمہ کو زیادہ مناسبت ہے)

(۶۰) مردمک سے ہو عزا خانۂ یک شہر نگاہ ...... مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ

خاک در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

(۶۱) کس قدر نالہ پریشاں ہے عیاذاً باللہ ...... کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ

یک قلم خارجِ آداب و جنون و تمکین
یک قلم خارجِ آداب و وقار و تمکیں

(دونوں مصرعوں میں اصلاحیں بہت مناسب ہیں ''نالہ پریشاں ہے'' کی جگہ خود کو ہرزہ سرا کہنا محل کے اعتبار سے ضروری تھا کیوں کہ جو وقار و تمکین کے آداب سے ناواقف ہو، اس کو ہرزہ سرا ہی کہنا مناسب ہے)

(۶۲) ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں نازِ خرام ..... ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرم خرام

ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

(۶۳) جلوہ تحریر ہو نقش قدم اس کا جس جا ..... جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا

وہ کفِ خاک ہے ناموس دو عالم کی ہیں

(''جلوہ تحریر'' غریب ترکیب تھی اس کی جگہ جلوہ پرواز رکھ دیا)

(۶۴) کفر سوز اس کا یہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے ......

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے

رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانۂ چیں

(۶۵) یا علی جنس معاصی اسد اللہ اسدؔ ...... جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسدؔ

کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

(۶۶) رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک

ہر قطرۂ اشک چشم چشم نم تھا

ہر قطرۂ اشک دیدۂ پر نم تھا

(چشم کی تکرار جو بری معلوم ہوتی تھی، اصلاح شدہ مصرع میں نہ رہی)

ان اصلاحوں سے ظاہر ہے کہ غالبؔ نے اکثر مقامات پر چند الفاظ یا کسی مصرع کی ترمیم و تنسیخ سے اشعار کو کس قدر ترقی دی۔ واضح رہے کہ جس کلام کی اصلاحیں اوپر درج کی گئی ہیں وہ غالبؔ کی پندرہ سے پچیس برس کی عمر تک کا کلام تھا یعنی بالکل ابتدائی۔ شروع میں جو اُن کی طبیعت پر فارسی رنگ غالب تھا وہ ان اشعار سے عیاں ہے، مگر اکثر اصلاحیں بتا رہی ہیں کہ بعد میں انھوں نے جہاں تک ہو سکا فارسی ترکیبوں کو اردو کے سانچے میں ڈھالنے یا آسان کرنے کی نمایاں کوشش کی اور اسی کوشش اور رجحان کا وہ نتیجہ نکلا جو اُن کے بعد کے کلام میں ملتا ہے اور جس کی بدولت ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' یا ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' ایسی ستھری غزلیں ہم تک پہنچیں۔ میں نے محض چند اصلاحوں کی خوبی ظاہر کرنے کے لیے نہایت مختصر نوٹ لکھ دیے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دو چار کو چھوڑ کر سب کی سب اصلاحیں لائق صد تحسین ہیں۔

نوٹ: اس عنوان پر امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون ''آج کل'' دہلی میں بھی نکلا ہے۔ مگر یہ مضمون اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے اور زیادہ مفصل ہے۔ ایڈیٹر

(سہ ماہی ''اُردو ادب''۔ انجمن ترقی اُردو (ہند)۔ علی گڑھ، جنوری تا مارچ ۱۹۵۲ء۔ ص ۲۵ تا ۳۸)

•••

قاضی عبدالودود

دیوانِ غالب کے دو نسخے

اس مقالے میں دیوانِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی سے بحث کی گئی ہے، مگر یہ ناتمام ہے، اس کا تکملہ آئندہ لکھا جائے گا۔ اس میں حسبِ ذیل مخففات مستعمل ہوئے ہیں: = بھوپال کا خطی نسخہ جس کی کتابت بتاریخ ۵، صفر ۱۲۳۷ھ مکمل ہوئی۔ دو چار سال قبل میں بمبئی میں تھا، تو میں نے یہ کوشش کی تھی کہ کچھ دنوں کے لیے یہ نسخہ کتب خانہ دانش گاہ بمبئی میں آجائے، لیکن یہ خبر ملی کہ بھوپال کے جس کتب خانے میں تھا، وہاں نہیں ہے۔ بعد کو ڈاکٹر گیان چند نے بھی اس کی تصدیق کی۔ ح =نسخۂ حمیدیہ، حب = حاشیۂ ب۔ حش = حاشیۂ ش۔ ش =نسخۂ شیرانی جو اب کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں ہے۔ ن = دیوانِ مروجہ۔ اس وقت میرے پیشِ نظر، جناب مالک رام کا مرتبہ نسخہ ہے، جس کا متن ان کے بیان کے مطابق مطبع نظامی کانپور [1] کے مطابق ہے اور جس میں پہلے صرف وہ کلام (باضافۂ یک شعر) ہے جو نسخۂ مذکورہ میں تھا۔ اور آخر میں بطور تتمہ کچھ ایسا کلام بھی ہے جو کانپوری نسخے میں نہیں۔

۱) ''غالب نے ایک خط میں لکھا تھا: ''ابتدائے'' فکر [ا] سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چناں چہ ایک غزل کا مقطع تھا:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسدؔ اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع

ہوگیا، آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان میں رہنے دیے۔'' اس سلسلے میں اُمور ذیل توجہ طلب ہیں: [۱] بیدل کا ذکر پرانے دیوان میں بہت جگہ ہے، لیکن اسیر وشوکت کا نام تک نہیں آیا۔ اس میں ایسے اشعار بھی ہیں، جواُن شاعروں کے مخصوص رنگ میں نہیں[۲] غالب رجب ۱۲۳۷ھ میں ۲۵ برس کے ہوئے تھے، اوران کا ایک دیوان جس کی کتابت اسی سال کے اوائل میں ہوئی تھی، چند سال قبل تک موجود تھا۔ اس سے قدیم تر نسخہ زمانۂ حال کے کسی شخص کے علم میں نہیں۔ یہ دیوان ''بہت بڑا'' (قول آزاد) کیا معنی ''بڑا'' بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی زمانے میں بھی اُردو دیوان کی ضخامت اتنی نہ رہی ہوگی کہ اسے ''بڑا'' کہہ سکیں۔ [۳] غالب نے خط زیر بحث میں انتخاب نہیں، دیوان کے (باستثنائے چند اشعار) یک قلم ضائع کر دینے کا ذکر کیا ہے، مگر دیباچۂ دیوان اُردو کو خود اُنھوں نے ''انتخاب'' کہا ہے۔ مروجہ دیوان اور ب وش کے مقابلے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سینکڑوں اشعار مشترک ہیں۔ آزاد کا یہ قول کہ انتخاب غالب کے دو دوستوں نے کیا، اور خود غالب کا اس سے کچھ سروکار نہیں، میرے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ [۴] غالب نے پرانے دیوان کا انتخاب کب کیا، اس کے بارے میں فی الحال اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا زمانہ گلشن بے خار میں ان کا ترجمہ قلم بند ہونے (غالباً ۱۲۴۸ھ میں) سے قبل ہے۔ [۵] دیوان اُردو پہلی بار ۱۲۵۷ھ میں طبع ہوا اور ۱۰۹۵ اشعار پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں انتخاب کے بعد کے اشعار بھی شامل ہوں گے۔ طبع ثانی کا زمانہ اس کے چند سال بعد ہے، اوران کے اشعار کی تعداد ۱۱۱۱ ہے۔ غالب کے دوران حیات میں دیوان چار بار اور چھپا۔ ۲؎ ان چاروں میں کانپوری نسخہ سب سے زیادہ صحیح المتن ہے۔ غالب کی وفات کے بعد برسوں تک اس کی نقل یا نقل درنقل چھپا کی، مگر ان میں اور کانپوری نسخے میں یہ فرق ہے کہ ''سہرا'' موخرالذکر سے غیر حاضر ہے۔ کانپوری نسخے کے اشعار کی تعداد ۱۸۰۲ ہے۔

۲) ح میں ب کے حوض وحواشی کے اشعار کے علاوہ وہ اشعار بھی ہیں ب میں نہیں، لیکن ن میں ہیں۔ ح کے حواشی میں دو چار اشعار ایسے بھی ہیں، جو زمانۂ حال کے نسخ دیوان میں اِدھر اُدھر سے لے کر شامل کیے گئے ہیں۔ قاعدہ یہ رکھا ہے کہ پہلے ہر حرف کی وہ غزلیں ہیں، جو کلا

یا جزءِ ن میں موجود ہیں، یا جن کی زمین میں ایسے اشعار ہیں جو ب میں نہیں ہیں، ان کے بعد وہ غزلیں ہیں جن کا تعلق ن سے نہیں، اور آخر میں ان غزلوں نے جگہ پائی ہے، جن کا ب سے کچھ سروکار نہیں۔ غزلوں کے بعد قصائد وغیرہ ہیں۔ قسم اول کی غزلوں میں پہلے وہ اشعار ہیں جو ب میں ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ ن میں ہیں یا نہیں۔ ب و ن کے مشترک اشعار جن میں اختلاف نہیں، عموماً م کے ساتھ مرقوم ہیں، اختلاف ہے، تو یہ دکھایا گیا ہے جس سے اشتراک کا حال معلوم ہو جاتا ہے، لیکن اس صورت میں م کبھی ہے، کبھی نہیں۔ آخر میں ایسے اشعار جو ن میں ہیں، مگر ب سے غیر حاضر ہیں، زیرِ عنوان ''مطبوعہ'' ۳ درج کیے گئے ہیں۔

(۳) مرتب ح نے اپنی تمہید کے ص ۹ میں ایک نقشہ دیا ہے، جو اس پر مشعر ہے کہ ب کی ۲۷۵ غزلوں کے اشعار ۱۸۸۳ [۴] ہیں، اس نقشے سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ ہر ردیف میں کتنی غزلیں اور کتنے اشعار ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی غزلیں اور کتنے اشعار ان زمینوں میں ہیں جن کے اشعار ن میں بھی ہیں۔ اور کتنی غزلیں نئی زمینوں میں ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حوض ب کی غزلیں ۲۷۶ اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۹۰۶ ہے۔ ذیل کے نقشے سے واضح ہوگا کہ مرتب نے ہر ردیف کی غزلوں اور ان کے اشعار کی تعداد کیا لکھی ہے اور یہ دراصل کیا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مشترک، زمینوں کی غزلیں اور ان کے اشعار کتنے ہیں (قسم اول) ۴ اور غیر مشترک زمینوں کی غزلوں اور ان کے اشعار کی تعداد کیا ہے:

ردیف	غزلیں	اشعار	تصحیح	قسم ا کی غزلیں	اشعار	قسم ۲ کی غزلیں	اشعار
الف	۶۰	۴۵	×	۳۸	۲۶۸	۲۲	۱۳۷
ب	۲	۱۳	×	×	×	۲	۱۳
ت	۲	۱۱	×	۲	۱۱	×	×
ث	۳	۱۳	×	×	×	۲	۱۳
ج	۲	۱۴	×	۱	۸	۱	۶
چ	۲	۲۳	×	۱	۹	۲	۱۴
خ	۱	۵	×	×	×	۱	۵
د	۵	۴۰	تعداد اشعار ۴۱	۱	۱۱	۴	۳۰

ر	۸	۵۶	×	۵	۳۶	۳	۲۰
ز	۹	۵۹	×	۵	۳۳	۴	۲۶
س	۳	۱۶	×	×	×	۳	۱۶
ش	۲	۱۴	×	۱	۹	۱	۵
ع	۲	۱۳	×	۲	۱۳	×	×
غ	۲	۱۲	×	×	×	۲	۱۲
ف	۲	۱۱	×	۱	۵	۱	۶
ک	۴	۳۰	غزلیں۳،اشعار۳۳	۲	۱۶	۱	۷
گ	×	×	۱غزل،اشعار۹	۱	۹	×	×
ل	۵	۳۴	×	×	×	۵	۳۴
م	۵	۳۶	×	۳	۲۳	۲	۱۳
ن	۲۸	۱۸۹	غزلیں۲۹،اشعار۲۰۳	۱۶	۱۱۳	۱۳	۹۰.
و	۶	۴۷	×	۱	۹	۵	۳۸
ہ	۸	۵۴	×	۲	۱۴	۶	۴۰
ی	۱۱۴	۷۸۸	اشعار۷۹۴	۶۴	۴۵۸	۵۰	۳۳۶
				۱۴۶	۱۰۴۵	۱۳۰	۸۶۱

(۴) (۱) غزل ۵ گ: گر تجھ کو ہے یقیں اجابت دعا نہ مانگ ۹۹ص (۲) غزل قسم۲: ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں (اشعار ۶) ۱۲۷ص، مگر ن کا شعر ذیل، ظاہراً یہ سمجھ کر کہ اس میں ''بے زبانوں'' قافیہ ہے، ۱۳۶ص (قسم۳) میں درج کیا ہے:

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

(۳) غزل قسم۲: شفق بدعویٔ عاشق گواہ رنگیں ہے (اشعار ۶) ۲۲۳ص۔ن میں اس زمین کی ایک غزل ۱۴ اشعار کی ہے (ح ۲۶۹ص قسم۳) جس کے دو شعر: کرے ہے بادہ الخ اور بجا ہے الخ ب ۓ میں بھی ہیں (۴) غزل قسم۲: بہار تعزیت آباد عشق ماتم ہے (۱۶ اشعار) ۲۲۳ص ب کا کوئی شعر ن میں نہیں، لیکن اس زمین کے وہ شعر: نہ پوچھ الخ اور بہت دنوں الخ ن میں ہیں (ح

۲۶۹ص قسم ۳) (۵) غزل قسم ۲: مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے (۶ اشعار) ۱۳۳ص۔ اس غزل کے ۳ شعر، مطلع، جز زخم الخ، جوش جنوں الخ ن میں بھی ہیں (۶) غزل قسم ۲: فرصت آئینہ صدر تک خود آرائی ہے (۷ اشعار) ۲۲۶ص۔ اس زمین کا ایک نیا شعر ن میں ہے:

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یہ ح ۲۴۶ص میں (قسم ۳) نقل ہوا ہے (۷) غزل قسم ۲: تا چند نفس غفلت ہستی سے بر آوے (۱۹ اشعار) ۲۳۸ص اس زمین کا ایک نیا شعر جو ح میں نقل ہونے سے رہ گیا ہے۔ مگر ن میں ہے، یہ ہے،

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

(۵) قسم اول کی غزل کا ایک اور شعر ایسا ہے جو ب ون میں مشترک نہیں، ح میں نقل نہیں ہوا:

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضے کا

(۶) مرتب ح نے تمہید میں (حوض ب کے متعلق، مگر یہ صراحتہً مرقوم نہیں) لکھا ہے۔ "غزلوں...... میں ۱۸۸۳ ہیں، ان میں سے نصف کے قریب اشعار مروّجہ دیوان میں موجود ہیں۔" اس سلسلے میں اُمور ذیل شایانِ التفات ہیں:

(۱) ح میں سہرا ملتا ہے۔ "دیوانِ مروّجہ" سے ان کی مراد یہ نسخہ نہیں، بعض قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں اس کی کوئی نقل یا نقل در نقل ہے۔ ے ۲۷ص کی ایک غزل میں ایک شعر: "پھر وہ سوے چمن... گلستاں میں ہواداروں کنا" ایسا شامل ہے جس کے متعلق وہ حاشیے میں لکھتے ہیں: دیوان...... شائع کردہٗ ...حسرت اور دیوان ..... بدایونی کی طبع ثانی کے آخر میں غالب کے غیر مروّجہ اشعار کے ضمن میں شائع کیا گیا ہے لیکن، اس کے باوجود، یہ غزل قسم ۲ کی غزلوں میں محسوب ہے۔ ۲ص ۱۵۶ص کا ایک شعر: "ہر داغ.... امتحاں نہ پوچھ" بھی

ن میں نہیں، لیکن نسخۂ حسرت اور نسخۂ بدایوں میں ہے، بدون م درج ہے۔ یہ بات کہ اس نوع کے دوشعر: ''شب...... فسوں خواب تھا' اور ''واں...... مضراب تھا'' ح ۹ص میں م کے ساتھ مرقوم ہیں، اس خیال کے خلاف پڑتی ہے جو اوپر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مرتب نے ایک شعر: کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا الخ جوب میں ہے، لیکن ''ن'' میں نہیں، ح کے ۵ص میں م کے ساتھ لکھا ہے اور ذیل کے مشترک ۸ اشعار کے ساتھ م نہیں دیا: تیشے...... قیود تھا ۳ص، غنچہ...... پایا ۵ص، ساحل اص (اص ممکن ہے کہ مرتب نے اس مقطع کے ساتھ سہواً ''مطبوعہ'' نہ لکھا ہو۔ اس غزل میں اس کے علاوہ بھی ایک مقطع ہے، اور پہلے مقطع کا مضمون اس غزل کے ایک اور شعر میں بھی بندھا ہے۔) باندھا ۸ص، لکھتا...... انگشت ۵۵ص، نظر...... در و دیوار ۷۰ص، وہ بھی...... ناز ۸۱ص، نہیں...... گلباز ۸۱ص، میں نے...... یاد آیا ۲۴ص، فروغ...... آتش ۸۸ص، سراغ...... قدم دیکھتے ہیں ۱۱۳ص، بنا کر...... کرم دیکھتے ہیں ۱۱۳ص، نگہ...... حیراں مجھ سے ۱۸۶ص، سمجھ...... نہ ہو جائے ۱۹۱ص، حسن...... پیدا کرے کوئی ۱۹۸ص۔

(۲) حسبِ ذیل اشعار ظاہراً مرتب کے نزدیک مشترک اشعار میں شامل نہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ ذیل میں صرف وہ شکل پیش کی جاتی ہے جو ب میں ہے، ن میں ان کی جو شکل ہے وہ بھی ح میں درج ہے:

گرمی برق تپش سے زہرۂ دل آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

۹ص

داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے
اے ہوس مبارک ہو کار عشق آساں ہے

۲۰۰ص

آتشیں پا ہوں گداز وحشت زنداں نہ پوچھ
موے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

اص

اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے
کہ حسرت کش رہا عرض سہتا ہے جدائی کا

ص۱۲

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ
اگرچہ گمشدہ ہے کاروبار دنیا کا

ص۱۵

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بے کسی
دل ز انداز تپاک اہل دنیا جل گیا

ص۲۳

انداز نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ص۲۶

اے عدوے مصلحت چند بضبط افسردہ رہ
کودنی ہے جمع تاب شوخی دیدار دوست

ص۵٦

اسدؔ اے بے تحمل عربدہ بے جا ہے ناصح سے
کہ آخر بے کسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

ص۷۱

نکوہش مانع دیوانگی ہائے جنوں آئی
لگایا خندۂ ناصح نے بخیہ جیب و دامن میں

ص۱۱۷

لوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش اسدؔ
لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

ص۱۰۸

جوں مردمک چشم سے ہوں جمع نگاہیں
خوابیدہ بحیر تکدۂ داغ ہیں آہیں

ص۱۱۹

چشم خوباں مے فروش نشۂ زار ناز ہے
سرمہ گویا موج دود شعلۂ آواز ہے

ص۱۸۴

یاد ہیں اے ہم نشیں وہ دن کہ وجہ ذوق ہیں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

ص۹۶

نہ لائی شوخی اندیشہ تاب 9 درد نومیدی
کف افسوس سو دن عہد تجدید تمنا ہے

ص۱۸۹

(۳) حوض ب ون کے مشترک اشعار غزل ۴۶۵، مروجہ دیوان ۱۴۶۰۔

(۴) مرتب نے حوض ح میں قسم ۳ کے صرف وہ اشعار دیے ہیں، جون میں ہیں، لیکن اس قاعدے کے خلاف ۲۴۷ص میں شعر ذیل درج ہے:

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

۷) مرتب نے تمہید میں یہ نہیں لکھا کہ حواشی ب میں مکمل غزلیں اور متفرق اشعار کس قدر ہیں۔ کسی خاص غزل یا کسی خاص شعر کے متعلق یہ اطلاع کہ حاشیہ ب میں ہے، حواشی ح میں ملتی ہے۔

(الف) حواشی ب میں حسبِ ذیل غزلیں ملتی ہیں، پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موج خزاب (تعداد اشعار ۱۲) ۵۳ص، اس کے کل اشعار ن میں ہیں۔ رہا گر کوئی تا قیامت سلامت (اشعار ۱۰) ۵۷ص، ان میں سے ۴ ن میں ہیں۔ کب فقیروں کو رسائی بت مے خوار کے پاس (اشعار ۸) ۸۵ص، باستثنائے مطلع کل اشعار ن میں ہیں۔ ہے کس قدر ہلاک فریب دعائے معنی

(اشعار ۱۱) ۱۰۰اص، ۲ کے سوا کل ن میں ہیں۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں (۱۱۰ اشعار) ۱۰۹اص، ایک کے سوا کل ن میں ہیں۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو (۱۱۰ اشعار) ۱۴۳اص، غزلیں ۶، اشعار ۶۱، مشترک اشعار ۵۱۔

(ب) قسم ا کی غزلوں کے متفرق اشعار حواشی ب میں: ا۔ روانی ہائے ... قاتل پسند آیا ۳ص، حوض میں سواد چشم الخ جس پر ۱۰ ''لالا'' مرقوم ہے۔ روانی ہائے الخ اس کا بدل ہے ۲، ۱۷، ۳، ۲۰، ۲، (ن) ۴، ۱۲۳، اعتبار عشق...... مجھ پر ہوا ۱۲۳ص ح میں اس کے مقابل ''مطبوعہ'' لکھا ہے، مگر حاشیہ ح میں ہے کہ یہ حاشیۂ ب کا شعر ہے، جس کی جگہ حوض میں ''زہد ..... ششدر ہوا ہے'' جس پر ''لالا'' مرقوم ہے، ۵، ۲۴، (ن) ۶، ۲۶ص، ۷۔ ۵۵ص، ۵ جن میں سے ۲ ن میں ہیں، ۸۔ ۱۶اص، ۹۔ ۹۷ص، ۲ (ن) ۱۰۔ ۱۰۸اص حوض ب و ح میں مقطع، اسد سے ترک الخ، حاشیۂ ح سے معلوم ہوتا ہے کہ اسد الخ پر ''لالا'' اور حاشیۂ ب میں اس کی جگہ یہ مقطع: نہ پوچھ...... خاک انداز (ن)، حاشیے میں اس زمین کے ۳ شعر اور جن میں سے ایک ن میں بھی ہے، ۱۱۔ ۹۴ص، ۲ (ایک ن میں) ۱۲۔ ۱۹۶اص، ۱ (ن)، ۱۳۔ ۱۰۵اص، ۱ (ن)، ۱۴۔ ۱۰۹اص، ۴ ان کے مقابل ''مطبوعہ'' مرقوم ہے، لیکن حاشیۂ ح سے پتا چلتا ہے کہ یہ حاشیۂ ب میں ہیں، ۱۵۔ ۱۱۵اص، ۲ (ان میں)، ۱۶۔ ۱۵۶اص، ۱ (ن)، ۱۷۔ ۱۶۶اص، ۱ (ن)، ۱۸۔ ۱۶۷اص، ۲ (ن)، ۱۹۔ ۱۷۰اص، ۱ (ن)، ۲۰۔ ۱۷۱اص، ۳ (۲ ن میں)، ۲۱۔ ۱۷۳اص، ۱ (ن)، ۲۲۔ ۱۸۷اص، ۳ شعر (''مطبوعہ'') جن میں سے ایک یہ ہے:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت آتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

یہ شعر حوض ح ۲۱۱ص میں بھی قسم ۲ کی ایک غزل میں (باختلاف قافیہ، ناچار کی جگہ مجبور) شامل ہے۔ دونوں صفحوں کے حاشیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بقافیۂ مجبور حاشیۂ ب میں ہے ۲۳۔ ۱۸۹اص میں پہلے ایک غزل جس کے کسی شعر کی نسبت اطلاع نہیں دی گئی کہ ن میں ہے، اس غزل کے بعد بعنوان ''مطبوعہ'' اسی زمین کے ۴ شعر جن کے متعلق حاشیۂ صفحہ مذکور میں یہ لکھا ہے کہ یہ اشعار حاشیۂ ب میں بھی ہیں۔ ان ۴ میں سے ایک ''نہ لائی شوخی... تمنا ہے'' باختلاف بعض الفاظ اس

غزل میں بھی ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حاشیۂ ب میں اس زمین کے نئے شعر صرف ۳ ہیں۔ مجموعی تعداد ۴۴، جن میں سے ۳۲ ن میں بھی ہیں۔

(ج) قسم ۲ کی غزلوں کے اشعار حواشی ب میں ۱۔۳۲ ص، ۲، ۲۔۳۶ ص، ۳، ۳۔۶۰ ص، ۴۔۴۷ ص، ۱، ۵ ص ۹۵ ص، ۱، ۶۔۹۸ ص، ۲، ۷۔۱۲۲ ص، ۱، ۸۔۲۱۱ ص، ۱ (یہ اس شعر کے علاوہ ہے جس کا قافیہ ''مجبور'' ہے) ہے ۱۲۔

(د) حواشی ب کے کل اشعار کی تعداد ۱۱۶ ہے، ان اشعار میں سے ۸۱ ن میں بھی ہیں۔

۸) ب (حوض و حاشیہ) کی غزلیں ۲۸۲، کل اشعار ۲۰۲۲، مشترک اشعار ۴۶۵+۸۱=۵۴۶۔

۹) ب میں فارسی قصیدے سے قطع نظر (اس سے بحث تکملے میں ہوگی) ۳ قصائد ہیں، ۱۔ مصرع ۱: ساز یک ذرہ نہیں ساز زمیں سے بیکار ۲۹۳، مرتب نے اس کے اشعار کی تعداد ۱۱۰ صحیح بتائی ہے، اور یہ بھی درست لکھا ہے کہ مشترک اشعار ۲۸ ہیں۔ ب و ن میں ترتیب اشعار یکساں نہیں، اور کئی شعر کے مقابل ح میں، جہاں چاہیے، م نہیں۔ ۲۔ مصرع ۱: توڑے ہے عجز تنک حوصلہ برروئے زمیں ۳۰۱ ص، تمہید میں تعداد اشعار ۷۶ صحیح ہے، مگر مشترک اشعار ۲۹ (بموجب تمہید) نہیں، ۳۲ ہیں۔ اس قصیدے کا ایک شعر: ''دہر جز...... خود بیں'' ن میں ہے، لیکن ب میں نہیں ۳۔ مصرع ۱: جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۳۰۷ ص کی تعداد ۲۹ تمہید میں ٹھیک ہے۔ یہ قصیدہ ن میں نہیں، لیکن اس کے ۳ شعر (تمہید میں ۲) اس میں بطور غزل موجود ہیں۔ ب میں ۱۱ رباعیوں میں سے صرف ۵ ن میں ہیں۔ اشعار قصائد و رباعیات ۲۲۸، مشترک اشعار ۳۷۔

۱۰) مرتب کا قول ہے: ''مروجہ دیوان میں جتنی کٹی چھٹی غزلیں وہ سب اس (ب) میں مکمل موجود ہیں، جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے، اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں، وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں'' (تمہید)۔ بہت سی کٹی چھٹی غزلیں بے شبہ ب میں مکمل موجود ہیں، لیکن ب میں ایسی متعدد

غزلوں کا ایک شعر بھی نہیں (مثلاً ''شرم'' اور ''کیا کریں'' والی ردیف کے اشعار)۔ اور شواہد درکنار، خود حواشی ح سے ثابت ہے کہ ''متفرق'' اشعار میں سے بعض (مثلاً شکوہ...... ویرانہ تھا'') ب یا اس کے حواشی میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ب (حوض و حاشیہ) میں ۵، صفر ۷ ۳ھ کے قبل کا بھی کلام نہیں مثلاً وہ غزل جس کا مقطع غالب کے خط میں ہیں اور جو یقین ہے کہ تاریخ مذکور سے پیشتر بھی ہے۔ اس کے بعد کے کل کلام کے تو اس میں ہونے کا سوال ہی نہیں۔

۱۱) ''یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں، کیوں کہ اگر چہ اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے، لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کے طرزِ تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے، اور گو محض اس کی بناء پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو، لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ ان میں اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قسم سے حاشیے پر بڑھائی گئی ہیں۔'' (تمہید)۔ حواشی میں جو اشعار ہیں وہ بے شبہ غالب کے ہیں اور اصلاحوں کے ذمہ دار بھی وہی ہیں، لیکن کاتب کون ہے اس کے متعلق فیصلہ کن بات ب کو دیکھے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔ اضافات و اصلاحات کے متعلق مرتب کے ایسے اقوال سے جو نقل نہیں ہوئے، ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ۵، صفر ۷ ۳ھ کے بعد کے ہیں۔ مگر اس کا امکان ہے کہ کچھ اس سے قبل کے ہوں۔

۱) نسخۂ شیرانی ۱! لاہور میں میری نظر سے گزرا تھا، لیکن اس مقالے کی تحریر کے وقت اس کا عکس سامنے ہے۔ یہ موجودہ حالت میں ۱۰۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ ورق اول کے صفحۂ ۱ میں صرف ''دیوانِ غالب اردو'' مرقوم ہے، دوسرے صفحے سے دیوان شروع ہوتا س ہے اور اس میں ۶ شعر ہیں۔ مسطر ۱۱ سطروں کا ہے، مگر بہت کم صفحے ایسے ہیں جن میں ۱۱ اشعار ہوں۔ ورق ۲۶ اس مقطع پر تمام ہوتا ہے جس کا مصرع ۲ یہ ہے: ''عالمہ ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ'' (ح ۶۴ ص) اور اشارۂ کاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کی غزل لفظ ''نفس'' سے شروع ہوتی ہے، لیکن

ورق ۲۷ کا آغاز ''نوازش ۱۲ استخواں فریاد'' (ح ۶۹ص) سے ہوتا ہے جو ''فریاد'' ردیف والی غزل کا مطلع نہیں۔ ح ۶۳ص سے پتا چلتا ہے کہ ''نفس'' چ کی ایک غزل ''نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ'' کا پہلا لفظ ہے۔ ورق ۲۶ کے بعد کم از کم ایک ورق غائب ہے۔ ورق ۱۰۶ ''دل و دیں نقد...... دستگرداں ہے'' پر تمام ہوتا ہے، اور اشارۂ کاتب اس پر مشعر ہے کہ صفحۂ آئندہ ''غم آغوش'' سے شروع ہوتا ہے جو اسی زمین کا ایک شعر ہے اور ن میں موجود ہے۔ ورق ۱۰۷ کا آغاز غزل کے کسی شعر سے نہیں بلکہ قصیدۂ نوینہ کے اس شعر سے ہوتا ہے جو ب میں اس قصیدے کا چوتھا شعر ہے۔ ورق ۱۰۶ کے بعد کتنے اوراق ضائع ہوگئے، اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ قصیدے کا خاتمہ ورق ۱۰۹ کے دوسرے صفحے پر ہوتا ہے، آخری مصرع یہ ہے:

وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

۲) ش (حوض و حاشیہ) کے حسبِ ذیل ۲۵/اشعار بیان سے غیر حاضر ہیں، ابتدا میں غزل کا شمار دیا گیا ہے:

۳

عالم طلسم شہر خموشاں ہے سربسر
یا میں غریب کشور گفت و شنود تھا

۷۰

سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ
جتنا کہ ناامید تر امیدوار تر

یہ شعر غلطی سے یہاں درج ہوا ہے، مروّجہ دیوانِ غالب میں ہے۔

پیٹھ خراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے
محو نسبت ہیں تکلف ہمیں منظور نہیں

(حاشیہ)

۱۱۳

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالب عرق بید نہیں

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی ہے ہم کو

(حاشیہ)

طاقت رنج سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ہجر یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ ۱۳ کی امید
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو
ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موج گردِ راہ مرے سر کو دوش ہے

(حاشیہ)

۱۵۴

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے
دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

۱۷۷

زندگی میں بھی رہا ذوق فنا کا مارا
نشہ بخشا غضب اس ساغر خالی نے مجھے
بس کہ ہے فصل خزاں چمنستان سخن
رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خورشید سے فنا ہوتی ہے شبنم غالبؔ
کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

۲۱۵

اے بے خبراں میرے لب زخم جگر پر
بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی
گو زندگی زاہد بیچارہ عبث ہے
اتنا ہے کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی

۲۱۴

دل تو ہو اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسباب تمنا چاہیے

۲۲۰

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
کبھی زمانہ مراد دل خراب تو. دے

۲۲۱

طلسم منت یک خلق سے رہائی دی
جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احسان ہے
جنوں نے مجھ کو بنایا ہے مدعی میرا
ہمیشہ ہاتھ میں میرے مرا گریباں ہے
اسدؔ کو زیست تھی مشکل اگر نہ سُن لیتا
کہ قتل عاشق دلدادہ تجھ کو آساں ہے

۲۲۵

انجام شمار غم نہ کچھ پوچھ
یہ مصرف تابکے نہیں ہے
جس دل میں کہ تابکے سما جائے
واں عزت تخت کے نہیں ہے

۲۳۸

پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگان عشق
جوں شمع آپ اپنی وہ خوراک ہوگئے

۲۴۳

کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

۲۴۴

خو انا نہیں ہے خط رقم اضطراری
تدبیر پیچ تاب نفس کیا کرے کوئی

۳) ذیل میں متون ش وح کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ان کے اختلافات تو دکھائے ہی جائیں گے، خاص خاص امور میں ان کے اتفاق کی طرف بھی ناظرین کی توجہ منعطف کرائی جائے گی۔ پہلے غزل کا شمار اور اس کے نیچے ش میں اس کے اشعار کی تعداد ہے۔ غزل ب میں نہیں، تو یہ بتانا غیر ضروری سمجھا گیا ہے، کہ ح کے کس صفحے میں ہے، موجود ہے، تو صفحے کا شمار دیا گیا ہے۔ غزل کا پہلا مصرع مکمل یا نامکمل شکل میں دیا گیا ہے۔ اگر اس کے سب یا کچھ الفاظ کے نیچے نشان ہے، تو یہ اس پر مشعر ہے کہ متنوع مختلف ہے۔ اختلاف یا اتفاق اس طرح دکھایا گیا ہے کہ پہلے وہ شکل ہے جوش میں ہے، اس کے بعد = اور ج کے الفاظ۔ غزلوں کے اشعار کی جو تعداد درج ہے، اس میں اقسام ذیل کے اشعار ہیں: (۱) وہ جو صرف ش میں ہیں، اور ۲) میں نقل ہو چکے ہیں۔ (۲) وہ جوش و ب میں ہیں، لیکن ن سے غیر حاضر ہیں (۳) وہ جو ان تینوں میں ہیں (۴) وہ جوش و ن میں ہیں، لیکن ب میں نہیں۔ ترتیب اشعار میں اختلاف ہے تو اس کا ذکر صرف اسی صورت میں کیا گیا ہے کہ یہ ضروری ہو۔ قوسین کے اندر لفظ ''قطعہ'' کا ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ش میں یہ لفظ موجود ہے اور اس سے قبل جس شعر کی طرف اشارہ ہے وہ بعد کے شعر یا اشعار کے ساتھ مل کر قطعہ ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ اسی صورت میں مرقوم ہے کہ ش میں ہے اور ح میں نہیں۔ مکمل شعر کی طرف اشارے کے لیے اس کی ابتدا کے بعض الفاظ کا دینا کافی سمجھا گیا ہے اور ان کے بعد التزاماً الخ

لکھا گیا ہے۔ بہت سے اختلافات جن کی نشاندہی کی گئی ہے، دراصل کاتب ش یا ح کے اغلاط ہیں۔ املا کے کچھ اختلافات ۳) اور کچھ ۵ میں دکھائے گئے ہیں، مگر ایک قسم کا اختلاف بکثرت ہے تو ہر جگہ لازماً اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۹/۱۱ص نقش...... تحریر کا۔ جز مژہ (مژہ)۔ آتشیں پا الخ کی دوسری شکل ش میں ہے۔ تماشا = تماشہ

۶/۲۲ص جنوں...... کمند آیا۔ زنجیر ہی = زنجیر ہے۔ نادیدنی دعوت = کذا (حاشیۂ ش داغ جگر ہدیہ)

۷/۳۳ص عالم...... وجود تھا۔ جوں (کذا) = چوں۔ ہے عرض = کذا (حش درست)۔

۶/۲۴ص شمار...... پسند آیا۔ ش میں سواد الخ نہیں، روانی ہائے الخ ہے۔ بادہ پر = بادہ بر۔

۷/۳۵ص تنگی...... وجود تھا۔ متاع = مطاع۔ ڈھانپے = ڈھانپا۔

۷/۲۹۶ص خود...... خو تھا۔ سیہ پیمانہ ہر = سیاہ از حلقہ ہائے۔ بے نقابی آپ پر = بے نقابی ہا بخود۔ شستہ تر رو = شیشہ برو۔ سے زانو زانو = کا نا بزانو۔

۷/۴۷ص کہتے...... پڑا پایا۔

۷/۸ دوست...... فرماویں گے کیا = بھرتے = بھرنے۔ خانہ الخ (قطعہ)، گرفتار وغا = گرفتار بلا۔ دلی = دہلی۔ رہے = رہیں۔

۹/۵۹ص عشق...... مزا پایا۔ خرام = خیال۔ دادن گل = دادن دل۔ ہم سے تیرے کوچے = ہم نے تیرے کوچہ۔ بے ستم = نے سم۔

۱۰/۲۲۱۰ص اف...... بے محابا جل گیا۔ شمع رویوں = شمع رویاں۔ ذوق آتش = شوق آتش۔ دکھاؤں (کذا) = دکھاتا۔ شعلہ رو جب ہو گئے = شعلہ رویاں جب ہوئے۔ بسوز آتش (ش وجب) = ز آتش خیزی۔ میں ہوں اور الخ = ہے اسد بیگانہ الخ۔

۷/۵۱۱ص کار...... عریاں نکلا۔ بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل (ش وحب) = عشرت ایجاد چہ بوے گئی۔ وکو دو چراغ۔ ب میں اس پر ''لالا''۔

۶/۱۲، ۲۹ص دویدن۔ زمیں پایا = دمیدن۔ سرمہ = سرمو۔ اُگی = اُگے۔ باگیرائی =

ناگیرائے۔ مسکن ہے (ہے صاف نہیں) = مسکن سے۔ یک دست و (مشکوک) = یک دست۔

۷/۱۳، ۶ص شوق = ساماں نکلا۔ پردے میں بھی = پردے سے بھی۔ پروہی (پر صاف نہیں) = پھر وہی۔

۷/۱۴ دھمکی میں مرگیا جو زباب نبرد تھا۔

۹/۱۵، ۶ص دہر...... تسلی نہ ہوا۔ صفحۂ آئینہ جولان گاہ = صفحہ آئینہ ہوا آئینہ۔ کرنے میں = کرنے پہ۔

۶/۱۶، ۳۱ص برہمن / شوخی اہتمام اس کا = شہرت۔ زینت ریزی = زینت ریز ہے۔ دیوے گا = لایا ہے۔ مہر (قہر؟)۔ عناں گیر = عنا گیر۔

۹/۱۷، ۷ص شب... محمل باندھا۔ جلوہ ہے = جلوہ سے۔

۷/۱۸، ۱۱ص نہ ہوگا...کم میرا۔ بے دماغی = بددماغی۔ غبار راہ = میں گرد راہ۔ آوازۂ = آوارۂ۔

۷/۱۹، ۸ص جب...... محمل باندھا۔ نہ بندھے الخ ش میں نہیں۔ پایہ = پاپہ۔

۷/۲۰، ۱۰ص نہ بھولا...انتظار اپنا۔ ہے چمن = سے چمن۔ نیاز = نثار۔ ہوائی نقشبند = ہوا ہے نقشبند۔

۷/۲۱ محرم نہیں...... راز کا۔

۱۲/۲۲، ۹ص شب...... تیرے دل بے تاب تھا = تیری۔ عناں گیر = عنا گیر۔ ہجوم اشک میں = ہجوم اشک سے۔ فوارۂ سیماب = فوارۂ سیلاب۔ ب میں اس زمین کی ۳ غزلیں ہیں (۹ص، ۱۰ص)، غزل ۲۲ کے ۲ شعر: دیکھتے تھے الخ اور موج سے پیدا الخ ب کی دوسری غزل اور ۴ شعر: جلوۂ گل الخ، یاں سر پر شور الخ، فرش سے تا عرش الخ اور یاں نفس کرتا تھا الخ تیسری میں ہیں۔

۶/۲۳، ۳۵ص یک...... بہار صحرا۔ یک قدم = اک قدم۔ خانہ ہے خاک = خانۂ خاک۔ سر میں = درد۔ دل میں = درِدل۔

۹/۲۴، ۹ص نالۂ دل...... نایاب تھا۔ محشرستاں = محشر آباد۔ یاد ایامیکہ = یاد ایام کہ۔ غزل ۲۳ کے ۵ شعر: نازش الخ، مقدم الخ، کچھ نہ کی الخ، آج کیوں پروا الخ (''قطعہ'' پیش ازیں = کل

تلک)اور یاد کرا لخ (جو آج کیوں پروا لخ کے بعد ہی ہے)، ب کی غزل ۳ میں ہیں۔

۶/ ۱۶،۲۵ص ،لب..... مردگاں کا، کمین گاہ = کمیندار۔ ستم دیدہ = بدرجستہ۔

۸/ ۲۶، ۳۶ص کیا..... نستن کا۔ نادیدہ صف = نادیدہ صفت۔ زنگ بستن = رنگ بستن۔ عاقبت ہیں = عافیت میں۔ اندیشۂ نستن (؟) = اندیشۂ رفتن۔ جوں موم = خوں موم۔ بیمار ہوتا = بیمار رہتا۔ آئینۂ = آئینہ۔

۹/ ۳۲،۲۷ص یاد..... سلسلۂ یارب تھا = درگرہ۔ تماشا چمن = تماشائے چمن۔

۱۰/ ۱۵،۲۸ص کس..... انتظار تھا۔ ماتم یک شہر آرزو = خون دو عالم معاملہ۔ توڑ = توڑا۔

۷/ ۱۶،۲۹ص زبس..... وہم بسمل کا۔

۹/ ۲۰،۳۰ص، بسکہ..... آساں ہونا۔

۷/ ۳۳،۳۱ص رات..... جانا نہ تھا۔ جناع = جناح۔

۷/ ۳۴،۳۲ص کرے..... نکتہ گوئی کا۔ آئینہ ہووے = آئینہ ہوے۔ چشمۂ آئینہ دھووے = چشمۂ آئینہ ہوئے۔ رنگی = زنگی۔

۹/ ۳۳،۳۳ص بس کر..... پروانہ تھا۔ سعی سپند = سعی پسند۔ بخت سیہ = بخت رسا۔ تڑپھنا = تڑپنا۔

۶/ ۳۶،۳۴ص شب..... تیر آیا۔ پاے پہ زنجیر = پائے بہ زنجیر۔

۸/ ۳۷،۳۵ص سیر آنسوئے تماشا ہے طلب گاروں کا

۷/ ۱۳،۳۶ص، شب..... اندازہ تھا۔ ترصدائی = ترصدائے۔

۷/ ۳۸،۳۷ص عیادت..... غمگیں کا۔

۷/ ۱۲،۳۸ص پے..... نارسائی کا۔ جہاں مت = جہاں مٹ۔ مغرور = مصروف۔ غوغا = چوچا۔

۸/ ۳۹، ۱۷ص ضعف..... یہ دور تھا = بھی۔ جس کے نام = اس کے نام۔ کا منتظر = کی منتظر۔

۷/ ۱۲،۴۰ص نہ ہو..... بے وفائی کا۔ بمہر (بضمۂ میم بعض اصحاب م کو مکسور سمجھتے ہیں)۔

بے سامانی = بے تامانی۔ن کا شعروہی اک بات الخ ش میں ہے،ووہی = وہی۔

۸/۴۱، ۲۰ص یک زرہ...... باغ کا چشم میں موج = چشم جنوں میں۔

۷/۴۲، ۲۲ص قطرہ... پرور ہوا۔نگیں اخگر = نگیں اختر۔زہد گردیدن الخ ش میں نہیں، اعتبار الخ ہے۔خونا کردگاں = نا افسردگاں۔ریشہ واری = ریشہ داری۔شکر لطف = لطف عام۔ مے ہی (کذا) = مے ہے۔مژگاں ساہاں (سپاہاں؟) = مژگاں سیاہاں۔

۹/۴۳، ۱۳ص وہ...... پنہاں سمجھا۔ سے میں تب = سے تپش

۸/۴۴، ۲۴ص پھر...... تریاد آیا۔تھا میں صحرا میں کہ = دشت کو دیکھ کے۔حب کا شعر: پھر ترے الخ ش میں ہے۔

۷/۴۵، ۲۵ص تو دوست کسو... ستم گر نہ ہوا تھا۔ظلم کہ = ظلم جو۔

۷/۴۶، ۲۷ص شب...... ناموس تھا۔پرستی بہار = پرستی ہے بہار۔طبع کی واشد نے = غنچۂ خاطر نے۔رنگ یک = رنگ صد۔یہ دل وابستہ گویا = گردۂ تصویر گلشن۔

۱۲/۴۷، ۲۵ص عرض...... قابل نہیں رہا۔جوں شمع = ہوں شمع۔اب لائق توجہ = شایان دست و بازوے۔بعادی حیرت (حیرت مشکوک) = بوادی حسرت۔مٹ گئی = مل گئی۔بے داد عشق سے نہیں ڈرتا ہوں پر اسد = انداز نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسد۔

۹/۴۸، ۱۸ص طاؤس...... آہ کا۔

۱۰/۴۹، ۱۹ص خود پرستی ...... نا آشنا۔آشنا کے = آشنا کی۔ن کے کئی زائد اشعار باستثنائے ''شکوہ سنج الخ'' ش میں ہیں۔

۶/۵۰، ۱۸ص بہار...... اشکباری کا۔ساقی ہو = ساقی ہے۔

۱۱/۵۱، ۲۶ص خلوت...... جولان میرا۔سرشار سے = سرشار ہے۔

۱۰/۵۲عشرت...... فنا ہو جانا۔بخشے ہے الخ (قطعہ،اس کے بعد ''تا کہ تجھ پر'' الخ)۔گزرنا = کذا۔

۷/۵۳، ۵۲ص بس کہ...... بیابان خراب۔طبع آ کہ = طبع موزوں۔اختر کئی (کذا، گنے؟) = اختر کئی۔اختر ہے = اختر سے۔آ دہم = ادہم۔طشت = کذا۔

۱۲/۵۴، ۵۳ص پھر...... بالکشا موج شراب۔ دل دوس (؟) = دل دوست۔ سیہ مستی = سیہ ہستی۔ ہے یہ برسات الخ۔ بناتی = بناتی۔ (قطعہ)۔ ہیں طوفانی = ہے طوفانی۔ کیفیت ہستی = ہنگامۂ ہستی۔ رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا سے ہے تصور میں زبس جلوہ نما۔

۶/۵۵، ۵۲ص ہے...... حاصل خیال عندلیب سے = پرور۔ بریدن = پریدن۔ پروانہ و = پروانۂ و۔

۱۰/۵۶، ۵۵ص جاتا...... ادھر انگشت۔ دیکھا ہے کسو کا جو = دیکھا ہے کسی کا جو (حوض ح) = حاشیۂ ح میں یہ عبارت: ''متن میں پہلے...... یوں تھا، خوباں کا جو دیکھا ہے''۔ مرتب نے یہ نہیں بتایا کہ ''دیکھا ہے کسی کا جو'' ب میں کس جگہ ہے۔ میں الفت مژگاں میں = مژگاں کی محبت میں۔ پاتی (پانی) تو پھر اس کی = باقی تو عجب کیا۔ تڑپھتی = تڑپتی۔ بس اوس (ش میں اُس کی عموماً اوس) = بس اس۔ ہر شمع شہادت کو ہے یاں = ہے شمع شہادت کے لیے۔ لوگوں کی تھی = لوگوں کے تھے۔ نشانی ترا = نشانی تری۔ دنداں = کذا۔

۱۳/۵۷، ۵۶ص نیم رنگی...... زار دوست۔ غیر از نقش = جز تمثال۔ پہ اُس کے = پہ اس کے۔ آنقاب روز = آفتاب صبح۔ اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر = اے عدوے مصلحت چند (کذا) بضبط افسردہ رہ۔ کون لاسکتا ہے تاب جلوۂ = کردنی ہے جمع تابِ شوخی۔ ب کے اشعار برق الخ اور لغزش الخ ش میں نہیں، اور ان کے کل زائد اشعار اس میں موجود ہیں۔ غیر یوں کرتا ہے الخ (قطعہ)۔ میری پرسش = پرسش مجھ سے۔ پسند آتی = پسند آئی۔

۱۰/۵۸، ۵۷ص رہا...... قیامت سلامت۔ خونابہ = خوں نابہ۔ خط خفا = خط وفا۔ گریکام = گریہ کام۔ جگر خالی = جگر خواہی۔ خستہ وشور = خستہ دشوار۔ وفور وفا = وفور بلا۔ ہجوم بلا = ہجومِ وفا۔

۷/۵۹، ۵۹ص ناز...... توانائی عبث۔ محک = مہک۔ کنج (گنج؟) = کنج۔ جان عاشق = طبع عاشق۔ باسیانی = پاسبانی۔

۹/۶۰، ۶۱ص گلشن...... دگر ہے آج۔ انتظام = انتظار۔ ہر رشتہ = سر رشتہ۔ دورافتادۂ = دور او فتادۂ۔

۲/۶۱، ۶۲ص جنبش ہر برگ...... اختلاج = گلبرگ۔ وحشی = وحشت۔ قہرمان عشق میں

(؟) سے کذا۔ جہاں دیتی ہے حیرت = نے بخشا بسکہ حیرت۔ گیسوشدن = گشتن بہر زلف۔ میخانہ ہا = میخان ہا۔ ''میناپہ'' کے بعد ''باج'' حرف ب کے اوپر دو نقطے بھی اس کے اوپر لفظ وحشی مرقوم ہے، یہ اس کی ی کے نقطے ہو سکتے ہیں، مگر آخر میں جو ی آتی ہے وہ عموماً ش میں نقطوں سے محروم ہے = باج۔

۷/۶۲، ۶۳ص بیدل...... دریدہ کھینچ۔

۷/۲۳، ۶۴ص قطع سفر ہستی و آرام وفنا کھینچ = آرام فنا۔

۵/۲۴، ۶۹ص نوازش...... نہاں فریاد۔ دلیہائے = دلہائے۔ ب کے ابتدائی دو شعر ش سے غائب۔

۱۱/۶۵، ۶۶ص حسن...... چھٹا میرے بعد۔ ساقی میں = ساقی پہ۔ سیلاب فنا = سیلاب بلا۔ ان کے ناخن (ان بدون ن) = اُن کے ناخن۔

۱۰/۶۶، ۷۰ص بلا سے...... بہ پیش نظر درودیوار۔ کسو سے = کسی سے۔ پانو = پاؤں۔ زمانہ میں = زمانے میں۔

۷/۶۷، ۷۴ص بس کہ...... ماہتاب آئینہ پر۔ چھڑکے = (کذا)۔ ''مدعی'' کے بعد کا لفظ پڑھا نہیں جاتا، ح میں میرے، مگر یائے معروف کی جگہ ہے۔ مجرم = خونی۔ پیچ تاب = پیچ و تاب۔ بنے = ہواز۔

۹/ ۶۸، ۷۱ص نہیں بند...... کنعان پر۔ چشم سے جس کی = چشم سے جس کے۔ زمانے سے = زمانہ سے۔ پ]ارہ ہائے = کذا۔

۷/۶۹، ۷۱ص صفا سے...... زنگ آخر۔ تڑپھ = تڑپ۔ نغمہ سے = نغمے سے۔

۸/۷۰، ۷۴ص بینش...... تو بہار تر۔ نالہ نکاہ = نالہ بہ کاہ۔ ازرحم = از زخم۔

۵/۷۱، ۷۲ص دیا...... فریب آخر۔ بے قراری سے = بے قرارانہ۔ پرفشانی ہوگیا = بال افشانی ہوا۔

۹/۷۲، ۷۲ص فسون یک دلی...... دشمن پر۔ خون تمنا = خون در عالم۔ قرض = فرض۔

۶/۷۳، ۸۲ص حسن...... تغافل ہنوز۔

۹/۷۴،۷۹ص بیگانہ وفا...... چمن ہنوز۔ زنجیر پا ہی = زنجیر پا ہے اس زمین کی صرف ایک غزل ش میں ہے۔، ب میں ۲۔غزل ۲ کے ۱۳ اشعار، فارغ الخ (جوں صبح و آفتاب = مانند صبح و مہر۔ جیب کفن = جیب و کفن))، اے شعلہ الخ، میخانہ جگر الخ غزل ۴۷ میں ہیں۔

۶/ ۸۳،۷۵ص چاک...... تامل ہنوز۔ تجمل = تحمل۔

۹/ ۸۰،۷۶ص حریف...... نیاز۔ پر دماغ = پھر دماغ۔ کو پرواز = کذا۔ صورت پرواز = کذا، لرزاں ہے = لرزے ہے۔ اسد سے الخ ش میں نہیں۔ صہبا ہے آبگینہ = صہبائے آبگینہ۔

۷/ ۸۳،۷۷ص کو...... جولان عجز۔

۷/ ۸۲،۷۸ص داغ...... بکہسار ہنوز = بہ کہسار۔ دور میں = دور بیں۔ تب = تپ۔ گزرے = گزرے۔

۹/ ۸۱،۸۹ص نہ گل...... ساز۔ سجدہ ہائے = سجدۂ جبیں۔ غم گیسو = خم کاکل۔ دور دراز = دور و دراز۔ آرایش = آرائش۔

۶/ ۸۴،۸۰ص نہ بندھا...... مور ہنوز۔ غنچہ = غنچے۔

۶/ ۸۵،۸۱ حاصل...... کوتاہ اور بس۔ تا چاک = بر چاک۔ پیچ تاب = پیچ و تاب۔ ہم خود = خود ہم۔ عقدہائے = عقدہ ہائے۔

۸/ ۸۵،۲۸ص کب...... میخوار کے پاس۔ اک بار = ہے ہے۔

۵/ ۸۶،۸۳ص قسمت...... محبوس رس۔ پیچ تاب = پیچ و تاب۔ ڈھونڈھنا (کذا) = خواستن۔ پردہ = کذا۔

۵/ ۸۶،۸۴ص کرتا ہے...... مایوس۔ ترے جلوے کی = رخ دوست کے۔ جلوہ پرستار = جلوہ نظر جوش۔

۹/ ۸۸،۸۵ص ہوئی...... بہار آتش۔ گداز موم ہے افسوں = نہ پاوے بے گداز موم۔ نکالے کب...... نکالے کیا۔ طپیدن = تپیدن۔ ہوتی ہے حل = کذا۔

۵/ ۸۸،۸۶ص باقلیم سواد آتش = بہ اقلیم۔ دیباچہ = دیباچہ۔ سامان = رنگ اور۔ بت بہر = بت ہی بر۔

۶/۸۷،۹۰ص جادہ حوز...... شعاع۔

۷/۸۸،۹۰ص رخ ...... جاودانی شمع۔ حسرت پروانہ = حسرت پرواز۔ بایمائے = بہ ایمائے۔

۶/۸۹،۹۲ص عشاق...... ہزار داغ۔ محو = نیست۔ یہاں = یاں۔

۶......۹۰،۹۲ص بلبلوں...... بار باغ۔ نقطۂ = نقطعۂ۔

۸/۹۱،۹۴ص نامہ...... غبار حیف۔ کسو = کسی۔ کرم = کرم نے۔

۲/۹۲،۹۴ص عیسی ...... شفاریز یک طرف۔ سنجیدنی = سنجیدگی۔ ہم یک طرف ہیں = ہم اک طرف ہیں۔ ہر سو ہو (کذا) = ہو سو ہو۔ دادۂ = دادہ۔

۹۳،۹۶ص زخم پر باندھے (کذا) ہیں...... بے پروانمک۔ وجد ذوق = وجہ ذوق۔ چھوڑ کر جاتا = چھوڑ کر جانا۔ مانگے = مانگیں۔ منت نہ کھنچوں گا = منت نہ چھوڑوں گا۔ خوباں ہے = خوباں ہیں۔ نصارا = اضارا۔

۸/۹۴،۹۷ص آہ...... اثر ہوتے تک = ہونے (ہر شعر میں) ن کے ساتھ۔ ساتھ دن = سات دن۔

۷/۹۵، ۹۷ص آئی ...... پارہ (کذا) ...... درمیان اشک۔ اشارا = اشارہ۔ طپیدن = تپیدن۔

۹/۹۶، ۹۹ص گر...... دعا نہ مانگ۔ جنبش نشاط (بساط؟) = جنبش نشاط۔ برگ دعا = برگ حنا۔ اس کی = اُس کی۔ پایمال = پائمال۔

۷/۹۷،۱۰۱ص بدر...... ہلال۔ رخ سے ترے = رخسار سے۔ داغ مہ = داغ شب۔ ورنہ تھا = ورنہ ہے۔

۱۱/۹۸،۱۰۰ص ہے...... وفائے گل۔ رہ گیا = مرگیا۔ گل حبیب = گل وحبیب۔ اسے = اُسے۔

۷/۹۹،۱۰۱ص ہوں...... خیال۔

۹/۱۰۰،۱۰۳ص بہر ...... سے رقم ایجاد گل = ہے حسرتیں کرتی ہے = حسرتیں کرتی ہی۔

۶/۱۰۱،۱۰۳اص گرچہ.....تلک دل۔شوق پروا=شوق بے پروا۔نشہ=نشہ۔
۷/۱۰۲،۱۰۴اص اثر کمندی.....نارسا معلوم۔
۷/۱۰۳،۱۰۶اص ازانجا.....یار ہیں ہم۔لاچار=کذا۔محمل آرائے=محفل آرائے۔
۱۰/۱۰۴،۱۰۴اص بسکہ.....میخانہ ہم۔ہر موج ایک=ہر موج یک۔تصویر چاک=تصویر برخاک۔جوں شمع خلوت خانہ=جوں شمع ماتم خانہ۔
۶/۱۰۵،۱۰۶اص جس دم کہ.....نفس تمام۔بہ گلوے=بہ گلوئے۔یوہیں=یونہی۔
۷/۱۰۶، ۱۰۵اص رہتے ...... بے دردانہ ہم۔شعلہ ہا=شعلہ ہاء پر (پُر؟) موہوم = پرموہم۔
۹/۱۰۷،۱۰۸اص خوش.....فغا کروں۔
۱۰/۱۰۸،۱۰۹اص وہ.....وصال کہاں۔خوباں ہی=اک شخص کے۔مضایقہ=مضائقہ۔
۱۰/۱۰۹،۱۱۱اص آنسو.....ہوا کہوں۔مگراوسے=مگراسے۔تواوسے=تواسے۔
۵/۱۱۰،۱۱۲اص ہم ...... مے پرستی ایک دن۔غرۂ اوج=غرۂ رفعت۔ڈھول دھپہ=ڈھول دھپا۔لاوے=لائے۔نغمہ ہائے=نغمہائے۔شیوا=شیوہ۔
۱۰/۱۱۱،۱۱۳اص مانع دشت.....تدبیر نہیں۔جادۂ غیر نگہ=جادۂ غیر از نگہ۔سبزے میں = پردے میں۔میر کے شعر کا الخ (قطعہ)
۷/۱۱۲،۱۲۰اص طاؤس.....رنگ نکالوں۔شمع سی=شمع کو۔
۷/۱۱۳،عشق.....نومید نہیں۔کہتی ہے=کہتے ہیں۔جیتی ہے=جیتے ہیں۔خلق=لوگ۔ڈرہے (کذا)=ڈر ہے۔
۷/۱۱۴،۱۲۱اص کیا.....دل تنگ نکالوں=کس۔کس پردے میں فریاد کی=اے نالہ میں کس پردے میں۔بمقدار دل دلتنگ=بمقدار دل تنگ۔آئینۂ بے زنگ=آئینۂ بے رنگ۔
۸/۱۱۵،۱۱۸اص صاف.....گلزار چمن۔میر آب......میزاب۔کِھل گئی......کھُل گئی۔گریۂ عشاق=دیدۂ عاشق ہے۔
۷/۱۱۶،۱۱۹اص جوں ..... میں ہوں جمع نگاہیں = سے۔کاکل میں پڑی = کاکل میں

پڑیں۔آئینہ کے=آئینہ کی۔حسرت کش یک=حیرت کش یک۔شوق تراشی ہیں=تراشے ہے۔

۷/ ۱۲۱،۱۱۷ص سودائے...... کشیدہ ہوں۔خونابہٗ=خوں نابہٗ۔گذشتن=گزشتن۔ہوں گرمی الخ اس غزل میں نہیں،غزل ۱۱۹ میں ہے۔

۷/ ۱۲۳،۱۱۸ص برگ...... کوہکن کی فکر میں۔موج دود=موج درد۔

۹/ ۱۲۲،۱۱۹ص خون درجگر...... رسیدہ ہوں۔پاے ہوس=پائے ہوس،اس قسم کی غلطی ح میں بکثرت۔

۸/ ۱۲۳،۱۲۰ص بقدر...... گریباں ہیں۔اتفاق جسم=اتفاق چشم۔بے مہر=ناہید۔

۸/ ۱۱۲،۱۳۱ص جہاں...... قدم دیکھتے ہیں۔کسوکو=کسی کو۔یک قد=اک قد۔تھا کہ=تماشا کر۔آئینہ سازی=آئینہ داری۔نالہ لی (کذا)=نالہ لے۔

۷/ ۱۱۴،۱۲۲ص جس جا کہ...... درمیان نہیں=جائیکہ۔وہاں=واں۔

۸/ ۱۲۴،۱۲۳ص فتادگی...... استوار رکھتے ہیں۔گذشتگاں=گزشتگاں۔زلف ناز=زلف باز۔اوس کافر=اس کافر۔

۸/ ۱۱۶،۱۲۴ص سرشک...... جانے میں۔

۷/ ۱۱۵،۱۲۵ص بے ترحم...... بیدادیاں۔اپنی بے کسی کی=اپنے درددل کی۔اون کو=ان کو۔

۷/ ۱۲۶،۱۲۶ص ظاہرا...... گیرا نہیں۔حسرت کش دامن یہ=دامان کے حسرت پہ۔سیلان=طوفان۔ایک امروز=یک امروز۔ذوق=شغل۔بعد از ضبط=بعد ضبط۔طلسم دہر=طلسم دیر۔

۸/ ۱۲۷،۱۲۷ص ضبط...... دیگر نہیں۔"ن کا شعر" ہوگئی ہے غیر کی شیریں الخ" اس میں ہے (بیانی=زبانی)۔

۷/ ۱۲۴،۱۲۸ص پانو میں...... حنا باندھتے ہیں۔پاؤں

۵/ ۱۲۴،۱۲۹ص اے نوا...... بکف چلتا ہوں میں۔یک طرف=اک طرف۔آب=آپ۔دوالی=دیوالی۔

۷/ ۱۱۸،۱۳۰ص تیرے توسن...... صبا باندھتے ہیں۔نشہ=نشہٗ۔

۷/۱۳۱، ۱۲۰اص تن بہ بند...... ندادہ رکھتے ہیں۔ سرِ پائے بپائے = سرے بپائے۔ بیہدہ = بیہودہ۔ دل = دلے۔

۱۰/۱۳۲، دیوانگی ...... زنار بھی نہیں۔ ہمارے جیب = ہماری جیب۔ ملنا ترا اگر = ملنا اگر ترا۔ یکطرف = اک طرف۔ بے سر = سر ہے۔

۷/۱۳۳، ۱۲۵اص بغفلت...... مخمور ملتے ہیں۔ آئینہ پرواز تسلی = آئینہ پرواز تسکیں۔

۶/۱۳۴، ۱۲۶اص فزوں...... کشتی میں۔ سواد = سویدا۔ بے ربطی شور = دیوانگیہائے۔

۷/۱۳۵، مزے...... نظر میں خاک نہیں۔ آب صرف = اب صرف۔

۵/۱۳۶، ۱۲۸ دیکھیے ...... ضبط افسردگاں۔ مہر از بہر = بہر جان۔ خاطر آزردگاں = خاطر افسردگاں۔

۷/۱۳۷، ۱۲۶اص بے دماغی...... تنہائی نہیں۔ چیونٹی کے پر = مور کے پر ہیں۔

۷/۱۳۸، ۱۲۵اص ہوئی ...... تدبیریں۔ کھینچی ہے = کھینچی ہیں۔ ہجوم سادہ لوحی = درشتی تامل۔ غبار آلودہ ہیں = غبار آلودہ میں۔ کریں ہیں = کرے ہیں۔

۱۰/۱۳۹، ۱۰۹اص غنچۂ...... دکھا کہ یوں۔ خاموشی = کذا۔ مینے = میں نے۔

۱۰/۱۴۰، ۱۴۷اص وارستہ...... محبت ہی کیوں نہ ہو۔ کسو سے = کسی سے۔ گلا = گلہ۔ ہر چند عمر = عمر عزیز۔ بہانۂ سکی (کذا) دلی = بہانۂ بیگانگی۔

۷/۱۴۱، ۱۴۴اص بے درد..... فرو نہ ہو۔

۷/۱۴۲، ۱۴۳اص حسد پیمانہ ہے...... تماشا ہو = سے۔ وہ دل = دل۔ لا جس سے = لایعنی۔ خرام ناز آجاوے = خرام اہتزاز آوے۔ عیش معاصی = ذوق معاصی (حاشیۂ ح ''پہلے ذوق کی جگہ عیش تھا'')

۸/۱۴۳، ۱۴۵اص مبادا...... نوا گم ہو۔ فرو ہوتا ہے سر سجدے میں = جبیں میں ادر لباس سجدہ۔ حسن یک = حسن اسد یک۔

۱۰/۱۴۴، ۱۴۶اص رنگ...... وفا گرد۔ آئینہ ہا = آئینہا۔

۶/۱۴۵، ۱۵۶اص رفتار...... قدم باندھ۔ جوں سبحہ = جو سبحہ۔ تمنائے پری ہے = کذا۔

ہمت (کذا)=تہمت۔ آئینہ پہ=آئینہ بہ۔ دیباچہ=دیباچۂ۔

۹/۱۴۶، ۱۵۵ص جز...... خفتگاں نہ پوچھ۔ پادشاہی = بادشاہی۔ عشق ناز=عشق باز۔ ہمرہاں=ہمزباں۔ گرتی (کذا)=گرمی۔

۵/۱۴۷، ۱۵۷ص خلق...... ناخواندہ۔ دیکھ کر بادہ پرستوں کی دلی افسردگیاں=میکدے میں زدل افسردگی بادہ کشاں۔ برجاماندہ=ہرجاماندہ۔

۵/۱۴۸، ۱۵۷ص بس..... پوشیدہ۔ مے ہی (کذا)=مے ہے۔

۷/۱۴۹، ۱۵۸ص جوش...... مجھ سے حسن...... بیدل نہ پوچھ=نشہ ہاے۔ قطرہ سے میخانہ =قطرہ ہی میخانہ ہے۔ نشۂ محفل=کذا۔

۸۰/۱۵۰، ۱۵۸ص شکوہ.... کا سمجھ۔ ہرتپش=مرتپش۔ توڑ=طور۔ عناں گسل=عنا گسل۔ آینہ دار=آینہ وار۔ خفتہ ہوں=خفتہ ہو۔ نغمۂ بیداں=نغمہ بے دلی۔ گریہ کو ماجرا=گریۂ ماجرا۔

۷/۱۵۱، ۱۵۵ص ازمہر..... دل ہے آینہ۔ پرفشاں=پُرفشاں۔

۱۰/۱۵۲، ۱۵۹ص کلفت...... مدعا سمجھ۔ بے نیازرہ=بے نیازِرہ نشہ=کذا۔ نازرہ=نازِرہ۔

۱۰/۱۵۳، ۱۶۰ص دل ہی...... درباں اٹھائیے۔ دوکان=کذا۔

۱۰/۱۵۴، مسجد...... خرابات چاہیے۔ ایک اور شخص=اک اور شخص۔ ایک گونہ=اک گونہ۔ نشوونما الخ (قطعہ) کے بعد اشعار ذیل:

ہے رنگ الخ، سرپاے الخ (کھچیے۔ یہ کیجیے بھی پڑھا جا سکتا ہے=چاہیے)، یعنی الخ۔

۹/۱۵۵، ۱۶۲ص بساط...... خون وہ بھی۔ یک صید=اک صید۔ یک موج=اک موج۔ سونچا=سوچا۔

۷/۱۵۶، ۱۶۰ص ہے نرم..... لبوں سے۔ غصۂ کم فرصتی=وعدہ کم فرصتی۔

۷/۱۵۷، ۱۶۱ص گم...... اٹھانے کی۔ دو ہی طاقت=مری طاقت۔ بتاں=بتوں۔ آساں ہے=پنہاں ہے۔

۶/۱۵۸، ۲۰۷ص پھونکتا...... اسرافیل کی۔

۵/۱۵۹، ۲۰۸ص کیا..... کابلی سے لطف وجور=لطف جور۔

۸/۱۶۰، ۱۶۳ص حاصل...... خرامی۔ سے فراغت = سے بھی فراغت۔

۱/۱۶۱، ۲۰۸ص نگاہ...... ناتوانائی۔ دسترد = دسترد۔ بیدمان = بیدماغان۔ محوناز = عرض ناز۔

۹/۱۶۲، ۱۶۳ص کیا تنگ ...... جہان ہے۔ بوسا = بوسہ۔ دتی = دہلی۔ حال انکہ = حالاں کہ۔ غمی (کذا) = غم سے۔

۱۲/۱۶۳، ۱۶۴ص درد...... بے قراری ہائے ہائے۔ محبت مل گئی = محبت مل گئے۔ اٹھالیتا = اٹھالیتے۔

۷/۱۶۴، ۱۶۵ص سرگشتگی...... یاس ہے۔ تر (کذا) = تپ۔ غرورحسن = غرورِ حُسن۔ ہر یک = ہراک۔

۸/۱۶۵، ۱۶۶ص گر خاموشی ...... حال ہے = خامشی۔ سمجھنی = سمجھنا۔ خرج = خرچ۔ آجائیو کہیں = آجائیو اسد۔ شوق = ذوق۔ دردکہ = دردکر۔

۷/۱۶۶، ۱۶۶ص نظر...... ادبی ہے۔ میں کس کی یہ = میں کس کے یہ۔ جنون یاس = جنون ویاس۔

۹/۱۶۷، ۲۱۰ص بزم...... نور ہے۔ بسکہ چشم الخ ش میں نہیں۔ افتادگی = افتادگی ہی۔ نشہ (کذا) بیماری = نشہ پیمائی۔ پاسباں معذور = پاسباں مجبور۔ والی سے ہے تکلیف سے ہے وہاں تکلیف۔ اوس = اس جگہ۔

۱۱/۱۶۸، ۱۸۶ص بس کہ...... زنہار ہے۔ جلوۂ رخسار = صافی رخسار۔ شوریدہ ذوق = شوریدہ ناز۔ جوش سودا کب حریف = یکطرف سوداو یکسو۔ یاں تک حسرت = اس کو حسرت۔

۱۱/۱۶۹، ۱۸۷ص تغافل...... پیدا ہے۔ ب میں اس زمین کی ۳ غزلیں ہیں اور ش میں ۲۔ غزل ۱۶۹ کا مطلع بالا اور اشعار ذیل غزل ا میں ہیں: تصرف وحشیوں الخ (لیلا = لیلیٰ) محبت طرز پیوند الخ، کیا یکسر الخ (نیاز = بناز)، اشعار ذیل غزل ۲ (۱۸۸ص) میں ہیں: اثر سوز الخ، تصور بہر الخ (طپیدن = کذا)، مجھے شبہائے الخ، ترے نوکر الخ، بسعی غیر الخ، شعر ذیل خزاں کیا الخ (۱۸۹ص) حب میں ہے۔

۵/۱۷۰، ۲۱۵ص بے خود ...... بے تاب ہوگئی۔ کھلی جلوہ = ہوئی جلوہ۔

۱۷۱/۱۱، ۱۸۹ص نیرم...... تکلیف بے جا ہے۔ یہ مطلع اور اشعار ذیل غزل ۳ میں ہیں: نہ لائی الخ (افسوس ملنا = افسوس سودن)، نشاط دیدہ الخ (روے برروے = بوسہ روے)، نہ سووے الخ، بسختی ہاے الخ (بھی صید = در بند)، نگہ معمار الخ (بکلف = کفِ)، اسد یاس الخ (آبیار ہر تمنا = آبیار آرزو)۔ اشعار ذیل دوسری غزل میں ہیں: نہاں الخ، عزیز و الخ، اشعار ذیل حب میں ہیں: مری ہستی الخ، وفاے دلبراں الخ۔

۱۷۲/۱۰، عشق...... وحشت ہی سہی، چھیڑ خوباں سے = یار سے چھیڑ۔

۱۷۳/۹، ۱۶۷ص رفتار ...... اضطراب ہے۔ بھاگتے گوں = بھاگنے کی گوں۔ جادادہ = جاداو۔

۱۷۴/۱۳، ۱۶۸ص ہے...... بجا مجھے۔ یہ پردۂ = یہ پردۂ۔ کسو پہ = کسی پہ۔

۱۷۵/۱۰، دیکھنا...... آجائے ہے۔ ٹہرا = ٹھہرا۔ اوتنا = اتنا۔

۱۷۶/۲، ۲۱۱ص اے...... آشامی تری۔

۱۷۷/۷، گرم...... نہالی نے مجھے۔ نسیہ = نسیۂ۔

۱۷۸/۷، ۲۲۶، فرصت...... آرائی ہے۔ ہر رنگ جنوں = ہر رنگ تپش۔ ماہتابی بکفِ = گل مہتاب (بکفِ)۔ ب کے مقطع: باغ خاموشی الخ کی جگہ اگ رہا ہے الخ (سے سبزہ = پہ سبزہ) جو ب میں نہیں، لیکن ن میں ہے۔

۱۷۹/۹، ۳۱۲ص ربط...... صدا ہے۔ بندا = بندہ۔

۱۸۰/۵، ۲۱۷ص خدایا ...... لقب کاٹے۔ میں نے = کذا۔

۱۸۱/۹، ۲۱۲ص گر...... فضا ہے۔ یک با = یک نام۔

۱۸۲/۷، ۲۰۰ص داغ ...... بدنداں ہے۔ عشق کار = کارِ عشق۔ ہرزہ گرد ہے = ہرزہ گردی۔ رنداں = زنداں۔ وحشت انجمن ہے گل دیکھ لالے کا عالم = گل بکوہ از لالہ بزم ساز بے تابی۔ مجمر کے = مجمر ہا۔ بے گہر صدف۔ از گہر صدف۔

۱۸۳/۱۴، پھر...... بے قراری ہے۔ چشم دلال (قطعہ) وو ہی صد = وہی صد۔ سررشتہ = سررشتہ۔ بے قراری کا حکم = اشکباری کا حکم۔

۱۸۴/۸، ۲۱۶ص ہر رنگ......ساز ہے مجھے۔

۱۸۵/۹، ۱۶۹ص کہوں ...... شعلہ رویاں کی۔ گر جاوے = گر جائے، کیوں کہ (کیونکے)=کذا۔

۱۸۶/۷، ۱۷۰ص جنوں......گوشادمانی کی=گر۔کماں ہم=کہاں ہم۔

۱۸۷/۸، ۱۷۱ص نکوہش......دلبر کی۔بجز دیوانگی الخ ش میں نہیں۔نشۂ=نشہ۔جایا=جانا۔

۱۸۸/۵، ۲۱۶ص نگاہ ناز......شرارت کی=یار۔آشنا ہووے=آشنا ہوے۔تپ=تب۔ یہ نبض=کیا نبض۔

۱۸۹/۷، ۲۱۳ص ضبط......گیر ہے۔ہر نہال شمع میں اک=از نہال شمع پیدا۔نکیین=مکین۔

۱۹۰/۶، ۲۱۸ص خبر......عدو جانے۔بکسوت=نہ کسوت۔زباں سے عرض الخ ش میں نہیں۔

۱۹۱/۷، ۲۱۴ص ذوق خودداری......تسخیر ہے=بے پروا۔پرواز عرض=عرض سواد۔غافل از=غفلت۔

۱۹۲/۷، ۲۱۹ص دیکھ......رام ہے۔بخشے=بخشی۔

۱۹۳/۵، ۲۴۱ص سوختگاں......داغ ہے۔نار=ناز۔وائے=عذر۔

۱۹۴/۱۰، بے اعتدالیوں ......ہم ہوئے۔آپ ہم اپنی......آپ ہی اپنی۔وہم سے=بیم سے۔او تنے=اتنے۔

۱۹۵/۸، ۱۷۸ص نشۂ مے......کشتہ ہے۔داغ ربط ہم=داغ ہم دیگر۔

۱۹۶ص، ۲۲۱ص صبح......شام ہے۔بسکہ ہے......بسکہ ہیں۔محو کیں=صرف کیں۔

۱۹۷/۸، ۱۸۴ص چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے = مے فروش نشہ زار ناز۔تو کہوے کہ=گویا موج۔عشاق ساز=عشاق سارا۔ بال و پر = بال پر۔ خار خار خاطر= خار و پیراہن۔نغمہ ہے کانوں میں اس کے نالۂ مرغ اسیر=نالۂ دل نغمہ ریزاں ہے بمضراب خیال۔غیر از وحشت مجنوں نہیں=کو جز وحشت مجنوں اسد۔لیلی معنی اسد=بسکہ لیلائے سخن۔

۱۹۸/۷، ۱۷۲ص آ......قرار نہیں ہے۔تیری بزم=تری بزم۔کیا ہے عہد تو=عہد تو کیا ہے۔

۱۹۹/۵، ۲۱۷ص ہوا......سادہ آتا ہے۔گذشتن=گزشتن۔ہریک=ہراک۔

۵/۲۰۰، ۲۱۸ص بفکر ... زانو ہے۔ کوشوں = کوشاں۔ لاوے = لائے۔

۷/۲۰۱، ۱۷۲ص ہجوم...... حاصل ہے۔ غنچۂ گل = غنچۂ دل۔

۱۱/۲۰۲، ۱۷۴ص ہم زباں...... تو مجھے۔ ب میں اس زمین کی دو غزلیں، دوسری ۱۷۵ص میں ہے۔ اس مطلع کے علاوہ اشعار ذیل: یاد الخ، خاک الخ، اضطراب الخ، چاہیے الخ (ناز = یار)، کثرت الخ (عاقبت = غالب) پہلی غزل، اور اشعار ذیل دوسری میں ہیں: باعث الخ (سرد یا = کردیا)، پابدامن الخ، دیکھنا الخ، ہوں سراپا الخ، ساز الخ۔

۷/۲۰۳، ۱۷۵ص نہ ہوئی...... تسلی نہ سہی۔ لگا لو یعنی = لگائے ہی بنی۔

۶/۲۰۴، ۱۷۶ص دل...... نہالی ہے۔ تار جادہ = تار جادۂ۔ اوٹھنا = اٹھنا۔

۷/۲۰۵، عجب...... ہم آگے۔ پانو = پاؤں۔

۷/۲۰۶، ۱۷۷ص تغافل...... عالی ہے۔ عجز نالی = عجز مالی۔ سیہ مستی = سیہ مستی ہے۔

۱۱/۲۰۷، ۱۷۳ص تشنۂ...... پانی مانگے۔ برنگ سے گل نے = رنگ نے گل سے۔ خط ہے = خط سے۔ پرداز (؟) = پرواز۔

۶/۲۰۸، ۲۱۹ص کاوش...... افسوں ہے مجھے۔ نعل = لعل۔ واشگفتن = در شگفتن۔ دیکھ لی = دیکھ لے۔

۶/۲۰۹، ۱۷۹ص گلشن...... خوش آئی ہے۔

۷/۲۱۰، جس زخم...... تدبیر رفو کی۔ صاحب = یاں تو۔ صد حیف الخ (قطعہ) کے بعد دشنے الخ۔

۷/۲۱۱، ۱۸۰ص یوں ... گردبار کے۔ رہتے ہیں ہم = رہتے ہم۔

۸/۲۱۲، ۲۴۰ص اگر...... جوشیدنی جانے۔ بہار اُس = بہارِ اس۔ زندہ دار = زندہ وار۔ پیچک میں = در پیچک۔ مسی کہ (مستیکہ ؟) = شوقیکہ۔ تماشا ہے = تماشاے۔

۷/۲۱۳، ۱۸۳ص عاشق ...... جانا نہ چاہیے۔ مل جائے گا بوسے = مل ہی جائے گا بوسہ۔ گذر گئے = گزر گئے۔ جادو = جادہ۔

۱۱/۲۱۴، چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے = اچھوں۔ اودھر = ادھر۔ چاہتے ہیں الخ۔ (قطعہ) اس شعر کے بعد غافل الخ۔

۷/۲۱۵، ۱۸۵ص خواب جمعیت مجمل ہے پریشاں مجھ سے =محمل۔ چشمک =حسمک۔

۹/۲۱۶، ۲۲۴ص جوہر...... بدل آسودہ ہے۔ یکسر = چندیں۔ پنبۂ مینائے مے =پنبۂ مینائی ہی۔

۹/۲۱۷، ۱۸۵ص ہر قدم دوری...... نمایاں مجھ سے۔ بہتر =خوشتر۔ دود کی طرح = درد کی طرح۔

۸/۲۱۸، اے خوشا...... وا کرے۔ حلقۂ گرداب =صفحۂ گرداب۔ گو بر سا = گو بر سا۔ یک خم = یک قلم۔

۷/۲۱۹، ۱۸۴ص چاک...... بعریانی کرے۔ صبح کے =صبح کی۔ پاوے = پائے۔ کہ گر کیجیے =اگر کیجیے۔ دل مایوس = دل نومید۔

۸/۲۲۰، وہ آکے...... اضطراب تو دے۔ پانو = پاؤں۔ ذرا = زرا۔

۹/۲۲۱، ۲۲۳ص عذار...... گریاں ہے۔ ہجوم ضبط فغاں سے مری زباں خموش = زباں بکام خموشاں زفرط تلخی ضبط۔ بستہ (کذا) = پستہ۔ فزا ہے = فزاے۔ کہ بخیہ جلوۂ آثار (آثار مشکوک) =نشان برش شمشیر۔ غنچۂ خاطر =غنچۂ دلہا۔ اسد جہاں کہ علی الخ کی جگہ ش میں دوسرا مقطع ''اسد کو زیست الخ''

۷/۲۲۲، ۱۸۹ص عیادت...... بازار بستر ہے۔ نور چشم واماندہا =نور العین واماندہا۔ اضطرار = اضطراب۔ شام تنہائی = وحشت شبہا۔ بذوق الخ اور ن کا مقطع کہوں کیا الخ ش میں نہیں۔

۵/۲۲۳، ۱۹۰ص خطر...... گردن نہ ہو جاوے = ہو جائے۔ سوزن سے (سے؟) =سوزن ہے۔ دوری = دوزی۔

۶/۲۲۴، ۲۲۷، نوائے...... بیتاب ہو جاوے۔ دخل تصرف کر = اعجاز پیدا کر۔ عشق = عجز۔ آب گل = آب وگل۔

۹/۲۲۵ فریاد...... لے نہیں ہے۔ سی = سی تو۔ غم نہ رہوے =غم نہ ہووے۔

۷/۲۲۶، ۲۲۲ص بہار...... ماتم ہے۔ درہم = برہم۔ ن کے اشعار نہ پوچھ الخ (اوس = اِس) اور بہت دنوں الخ ۲۲۶ میں ہیں۔

۸/۲۲۷، ۲۲۳ص شفق...... رنگیں ہے۔ برنگ پرتو خور = سے پرتو خورشید۔ ۲۲۳ص کی غزل کے علاوہ ۲۲۷ میں اشعار ذیل: کبھی تو اس سر شوریدہ الخ اور اسد ہے نزع میں الخ ش میں ہیں۔

۷/۲۲۸،۱۹۱ص دل سراپا وقف سودائے نگاہ تیز ہے۔ وہ مژ برآہ رو بانیدن از دل۔ مست تغافل = محو تغافل۔ ان ستم کیشوں الخ ش میں نہیں۔ اوس کافر = اِس کافر۔

۸/۲۲۹، ۲۲۷ص تا چند ... بت خانہ کھینچے۔ کرتے ہوئے تصویر یار آئے ہے حیا = خود نامہ بن کے جایئے اس آشنا کے پاس (وہ شعر جس کا یہ مصرع اہے، ب کی اس غزل میں ۃ ے جو ''تا چند...... بت خانہ کھینچے'' کے بعد ہے۔) ش کی غزل ۲۳۰...... پرواز آشیانہ الخ ۲۲۹ میں نہیں، ۲۳۰ میں ہے۔

۸/۲۳۰، ۲۲۸ص داماں...... تماشہ نہ کھینچے۔ نشہ = نشۂ۔ غبار چشم = غبار راہ۔

۹/۲۳۱، ۱۹۲ص تر...... سامانی مجھے۔ محال = مجال۔ جوش پر افشانی = جوش پریشانی۔ ۲۳۱ کے دو شعر ''کیوں نہ الخ'' (صید = محو) اور ''میرے غم خانے الخ'' ن کی غزل: ''دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے'' میں ہیں جو ب سے غیر حاضر ہے۔

۸/۲۳۲، ۱۹۴ص یاد...... یارب مجھے۔

۸/۲۳۳، کبھی نیکی...... آجائے ہے مجھ سے۔ کھچنا = کھنچنا۔ کب یہ فتنہ = کب یہ ظلم۔ ٹھہرا = ٹھہرا۔ داستان شوق = داستان عشق۔

۶/۲۳۴، ۲۲۹ص مژہ... جلوۂ ادراک باقی ہے۔ شست وشوے = شت وشوے۔ خندہ یعنی = عقدہ یعنی۔ تمنا ہوگئی = کذا۔

۷/۲۳۵، ۲۲۹ بس کہ... وحشتناک ہے۔ صید انداز = ناز یک صید۔ فتراک بیتابی = آشفتہ فتراکی۔

۵/۲۳۶، ۱۹۵ص ازبسکہ . علامت ہے۔ بہ پیچ = یہ پیچ۔ کیوں کہ = کذا۔ ورطۂ سلامت = ورطۂ ملامت۔ بجانوں = نہ جانوں۔ کیوں کہ = کذا۔

۱۱/۲۳۷، ۲۳۰ص شکل... بنایا ہے مجھے۔ رنگ دکھایا = چشم دکھایا۔ سم (کذا) = ستم۔ کانٹوں سے = کانٹوں میں۔

۷/۲۳۸، رونے سے... بے باک ہوگئے۔ اسباب = آلات۔ پوچھے ہے کیا وجود الخ ش میں نہیں گلا = گلہ۔

۸/۲۳۹، ۱۹۶ص شوخی...... آبیار نغمہ ہے۔ وہاں = واں۔

۷/۲۴۰، ۱۹۷ص خود فروشی ہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے۔ ہر شکست = تا شکست۔ دل میں = دل ہا۔ عرض ناز شوخی دنداں = شوخی اظہار دندانہار ہے عدم میں غنچہ محو عبرت = ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کش۔ شورش باطن = سوزش باطن۔

۵/۲۴۱، ۱۹۷ص حسن...... متاع جلوہ ہے۔

۹/۲۴۲، ۱۱۸ص جب تک...... پیدا کرے کوئی۔ جوں درد میرے = ہاں درد بن کے۔ لیلا (قافیہ، دوسری جگہ قافیہ نہیں، تو لیلیٰ) = کذا۔

۸/۲۴۳، ۲۳۱ص جنوں...... <u>تدبیر</u> بہتر ہے = زنجیر۔ دلبستگی = دلتنگی۔ تدبیر غفلت = تدبیر و غفل۔ خود آرائے = خود آرائی۔ تمنا ہے اسد = تمنا ہے اسد۔

۹/۲۴۴، ۱۹۹ص، وحشت...... انشا کرے کوئی۔

۸/۲۴۵، ۱۹۹ص باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے <u>مجھے</u>۔ ب کا باغ تجھ بن الخ اور ن کا زندگی میں الخ ۲۴۵ میں نہیں۔

۶/۲۴۶، ۲۰۰ص کوہ...... صدا ہو جائیے۔ پر پ ہے = پر ہے یہ۔ کر (کذا) ہمہ = گر ہمہ۔

۶/۲۴۷، ۲۳۲ص گریہ سرشاری <u>شوق بیاباں</u> زدہ ہے = شوقے بہ بیاباں۔ دل بر = دلے بر۔

۷/۲۴۸، ۲۳۲ص خواب...... نظر پنہاں ہے۔ بیضہ مژہ سے = بیضۂ مژگاں۔

۶/۲۴۹، ۲۳۳ص مستی...... ہلاک ہے۔

۹/۲۵۰، ۲۰۲ص غم...... آئیں ہے۔ کردگاں لبریز = کردگانِ عشق۔ رسوائے آئیں = رسوائے آئیں۔ عقد = عقدہ۔ کی خواب = کا خواب۔ پسینا = پسینہ۔

۱۷/۲۵۱، مدت...... یہاں کیے ہوئے۔ بھر رہا ہوں = بھر رہا ہے۔ نالہ ہائے = نالہائے۔ ڈھونڈھے (کذا) پھر کسو = مانگے ہے پھر کسی۔ مانگے ہے پھر کسو = چاہے ہے پھر کسی۔ ناز کو چاہیے = ناز کو تاکے۔ ش میں جی الخ پھر دل میں الخ سے قبل ہے پہ کسو = پہ کسی۔

۶/۲۵۲،۲۰۲ص دیکھتا...... آمادہ ہے۔ کھینچے ہے انگلی = رکھتا ہے انگلی۔

۷/۲۵۳،۲۳۳، نظر پرستی ..... خود آرائی = وخود آرائی۔ گذشتن = گزشتن۔

۷/۲۵۴،۲۳۴ص کوشش...... شکنی ہے۔ پامرد = پامزد۔ بے نگہی = بے نگہی۔

۵/۲۵۵، ۲۳۵ص کاشانہ ...... بداند اختنی ہے۔ اور وہاں = چارہ گر۔ حوصلہ پرداز = حوصلہ ادگار۔ تماشائے = بتماشائے۔

۲/۲۵۶ گلستاں...... مضمون ہے۔ عدم الخ ش میں نہیں۔ ایجاد = ایجاء۔ ہجوم گریہ = رجوع گریہ۔

۹/۲۵۷،۲۰۳ص منت. .....اختیار ہے۔ بہ آب = پرآب۔ ۲۵۶ میں ب کی اس زمین کی دوسری غزل (۲۰۴ص) کے دوشعر: دل مدعی الخ اور پیچ الخ شامل ہیں۔

۹/۲۵۸، ۲۳۶ص گدائے طاقت...... زباں تجھ سے۔ اسد طلسم قفس میں رہے قیامت ہے = اسد بموسم گل در طلسم کنج قفس۔

۹/۲۵۹،۲۰۳ص جی جا. ...زلف یار ہے۔ گذر = گزر۔

۷/۲۶۰، ۲۳۷ص حکم......آرمیدن منع ہے۔ طوفان بہا = طوفان ہے۔

۲/۲۶۱، ۲۳۸ص چارسوے...... صاحبدکانی مفت ہے۔ جو سمجھیں = جو کہویں۔ دست دیالی (کذا) = دست و پائے۔ نقد الخ ش میں نہیں۔

۷/۲۶۲، ۲۳۷ص قتل...... تدبیر آوے...... اُس بیاباں = اِس بیاباں۔ بعیر (کذا) = تعمری۔ بعریانی زخم = بعریانی داغ۔ ن کا شعر ہوں میں بھی تماشائی الخ بھی ش میں ہے۔

۲/۲۶۴،۲۰۴ص خموشیوں......ادا نکلتی ہے۔ ہوتی ہے شبنم = آتی ہے شبنم۔

۷/۲۶۵، ۲۳۹ص بیتابی...... تسلی ہے۔ غافل = موج۔ کردن ہمہ = گردن ہمہ۔ گیراں = گیری۔

۱۰/۲۶۶، ۱۸۰ص بنقص ظاہری...... پنہاں ہے۔ سواد سنگستاں = سواد سنبلستاں۔ حجاب ناز = حجاب یار۔ ہوئی یہ کثرت غم سے تلف = اسد یہ فرط غم نے کی تلف۔ اس زمین میں ب میں ۳ غزلیں۔ ۲۶۶ میں دوسری غزل کے اشعار: غبار دشت الخ۔ زبس دوش الخ اور اسد بد الخ موجود

ہیں اور غزل ۳ کا شعر ذیل میں بھی ہے: رہا بے قدر الخ (۱۸۲ص)۔

۱۰/ ۲۶۷، ۲۰۵ص آئینہ...... تماشا کہیں جسے۔

۸/ ۲۶۸، ۱۸۱ص تمام اجزاے عالم صید دام چشم گریاں ہے = جہاں زندان موحستان دلہاے پریشاں۔ صاحبدلاں = صاحبداں۔ نقطے میں = دو نقطہ۔ ب کی غزل ۳ کے اشعار: ہجوم نالہ الخ، کجاے الخ، تکلف ساز الخ، تماشا سرخوش الخ، تکلف برطرف الخ اور ن کا شعر دل و دیں الخ ۲۶۸ میں ہے۔

قصیدہ ۳۰۲ص جوش تمنا = دردو دو عالم۔ نشہ = کذا۔ ۳۰۳ص ستایش = ستائش۔ پریشاں ہے = پریشاں ہیں۔ اوٹھے = اٹھے۔ یا پیانہ = پاس پیانہ۔ نقش نمکیں = نقش تمکیں۔ پر پروانہ = پر پرواز ۳۰۴ص ہرصبح = ہمہ صبح۔ جلوہ تحریر الخ (۳۰۵ص) نسبت الخ سے ش میں قبل ہے۔ ۳۰۵ص اس کی گلچیں = اس کے گلچیں۔ دامن زیں = دامن دیں۔ بجیر تکدۂ = بحر تکدۂ۔ بادشہا = کذا۔ پذیر = کذا ۳۰۶ص آستاں پر تیرے = آستاں پر ترے۔ در کے کئی = در کے لیے۔ آرایش = آرائش۔ شہپر = دبیر۔ جہاں تک چلے = جہاں تک چکے۔ توحید قضا = توحید فضا۔ گل و لالۂ = گل و سنبل۔

۴) ذیل کی ۸ غزلیں ح ش و ن میں ہیں، مگر ب میں نہیں:

۱۲/ ۱، ستایش ...... رضواں کا بعنوان ''از باندہ فرستادند'' ورق ۳ ب و ۴ الف۔ کھودنے پر گھاس (کذا) کے ہے = گھاس کے ہے کھودنے پر۔ سوتے = سوئے۔

۱۳/ ۲ ہوس = کیا کیا، ورق ۹ الف۔ فایدا = مدعا۔ شعلۂ خس = شعلۂ حسن۔ قیمت دل = شیشۂ دل۔ کیا کس نے الخ (قطعہ)۔

۱۱/ ۳ آبرو ...... کہ گلشن میں نہیں بعنوان ''از باندہ رسید'' ورق ۴۳ لف۔ کہ گلشن سے جو گلشن۔ جوں خوں کہ = جوخوں کہ۔ موجۂ صہبا کی = موج مے کی آج۔ ناتوانی کی نمود = ناتوانی کی نمو۔ درد سے خالی = درد سے فارغ۔

۱۰/ ۴، ذکر...... منظور نہیں ورق ۴۳ الف و ب۔

۸/ ۵، نالہ...... ایجاد نہیں ورق ۴۳ ب۔ ن کے دو شعر سید الخ ش میں نہیں۔ دلتنگی زنداں = بے مہری یاراں۔ اوستاد = استاد (یہی چاہیے)۔ رہگذر = کذا۔ کرتی ہے اثبات = کذا۔

۱۲/ ۶، واں...... پے ہم ہے ہم کو ورق ۶۱ الف۔ بولا = بولے۔ ناچار = کذا۔ کھلتا غالب = کھلتا یعنی۔ مقطع الخ ش میں نہیں۔ لیے جاتی ہے الخ کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۳/ ۷، ظلمت...... جوش ہے ورق ۶۱ الف۔ اے شوق ہاں = اے شوق یاں۔ سرور وسور = سرور وشور۔ تسلیم و (ومشکوک) = تسلیم۔ لطف خرام الخ ش میں نہیں۔

۸/ ۸ کب سنے ہے وہ کہانی میری ورق ۶۱ الف و ب۔ سنے ہے وہ = وہ سنتا ہے۔ خونابہ = خوں نابہ۔

۵...... ش کا مجہول الاسم کاتب کچھ باتوں میں (سہو سے قطع نظر) پابند قاعدہ معلوم ہوتا ہے، اور کچھ میں نہیں:

(۱) الف مضموم ابتدا میں ہو تو اظہار ضمہ کے لیے ہر جگہ و، مگر غزل ۲۵۲ میں انگلی بدون و۔

(۲) دھبا غزل ۱۱۰ میں دھبہ، مگر فارسی عربی کے کچھ الفاظ جو یائے مختفی سے لکھے جاتے ہیں، یا تو التزاماً الف سے ہیں، یا کبھی ہ اور کبھی الف سے = پردا ۹۱ (پردہ ۱۱۲)، ارادا ۲۵۱، مزا ۹۳، نقشا حش ۱، گلا ۲۳۸، بندا ۱۷۹، بوسا ۱۶۲ (بوسہ ۲۲۰)، شیوا ۱۱۰، ذرا (دراصل ذرہ) ۲۲۰۔ واضح رہے کہ (۲) یا (۳) میں الفاظ کی اس شکل سے بحث نہیں، جو تراکیب فارسی میں ہے، یا قافیہ ہونے کی صورت میں ہے۔

(۳) ہیولیٰ (حش ۱) ہر جگہ ہیولا ہے، اور قویٰ جو صرف ایک جگہ آیا ہے قوا ہے ۱۰۸، لیکن اعمی ۱۷۹ (ی پر الف نہیں)، اور دعوی ۴۰ (ی پر الف نہیں)، ملتے ہیں۔

(۴) بہ تنگی ۳، تا بہ کے ۲۲۵ (تا بکے ۲۲۵)، بہ کیفیت ۲۶۳، بامید ۱۶، بآغوش ۲۰۷، بیزم ۱۷۱...... پادشاہی ۱۴۶، بادشہ قصیدہ ورق ۱۴۔

(۵) ٹ دو طرح ملتی ہے: ت ط ۸، ۱۴، ت ۳۳، ۳۸۔

(۶) فارسی میں جو الفاظ اب بھی ذ سے لکھے جاتے ہیں، وہ باستثنائے تذرو (تذرو ۱۷۳) ذ سے ہیں۔ ذرا اور دہ گزارش (۵) بھی جوز سے ہے ذ سے مرقوم ہیں۔

(۷) ش میں طپیدن ۳۷، غلطیدن ۴ اور طشت ۵۳ ہیں، لیکن مقدم الذکر کا حاصل

مصدر تپش التزامات سے ہے۔

(۸) کاتب نے ک فارسی و عربی میں فرق نہیں کیا

(۹) پنو چھا، کلام، لنکا ۳، ندی ۱۱، مہوا ۱۵، غیر ے ۶۶، کچھ ۱۵۴، گلہ نہ ہوا ۱۵، نہ دبا ۱۵، نہ بھولا ۲۰، ۵ بخشی بھی ہیں۔

(۱۰) دھنواں ۶۵، دھنوے سے ۸۵، یو ہیں ۱۰۵، مانگے (مانگیں) ۹۳، باندھے (باندھیں) ۹۳، سونچ ۱۵۵، مینے ۱۳۹ (میں نے)، گھاس ، پانو ۲۲۰۔

(۱۱) خورشید ۹۹، دوکان آتش باز ۱۰، عموماً پیچتاب مگر ایک جگہ پیچ وتاب ۲۳۶، مجھیو ۲۰۱، رہیو ۱۱۱، ستاو ۱۶۲، وو ہی ۱۸۳، وہ ۱۶۹۔

(۱۲) ٹہرا ۲۳۲، کیوں کہ ۱۳۹ (کیونکے)، تجسے ۲۴۳، تجکو ۲۲۱، مجکو ۲۲۱، تجھسا ۲۶۷، تجھسے ۲۱۷، یہاں (یاں) ۷۷، وہاں (واں) ۱۲۲، ساتھ (سات) ۹۴، تڑپھنا ۳۳، ڈھونڈھنا ۲۵۱، ٹھنڈ ۱۶۲۱۔

(۱۳) رتبہ میں ۵۶، اے شعلہ ۸۸، نشہ (کذا) کے ۵۴ بمیر دے میں ۱۳، کارخانے سے ۱۱، زمانے نے حش ا، معاملے میں ۴۰، ریختے کا ۱۱۱۔

(۱۴) نگہہ ۲۹، تہہ ۱۰۶، جولانگہہ ۱۵، یہہ ۱۸، کہہ ۲۴، توجہ ۴۷، گنہ ۳۸، نگہہ ۳۹، یہ ۵۸، تہ ۱۷۱۔

(۱۵) شعلہ ہا ۱۰۶، خندہ ہا ۹۸، میخانہ ہا ۶۱، غمزہ ہا ۹۲، جلوہ ہا ۱۹۸، نامہ ہا ۱۲۰، عقدہ ہا ۱۲۵ (عقد ہا ۸۱)، مژہ ہا ۲۱، نالہ ہا ۲۷، بخیہ ہا ۱۳۴، آئینہ ہا ۱۴۴، اندیشہ ہا ۹۷، نسخہ ہا ۱۴، پارہ ہا ۶۸۔

(۱۶) موے آتشدیدہ ا، مژہ ہاے دراز ۲۱، ایسی ترکیبوں میں ی پر ہمزہ نہیں۔

(۱۷) جوے شیر ا، نور ہاے راز ۲۱، اس قسم کی ترکیبوں میں عموماً ی پر ہمزہ نہیں لیکن سودائے انتظار ۶۶، پائے پارہ ۱۱۵، جلوہ ہائے معانی ۱۹۸، بہائے نے ۲۳۸، جویائے خس ۲۰۱، حنائے کف ۲۲۷، سوئے دل ۲۵۶، موجود ہیں۔

(۱۸) نازکی وحشت ۲۵۳، فسردگی انتظار ۲۴۹، دعوی تمکین ۲۵۳، درازی رگ ۲۲۷،

نازکی طبع ۲۲۶، پئے مژہ ۲۰۷، مئے ذات ۱۵۴، پے خامہ ۲۰۷، مے عشرت ۱۵۵۔

(۱۹) دیے قصیدہ ورق ۱۰۹، لیے ایضاً ڈالیے ۲۶۷، چاہیے ۲۵۷، ہوئے ۲۵، کھینچیے ۲۳۰، ڈریے ۱۱۳، کھیچیے ۲۲۹، ہوے ۲۰۵، چاہیے ۲۰۲، آئے ۱۵۶۔

(۲۰) زشتی و نیکی ۱۳۱، لالہ وگل ۲۳۷، آئینہ واقلیم ۲۶۶، میں وادری بدون ہمزہ۔

(۲۱) نکتہ سرائی طبع ۱۰۸، تشدید و ہمزہ کے ساتھ، مگر تختی را، ۴۸ ان کے بغیر۔

(۲۲) بوریئے ۱۸۶، شئے ۲۲۵، پایدار ۱۶۳، پایمال ۹۶، نشۂ ۱۴۹ (مگر نشہ بدون ہمزہ) ۱۰۱، ۱۴۹، ۱۵۲، ۱۶۷، جرات ۴۴، جرأت ۷۷، جاے کہ (جائیکہ) ۲۵۳، آرایش ۲۷، آسایش ۱۰۲ (حاصل مصدر بدون ہمزہ)، مۂ نو (ہمزہ غلط) ۱۱۲، نؤمیدی (ہمزہ غلط) ۱۱۱، مگر مہ اور نو کی صحیح شکلیں بھی۔

(۲۳) مایل ۹، سایل ۹ (سائل ۱۹۴)، حایل ۴۷، زایل ۲۵۶، لایق ۴۷، فایدہ ۲۲۹، مایدہ ۱۳، دایم ۱۰۴، مضایقہ ۱۰۸، طایر ۱۰۹، شقایق ۱۱۶، شمایل ۱۳۵، علایق ۲۰۰، کاینات ۱۶۲۔

(۲۴) ایک (اک) ۶۹، میرے (مرے) تیری (تری) ۲۶۷، دوالی ۱۲۹، جوں ۱۱۷۔

(۶) ش کا زمانۂ کتابت اس کتاب میں درج نہیں، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ اس میں کوئی چیز مأۃ سیزدہم کے عشرۂ چہارم کے نصف اول سے قبل کی لکھی ہوئی اور ۱۲۴۵ھ کے بعد کی نہ ہو۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ میرے پاس ہے مگر اس وقت پیشِ نظر نہیں، اس کے اور دوسرے قدیم نسخوں کے سنین طبع اور ان کے اشعار کی تعداد ماخوذ از دیباچہ نسخۂ مالک رام۔

۲۔ اس میں نگارستان سخن شامل ہے۔

۳۔ ''مطبوعہ'' کے تحت بعض اوقات ایسے اشعار بھی جو ب میں باختلاف موجود ہیں۔

۴۔ یہی تعداد جناب مالک رام کے مقدمۂ دیوان میں بھی ہے۔

۵۔ غزل کا پہلا مصرع مکمل یا نامکمل بجائے غزل۔

۶۔ یہ دونوں شعر ح میں ۲ جگہ۔

۷۔ ان میں مطلق اختلاف نہیں۔

۸۔ ممکن ہے کہ مرتب نے اس مقطع کے ساتھ سہواً ''مطبوعہ'' نہ لکھا ہو۔ اس غزل میں اس کے علاوہ بھی ایک مقطع ہے، اور پہلے مقطع کا مضمون اس غزل کے ایک اور شعر میں بھی بندھا ہے۔

۹۔ یہ شعر مشترک نہیں، مگر مرتب کے نزدیک یہ ہے: نہیں بند زلیخا بے تکلف ماہ کنعاں پر، سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر اے ص۔

۱۰۔ ایسے اشعار ب میں اور بھی ہیں، جو کبھی حوض اور کبھی حاشیہ ح میں درج ہیں۔

۱۱۔ کسی اور شخص نے اگر ش پر کچھ لکھا ہے تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ مگر اس کی مجھے خبر ہے کہ اس کے وجود سے غالب شناس واقف ہیں۔

۱۲۔ ہر حرف کی غزلوں پر ہندسے دیے ہوئے ہیں، دال کی آخری غزل کا شمار ۳ ہے۔

۱۳۔ ن میں دوسرا مصرعہ بجنسہٖ ہے اور پہلا یوں: لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب۔

(معاصر، حصہ ۱۲۔ پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء، ص ۱ تا ۴۷)

◆◆◆

ڈاکٹر گیان چند
ایم اے۔ ڈی فل حمیدیہ کالج، بھوپال

غالب اور بھوپال

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

مالک رام صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالب میں ایک نئی غزل شامل ہے جس کا مقطع چونکا دینے والا ہے:

پیرانہ سال غالبؔ مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

بھوپال میں غالبؔ کی آمد کا کوئی ثبوت نہیں۔ میں نے جناب مالک رام کو لکھا کہ یہ غزل الحاقی ہے لیکن وہ اپنے نو دریافت مایۂ عزیز کو گنوا دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ غزل غالب ہی کی ہے۔

حال میں اس غزل کا راز سربستہ وا ہوگیا۔ یہ غزل سب سے پہلے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ ''گوہر تعلیم'' بابت اپریل ۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس مذاق کے مصنف اسکول کے ہیڈ مولوی جناب محمد ابراہیم خلیلؔ تھے۔ ''اپریل فول'' کا عنوان دے کر نیچے نوٹ دیا تھا:

''ماخوذ از کتب خانہ نواب یار محمد خاں''

بوسیدہ اوراق میں غالب کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

وہاں سے لے کر اوائل ۳۸ء رسالہ ہمایوں نے اسے شائع کر دیا اور ہمایوں سے لے کر خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار منادی کی زینت بڑھائی اس طرح اس مذاق نے بڑے بڑے ادیبوں کو اپریل فول بنا دیا۔

آج کل خلیل صاحب ممبر مسلم وقف بورڈ ہیں۔ متشرع بزرگ ہیں اور علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے صاحب زادے ایم۔ اے اردو میں میرے شاگرد ہیں۔ ان کی زبانی یہ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ اسی روز ان صاحب زادے کے نکاح میں شرکت کے لیے موتی مسجد بھوپال میں جانا پڑا۔ وہاں خلیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اس واقعہ کی تصدیق چاہی۔ مسکرا کر اعتراف کر لیا۔ فرمایا کہ دیوانِ غالب میں اس غزل کو شامل دیکھ کر میں نے مالک رام صاحب کی خدمت میں تمام پوست کندہ حقیقت لکھ کر روانہ کر دی تھی۔

مالک رام صاحب نے سکوت ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

چوں کہ ایک اہل دیں بزرگوار خانہ خدا میں اس غزل کی تصنیف کا اقرار کر چکے ہیں اس لیے اس واقعہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

نسخۂ حمیدیہ کا مخطوطہ

نسخۂ حمیدیہ جس بیش بہا مخطوطے سے شائع ہوا ہے وہ اب ناپید ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور دوسرے کئی حضرات مجھ پر تقاضا کیا کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں تفتیش کروں۔ اس پوچھ گچھ کا نچوڑ یہ ہے۔

مفتی انوار الحق نے اس مخطوطے کو ایڈٹ کر کے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو دے دیا تھا۔ بجنوری نے اس پر اپنا معرکۃ الآراء مقدمہ لکھا اور انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مفتی انوار الحق نے ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے مخطوطہ طلب کیا لیکن اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس کے بجائے اس کی ایک خوش خط نقل ملی جس کو شائع کر دیا گیا۔

چند ماہ ہوئے میرے کالج کے شعبۂ اردو کے ایک لیکچرر نواب صاحب بھوپال سے ملے اور اس مخطوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ سابق بیگم بھوپال (نواب سلطان جہاں بیگم) نے جن کے عہد میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا ہے۔ کئی بار اس مخطوطے کو دیکھنے کی

خواہش کی لیکن وہ نہ دیکھ سکیں کیوں کہ اس وقت تک وہ مفقود ہو چکا تھا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت اس کا مخطوطہ ناپید تھا۔ مطبوعہ نسخے میں یہ بات ظاہر نہیں کی گئی۔ ورنہ اس کی وقعت باقی نہ رہتی۔

مفتی انوارالحق کی صاحب زادی ایم۔ اے اردو میں ہمارے کالج میں پڑھتی تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر دریافت کر کے یہی بتایا کہ مخطوطہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے یہاں گم ہوا۔

کچھ عرصہ ہوا پروفیسر سید احتشام حسین نے مجھے بتایا کہ انھوں نے لکھنؤ میں نسخۂ حمیدیہ کا ایک پرانا مطبوعہ نسخہ خریدا۔ یہ نسخہ مفتی انوارالحق کے صاحب زادے کی مِلک رہ چکا تھا۔ ان صاحب زادے نے اس پر ایک نوٹ لکھا ہے کہ نسخہ کا مخطوطہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری لے گئے تھے۔ ان کے انتقال پر نسخہ تو نہ ملا۔ لیکن یہ معلوم ہوا کہ اصل مخطوطہ مولوی عبدالحق لے گئے ہیں۔

راقم الحروف نے مولوی عبدالحق کی خدمت میں یہ سب لکھ کر بھیجا۔ وہ اس کی صداقت سے قطعاً انکار کرتے ہیں۔ انھیں اس نسخے کا کوئی علم نہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کے مخطوطے کا وجود ضرور تھا، سطور بالا میں جن خلیل صاحب کا ذکر کیا گیا ہے، وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ انھوں نے یہ مخطوطہ دیکھا تھا۔

(ششماہی ''اُردوے معلّٰی'' (غالب نمبر)۔ دہلی یونی ورسٹی۔ فروری ۱۹۶۰ء۔ ص ۹۲ تا ۹۴)

◆◆◆

وجاہت علی سندیلوی

نسخۂ حمیدیہ پر ایک نظر

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت یقیناً ہمارے ادب میں ایک گراں مایہ تاریخی اضافہ ہے جس سے غالب جیسے یگانہ روزگار کی ابتدائی جولانی طبع، پرواز تخیل اور تجرباتی شاعری کے نقوش اولیں ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اس سے یہ پتہ تو چلتا نہیں کہ انھوں نے کون سی غزل کب کہی تھی، لیکن مجموعی طور سے غالب کو واقعی غالب بننے میں کون سے ہمت شکن اور صبر آزما معرکے سر کرنا پڑے تھے اور ان کی اردو شاعری کو اپنے معراجِ کمال پر پہنچنے سے قبل کن ارتقائی منازل سے گزرنا پڑا تھا اس کا پس منظر بہت نمایاں طور سے واضح ہو جاتا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی کتابت کے وقت غالب کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کم عمری میں ان کا فارسی کے معتد بہ کلام کے علاوہ اردو میں تقریباً انیس سو اشعار کہہ ڈالنا ان کی غیر معمولی فطری ذہانت اور شاعرانہ استعداد کا ایک بین ثبوت ہے۔ وہ اس عمر میں اس قدر شہرت اور قبولیت عام بھی حاصل کر چکے تھے کہ ان کا کلام دہلی سے بھوپال جو اس زمانے میں ہفتوں کی دشوار گزار مسافت پر واقع تھا۔ ایک نادر تحفے کے طور پر پہنچایا گیا تھا۔

غالباً بہت سے لوگوں کو یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ ان معرکۃ الآراء غزلوں میں سے کہ جن پر متداول دیوان غالب کی موجودہ قدر و منزلت کی اساس قائم ہے ایک تہائی کے قریب غالب چوبیس سال کی عمر اور قریب نصف تیس سال کی عمر سے قبل ہی کہہ چکے تھے۔

اس سلسلے میں یہ تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غالب نے جب پہلے پہل ۱۸۲۳ء میں اپنا اردو دیوان مرتب کیا تھا تو اس میں اشعار کی کل تعداد ۱۰۷۰ تھی لیکن جب آٹھ سال بعد ۱۸۳۱ء

میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۰۹۵ ہو گئی تھی یعنی آٹھ سال میں صرف پچیس اشعار کا اضافہ ہوا تھا۔ دیوان کا دوسرا ایڈیشن چھ سال بعد ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ اس میں اشعار کی تعداد ۱۱۱۱ تھی یعنی چھ سال میں صرف سولہ اشعار کا اضافہ ہو سکا تھا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں چھپا جس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ تھی یعنی چودہ سال میں ۶۸۵ اشعار اور کہے گئے تھے چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں چھپا اس میں اشعار کی تعداد ۱۸۰۲ ہو گئی تھی، یعنی ایک سال میں صرف چھ اشعار اور دیوان میں شامل کیے گئے تھے پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھپا اس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۵ تھی کیوں کہ یہ تیسرے ایڈیشن کی نقل تھا اور ایک شعر کاتب کی غلطی سے چھوٹ گیا تھا۔ کسی شاعر کے شعر کہنے کی رفتار کسی آلے یا مشین سے نہیں ناپی جاسکتی اور محض قیاسات کی بنا پر قطعی طور پر کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ ایک معینہ زمانے میں اس نے کتنے شعر کہے ہوں گے اور غالب نے تو اپنے درمیانے زمانے میں فارسی کو اپنا کر اردو شاعری ترک کر دی تھی۔ تاہم اوپر دیے ہوئے اعداد و شمار سے جو تیس سال کی طویل مدت کا احاطہ کیے ہوئے ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب بہت پُر گو شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے بارہ یا پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور یقیناً اوائل عمر میں جبکہ ان کی بے فکری کا زمانہ تھا اور شعر و شاعری کا نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا انھوں نے مقابلتاً فکر و سخن بھی زیادہ کی ہوگی للہذا کسی قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۱ء میں ان کا جو مجموعہ کلام (نسخہ حمیدیہ) متدون ہوا تھا اور جس میں ۱۸۸۳، اشعار صرف غزل کے تھے وہ صرف دو چار سال کی مشق سخن کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کا بیشتر حصہ ان کا اس وقت کا کہا ہوگا کہ جب ان کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ یا سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی اور اس کم عمری میں بھی یقیناً وہ بہت سی ایسی غزلیں بھی کہہ چکے تھے جو بعد میں ان کے دیوان کے انتخاب میں شامل ہوئیں اور آج تک اردو ادب کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں اس طرح ایک جلیل القدر فنکار کی خصوصیات ان میں شروع ہی سے نمایاں تھیں:

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے
غافلاں! آغاز کار، آئینہ انجام ہے

اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ غالب کا جو کلام نسخۂ حمیدیہ میں پایا جاتا ہے اس سے بحیثیت مجموعی سلاست زبان، ندرت خیال اور طرزِ بیان میں ان کا وہ کلام بہتر ہے کہ جو انھوں نے ۱۸۲۱ء کے بعد کہا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کی ابتدائی ادبی

کاوشیں اپنے تخیل کی بے باکی، تشبیہات کی عجوبہ کاری اور موضوعات کی فراوانی کے باعث ایک بلند مرتبہ مفکر اور قادر الکلام شاعر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اور اس ابتدائی کلام کے خس وخاشاک میں بھی ایسے ایسے گلہائے بے خزاں چھپے ہوئے ہیں جو رشکِ بہار کہے جانے کے مستحق ہیں اس نومشقی کے کلام میں بھی غالب کا اپنا ایک مخصوص رنگ اور تجربہ ہے اور اگر چہ اس وقت انھیں زبان و بیان اور خیالات کے باہمی ربط پر وہ استادانہ قدرت حاصل نہ تھی جو بعد کو ان کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی تاہم ان کے کلام کے بلند حکیمانہ تیور اور خیال اور بیان کی مشکل پسندیاں اس بات کی صاف غمازی کرتی ہیں کہ اس شاعر کا طرزِ فکر اور زاویہ نگاہ عام شاعروں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے اور یہ کوئی پست یا ادنیٰ بات تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ مقلد نہیں موجد ہے۔ اس کی بے راہ روی میں بھی ایک قرینہ اور سلیقہ ہے۔ یہ راستے سے بھٹکا نہیں بلکہ اپنے لیے نئے راستے بنانے کی جستجو میں ہے۔ شاعری میں یا تو سرے سے اس کا کوئی مقام ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو صرف درجہ اول میں۔

ایک یہ خیال بہت عام ہے کہ غالب کا ابتدائی کلام نہ صرف حد درجہ مشکل اور مغلق تھا بلکہ زیادہ تر مہمل بھی تھا۔ بلاشبہ اس کلام کا معتد بہ حصہ فارسی ترکیبوں، پیچیدہ تشبیہوں غیر مانوس استعاروں اور خیالی مضمونوں کے باعث مشکل اور ایک حد تک مغلق بھی ہے لیکن اس کو مہمل ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ غالب نے کبھی کوئی شعر مہمل نہیں کہا۔ شروع شروع میں وہ بیدلؔ کے فارسی کلام سے بہت متاثر تھے اور اس طرزِ سخن کو اردو کے لیے ایک بالکل عجوبہ چیز سمجھ کر اپنی اردو شاعری میں ایک بالکل نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی فطری افتاد بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ عام پامال راستوں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی شاہراہ بنائیں لہٰذا اپنے بے پناہ تخیل، جودتِ طبع اور استعدادِ شعری کا سہارا لے کر انھوں نے محض خیالات اور تصورات کی دنیا میں اپنی شاعری شروع کردی تھی۔ اس میں خیالات میں ضبط و نظم کم اور ذہنی اور لفظی بازی گری زیادہ تھی۔ حسن معنی پر اتنا زیادہ زور نہیں تھا جتنا کہ شکوہ الفاظ ندرت فکر اور پرواز تخیل پر جو دوسروں کا آسمان تھا اس کا وہ اپنی زمین بنانا چاہتے تھے۔ اپنے اظہار مطلب کے لیے وہ ایسے ایسے خیالی مفروضات پیچیدہ محاورے اور نادر تشبیہات تلاش کرتے جو عام انسانوں کے ذہن اور قیاس میں بھی نہ آسکتیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان دشوار، دور از کار اور پر پیچ خیالات کے اظہار کے لیے انھوں نے جو زبان استعمال کی

ہے اسے نہ تو اردو کہا جاسکتا ہے اور نہ فارسی۔ اور اس کے لیے وہ ایک حد تک مجبور بھی تھے۔ کیوں کہ تنہا سیدھی سادی اردو اس بارِ گراں کو اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ خیالات ہوائی اور زبان دو آتشہ لہٰذا ظاہر ہے کہ کیا نتیجہ ہوسکتا تھا بہت سے اشعار پہیلیاں بن کر رہ گئے۔ تاہم اس قسم کے اشعار کی تعداد پورے نسخہ حمیدیہ میں چار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے اور اس معاملہ میں بھی غالب جتنے بدنام ہیں اتنے قصوروار نہیں ہیں۔

غالب کی ابتدائی مشکل گوئی کو بھٹکنے یا بہکنے سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا اسے صرف ان کی تلاش اور تحقیق کی ایک منزل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت ان کا اندازِ فکر ہی کچھ ایسا تھا کہ عام فہم زبان اس کی متحمل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ مثال کے طور پر کیا حسب ذیل اشعار جن افکار اور خیالات کے حامل ہیں وہ کسی آسان تر زبان میں ادا کیے جاسکتے ہیں؟

بامید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت
مبادا ہوں عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

☆

ہوں داغ نیم رنگی شام وصال یار
نور چراغ بزم سے جوش سحر ہے آج

☆

وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراج تمنا کے لیے درکار ہے

وغیرہ وغیرہ

آسی صاحب نے اس کلام کے متعلق لکھا ہے کہ ''میرے نزدیک تو یہ وہ کلام ہے جو مرزا کو عوام کی صف سے علیحدہ کر کے زمرہ خواص میں لے آتا ہے اور ان کے تخیل کی رفعت کا اندازہ کراتا ہے اور ان کی وسعت نظر کی شہادت دیتا ہے۔''

غالب کے متعلق جہاں ضرورت سے زیادہ خوش فہمیاں ہیں وہاں بے بنیاد غلط فہمیوں کی بھی وہ فراوانی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے حصے میں آئی ہوں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ غالب کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان کے خلاف اعتراضات

اور معترضین کی فوج درفوج پر بھی ایک نظر نہ ڈال لی جائے سرقہ، علم عروض سے ناواقفیت، الفاظ اور تراکیب کا غلط استعمال، تعقید، پیچیدگی، مشکل گوئی، ہرزہ سرائی غرض کہ شاید ہی فن شاعری کا کوئی الزام ہو کہ جس کے ملزم بے چارے مرزا غالب نہ ٹھہرائے گئے ہوں اور پھر الزام لگانے والے کچھ ایسے ویسے لوگ نہیں بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر علامہ عصر۔ نقادذی مرتبت وغیرہ لیکن یہ غالب کی جاندار اور لازوال شاعری ہی کا دم خم تھا کہ ان زبردست آندھیوں کے مقابلے میں بھی اس کا چراغ اس تابناکی سے روشن ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی میں اور اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک بہت عام خیال ہے کہ اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں غالب کے خیالات اس قدر الجھے ہوئے تھے اور ان پر فارسیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ وہ آسان زبان میں شعر کہنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس الزام کا بخوبی ازالہ کرسکتا ہے نسخہ مذکور کے اشعار میں سے تقریباً ایک تہائی اشعار دیوانِ غالب میں شامل ہو کر اردو زبان کے رگ وریشہ میں آج بھی تازہ اور صالح خون کی طرح دوڑ رہے ہیں علاوہ ازیں دیوان کے بعض بہت سہل اور رواں اشعار ۱۸۲۱ء سے قبل ہی کہے جاچکے تھے۔ ان کی تعداد قریب دو ڈھائی سو کے ہوگی۔ نمونے کے لیے صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

☆

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں کہ خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

☆

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

☆

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

☆

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

☆

میں نامراد دل کو تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

یہ خیال کہ غالب بیشتر مشکل اور مغلق کہتے تھے اور پھر ایک دم سے انھوں نے اپنا طرزِ سخن بدل دیا اور آسان اور عام فہم کہنے لگے بالکل غلط ہے نسخۂ حمیدیہ میں ہمیں غالب کی شاعری اور زبان کا ایک تاریخی تسلسل اور منطقی ربط ملتا ہے۔ غالب نے جس زمانے میں اپنے مشکل ترین اشعار کہے ہیں اُسی زمانے میں انھوں نے اپنے بعض آسان ترین اشعار بھی کہے ہیں۔ ان کی قوتِ اظہار سہل ممتنع کہنے سے قاصر کبھی نہیں رہی البتہ پہلے زیادہ تر خیالات کی پیچیدگیاں زبان پر حاوی ہوگئی تھیں پھر جب خیالات میں انقلاب ہوا تو زبان میں بھی تبدیلی ہوگئی۔ پہلے غالب کے شعر کا ہدف عموماً دماغ ہوتا لہٰذا خیالات کی پیچیدگیاں لازمی تھیں لیکن بعد میں جب اس کا ہدف دماغ کم اور دل زیادہ بن گیا تو انھوں نے دل میں اترنے والی زبان کو خود بخود اپنا لیا۔

یہ سمجھ لینا کہ ۱۸۲۱ء سے قبل کے جتنے بھی آسان اشعار تھے وہ سب کے سب دیوانِ غالب میں شامل کر لیے گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ میں مثالاً صرف چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جو دیوان میں شامل نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہے:

ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شاہانِ حسن کا دستور

☆

کیا ہے ترک دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے

☆

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردش گردوں دل وہ بھی

☆

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

☆

یک نفس ہر یک نفس جاتا ہے قسط عمر میں
حیف ہے ان کو جو کہویں زندگانی مفت ہے

جن لوگوں کا خیال ہے کہ غالب کی نومشقی کا کلام سراسر دشوار اور پیچیدہ تھا انھیں شاید حیرت ہو کہ غالب جب دہلی بھی نہیں پہنچے تھے اس وقت بھی وہ اردو کے اتنے سلیس اور رواں اشعار کہہ چکے تھے کہ ان پر سہل ممتنع کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ کلام نسخہ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہے لہٰذا اس کی تدوین سے قبل اس کو وہ خارج کر چکے تھے:

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

☆

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

☆

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

نسخہ حمیدیہ سے اس بات کا بھی ثبوت مل جاتا ہے کہ غالب کوئی شعر یا غزل کہہ کر اس سے

بے نیاز نہیں ہو جایا کرتے تھے بلکہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے پچھلے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالتے رہتے اور اُس کو ترقی دینے کے لیے اس میں برابر ترمیم اور اصلاح کرتے رہتے تھے۔ بعض اشعار میں انھوں نے صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو دو تین تین مرتبہ اصلاح کی ہے۔ بعض اشعار کو یک قلم کاٹ دیا ہے بعض موقعوں پر نئے اشعار کہہ کر پرانی غزلوں میں شامل کر دیے ہیں۔ اکثر کسی پوری غزل کو قلم زد کر کے اس کے بجائے اسی ردیف اور قافیوں کی دوسری غزل کہہ ڈالی ہے۔ ان اصلاحوں سے غالب کے ذہنی ارتقاء اور فنی استعداد کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ آسان پسندی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں، پہلے کہا تھا:

آتشیں پا ہوں گداز وحشت زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

پھر اس شعر کو ترقی دے کر یوں کہا ہے:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

اب نہ صرف مضمون صاف ہو گیا بلکہ دونوں مصرعے پہلے سے زیادہ چست بھی ہو گئے۔
پہلے کہا تھا:

عشرت ایجاد چہ بوئے گل و کو دود چراغ
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھر اس شعر کی یوں ترمیم کی:

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں یہ اشارہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غیر شعوری طور سے غالب اس شعر میں بیدلؔ کے اس شعر کا ترجمہ کر گئے ہیں:

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

پہلے کہا تھا:

چشمِ خوباں سے فروش نشہ زار ناز ہے
سرمہ گویا موج دود شعلہ آواز ہے

اس صورت میں دونوں مصرعوں کے درمیان ربط کی کمی تھی۔ پہلے میں صرف آنکھ کی تعریف کی گئی تھی اور اس کا آواز سے کوئی تعلق واضح نہ ہوتا تھا اور دوسرے میں سرمہ کو شعلہ آواز کا دھواں کہا گیا تھا لیکن یہ شعلہ کیوں اور کیسے پیدا ہوا یہ ظاہر نہ ہوتا تھا اس کمزوری کو دور کر کے شعر کی یوں اصلاح کی ہے:

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرواز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

اب دونوں مصرعوں میں منطقی ربط پیدا ہو گیا اور اگرچہ دوسرا مصرعہ اپنے نقش اول سے کافی دب گیا ہے لیکن شعر کے معنی صاف ہو گئے ہیں۔ اسی طرح نسخۂ حمیدیہ میں اشعار کو زیادہ رواں اور مطالب کو زیادہ آسان بنانے کی بیسوں اصلاحیں موجود ہیں۔ غالب کے استاد خود غالب تھے اور اگرچہ انھوں نے کبھی کسی دوسرے سے اصلاح نہیں لی لیکن خود اپنی اصلاح کرنے سے وہ غافل نہیں رہے۔ وہ خود اپنے اس شعر:

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

کی بہترین تفسیر تھے۔ اُردو میں کیا شاید ہی کسی زبان میں کوئی ایسا بڑا قابلِ ذکر شاعر ہو کہ جس نے خود اپنے قلم سے اپنا اتنا بڑا کلام قلم زد کر دیا ہو جتنا کہ غالب نے:

عیار جلوۂ نازش گرفتن ارزانی
ہزار بار بہ تقریب امتحانم سوخت

(''باقیاتِ غالب'' (ترمیم واضافہ)۔ اردو، اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۳۰ تا ۴۰)

◆◆◆

سید احتشام حسین (لکھنؤ)

کچھ نسخۂ حمیدیہ کے متعلق

(مراسلات)

محترمی، تسلیم۔

ادھر کچھ دنوں سے مفتی انوار الحق کے شائع کیے ہوئے دیوانِ غالب جدید المعروف بہ ''نسخہ حمیدیہ'' کی اصل کے متعلق کچھ بحث جاری ہے اور اس سلسلے میں اس کی اس مطبوعہ کاپی کا ذکر بھی آتا ہے جو میرے پاس ہے۔ شاید اس سے کچھ نتائج نکالنے میں مدد ملے اس لیے میں اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک مطبوعہ نسخہ بڑے شوق سے فراہم کیا تھا لیکن وہ کسی طرح میرے پاس سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد سے برابر یہ فکر رہی کہ کہیں سے پھر مل جائے۔ چناں چہ کئی کتب فروشوں سے کہہ رکھا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں ایک دن مہتمم دانش محل لکھنؤ نے یہ خوشخبری دی کہ انھیں ایک کاپی مل گئی ہے اور انھوں نے اس کو میرے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ کتاب میرے ہاتھ میں آئی تو مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہوا کہ کسی قدر پرانی ہے۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کے آخری صفحہ پر حسب ذیل عبارت ہاتھ سے لکھی ہوئی ملی:

> ''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلامِ غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے

کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو مجھے پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔ ارادہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ غالب کا ایک فوٹو اور ان کا خطِ خاص کا نمونہ بھی دینا چاہیے مگر اس کی بہم رسی کے لیے متردد تھے۔ میرے پاس وہ مختصر تذکرہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا جو اُن سے مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر دہلی کے تذکرۂ شعرائے فارسی کے لیے میرے والد ماجد مرحوم نے لکھوایا تھا، وہ میں نے بجنوری مرحوم کو دیا مگر ان کے انتقال کے بعد جب یہ نسخہ بالآخر شائع ہوا تو نہ اس کے ساتھ مرزا کی تصویر تھی نہ ان کے خط کا وہ نمونہ۔ مسٹر شعیب قریشی کی وساطت سے اس کو بہت تلاش بھی کیا کہ وہ مرحوم کے ورثاء سے واقف تھے اور بوقت وفات بھوپال میں موجود بھی تھے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر حیدر آباد آ کر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) کے پاس وہ احوال غالب خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمدللہ کہ ابھی تک ضائع نہیں ہوا، مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہو جائے۔

۱۱، مئی، ۱۹۳۷ء

محمد احتشام الدین دہلوی"

غالب شناسوں کے لیے اس عبارت میں بہت سا دلچسپ مواد ہے اس سے نہ صرف تذکرۂ شعرائے فارسی کے لکھے ہوئے غالب کے "مختصر تذکرہ" کا کچھ سراغ ملتا ہے بلکہ انگریز مرتب تذکرہ کے نام کے متعلق بھی شک پیدا ہوتا ہے کیوں کہ مجھے کوئی اور نام یاد آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے خود مفتی انوار الحق کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے مقدمہ متداول نسخوں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ممکن ہے مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے کیوں کہ ابھی تک انھوں نے اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا اور قرین قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ ردوبدل ہوتا کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مرجبہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلم زدہ کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہو گیا تھا...... لیکن افسوس کہ ان کی مرگ بے ہنگام نے بہت عجلت کی......" مفتی انوار الحق نے یہ بھی لکھا ہے کہ

بجنوری نے انجمن ترقی اردو ہند کے لیے دیوانِ غالب اردو کا نیا ایڈیشن تیار کرنا منظور کیا تھا، یہ مقدمہ اُسی کے لیے لکھا گیا تھا۔ مولوی احتشام الدین دہلوی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ مقدمہ ''نسخہ دیوان معدوم'' کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا گیا اور خواہ ڈاکٹر بجنوری نے انھیں مقدمہ کا مسودہ دکھایا۔ یہ معمولی سا مسئلہ کہ بجنوری نے یہ مقدمہ کس دیوان کو سامنے رکھ کر لکھا اس لیے معما بن جاتا ہے کہ ان کے مقدمے میں نسخہ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔ مگر مولوی احتشام الدین کو اصرار ہے کہ بجنوری نے اُسے بھی سامنے رکھا تھا۔ ایک دلچسپ سوال یہ بھی ہے کہ اگر یہ مقدمہ اس دیوانِ غالب کے لیے لکھا گیا تھا جو انجمن ترقی اردو کے لیے مرتب ہو رہا تھا تو پھر مفتی انوار الحق کے ہاتھ کس طرح لگا۔ اگر مولوی عبدالحق صاحب توجہ فرمائیں تو یہ گتھیاں کسی حد تک سلجھ سکتی ہیں۔ کیوں کہ مولوی احتشام الدین ۱۹۳۷ء میں یہ اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا احوالِ غالب عبدالحق صاحب کے پاس ہے اور ضائع نہیں ہوا ہے۔

مولوی احتشام الدین دہلوی کا مملوکہ یہ نسخہ حمیدیہ یا تو دہلی کے ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں لوٹا گیا ان کے ورثاء نے پاکستان جاتے وقت اسے بیچ دیا اور دوسری کتابوں کے ساتھ یہ لکھنؤ پہنچ گیا بہر حال ان کی چند سطریں کئی حیثیتوں سے اہم ہیں۔ اگر چہ ان سے اصل مسودہ دیوانِ غالب کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہوتی لیکن بعض دوسرے مسائل ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے میرے حوالہ سے بعض باتیں اسی عبارت کے متعلق کہی ہیں، ان کی تصحیح بھی اس عبارت کی اشاعت کے بعد ہو جائے گی۔ اس میں وہ باتیں نہیں ہیں جو انھوں نے رسالہ اردوئے معلیٰ (دہلی یونیورسٹی) میں لکھی ہیں۔ یا تو مجھ سے بتانے میں غلطی ہوئی یا اُن کی یادداشت نے انھیں دھوکا دیا۔

مالک رام صاحب نے دیوان غالب مرتبہ عرشی رام پوری پر تبصرہ کرتے ہوئے (فکر و نظر علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء) جین کے مضمون کا حوالہ دے کر بعض شکوک کا اظہار کیا ہے، اس لیے محمد احتشام الدین دہلوی کی اس عبارت کی اشاعت ضروری معلوم ہوئی۔

(ہفتہ وار ''ہماری زبان''۔ علی گڑھ۔ یکم مارچ ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۲ اور ۱۳)

◆◆◆

مولانا امتیاز علی عرشی (رامپور)

نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری!!

نومبر ۴۹ء میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کو نسخۂ حمیدیہ کی ایک کاپی ملی تھی، جو محمد احتشام الدین دہلوی کی مِلک رہ چکی تھی، اس کاپی کے اندر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقدمے کے آخر میں مالک نسخہ کا ایک نوٹ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء درج ہے، اس کے ضروری حصے یہ ہیں: ؎۱

''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالبؔ کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلامِ غالبؔ کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا، کتابچہ ان کے پاس موجود تھا، اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا، اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔''

اس نوٹ پر پروفیسر احتشام حسین صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ضروری حصہ یہ ہے:

''غالبؔ شناسوں کے لیے اس عبارت میں بہت سا دلچسپ مواد ہے......

اس سے خود مفتی انوار الحق کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے مقدمہ متداول نسخوں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے مرحوم اس تبصرہ پر نظر ثانی کرتے، کیوں کہ ابھی تک انھوں نے اس مضمون کو ختم نہیں کیا تھا۔ اور قرینِ قیاس ہے کہ اس میں اور کچھ ردو بدل ہوتا، کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروّجہ اور

مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا، اور اب ایک سو (۱۰۰) برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلم زدہ کلام مل جانے سے میدان سخن فراغ ہوگیا تھا...... لیکن افسوس کہ ان کی مرگِ بے ہنگام نے بہت عجلت کی ...''

مفتی انوار الحق نے یہ بھی لکھا ہے کہ بجنوری نے انجمن ترقیٔ اُردو ہند کے لیے دیوانِ غالب اُردو کا نیا ایڈیشن تیار کرنا منظور کیا تھا، یہ مقدمہ اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔

مولوی احتشام الدین دہلوی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ مقدمہ نسخۂ دیوان معدوم کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا گیا۔ اور خود بجنوری نے انھیں مقدمہ کا مسودہ دکھایا۔

یہ معمولی سا مسئلہ بجنوری نے یہ مقدمہ کس دیوان کو سامنے رکھ کر لکھا اس لیے یہ معمہ بن جاتا ہے کہ ان کے مقدمہ میں نسخۂ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔ مگر مولوی احتشام الدین کو اصرار ہے کہ بجنوری نے اسے سامنے رکھا تھا......

ان دونوں بزرگوں کی تحریریں پڑھ کر حسبِ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) کیا انجمن ترقیٔ اُردو نے بجنوری سے دیوانِ غالب مرتب کر دینے کی فرمائش کی تھی؟

(۲) کیا بجنوری نے اس نسخے کے لیے کوئی مقدمہ بھی لکھا تھا؟

(۳) محاسنِ کلامِ غالب کے نام سے دیوانِ غالب پر بجنوری کا جو تبصرہ انجمن ترقیٔ اُردو نے پہلے اپنے رسالہ اُردو بابتہ ماہِ جنوری ۲۱ء میں اور پھر اسی سال علی گڑھ سے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، کیا وہ یہی مقدمہ ہے جو انجمن کے مجوزہ ایڈیشن کے لیے لکھا گیا تھا؟

(۴) کیا بجنوری نے یہ مقدمہ لکھتے وقت صرف متداول دیوان ہی کو سامنے رکھا تھا؟

(۵) کیا نسخۂ بھوپال جو نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل ہے، بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہوگیا تھا؟

(۶) کیا بجنوری نے اس نسخے پر کچھ کام کرنا شروع کر دیا تھا جو اُن کی موت کے باعث نامکمل رہ گیا؟

(۷) اس کام کی نوعیت کیا تھی؟

پہلا سوال:

اس سوال کا حل مولوی عبدالحق صاحب کے اس نوٹ میں موجود ہے جو اُنھوں نے محاسنِ کلامِ غالب مطبوعہ ۱۹۲۱ء پر بطور پیش لفظ لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''انجمن ترقیٔ اُردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اُردو دیوان کا ایک نفیس صحیح جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چناں چہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔

میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ کے غالبؔ کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔

اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔

مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔

لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پُتلا تھا، بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

یہ مضمون جو زورِ بیان، جدتِ فکر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے مرحوم کی یادگار میں سب سے اوّل رسالہ اُردو میں شائع ہوا تھا، اور اب مستقل کتاب کی شکل میں چھاپا جاتا ہے۔''

اس پیش لفظ سے یہ امر تو بصراحت معلوم ہو جاتا ہے کہ انجمن نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا۔ مگر اسے کس نے مرتب کیا تھا اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہاں اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش بجنوری مرحوم سے ضرور کی گئی تھی جو اُنھوں نے پوری بھی کر دی تھی۔

اس سلسلے میں مفتی انوار الحق صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کے دیباچے میں لکھا ہے:

''جب انجمن ترقی اُردو نے دیوانِ غالب اُردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور اُنھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیب

خاطر قبول کیا اور اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ تھا۔

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوانِ غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔''

اس بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب و تصحیح دیوان کی خدمت بجنوری ہی کے ذمے عائد کی گئی تھی اور اُنھوں نے اسے نہایت ضابطے سے انجام دیا تھا، یعنی پہلے دیوان کے متداول نسخے اکٹھے کیے گئے تھے اور ان کی مدد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا۔

یہ بات مفتی صاحب کو کیسے معلوم ہوئی خود بجنوری مرحوم کی زبانی یا کسی اور سے، اس کا اُنھوں نے ذکر نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا بیان صحیح ہو اور مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے اس کی صراحت مناسب نہ خیال کی ہو۔ اب تنہا وہی بتا سکتے ہیں کہ انجمن کے لیے اُنھوں نے بجنوری مرحوم سے دیوان مرتب کرایا تھا یا نہیں، اور وہ نسخہ جو بقول انوارالحق مرتب ہو چکا تھا کہاں گیا۔ ؟

دوسرا اور تیسرا سوال:

مولوی صاحب کے پیش لفظ اور مفتی صاحب کے بیان محولہ بالا سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بجنوری نے دیوانِ غالب پر تبصرہ لکھا تھا اور وہ تبصرہ وہی ہے جو محاسنِ کلامِ غالب کے نام سے انجمن نے چھاپا اور اس کے بعد نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل کر لیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بجنوری جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھ رہے تھے اپنے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتے تھے۔ مولوی احتشام الدین نے بصراحت کہا کہ مرحوم نے علی گڑھ میں انھیں اس کا کٹا پھٹا مسودہ پڑھ کر سنایا تھا ان کے ماسوا ڈاکٹر سید محمود صاحب نے بھی اپنے مقدمہ دیوانِ غالب (نظامی ایڈیشن، طبع سوم، ۱۹۲۰ء) میں بجنوری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالبؔ کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچانی تھی اور جو غالبؔ کے کلام کو

ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی، شاعر اور سائنسدان سب متحیر رہ جاتے۔

آہ، عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، اور تو ملک اور قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔

غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے اور شاید تیرے ہی واسطے یہ کہا ہو:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی رحمٰن
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ نوجوان فلسفی، جو شاعرانہ تخیل سے بھی بہرہ ور تھا، ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس ویدا اور دیوانِ غالبؔ۔''

ان لفظوں سے مترشح ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ عبارت لکھتے وقت بجنوری کے تبصرہ لکھنے سے واقف تھے۔ موصوف نے یہ مقدمہ ۸، اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ختم کیا تھا اور اس تاریخ تک محاسنِ کلامِ غالب رسالہ اُردو میں بھی شائع نہ ہوا تھا جو موصوف اسے مطبوعہ شکل میں پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُنھوں نے بھی اس تبصرے کا ذکر یا تو خود ہی بجنوری مرحوم سے سنا ہوگا، یا ان کے اور اپنے مشترک دوست کی زبانی جانا ہوگا۔ چوں کہ آخری پیراگراف میں ''الہامی دو کتابیں ہیں'' والی بات ''کو کہا کرتا تھا'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس مقدمے کے اہم حالات سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے۔

چوتھا سوال:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''جی ہاں، بجنوری نے اپنا تبصرہ صرف متداول دیوانِ غالبؔ ہی کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

۱۔ پہلی دلیل تو وہ ہے جس ...... کی طرف پروفیسر احتشام صاحب نے ان لفظوں سے اشارہ کیا ہے کہ ''ان کے مقدمے میں نسخۂ حمیدیہ کے مخصوص اشعار کے حوالے نہیں ملے۔'' واقعہ یہ ہے کہ بجنوری جیسا شخص تبصرہ لکھتے وقت نسخۂ حمیدیہ کو پا گیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ وہ مرزا صاحب کے منسوخ الہام کی فلک پیمائی پر زمین و آسمان کے قلابے

نہ ملا دیتا۔ لہٰذا قلم زد اشعار پر مقدمے میں ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ اس نسخے کی دستیابی سے پہلے اپنا تبصرہ مکمل کر چکے تھے۔ اور مفتی صاحب نے بجا لکھا ہے کہ:

> ''ممکن ہے کہ مرحوم اس تبصرے پر نظرِ ثانی کرتے، کیوں کہ ابھی تک اُنھوں نے اسے ختم نہیں کیا تھا اور قرینِ قیاس ہے کہ اس میں کچھ ردوبدل ہوتا کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مروّجہ اور مطبوعہ دیوان کے متعلق تھا۔ اور اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالب کا غیر مطبوعہ اور قلم زد کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہو گیا تھا۔ مقابلے کے لیے نئے نئے مضمون ہاتھ آ گئے تھے اور مرحوم کی نکتہ رس اور دقیقہ سنجی کے لیے نہایت وسیع جولانگاہ مہیا ہو گیا تھا۔'' (ص ۲۹)

۲۔ دوسری دلیل جو اس بحث کو بالکل ختم کر دیتی ہے یہ ہے کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں دیوانِ غالبؔ کی غزلوں اور ان کے اشعار کی تعداد بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''غالبؔ کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات ۱۸۵ غزلوں سے، جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں، زیادہ نہیں۔'' صفحہ (۳۸)

یہ تصریح صرف نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ شائع شدہ مقدمہ بجنوری میں ہوتی تو شبہ کیا جا سکتا تھا کہ مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن حسنِ اتفاق سے یہ پوری عبارت محاسنِ کلامِ غالب، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۲۱ء کے صفحہ ۵ پر بھی موجود ہے چوں کہ یہ تعداد نہ نسخۂ بھوپال کی غزلوں اور ان کے اشعار کی ہے، نہ نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں اور ان کے اشعار کی، بلکہ مرزا صاحب کے دیوان متداول کی غزلوں اور ان کے شعروں کی ہے، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجنوری نے اپنے تبصرے میں صرف دیوان متداول ہی کو استعمال کیا تھا۔ نیز ان کے دلائل کے پیشِ نظر:

(۱) مولوی احتشام الدین دہلوی کا یہ بیان محلِ نظر قرار پائے گا'' کہ یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالبؔ کے نسخۂ دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلامِ غالبؔ کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادے کی پیروی میں لکھا گیا۔'' اور

(۲) اس کے برخلاف مفتی صاحب کا بجنوری کے مذکورہ بالا بیان پر حاشیہ صحیح مانا جائے گا۔ چوں کہ یہ مقدمہ جدید قلمی نسخے کے ملنے سے پہلے لکھا جا چکا تھا، اس سبب سے اس تعداد میں صرف قدیم مطبوعہ دیوان کے شعر شمار کیے گئے ہیں۔ (صفحہ ۳۸ کا حاشیہ ۱)

پانچواں سوال:

جہاں تک مفتی کا تعلق ہے۔ اُنھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہوا۔ بلکہ ان کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی یہ عبارتیں قابلِ غور ہیں:

(۱) غالبؔ کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا ہوا تھا اور جس کے وجود کا کسی کو سان وگمان بھی نہ تھا۔ (تمہید ص ۳)

(۲) اب ایک سو برس کے قلمی دیوان میں غالبؔ کا غیر مطبوعہ اور قلم زدہ کلام مل جانے سے میدانِ سخن فراخ ہو گیا تھا۔ (تمہید ص ۲۹)

غالبؔ کا انتقال ۱۵، فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا تھا، ان کے انتقال کے پورے پچاس برس بعد نسخۂ بھوپال کے نکلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ۱۵، فروری ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ یہ نسخہ دستیاب ہوا تھا اور ایک صدی تک گوشۂ خفا میں پڑے رہنے کے بعد دیوان کے منظرِ عام پر آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تاریخ کتابت یکم نومبر ۱۸۲۱ء کے سو برس بعد یعنی نومبر ۱۹۲۱ء میں دستیاب ہوا تھا۔

ان دونوں تاریخوں کے تضاد کے باوجود یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم فروری ۱۹۱۹ء سے پہلے دیوان نہیں ملا تھا۔ چوں کہ بجنوری مرحوم نے معارف ماہ نومبر ۱۹۱۸ء کے شذرات کے مطابق ۳ ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں انتقال کیا تھا۔ اس لیے اس سے یہ بھی ترشح ہو گیا کہ ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ملا تھا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے اولاً اس لیے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے صراحت کی ہے کہ نہ صرف بجنوری کی حیات میں یہ نسخہ مل چکا تھا بلکہ اُنھوں نے انجمن کے لیے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ دوسرے اس بنا پر کہ معارف ستمبر ۱۸ء کے شذرات میں اس نسخے کے ذکر کے ساتھ یہ اطلاع بھی ۴ دی گئی ہے کہ آج کل یہ بجنوری کے زیرِ مطالعہ ہے۔ عنقریب نتائج فکر منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔

ان شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس دعویٰ کی صحت میں کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں نکل آیا تھا اور اُنھوں نے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔

چھٹا سوال:

مذکورہ بالا بیان سے اس سوال کا جواب بھی بآسانی دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بجنوری نے اس نسخے پر کام شروع کر دیا تھا مگر ان کی موت نے اسے ناتمام رکھا۔

ساتواں سوال:

چوں کہ مولوی عبدالحق صاحب اور سید سلیمان ندوی صاحب دونوں نے ان کے کام کی نوعیت پر مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے متن کی ترتیب کا کیا ڈول رکھا تھا۔ ممکن ہے مفتی صاحب نے جس طرح مرتب کیا ہے، یہی ان کا نقشہ ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اور طرح پر کام کرنا چاہتے ہوں، اور ان کا کیا ہوا کام ضائع ہو گیا ہو۔

یہاں سوئے ظن سے کام لینے والا کہہ سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے جو کام اپنے نام سے شائع کیا ہے یہ سب یا اُس کا بڑا حصہ بجنوری کا انجام دیا ہوا تھا۔ لیکن پہلے تو اُنھوں نے بجنوری کا تذکرہ جس محبت اور افسوس کے ساتھ کیا ہے اس کا تقاضا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے کام کو چھپا جاتے۔ دوسرے نواب حمید اللہ خاں کے تعلقات بجنوری سے بہت گہرے تھے اور خود انھیں اس دیوان سے بھی دلچسپی تھی، چناں چہ ان کا پیش لفظ بھی دیوان کے شروع میں موجود ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ بجنوری کے کام سے جو بھوپال ہی میں کیا جا رہا تھا، وہ ناواقف رہتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے علم میں سب کچھ ہوتے ہوئے مفتی صاحب جرأت کر کے نواب صاحب کے دوست کے کام کو اپنا کہہ کر پیش کر دیتے، اس طرح یہ بھی ناقابلِ بیان ہے کہ اپنے پیش لفظ میں نواب صاحب ڈاکٹر بجنوری کے کام کی داد نہ دیتے۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی فرمائش پر یہ کام ہو رہا تھا اس لیے ان کا اس کام کی تفصیل سے واقف ہونا ضروری تھا۔ اگر یہ سب کام جو مفتی صاحب نے شائع کیا ہے بجنوری کا ہوتا تو ناممکن تھا کہ مولوی صاحب خاموش رہ جاتے اور مفتی صاحب کا پردہ چاک نہ کر دیتے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری زبان، علی گڑھ، بابتہ یکم مارچ ۱۹۶۱ء باب مراسلات، مئی ۱۹۶۱ء۔

۲۔ یہ مضمون مولوی عبدالحق مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

۳۔ یہ دونوں اطلاعات مختارالدین احمد صاحب آرزو کے مہیا فرمائی ہیں۔

۴۔ دونوں اطلاعات مختارالدین احمد صاحب آرزو نے مہیا فرمائی ہیں۔

☆ حال ہی میں ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ دیوان مولوی عبدالحق مرحوم نے سیّد ہاشمی فریدآبادی مرحوم سے مرتب کروایا ہے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانے میں اب بھی موجود ہے۔

(ماہنامہ "نیادور" لکھنؤ۔ مئی ۱۹۶۱ء۔ ص۵ تا ۸)

◆◆◆

نادم سیتاپوری

نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں

جب تک غالبؔ کا آرٹ اور فن زندہ ہے ''نسخۂ حمیدیہ'' کا نام جاوداں رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس غیر ادبی اور خالص سیاسی نام کے پس منظر میں ایک ایسی اہم شخصیت کی ''موت'' کا راز پنہاں ہے جو غالبؔ کے اوّلیں قدر شناسوں اور پرستاروں میں سرِفہرست نظر آتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نواب فوجدار محمد خان'' اپنے عہد کی وہ منفرد شخصیت تھے جنھوں نے غالبؔ کے فن اور آرٹ کو اس وقت پرکھا جب غالبؔ کے خلاف ایک انقلابی قسم کا نعرہ جنم پا چکا تھا:

''مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے''

جس زمانے کا یہ ذکر ہے ہندوستان میں مغل اقتدار ابھی باقی تھا۔ اور اودھ بھی! حیدرآباد بھی بھوپال بھی، رامپور بھی ٹونک بھی! لیکن مشکل پسند غالبؔ کی شنوائی کہیں نہیں ہوئی، غالبؔ کے اس ''ناقابلِ فہم فن'' کو قبول کیا تو بھوپال کے ایک لٹے ہوئے چھوٹے سے رئیس نے، جو تاج اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ اور یہ جاہ پرست دنیا کے نام سے متنفر و بیزار ہو چکی تھی۔ برسہا برس کے بعد جب اس کی کمائی ہوئی دولت کا یہ دفینہ ہاتھ آیا تو بھوپال کے برسرِ اقتدار فرماں روا، نواب حمید اللہ خاں مرحوم کے نام سے نسبت دینے کے بعد بھی مفتی انوار الحق مرحوم ڈرتے ڈرتے صرف اتنا لکھ سکے:

> ''اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں (بھوپال) کیوں کر پہنچا! لیکن

تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیسِ وقت نواب غوث محمد خان کے بیٹے ''میاں فوجدار محمد خان صاحب'' کے لیے لکھا گیا تھا چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے:

''دیوانِ ہٰذا من تصنیف مرزا نوشہ دہلوی المتخلص بہ اسدؔ۔ از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوشخط۔''

اور اس کے سامنے ان (نواب فوجدار محمد خاں) کی مہر ہے اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے:

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ ''اسد و غالبؔ'' سلہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر مظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت۔''

اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ شروع میں خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سنہری جدوَل ہے جگہ جگہ میاں فوجدار خاں کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں۔'' [۱]

گویا مفتی انوار الحق مرحوم کو ان اسناد کے بعد بھی اس تیقن میں پس و پیش تھا کہ یہ دیوان میاں فوجدار محمد خان کے لیے تحریر کیا گیا تھا چناں چہ ''غالباً'' کی یہ غیر یقینی اور مشکوک کیفیت اس کی غماز ہے۔ اور تھا بھی مفتی صاحب مرحوم کے لیے یہ دشوار! کیوں کہ اُن کے ''خداوند نعمت'' ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خان مرحوم نے اپنے ''سرنامہ'' (نسخۂ حمیدیہ) میں نواب فوجدار محمد خان کا نام لینا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ ورنہ جہاں تک ان حقائق کا تعلق ہے اس زمانے کا بھوپال ان شخصیات سے خالی نہیں تھا جنھیں اس دیوان کے بھوپال پہنچنے کی پوری تاریخ سے آگاہی اور باخبری تھی۔ تلامذۂ غالبؔ میں ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعتؔ شیروانی اور خان محمد خان شہیرؔ اس وقت تک ضرور مر چکے تھے پھر بھی ذکی مارہروی وفات ۱۹۳۰ء بھوپال ہی میں موجود تھے اور حکیم معشوق علی خاں جوہر شاہجہانپوری (وفات ۱۹۲۸ء) حیدرآباد دکن میں بقیدِ حیات تھے۔ ان سے تو بہر حال کچھ نہ کچھ تفصیلات معلوم کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ بھی نہیں تھا کہ مفتی صاحب نے میاں فوجدار محمد خان کے

فرزند ارجمند اور غالبؔ کے شاگرد میاں یار محمد خان شوکتؔ (وفات ۱۹۱۲ء) کا زمانہ نہ پایا ہو۔ یا میاں عالمگیر محمد خان (وفات ۵۶۔۱۹۵۵ء) اور میاں ارجمند محمد خان سلیم بھوپالی (وفات تخمیناً ۱۹۵۶ء) کو نہ دیکھا ہو جو گزشتہ بھوپال کی زندہ تاریخ تھے۔

یہ دیوان (مکتوبہ یکم نومبر ۱۸۲۱ء) اپنے سن کتابت کے تخمیناً سو برس کے اندر ڈاکٹر بجنوری (وفات نومبر ۱۹۱۸ء) کی زندگی میں دستیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اسے طباعت و اشاعت کی منازل طے کرتے کرتے ایک صدی (سن کتابت سے) کچھ زیادہ ہی زمانہ گزارنا پڑا یعنی ۱۹۲۱ء کے بعد ہی اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ پھر بھی یہ زمانہ تھا کہ بھوپال میں بکثرت ایسے معمر افراد موجود تھے جنھوں نے میاں فوجدار محمد خان کا عظیم الشان کتب خانہ بھی دیکھا تھا اور اس دیوان (غالبؔ) کے بھوپال پہنچنے کی تفصیلات سے بھی واقف تھے۔ انھیں باخبر ارباب علم و ادب میں ایک جناب محمد یوسف قیصر بھوپالی بھی ہیں جنھوں نے ابھی ۱۹۵۶ء میں میاں فوجدار محمد خان کے اس کتب خانہ کا تفصیلی حال بھی بیان کیا ہے اور ''نسخۂ حمیدیہ'' کے بھوپال پہنچنے کا واقعہ بھی:

> ''فوجدار محمد خان کا کتب خانہ (ہندوستان کے ان کتب خانوں میں جن کو آج تک انگلیوں پر گنا کرتے ہیں) بے شمار قلمی نسخے تھے۔ فوجدار محمد خان کو کتابوں سے عشق تھا...... ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی اچھی کتاب سُن پاتے تھے بے قرار ہو جاتے تھے اور جب تک وہ کتاب یا اس کی نقل ان کے کتب خانے میں نہ آ جائے ان کو چین نہیں آتا تھا، ان کی دولت و امارت کا بھی یہی ایک مصرف تھا۔ ان کے بہت سے ایجنٹ ہندوستان کے دورے کرتے تھے اور جب کہیں کوئی اچھی کتاب دیکھتے اس کو خریدنے کی کوشش کرتے اور اگر یوں نہیں ملتی تو اس کی نقل کرائی جاتی اور مالک کتاب کو اس کی نقل کرائی کی اجازت کا کافی صلہ دیا جاتا۔ ان کے یہاں بہت سے خوش نویس اور خطاط مستقل ملازم تھے جو کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ کوئی موضوع علم و فن کا ایسا نہیں تھا جس کے دو چار نسخے یہاں نہ ہوں۔ غرضیکہ ان کا کتب خانہ لاجواب تھا۔
>
> فوجدار محمد خان کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ ان کے اوقات

فرصت کا مشغلہ یہی ایک کتب بینی تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اس کتب خانے کا جو حشر ہوا اس کو سن کر آنسو نکل پڑتے ہیں۔ جہاں (اب) ''حمیدیہ ہاسٹل'' ہے، اُس کے جنوبی حصے میں ان کا ''محل'' تھا (اب) اس حصے میں کچھ کوارٹر ڈاکٹروں اور نرسوں کے بن گئے ہیں۔ ان کے ''محل'' کی بارہ دری کا کچھ حصہ اور محل کے آس پاس کی کچھ دیواریں اب بھی باقی ہیں، بلکہ بارہ دری کے بالائی حصے کو کوارٹرس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہیں وہ رہتے تھے اور یہیں ان کا کتب خانہ تھا جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا تمام سامان اسی جگہ چھوڑ دیا گیا اور اس کی کچھ پاسبانی بھی نہیں کی گئی بلکہ دانستہ اس جگہ کو سنسان اور غیر محفوظ کر دیا گیا۔ نتیجہ میں جہاں ان کا بہت سا اور سامان چوری ہو گیا وہاں اُن کی کتابیں بھی لوگ اُٹھا اُٹھا کر لے گئے۔ یہ وہ کتابیں تھیں کہ ایک ایک کتاب نقل کرانے میں سینکڑوں روپیہ بلکہ ہزاروں روپیہ صرف ہوا تھا۔ جب یار محمد خان (شوکت) (ابن میاں فوجدار محمد خان) کو بہت سمجھایا گیا تو اُنھوں نے اس ذخیرے کو وہاں سے منگوا کر اپنے یہاں (لکھیرہ پورہ میں) ایک کمرے میں بھر دیا اور وہ ایک مدت تک وہاں پڑا ہوا دیمک کی نذر ہوتا رہا۔ سرکار نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں ''سرکار'' نے یار محمد خان شوکتؔ کے انتقال (۱۹۱۲ء) کے بعد وہ ذخیرہ اپنے محل پر منگوا لیا وہاں بھی ایک عرصہ تک غیر محفوظ حالت میں پڑا رہا۔ آنے جانے والے اس طرف سے گزرتے اور دو چار کتابیں اُڑا کر لے جاتے۔ پھر اس میں سے کچھ حصہ تو سرکار نے اپنے ذاتی کتب خانے میں رکھ لیا اور باقی حمیدیہ لائبریری میں بھیج دیا۔ جس کا نام اب سینٹرل لائبریری ہے۔ ان کی کتابیں بھوپال میں بھی بعض لوگوں کے پاس ہیں اور زیادہ تر کتابیں بھوپال سے باہر چلی گئیں۔'' ۲

غالبؔ کے اُردو اور فارسی کلام کے جتنے قلمی مجموعے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں اس اُردو دیوان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے ۱۸۲۱ء کا مخطوطہ ہے۔ اُردو دیوان کا دوسرا قدیم مخطوطہ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کے کتب خانے میں تھا جس کا سنِ کتابت ۱۸۴۱ء بیان کیا جاتا ہے۔ اور

رامپور اسٹیٹ کا قلمی نسخہ تو اس کے بہت بعد کا ہے یعنی ۱۸۵۶ء یا ۱۸۳۷ء کا مکتوبہ۔ فارسی نظم و نثر کے مخطوطات میں ''میخانۂ آرزو'' قدیم ترین ہے جو ۱۸۳۷ء کا مخطوطہ ہے اور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ متفرق بیاضوں کو چھوڑ کر غالبؔ کے اُردو کلام کا یہ مجموعہ ہی اُردو کا سب سے زیادہ قدیم دیوان ہے جو بقول شیخ محمد اکرام، غالبؔ کی ابتدائے مشقِ سخن ۱۸۰۷ء (؟) (۱۸۲۱ء) سے تعلق رکھتا ہے:

> ''اس دور میں ان اشعار کا انتخاب ہے جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے اور ''نسخۂ حمیدیہ'' کے متن میں موجود ہیں ...اس دور کے اشعار کو مفتی انوارالحق نے بھی باقی اشعار سے علیحدہ شائع کیا ہے۔''

اور انھی حقائق کو سامنے رکھ کر یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ میاں فوجدار محمد خان وہ پہلے ''غالبؔ شناس'' تھے جنھوں نے غالبؔ کے اس اُردو کلام کی پذیرائی کی جسے غالبؔ کے مخلص دوست اور محسن علامہ فضل حق خیر آبادی اور دوسرے احباب نے عام مذاق سے ہٹا ہوا قرار دے کر نا قابلِ انتخاب قرار دیا تھا۔ اور ان کا اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کو وہ قبول عام آج تک حاصل نہ ہو سکا جو اس مروّجہ مطبوعہ دیوان کو حاصل ہے جس کے کئی ایڈیشن خود غالبؔ کی زندگی میں چھپ چکے تھے۔

میاں فوجدار محمد خان بھوپال کے اس فرماں روا خاندان کے ایک ممتاز رکن تھے جس کی بنیاد سردار دوست محمد خان نے ۱۷۲۳ء میں ڈالی تھی۔ سردار دوست محمد خان کے بعد زمامِ حکومت ان کے بیٹے نواب یار محمد خان کے ہاتھ میں آئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نواب فیض محمد خان فرماں روا ہوئے۔ فیض محمد خاں چوں کہ لاولد تھے اس لیے ان کے مرنے کے بعد حیات محمد خان اور پھر اُن کے فرزند نواب غوث محمد خان مسند آرائے تختِ سلطنت ہوئے۔ میاں فوجدار محمد خاں انھیں نواب غوث محمد خان کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے حقیقی بھائی بہنوں میں ان کے بڑے بھائی نواب معز محمد خان اور ایک بہن نواب قدسیہ بیگم تھیں جن کی شادی نواب غوث محمد خان نے اپنے رشتہ کے بھتیجے نظیر محمد خان (بن وزیر الدولہ وزیر محمد خان) کے ساتھ کر کے اپنا ''مختارِ کُل'' بنا دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' تقریباً تمام ہندوستان میں ''معاہدوں کا

سنہرا جال'' بچھا کر ہر چھوٹی بڑی ریاست میں انتشار پیدا کر رہی تھی۔ میسور اور بنگال پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ دکن اور کرناٹک بھی کمپنی کی بالادستی کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ اودھ میں ان کی سازشوں کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور دہلی کا تخت وتاج تو گویا ایسٹ انڈیا کمپنی کے چشم و ابرو کا محتاج ہی تھا! سینٹرل انڈیا کی یہ چھوٹی ریاست بھلا انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے کس طرح محفوظ رہتی چناں چہ نواب فیض محمد خاں کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب حیات محمد خاں ۱۱۹۲ھ میں جب مسند نشین ہوئے تو ''جنرل گڈرڈ'' نے بھوپال پہنچ کر معاہدہ کا پہلا پھندہ بھوپال کے گلے میں ڈال ہی دیا۔ یہ معاہدہ دراصل سازشوں کا ایک ''بگل'' تھا اس کے بعد ہی انگریزوں نے ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کر دی۔ ۱۸۰۶ء میں نواب حیات محمد خان کا انتقال ہوا اور یہی وہ منحوس سال تھا جب کمپنی نے ''معاہدہ لیک'' کر کے مغل اقتدار کے تابوت میں آخری کیل بھی گاڑ دی تھی۔ دہلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ کمپنی کے تنخواہ دار ایجنٹ ایک طرف تو ہندوستان کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی پھیلانے میں مصروف تھے دوسرے ان کے چالاک فوجی جنرل اپنی سپاہ کی مدد سے معاہدوں کا جال بچھاتے پھر رہے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں ''جنرل اوڈم'' اسی سلسلہ میں ہوشنگ آباد پہنچا۔ نواب غوث محمد خان کو ان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ یہ خود تو نہیں گئے اپنے بجائے اپنے داماد اور ''مختارِ کل'' نظر محمد خان کو ہوشنگ آباد بھیج دیا۔ نظر محمد خاں نے یہاں پہنچ کر ایک نیا گل کھلایا۔ انگریز جنرل سے سازش کر کے ایک نیا معاہدہ بجائے نواب غوث محمد خاں کے اپنے نام سے کر لیا اور اس معاہدہ کی رو سے ریاست بھوپال کو اپنی موروثی جائیداد قرار دے لیا۔ بہت دنوں تک نظر محمد خان نے اس معاہدہ کو چھپائے رکھا۔ لیکن کہاں تک چھپاتے آخر کار راز کھل کر رہا اور نظر محمد خان کو اسلام نگر کے قلعہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

نواب غوث محمد خان ایک رحم دل اور جذباتی انسان تھے۔ داماد کی موت کا انھیں بہت ہی صدمہ ہوا اور اپنی نوعمر بیٹی کے سہاگ کے اُجڑنے کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ اُنھوں نے اپنی اولادِ نرینہ کو محروم کر کے اپنی بیوہ بیٹی نواب قدسیہ بیگم کو اپنا جانشین بنا دیا۔ بھوپال کا یہ پہلا انقلاب تھا جس نے فرماں روا خاندان کے ہاتھ سے عنانِ اقتدار چھین کر دوسرے خاندان میں منتقل کر دی۔

نواب غوث محمد خان نے ۱۸۲۳ء میں رحلت کی۔ اُن کے بڑے بیٹے نواب فوجدار محمد خان بظاہر تو تخت نشین کیے گئے لیکن ان کی بہن قدسیہ بیگم اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوئیں اور رفتہ رفتہ انھیں اس ''معمولی جاگیر'' میں محدود و محصور کر دیا گیا جو مرحوم نواب غوث محمد خان کے ذاتی جاگیر اور جیب خرچ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور پھر والا جاہ نواب صدیق حسن خان کے عہد تک اس ''جاگیر'' کے بہت بڑے حصے سے بھی ان کی اولاد کو محروم کر دیا گیا۔

میاں فوجدار محمد خان انھیں نواب معز محمد خان اور پہلی خاتون فرماں روا نواب قدسیہ بیگم کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ تو خود ان کے باپ نواب غوث محمد خان کے ہاتھوں ہی ہو چکا تھا، رہا سہا اقتدار اور اعزاز دھیرے دھیرے نئے حکمران ختم کرتے چلے گئے۔ سیاسی دور اندیشی کے خیال سے انھیں دو مرتبہ برائے نام ''مختارِ کل'' کا عہدہ بھی دیا گیا۔ مگر وہ ایک قسم کی سیاسی چال تھی۔ اس لیے بھوپال کی سیاسی تاریخوں نے ان کے اس عہد کو ہمیشہ تاریکِ زمانہ قرار دیا۔ چناں چہ ''تاریخ الکہ بھوپال'' کا بے لاگ مورخ بھی اپنے پیش رووں کے آگے بے بس ہو کر یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا:

> ''میاں فوجدار محمد خان مختاری سے جان چراتے تھے۔ قاضی حنیف ساکن دوراہہ نے جو کہ میاں موصوف کے بڑے خیر خواہ تھے یہ اپنی خواہش پوری کی، جب کہ میاں موصوف کی کم توجہی کاروبار ریاست میں پائی گئی اور انتظام میں خلل پڑا تو گورنمنٹ (برطانیہ) نے سکندر بیگم کو معین انجام اُمورِ ریاست کیا۔ آخر سکندر بیگم نے اپنی تدبیر اور کوشش سے وہ کارروائی کی کہ فوجدار محمد خان کو صاف مٹا دیا ''خود مختار'' بن گئیں۔ گورنمنٹ نے میاں موصوف سے استعفیٰ لیا۔ ان کی حکومت صرف آٹھ دس ماہ رہی۔''

اسی صفحہ (۵۹) کے حاشیہ پر بھی میاں فوجدار محمد خان کا ذکر کیا گیا ہے:

> ''یہ بڑے ہوشیار و چالاک تھے لیکن اس وقت اس کام میں اُنھوں نے ایسی کم توجہی اور کم ہمتی کا کام فرمایا کہ جس سے ان پر حرف آیا یا قسمت کا لکھا آگے آیا اور ادبار نے منہ دکھایا۔ گئی ہوئی حکومت کی اُمید نے منہ دکھایا تھا۔ اس کو حرفِ غلط کی

طرح مٹا دیا۔ان کی چالیس ہزار کی جاگیر تھی اور انتظامِ خانگی بہت عمدہ۔ ہر چیز قابل تعریف۔علومِ عقلی و نقلی کے سوا اکثر فنون میں ماہر تھے۔ بعد توبہ نصوح حج کیا۔لوٹ کر آئے اور چھ ماہ کے بعد انتقال کیا ''نیک آخرت'' (۱۲۸۱ھ) تاریخ وفات ہے۔'' ۳

میاں فوجدار محمد خان کی سیاسی زندگی کے یہی دھندلے نقوش ہیں جو کم و بیش تاریخوں میں ملتے ہیں۔لیکن ان سطور سے نہ تو ان کی معارف پروری پر کوئی خاص روشنی پڑتی ہے اور نہ شعری فن سے وابستگی یا دلچسپی کا ہی کوئی ثبوت ملتا ہے۔اس سلسلے میں ہماری تھوڑی بہت رہنمائی صرف بھوپال کے بزرگ صحافی، ادیب اور نگار جناب قیصؔر بھوپالی کے وہی مضامین کرتے ہیں جو ابھی چند سال ہوئے شائع ہوئے تھے۔ جناب قیصؔر بھوپالی میاں فوجدار محمد خان مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''فوجدار محمد خان غالؔب کی شاعری اور ان کی جدّتِ افکار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مرزؔا سے ملنے کے لیے دہلی پہنچے اور کچھ دنوں تک ان کے پاس رہے۔ بادشاہ کے یہاں مشاعروں میں بھی شریک ہوئے اور مرزؔا سے ایک خصوصی مراسم کا تحفہ (نسخۂ حمیدیہ) لے کر بھوپال واپس آگئے۔کہا جاتا ہے کہ وہ غالؔب کے شاگرد بھی ہو گئے تھے مگر اس کی آج تک کوئی تصدیق نہیں ہوئی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مرزا غالؔب کے خیر اندیش دوستوں میں ضرور شامل تھے اور ان سے مراسلت بھی بکثرت تھی۔لیکن آج تک فوجدار محمد خان کا ایک مصرعہ بھی سننے میں نہیں آیا اور نہ کسی تذکرے میں نظر سے گزرا۔ظاہر ہے کہ جب ان کے صاحب زادے نواب یار محمد خان شوکؔت تذکرہ ''فرح بخش'' لکھتے ہیں تو اپنے والد محترم کے اشعار سے اسے کیوں محروم کرتے۔ وہ (میاں فوجدار محمد خان) ذہین و طباع ضرور تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا، وہ سخن فہم تھے۔اور جہاں تک معلوم ہوا ہے ''سخن سنج'' نہیں تھے۔ شاعری سے لطف اندوز ضرور ہوتے تھے مگر شاعر نہیں تھے۔اور بھوپال میں سب سے پہلے وہی شخص جو غالؔب کا کلام سن کر جھوم اُٹھے اور بے ساختہ غالؔب کے قدموں پر

جا کر گر پڑے، اور ان کے قدر دان، دوستوں کے زمرے میں داخل ہو گئے۔'' ۴

جناب مالک رام نے بھی میاں فوجدار محمد خان کا ذکر اپنی روایتی احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔ نواب یار محمد خان شوکت بھوپالی کا ذکر کرتے ہوئے جناب مالک رام تحریر فرماتے ہیں:

''غالب کے تعلقات ان (شوکت) کے والد نواب فوجدار محمد خان سے بہت دوستانہ تھے۔ غالب کے قدیم اُردو کلام کا مجموعہ جو ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے انھیں کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔'' ۵

بی بی رشیدہ بھوپالی نے اپنے مضمون (''غالب کے ایک غیر معروف شاگرد'') میں لکھا ہے:

''نواب فوجدار محمد خان بھوپال کی پہلی فرماں روا خاتون نواب گوہر بیگم (قدسیہ بیگم) کے حقیقی بھتیجے ۶ اور ان کے والد ماجد نواب غوث محمد خان سردار دوست محمد خان (بانئ ریاست بھوپال) کے حقیقی پوتے تھے۔ نواب فوجدار محمد خان بھوپال کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے کو غیر سیاسی بنا کر علم و ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی کافی عمر ادبی مشاغل میں بسر ہوئی اور مرتے وقت اتنا بڑا کتب خانہ چھوڑا جس کی مثال ''مالوہ'' کیا اس زمانے میں دور دور نہیں ملتی تھی۔ وہ غالب کے گہرے دوست ہی نہیں تھے بلکہ انھیں مرزا سے ایک قسم کا والہانہ عشق تھا۔ خط و کتابت سے ''نصف ملاقات'' کی منزلیں طے ہوئیں۔ اور پھر خود دلی جا کر غالب سے شرفِ ملاقات کی آرزو پوری کی۔

دیوانِ غالب کا ''نسخۂ حمیدیہ'' جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد گورنمنٹ بھوپال نے شائع کیا، انھیں نواب فوجدار محمد خاں کے ان خصوصی تعلقات کی یادگار تھا جو اُن سے اور غالب سے تھے۔ نواب فوجدار محمد خان نے اپنا ذاتی خوش نویس دلی بھیج کر غالب کا یہ دیوان نقل کرایا تھا جو اُن کے کتب خانے کی تباہی کے بعد گورنمنٹ بھوپال کے قبضہ میں پہنچا اور پھر ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھوں ''خدا بخش لائبریری'' (پٹنہ) پہنچ گیا اور بھوپال ایک گراں مایہ ادبی تحفے سے محروم ہو گیا۔''☆ ۷

نسخۂ حمیدیہ کا اصلی مخطوطہ تو اب تک میری نظر سے نہیں گزرا لیکن میاں فوجدار محمد خان کے عظیم کتب خانے کے متعلق بے شمار روایتیں بھوپال کے زمانۂ قیام میں ''تواترات'' کے ساتھ مجھ تک پہنچیں۔ اور اس کتب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں دیکھنے میں بھی آئیں۔ سینٹرل لائبریری بھوپال جو حکومتِ ہند کے قبضے میں پہنچنے کے بعد اب ''آزاد لائبریری'' بنادی گئی ہے اس کے شعبۂ مخطوطات میں میاں فوجدار محمد خان کے کتب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں اب سے آٹھ دس برس ادھر تک موجود تھیں جن میں میرؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ اور جرأتؔ وغیرہ کے قلمی دیوان بھی تھے اور میرا قیاس یہ ہے کہ قلمی دیوان بھی میاں فوجدار محمد خان نے اپنے خوش نویس دلّی بھیج کر نقل کرائے ہوں گے۔

جس زمانے میں بھوپال کی آزاد لائبریری میں ان قلمی کتابوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا تھا، اس زمانے میں اس لائبریری سے مخطوطات کے سرقہ کی ایک باقاعدہ تحریک چل رہی تھی۔ میاں فوجدار محمد خان کے صاحب زادے میاں یار محمد خان شوکتؔ (تلمیذ غالبؔ) کے ''گلدستۂ نرگس'' کا قلمی نسخہ جس پر غالبؔ کی اصلاحیں تھیں خود میں نے دیکھا مگر چند روز کے بعد وہ غائب ہوگیا، اسی طرح دوسری کتابیں بھی چوری ہوگئیں۔ اور لائبریری کے ذمہ داروں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کیوں کہ ہر ''اُردو دشمن'' تحریک سے خود انھیں بھی دلچسپی تھی۔ جب میں بھوپال پہنچا تو اس وقت میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی عمارت بھی منہدم ہو چکی تھی۔ پرانے قلعے کے جانب جنوب بڑے تالاب کے کنارے اس عمارت کے کچھ آثار ضرور باقی تھے۔ اس کتب خانے کے مٹنے کی بے شمار روایتیں سننے میں آئیں۔ معلوم ہوا کہ فوجدار محمد خان نے جب ''لکھیرے پورہ'' میں اپنا محل بنوالیا تب بھی اس کتب خانے کا ایک بڑا حصہ پرانی ہی عمارت میں پڑا رہا جس کی بہت کچھ تفصیلات آپ سطورِ بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

جناب مالک رام نے ''ذکرِ غالبؔ'' میں جگہ جگہ روایات کا سہارا لینے کے باوجود غالبیات کی اس ''اہم کڑی'' کو غیر ضرور قرار دے کر نظر انداز کر دیا لیکن تعجب تو یہ ہے کہ مولانا عرشی کی ''ژرف نگاہی'' نے بھی صرف ''نسخۂ بھوپال'' کہہ کر غالبؔ کے پہلے اُردو دیوان کے مسئلہ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔

غالبیات پر کام کرنے والے ان دونوں محققین کا یہ سکوت ہو سکتا ہے کہ آج زیادہ اہم نہ سمجھا

جائے لیکن آنے والے تحقیقی دور میں اس ''تشنگی'' کے صرف ایک ہی معنی لیے جائیں گے اور وہ یہ کہ ان اربابِ نظر کے نزدیک ان روایات کی کوئی اہمیت نہیں تھی جن کی بناء پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُردو دیوانِ غالب کا یہ پہلا نسخہ غالبؔ نے اپنے ایک ممتاز دوست میاں فوجدار محمد خان کی فرمائش پر لکھوا کر ان کی نذر کیا تھا۔ اور اس ''اعتنا و اغماز'' کے سلسلے میں جس استدلال کو آج بنیاد بنایا جائے گا، اس پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ اس کا جواب صرف یہی دیا جائے گا کہ غالبؔ کے خطوط اور دوسری تحریروں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان کے دوستوں میں فوجدار محمد خان بھی کوئی شخص گزرے ہیں۔ اور صحیح یہ بھی ہے کہ غالبؔ کے خطوط و مکاتیب کے جو مجموعے اب تک سامنے آسکے ہیں، ان میں کہیں بھی میاں فوجدار محمد خان کا نام نہیں ملتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالبؔ کے بھوپالی شاگردوں میں سوائے ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعتؔ شیروانی کے آج تک نہ کوئی خطوط خان محمد خان شہیرؔ نہ حکیم معشوق علی خان جوہرؔ، نہ حکیم اشفاق حسین خان ذکی مارہروی اور نہ خودیار محمد خان شوکتؔ کے نام سے سامنے آسکے ہیں۔ غالبؔ کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے والے شاید ہی اسے باور کرسکیں کہ مرزا اور ان کے شاگردوں کے درمیان سلسلہ مراسلت نہ رہا ہوگا۔

سابق فرماں روائے بھوپال نے اگر خاندانی مناقشات اور رقابتوں کی وجہ سے اس دیوان کو ''نسخہ حمیدیہ'' ہی تک محدود رکھنا مناسب سمجھا تب بھی ریسرچ و تحقیق کو ''احتیاط وخوردہ گیری'' کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔

غالبؔ کا یہ پہلا اُردو دیوان کس طرح بھوپال پہنچا، بھوپال کے معمر ادیب قیصرؔ بھوپالی کا بیان ہے:

> ''ان قلمی کتابوں ہی میں غالبؔ کا وہ مکمل دیوان بھی تھا جس کا اس وقت تک انتخاب نہیں ہوا تھا۔ نہایت ہی خوشخط ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ غالبؔ کا خط ہے وہ نستعلیق کے خوش نویس بھی تھے مگر ایسا کہنے والوں کا یہ حسنِ ظن ہے۔ فوجدار محمد خان نے اپنے ایک خوش نویس کو بھیج کر اس کی نقل کرائی تھی اسی نقل کو غالبؔ نے بطریق تصحیح دیکھا جہاں غلطی دیکھی اور دیکھتے وقت کسی مصرعہ یا شعر کا کوئی اچھا سا مضمون

ذہن میں آ گیا تو خوشخط کاٹ کر اپنے قلم سے پورا شعر یا مصرعہ لکھ دیا یا کوئی غزل لکھنے سے رہ گئی یا دورانِ کتابت میں کوئی تازہ غزل لکھی تو وہ ردیف کے اعتبار سے خوشخط دیوان کے صفحہ کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھ دی۔ اُن کا خط شکستہ تھا مگر اچھا تھا۔

حمیدیہ لائبریری میں اس دیوان پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی نظر پڑی۔ وہ بھوپال میں مشیر تعلیمات تھے، احمد آباد (بھوپال) میں رہا کرتے تھے۔ حمیدیہ لائبریری بھی انھیں کی تفویض میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے غالبؔ کے شیدائیوں میں تھے۔ مکمل دیوان دیکھ کر اچھل پڑے۔ بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگالیا۔ سر پر رکھا اور بنگلے پر لے آئے۔ ایک کاتب کو نوکر رکھا اور اس سے دیوان کی کتابت کرائی۔ ایک نہایت ہی مبسوط مقدمہ لکھا۔ یہ سب کام ابھی ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ...... اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کے بعد یہ کام مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات کے سپرد ہوا۔ کتابت ہو چکی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک دیباچہ لکھ کر کتاب میں شامل کر دیا۔ نواب صاحب بھوپال نے بھی ایک پیش لفظ لکھ کر اس کو شائع کر دیا۔ دیوان کا نام ''نسخۂ حمیدیہ'' رکھا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور مرزا غالبؔ کی تصویریں قلمی دیوان کے ایک صفحہ کا فوٹو ہے۔'' ۸

''نسخۂ حمیدیہ'' کے بھوپال پہنچنے کی یہ تفصیلات اس معمر بزرگ ادیب وصحافی کا بیان ہے جس نے برسوں ڈاکٹر بجنوری، ڈاکٹر وارثی، مفتی انوار الحق، مولانا عبدالرزاق البرامکہ، سر راس مسعود اور مولانا ابوالکلام آزادؔ کے ساتھ رہ کر ادبی خدمات انجام دی تھیں۔ اور ''نسخۂ حمیدیہ'' کی جدید ترتیب وتدوین اور اشاعت سے اتنا قریب تھا کہ اس کی بیان کی ہوئی روایات پر مبالغہ آرائی کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قیصرؔ بھوپالی کی عظمت کردار سے ذاتی طور پر مجھے ایک لگاؤ بھی رہا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ ان روایات کا احترام کرتا ہوں جن کی تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں۔ میاں فوجدار محمد خان کی قابلِ ذکر اولاد میں صرف نواب یار محمد خاں شوکتؔ (۱۶، جولائی، ۱۸۳۳ء، ۱۸، اگست، ۱۹۱۲ء) ایک خاص شہرت کے مالک تھے جن کا سرسری تذکرہ ''تلامذۂ غالبؔ'' میں کیا گیا ہے۔ باپ کی طرح انھیں بھی مرزا غالبؔ سے والہانہ عشق تھا۔ بہ نفسِ نفیس دلّی جا کر اُنھوں

نے مرزا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور غالبؔ کے بھوپالی شاگردوں میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ اور تذکروں کی سرزمین بھوپال میں ان کا تذکرہ ''فرح بخش'' پہلا تذکرہ ہے جو ۱۲۸۹ھ میں مطبع نظامی، کانپور میں چھپا تھا۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ صفحہ ۵۔۶، تمہید نسخۂ حمیدیہ۔

۲۔ ''غالبؔ کے پانچ شاگرد'' قسط نمبر ۱، مطبوعہ ''روزنامہ ندیم'' بھوپال ۵، فروری، ۱۹۵۶ء۔

۳۔ صفحہ ۵۹۔ تاریخ الملکہ بھوپال، مطبوعہ مطبع عالی جاہ لشکر گوالیار، ۱۳۱۳ھ۔

۴۔ ''غالبؔ کے پانچ شاگرد''، قسط نمبر ۱، مطبوعہ روزنامہ ''ندیم''، بھوپال۔ ۵، فروری، ۱۹۵۶ء۔

۵۔ تلامذۂ غالبؔ، ۲، ۱۷۔

۶۔ نواب فوجدار محمد خان نواب قدسیہ بیگم کے حقیقی بھائی تھے بھتیجے نہیں۔ (ن۔س)۔

☆ اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھوں ''نسخۂ حمیدیہ'' پٹنہ کی خدا بخش لائبریری پہنچا اور وہاں موجود ہے۔ (ن۔س)۔

۷۔ صفحہ ۴۷، ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، جمہوریت نمبر، ۱۹۵۸ء۔

۸۔ ''مرزا غالبؔ کے پانچ شاگرد''، قسط نمبر ۱، مطبوعہ روزنامہ ''ندیم''، بھوپال، ۵، فروری، ۱۹۵۶ء۔

(ماہنامہ ''فروغ اُردو'' (غالب نمبر)۔ لکھنؤ۔ دسمبر و نومبر ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۱ تا ۵۱)

•••

عبدالقوی دسنوی

نسخۂ حمیدیہ

نسخہ فوجدار محمد خاں کے ملنے کا ذکر پہلے آچکا ہے، جس زمانہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ریاست بھوپال میں ''مشیر تعلیمات'' کے عہدے پر فائز تھے...... انھیں دنوں وہ انجمن ترقی اُردو کی خواہش پر دیوان غالبؔ کی ترتیب واشاعت میں مصروف تھے۔

دراصل انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نیا نسخہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس میں مرزا کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کر کے شامل کرنے کا خیال تھا۔ یہ بھی کوشش کی جارہی تھی کہ مرزا کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھائے جائیں۔

سید ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ ''دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا بیضہ تیار ہوگیا۔'' [۱]

اسی دوران میں نظامی پریس بدایوں نے مرزا کے دیوان کا نیا نسخہ شائع کردیا۔ جس کی وجہ سے انجمن سے دیوان غالبؔ کی اشاعت کا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اسی زمانے میں لندن سے واپس تشریف لائے تو دیوان غالبؔ کی اشاعت کا کام بجنوری کے سپرد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھی اس کام کے کرنے کے لیے آمادگی اور دلچسپی ظاہر کی۔ عجیب اتفاق کہ ادھر وہ دیوانِ غالبؔ کی اشاعت کا انتظام کررہے تھے ادھر دیوان غالبؔ کا وہ نسخہ بھوپال میں مل گیا جو بظاہر گمشدہ تھا یا تلف ہوچکا تھا۔

سید ہاشمی صاحب تبصرے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اُردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخہ کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالبؔ کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانہ میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخہ میں نہیں ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام و کمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا نے دیوان چھپواتے وقت خارج کر دیا تھا۔''

ہاشمی صاحب بتاتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر بجنوری مرحوم غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح شائع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے تو خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جائے کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔'' ۲

لیکن افسوس کہ ابھی کتابت کا کام شروع ہی ہوا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا انتقال ہو گیا ۳ جس کی وجہ سے ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ خیال تھا کہ بجنوری مرحوم نئے سرے سے دیوان غالبؔ کا جائزہ لیں گے اور ''محاسن کلام غالبؔ'' میں اضافہ کے بعد اسے دیوان میں شامل کریں گے۔

ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد یہ کام مفتی انوار الحق کے سپرد ہوا۔ جنھوں نے ۱۹۲۱ء میں اسے نئے اور پرانے کلام کے ساتھ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شائع کیا۔ جس کی ضخامت ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کے پہلے ہی صفحہ پر نواب حمید اللہ خاں کا ''سرنامہ'' ہے۔

صفحہ۳ سے تمہید ہے جو مفتی انوار الحق صاحب (ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم بھوپال) کی لکھی ہوئی ہے اور ۲۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں قلمی نسخہ کی اہمیت اور نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی اشاعت کیوں ضروری تھی۔

تمہید کے بعد ''عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم'' کے عنوان سے صفحہ ۲۵ سے مفتی صاحب ہی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو صفحہ ۳۱ پر مشتمل ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس حصے میں عبدالرحمٰن بجنوری کے حالاتِ زندگی پر روشنی نہیں پڑتی ہے۔ ضرورت تھی کہ بجنوری کے حالاتِ زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی۔

صفحہ ۳۳ سے عبدالرحمٰن بجنوری کا وہ مضمون جو ۱۳۹ صفحہ تک ہے اس سے پہلے یہ مضمون رسالہ اُردو میں چھپ چکا تھا اور بعد میں ''محاسن کلام غالب'' کے نام سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مضمون کو تیسری مرتبہ اس نسخہ میں شائع کرنے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہ تھی۔ بہر حال نسخۂ حمیدیہ کو شائع کر کے نواب صاحب بھوپال نے بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے دنیائے اُردو ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گی۔ کاش یہ نسخۂ فوجدار محمد خاں الگ سے شائع کیا جاتا تو اس کی اور زیادہ اہمیت بڑھ جاتی۔

حوالہ وحواشی

۱۔ اردو ص ۳۰۷، اکتوبر ۱۹۲۲ء۔

۲۔ اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء۔

۳۔ ۷، نومبر 1918ء بھوپال میں وفات پائی اور یہیں سپرد ِخاک ہوئے۔

(''بھوپال اور غالب''۔ فروری ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۲۱ تا ۱۲۴)

•••

عبدالقوی دسنوی

بھوپال اور غالبؔ

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل اپریل فول کے سلسلے کی کڑی سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے پیچھے ریاست بھوپال کی مرزا غالبؔ کو بھوپال بلانے کی خواہش کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہاں ہمیشہ اہلِ علم اور اہلِ فن کو بلایا گیا اور ان کی سرپرستی کی گئی۔ چناں چہ مرزا غالبؔ کو بھی یہاں آنے کی دعوت دی گئی اور پُرزور کوشش کی گئی کہ وہ یہاں تشریف لائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کی شکست کے بعد دہلی کی سرزمین باشندگانِ دہلی کے لیے عرصے تک کے لیے تنگ ہوگئی تھی۔ لوگ موقع پا کر دہلی چھوڑ رہے تھے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر پناہ حاصل کر رہے تھے۔ مرزا غالبؔ کے لیے بھی یہ زمانہ بہت ہی پریشان کن تھا جس کا اظہار ان کے خطوط اور کلام سے ہوتا ہے۔ نومبر ۱۸۵۷ء کا ایک مکتوب ملاحظہ ہو جو حکیم غلام نجف کے نام ہے:

> ''میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، الٹا نہیں، کسی محکمے میں بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور

کہیں جانا تو بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔''

اس سلسلے کے چند شعر بھی بڑے دردناک ہیں:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کن مصیبتوں کا شکار تھے اور کس قدر پریشان تھے۔ شاید انھیں حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے اپنے ماموں فوجدار محمد خاں کو تحفے اور نذرانے کے ساتھ دہلی بھیجا تھا اور ان کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ سید امجد علی اشہری اپنی کتاب ''ایشیائی شاعری'' میں تحریر کرتے ہیں:

''مجھ کو دلّی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو دیکھ لینا، اس وقت سے ولیؔ و سوداؔ تک سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے۔ ۱۲۸۵ھ میں، میں نے حضرت میرزا صاحب کو الٰہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا اور ان کی شیوا بیانیوں سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشیں والیۂ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر مرزا سے دلّی چھٹنا مشکل تھا۔'' [1]

سید امجد علی اشہریؔ وامجدؔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں پیدا ہوئے۔ مشرقی علوم میں کمال حاصل

کیا۔نواب سکندر جہاں کے آخری زمانہ حکومت میں بھوپال آ کر ملازم ہوئے، ۱۳۰۴ھ میں بھوپال سے حیدرآباد چلے گئے۔شعروشاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔نواب صدیق حسن خاں سے بڑے اچھے تعلقات تھے ''ایشیائی شاعری''، ''حدیقہ شاہجہانی''، ''گلدستۂ اردو''، ''گلدستۂ سلطانی'' وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ ملنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''طبقۂ شعراء میں میرزا غالبؔ، میر انیسؔ، میرزا دبیرؔ، نواب میرزا داغؔ، منشی امیر احمد صاحب، امیرؔ مینائی، منشی اسمٰعیل حسین منیرؔ، جیسے لاثانی سخن طرازوں کے دیکھنے اور ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر حاصل ہوا۔'' ۲

نواب صدیق حسن خاں بہادر قنوج کے رہنے والے تھے۔ بھوپال آئے اور سرکار میں ملازمت حاصل کی۔ ان کا عقد نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کے ساتھ ہوا۔عربی فارسی کے باکمال عالم تھے،شعروشاعری سے بھی شغف تھا۔ فارسی میں نوابؔ تخلص کرتے تھے اور اُردو میں توفیقؔ تخلص تھا۔کئی اچھی کتابوں کے مصنف تھے۔ غالبؔ سے ان کی ملاقات کے سلسلے میں سید محمد علی حسن مآثر صدیقی میں تحریر کرتے ہیں:

''زمانہ آغازِ ملاقات میں والا جاہ ایک بار مرزا غالبؔ مرحوم کے دولت خانہ پر، خانہ بے تکلف سمجھ کر بلا اطلاع سابق یکا یک پہنچ گئے۔اس وقت یارانِ رنگین طبع کی محفل گرم تھی، مرزا صاحب نے ان کو دیکھ کر بے ساختہ یارانہ لہجہ میں کہا:

بیا برادر ، آؤ رے بھائی

اس وقت آپ کی کیا دعوت کروں۔ پہلے سے مجھ کو آپ کے آنے کا علم بھی نہ تھا۔خیر بیٹھیے۔ میں ضیافتِ طبع کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انھیں دنوں میں شاہی دربار کی فرمائش سے لکھی تھی اس کا مطلع یہ ہے:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والا جاہ اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ میرزا صاحب کا وہ دل آویز لب ولہجہ اور ان کے فصیح وبلیغ اشعار کی حسن ترتیب وادا اور لطائف شعریہ اور جزالت معنی کی تاثیر

کچھ ایسی دل میں پیوست ہوگئی ہے کہ جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو دل میں ایک عالم وجد و حال پیدا ہو جاتا ہے اور ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو لطف حاصل ہوتا ہے:

''تازہ تر از تازہ ترے می رسد''

مرزا غالبؔ بھوپال تشریف نہیں لائے لیکن نواب سکندر جہاں بیگم، فوجدار محمد خاں کو ان کی خدمت میں بھیجتی رہیں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں:

''پھوپھی وقتاً فوقتاً اپنے ماموں میاں فوجدار محمد خاں کو غالبؔ کی خدمت میں نذرانے کی رقوم دے کر بھیجا کرتی تھیں۔ اس آمد و رفت کا نتیجہ تھا کہ فوجدار محمد خاں کو غالبؔ نے اپنے اصل دیوان کا نسخہ اپنے قلم سے تصحیح کر کے نذر کیا جو اُن کے کتب خانے کی زینت بنا۔'' ۳؎

فوجدار محمد خاں بڑے علم دوست بزرگ تھے، ان کے کتب خانے کے بارے میں یوسف قیصر صاحب لکھتے ہیں:

''فوجدار محمد خاں کا کتب خانہ ہندوستان کے ان کتب خانوں میں تھا جن کو آج تک انگلیوں پر گنا کرتے ہیں۔ بے شمار قلمی نسخے تھے۔ فوجدار محمد خاں کو کتابوں سے عشق تھا۔ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی اچھی کتاب سن پاتے تھے، بے قرار ہو جاتے تھے اور جب تک وہ کتاب یا اس کی نقل ان کے کتب خانے میں نہ آجائے ان کو چین نہیں آتا تھا۔ ان کی دولت و امارت کا یہی ایک مصرف تھا...... ان کے یہاں بہت سے خوش نویس اور خطاط مستقل ملازم تھے جو کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ کوئی موضوع علم و فن کا ایسا نہیں تھا، جس کے دو چار نسخے ان کے یہاں نہ ہوں۔ غرضیکہ کتب خانہ لاجواب تھا۔ فوجدار محمد خاں کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ ان کے اوقات فرصت کا مشغلہ یہی ایک کتب بینی تھا۔'' ۴؎

دیوانِ غالبؔ کا وہ قلمی نسخہ جسے خود مرزا نے فوجدار محمد خاں کو عنایت کیا تھا اس کے بارے میں یوسف قیصر بتاتے ہیں:

''ان قلمی کتابوں ہی میں غالبؔ کا وہ مکمل دیوان بھی تھا، جس کا اس وقت

انتخاب نہیں ہوا تھا، نہایت ہی خوش خط ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ غالبؔ کا خط ہے مگر ایسا کہنے والوں کا یہ حسن ظن ہے۔ فوجدار محمد خاں نے اپنے ایک خوش نویس کو بھیج کر اس کی نقل کرائی تھی۔ اسی نقل کو غالبؔ نے بطریق اصلاح دیکھا، جہاں غلطی دیکھی اور دیکھتے وقت کسی مصرعہ یا شعر کا کوئی اچھا سا مضمون ذہن میں آ گیا تو خوش خط کو کاٹ کر اپنے قلم سے پورا شعر یا مصرعہ لکھ دیا یا کوئی غزل لکھنے سے رہ گئی یا دورانِ کتابت میں کوئی تازہ غزل لکھی تو وہ ردیف کے اعتبار سے خوش خط دیوان کے صفحہ کے حاشیہ پر اپنے قلم سے لکھ دی۔'' ۵

یہی نسخۂ فوجدار محمد خاں جو کہ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے، ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں متداول دیوان بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اسے مفتی انوار الحق صاحب نے جو اس زمانے میں ناظم تعلیمات تھے، مرتب کر کے شائع کیا ہے جس میں ''سرنامہ'' کے عنوان سے نواب حمید اللہ خاں نے اپنی مسرت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

میں دلی مسرّت سے مرزا غالبؔ دہلوی کے دیوان اُردو کا یہ جدید نسخہ ابنائے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور مجھے اپنی اس سعادت پر فخر ہے کہ اس شہنشاہ اقلیم سخن وری کے عہدِ شباب کی نازک خیالی اور نکتہ سنجی کے یہ نقشِ اوّل جو سو برس سے کنج خمول اور گوشہ ذہول میں پڑے تھے آج میرے ذریعہ سے ملک میں رونما اور جلوہ پیرا ہوتے ہیں اُردو جو بلا اختلاف مذہب وملت ہم سب کی مشترکہ زبان ہے اور جس پر ہماری ساری ترقیوں کا انحصار ہے، اپنے مجموعہ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا ناز کرے بجا ہے اور اربابِ فہم ونظر بلا امتیاز قوم ووطن اس خلاق معانی کی نغمہ سرائی اور مضمون آفرینی کے دلدادہ ہیں اس کی جس قدر، قدر کریں زیبا ہے کیوں کہ اس میں کلام نہیں کہ:

از تازگی بہ دہر مکرر نمی شود
نقشے کہ کلک غالب خونیں رقم کشد'' ۶

صفحہ ۳ر سے تمہید ہے جو مفتی انوار الحق صاحب مرتب نسخۂ حمیدیہ نے تحریر فرمائی ہے۔ صفحہ ۲۵ر پر ''عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم'' کے عنوان سے مرتب نسخۂ حمیدیہ کا ہی مضمون ہے۔ صفحہ ۳۳ر سے عبدالرحمٰن بجنوری کا وہ مضمون ہے جسے انجمن ترقی اُردو کے ایما سے اُنھوں نے لکھا تھا اور جو ان کے انتقال کے بعد اُردو جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اور پھر محاسنِ کلامِ غالب کے نام سے الگ سے کتابچہ شائع ہوا۔

مفتی انوار الحق صاحب ''نسخۂ فوجدار محمد خاں'' کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے: ''دیوانِ ہٰذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی خوش خط'' اور اس کے سامنے ان کی مہر ہے اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے ''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت''۔ اس کا خط پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ جگہ جگہ فوجدار محمد خاں کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالبؔ کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے، اُنھوں نے خود جا بجا اصلاحیں کی ہیں۔'' ؎

اس دور میں عبدالرحمٰن بجنوری کا شمار ان چند نوجوانوں میں ہوتا تھا جنھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس سے صحیح فائدہ اُٹھانے کے خواہش مند تھے۔ مسئلہ تعلیم سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ یورپ سے واپسی پر ایک کالج کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے۔ بھوپال کی بیگم صاحبہ نے بھی اس سے دلچسپی لی اور ایک اچھی رقم اکٹھا کر دی۔ شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی دونوں ان کے

ہم خیال تھے۔ بجنوری مرحوم کی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی ابتدا ہونے والی تھی تو اس کے پرنسپل کے لیے بجنوری مرحوم کا انتخاب ہوا تھا۔

محاسنِ کلامِ غالب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی نظر غالبؔ پر کیسی تھی۔ جب نسخہ فوجدار محمد خاں کا انھیں علم ہوا تو انھیں کس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے غالبؔ کے شیدائیوں میں سے تھے۔ مکمل دیوان دیکھ کر اچھل پڑے بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور اپنے بنگلے پر لے آئے۔ ایک کاتب کو نوکر رکھا اور اس سے دیوان کی کتابت کرائی۔'' ۸

سید ہاشمی صاحب نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اُردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جب کہ مرزا غالبؔ کی عمر صرف ۲۵ ربرس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا، لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانہ میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔'' ۹

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس نسخے کو بہت اہتمام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ اس کی کتابت کا کام شروع کر دیا تھا اور اس کی طباعت کے سلسلے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ طاعون جیسا موذی مرض پھیلا اور عبدالرحمٰن بجنوری اس مرض کے شکار ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کا ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں:

> ''جب مرزا غالبؔ کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بے تاب ہو گئے اور اس

اصل نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے، اعلیٰ قسم کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابک دست مصور سے تصویروں کی فرمائش، ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہ کار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔" [10]

یہ ایک حقیقت ہے کہ نسخۂ فوجدار خاں کا دریافت ہونا غالبیات کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس پر دنیائے اُردو اور خاص طور سے سرزمین بھوپال جس قدر ناز کرے بجا ہے چوں کہ اس نسخے کی اشاعت کا انتظام نواب حمید اللہ خاں نے کیا اور اگر چہ اس طرح شائع نہیں کیا جاسکا جیسا ہونا چاہیے تھا یا جس طرح سے عبدالرحمٰن بجنوری چاہتے تھے، پھر بھی اس کی اہمیت کا اعتراف بجاطور پر سارے ہندوستان نے کیا۔ محمد عبدالرحمٰن چغتائی نے نقشِ چغتائی "نذر" کرتے ہوئے نواب حمید اللہ خاں کی علم دوستی کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں اپنی اس کوشش کو افتخار الملک ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ کی علم دوستی اور ادب نوازی کو نہایت خلوص کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔"

مرزا غالبؔ کے تقریباً نو (۹) شاگردوں کا تعلق بھوپال سے رہا ہے جن کا تعارف مختصراً حسبِ ذیل ہے:

مولوی ابوالفضل محمد عباس رفعتؔ:

محمد عباس رفعتؔ کی پیدائش ۳۰، جنوری ۱۸۲۶ء کو بنارس میں ہوئی۔ ان کے والد احمد شیروانی عربی زبان کے عالم بزرگ تھے۔ رفعتؔ نے بھی عربی فارسی کی بڑی اچھی تعلیم پائی تھی۔ عربی کی تعلیم اپنے والد محترم سے اور فارسی میر خیرات علی خاں مشتاقؔ خیرآبادی سے حاصل کی تھی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے "مرزائی خانی" اور "ابوالفضل دوراںؔ" کے خطابات ملے تھے۔ دہلی میں

انشائے نور چشم، شہنشاہ نامہ، تذکرۂ فرح بخش، فسانۂ رحمت، مراسلاتِ شوکت وغیرہ تقریباً پندرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۸، اگست ۱۹۱۲ء کو بھوپال ہی میں انتقال ہوا۔

حافظ خان محمد خاں شہیر:

یہ غلام محمد خاں کے فرزند تھے، ہوش سنبھالا تو طبیعت کی موزونی کی وجہ سے کسی اچھے اُستاد کی نگرانی کی ضرورت محسوس کی۔ ان کی خوش نصیبی تھی کہ غالب جیسا اُستاد انھیں مل گیا۔ عرصے تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔

شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کو جب کراؤن آف انڈیا (Crown of India) کا خطاب ملا تو شہیر نے ایک قصیدہ کے ذریعہ اظہارِ مسرت کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے قصیدہ پسند فرمایا اور شہیر کو ''افتخار الشعراء'' کا خطاب دیا۔

شہیر بھوپال آکر عام طور سے فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے۔ نواب صدیق حسن کے صاحب زادے نور الحسن کلیم اور علی حسن کے اتالیق بھی رہے تھے ان کے علاوہ یہاں شہیر کے اور شاگرد تھے۔

ان کا انتقال ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں ہوا اور سیفیہ کالج کے جانب شمال قلندر شاہ کے تکیہ میں مدفون ہوئے۔

منشی ارشاد احمد میکش، محوی:

میکش شیخ عبدالقادر کے فرزند تھے۔ قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ ابتدائی عمر دہلی میں گزاری۔ فارسی میں محوی اور اُردو میں میکش تخلص کرتے تھے۔ غالب اور بعد میں صہبائی سے اصلاح لیتے تھے۔ آخری زمانے میں بھوپال چلے آئے تھے۔ یہاں نواب دولہ میاں کے یہاں ملازم رہے۔

حکیم محمد معشوق علی خاں جوہر شاہجہاں پوری:

جوہر اصغر علی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۸۵۲ء میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ پہلے گھر پر، پھر دہلی اور لکھنؤ میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں بھوپال تشریف

لائے۔ یہاں طبابت اور پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۸ء تک ان کا قیام بھوپال ہی میں رہا، پھر حیدرآباد چلے گئے جہاں سے ۱۹۲۵ء میں اپنے وطن شاہجہاں پور گئے۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔

بھوپال میں جوہر کے بہت سے شاگرد تھے۔ یوسف قیصر صاحب انھیں میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے یہاں شعروشاعری کا بہت اچھا مذاق پیدا ہوگیا تھا۔ لالہ سری رام خمخانۂ جاوید حصہ دوم میں ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''عنفوانِ شباب میں دہلی آکر نواب اسداللہ خاں غالبؔ کے فیضِ صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور فخرِ تلمذ بھی حاصل کیا تھا۔ کئی ماہ تک ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اصلاح لی......''

مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ:

عزیزؔ بنارس کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں بودوباش اختیار کرلی تھی۔ مرزا غالبؔ کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ کافی عرصے تک مرزا کی خدمت میں رہے اور ان ہی کے ذریعہ قلعہ تک رسائی ہوئی۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''احترام الدولہ حاذق الزماں حکیم احسن اللہ خاں صاحب ثابت جنگ نے حضرت بہادر شاہ سے بہ نذر مرثیہ وقصیدہ، خلعت چار پارچہ معہ گوشوارہ وخطاب سراج الشعراء وسلطان الذاکرین دلوایا تھا۔'' [۱۱]

مرثیہ گوئی سے بے حد دلچسپی تھی۔ بڑے پُرگو تھے۔ زندگی کے آخری زمانے میں بہ تلاشِ روزگار بھوپال تشریف لائے۔ یہیں ان کا انتقال (۱۸۷۲ء) ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔

سید احمد حسن قنوجی۔ عرشیؔ:

نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی تھے۔ تاریخ پیدائش ۱۹، رمضان ۱۲۴۶ھ ہے۔ ابتدائی تعلیم قنوج میں ہوئی پھر مختلف جگہوں میں مختلف اساتذہ سے تعلیم پائی۔

لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے اور حضرت غالبؔ سے مشورۂ سخن کرتے۔'' ۱۲

حج بیت اللہ کے لیے اکیلے نکل پڑے اور بڑودہ میں بیمار ہوئے وہیں ۱۲۷۷ھ میں انتقال کیا۔ ان کا کلام فصیح اور بلیغ ہوتا تھا۔

مولوی محمد ولایت علی خاں عزیزؔ:

صفی پور میں ۸، مارچ ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوئے اور ۲، جولائی ۱۹۲۸ء کو صفی پور ہی میں انتقال کیا۔ فارسی میں مرزا غالبؔ سے استفادہ کیا تھا جس کا اقرار اُنھوں نے اس طرح کیا ہے:

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اس زباں میں ہوں اس ذوالجلال کا
ہاں نظم فارسی میں ہوں غالبؔ سے مستفید
منت گزار لطف ہوں، دو تین سال کا
بھیجی تھی ایک نثرِ مطول بھی چار جزو
ہوں معتقد میں دونوں میں ان کے کمال کا
پس نثر میں بھی مجھ کو تلمذ جو ہے تو کیا
اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

اُردو نظم میں طور تجلی، نور ولایت، نظم دلفریب کتابیں موجود ہیں۔ اُردو اور فارسی نثر میں بھی مختلف چیزیں تحریر کی ہیں۔ ان میں ایک ''پیش کش شاہجہاں'' ہے جو اُنھوں نے والیہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ۱۳

حکیم اشفاق حسین زکی مارہروی:

زکی ۱۸۳۷ء میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر دوسرے مقامی اساتذہ سے بھی تعلیم پائی۔ آپ ۱۹۰۷ء میں

بھوپال تشریف لائے اور محکمۂ بندوبست اور پھر جمع بندی کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔۱۴، ۱۵، اکتوبر ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا اور بھوپال میں تکیہ بھولا شاہ میں سپرد خاک ہوئے۔عبدالقدیر آزادان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''حکیم صاحب (زکی) ممدوح ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں جن کی زیارت کے لیے لوگ ترپتے ہیں۔آپ حضرت غالبؔ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں ... آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ ذیل کی غزل سے لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت غالبؔ کی دشوار گزار زمینوں پر غزل سرائی آپ ہی کا حق ہے۔'' [۱۴]

ملاقاتی......

مولوی جمال الدین خاں گمنامؔ:

گمنامؔ نے ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی۔شاہ رفیع الدین کے حلقۂ درس میں رہے، اس لیے ان کی زندگی مذہبی تھی۔شاہ صاحب کے کہنے پر بھوپال آئے اور نواب سکندر جہاں کے دربار میں تیس روپے ماہوار پر رکھ لیے گئے۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۲۶۰ھ میں مدارالمہام کے عہدے پر پہنچے۔چالیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی۔مومنؔ، ذوقؔ اور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ سے خصوصی تعلقات تھے۔۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔نواب شاہجہاں بیگم نے تاریخ وفات کہی:

''بود مہر آسمان علم و دین عدل و شرع''

مطالب الغالب (شرحِ دیوانِ غالبؔ)

ممتاز احمد سہاؔ مجددی نے غالبؔ کی یہ شرح بفرمائش مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری بازار لاہور تحریر کی تھی، جو کریمی پریس سے شائع ہوئی یہ شرح ۱۶/۳۰×۲۰ کے ۳۹۹ رصفحات پر مشتمل ہے۔ابتدا میں صفحہ ۳ سے ۳۱ تک سہاؔ صاحب کا لکھا ہوا مبسوط مقدمہ ہے۔سنہ طباعت ۱۹۲۸ء ہے۔

ممتاز احمد مجددی ۹، فروری ۱۸۹۳ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ سلیمانیہ اور جہانگیریہ بھوپال میں ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں بلند شہر چلے گئے۔ وہیں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر علی گڑھ میں انٹرنس تعلیم حاصل کی۔ تقریر کرنے کا فن بھی حاصل کیا۔ ان کی ذہانت دیکھ کر نواب وقار الملک نے تین سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ علی گڑھ سے حیدر آباد چلے گئے پھر ۱۹۲۱ء میں بھوپال واپس آئے، یہیں ''مطالب الغالب'' تحریر کی۔ ۱۹۲۲ء میں حکیم شجاع کی خواہش پر لاہور گئے اور رسالہ ''ہزار داستان'' میں کام کرنے لگے۔ لاہور سے خیر پور گئے جہاں نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں بھوپال آئے۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن چند سال بعد یعنی ۲۷، دسمبر ۱۹۴۷ء کو معمولی علالت کے بعد وفات پائی۔

سہا مجددی کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کا کلام تلف ہو گیا، البتہ ان کے کلام کا کچھ حصہ مختلف رسائل میں ملے گا۔

بھوپال والی غزل:

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو
تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشم مست ہو اور دورِ جام ہو
بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہو جریم ہے محرم کا رازدار
میں سر بکف ہوں تیغِ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور لوں کبھی
پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو
وہ دل کہاں کہ حرفِ تمنا ہو لب شناس
ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو

گھس مل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزم غیر ہی میں ہوں پر اژدہام ہو
اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اُٹھوں
مجھ پر جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو
پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل ابوالرشاد مولوی محمد ابراہیم خلیل صاحب نے جو سابق نارمل ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھوپال کے اُردو عربی اور فارسی شعبہ کے صدر تھے، کہی تھی اور گوہر تعلیم بھوپال کے اپریل ۱۹۳۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر اپریل فول لکھ دیا گیا تھا۔ جوہر قریشی نے اسے ماہنامہ دین و دنیا دلّی میں ''مرزا صاحب کی ایک غیر مطبوعہ غزل'' کے عنوان سے شائع کرائی۔ اس سے اپریل ۱۹۳۹ء میں ہمایوں نے لیا اور جناب مالک رام نے ہمایوں سے اپنے مرتب کردہ دیوان غالبؔ میں شامل کر دیا اور یہاں سے نسخہ عرشی میں بھی شامل ہوگئی اور اس طرح ایک لطیفہ ادبی تحقیق کے لیے ایک حادثہ بن گیا۔

آخر میں ایک لطیفہ اور سن لیجیے۔ یہ لطیفہ بھوپال کے ایک صاحب کی غالبؔ سے ملاقات کے سلسلے کا ہے جسے ایچ۔ ایم حنیف صاحب نے اپنے مضمون GHALIB [۱۵] میں پیش کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ترجمہ: ''ایک مرتبہ بھوپال کے ایک صاحب مرزا سے ملنے آئے۔ حسبِ معمول وہ شغل سے کر رہے تھے۔ اُنھوں نے مہمان کی طرف بھی گلاس بڑھایا۔ مہمان کو علم نہ تھا کہ مرزا شراب بھی پیتے ہیں چناں چہ اُنھوں نے اسے کوئی بے ضرر مشروب سمجھ کر گلاس لے لیا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ یہ شراب ہے۔ بھوپالی مہمان نے فوراً ہی گلاس رکھ دیا اور معذرت کے انداز میں بولے کہ غلط فہمی میں، میں نے اسے ہاتھ لگا دیا۔ مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ ''آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی غلطی آپ کی نجات کا ذریعہ بن گئی۔'' [۱۶]

حوالہ وحواشی:

۱۔ ص ۱۲۸۔
۲۔ خمخانۂ جاوید، جلد اول، تقاریظ صفحہ ۶۴۔
۳۔ اُردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ص ۷۰۔
۴۔ ''غالب کے پانچ شاگرد''، قسط نمبر ۱، روزنامہ ندیم بھوپال، ۵، فروری ۱۹۵۶ء۔
۵۔ ''مرزا غالبؔ کے پانچ شاگرد''، ندیم، بھوپال، ۱۵، فروری ۱۹۵۶ء۔
۶۔ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۔
۷۔ نسخۂ حمیدیہ، ص ۵۔
۸۔ ''مرزا غالب کے پانچ شاگرد'' قسط نمبر ۱، ۵، فروری، ۱۹۵۶ء، ندیم، بھوپال۔
۹۔ سہ ماہی اُردو، اکتوبر، ۱۹۲۲ء۔
۱۰۔ مقدمات عبدالحق، اضافہ شدہ ایڈیشن، ص ۳۷۲۔
۱۱۔ خمخانۂ جاوید، جلد پنجم، ۵۸۷۔
۱۲۔ خمخانۂ جاوید۔
۱۳۔ تلامذۂ غالبؔ، مالک رام۔
۱۴۔ ماہنامہ زرنگار، بھوپال، مارچ ۱۹۲۹ء، غالبؔ نام اورم ص ۳۵۔
۱۵۔ الٰہ آباد ریویو (انگریزی) اکتوبر ۱۸۹۱ء۔
۱۶۔ نیادور، لکھنؤ۔ (غالب نمبر)۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔

(ماہنامہ ''نیادور'' (غالب نمبر)۔ لکھنؤ۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۳۶ تا ۱۴۲)

◆◆◆

ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال)

دیوانِ غالبؔ (نسخۂ بھوپال) کی کہانی

کتابت سے گمشدگی تک

دیوانِ غالب کا وہ قلمی نسخہ جو بھوپال میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں محفوظ رہا، غالباً پہلا ایسا نسخہ تھا جسے غالبؔ نے صاف نقل کروایا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اور جناب امتیاز علی عرشی جنھوں نے اس نسخہ کو دیکھا ہے۔ بتاتے ہیں کہ اس میں قصیدوں اور غزلوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دولوحیں تھیں جو سنہری کام سے مزین تھیں۔ [1] جدولیں رنگین اور طلائی اور باریکا لاجوردی تھا۔ [2] اور دیوان صاف نستعلیق خط میں تحریر تھا۔ [3] عرشی صاحب کا قیاس ہے کہ یہ نسخۂ غالب کے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ [4] لیکن جس اہتمام کے ساتھ یہ نسخہ تیار کیا گیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے خصوصیت کے ساتھ کسی اہم فرد کے لیے نقل کرایا گیا تھا، محض شاعر کا اپنا نسخہ نہ تھا۔

متن میں مندرجہ کلام کے خاتمہ پر کاتب نے تاریخ اختتام کتابت ۵، صفر ۱۲۳۷ھ/ ۱۸۲۱ء تحریر کی ہے۔ [5] اور ۱۸۲۱ء تک غالبؔ کی مالی حالت جو دہلی آنے کے بعد رفتہ رفتہ بگڑتی جارہی تھی، خاصی بگڑ گئی تھی ان کے چچا سسر نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ ولوہارو سے انھیں پنشن کی جو رقم ملتی تھی وہ پہلے ہی ناکافی تھی کہ اسی دوران نواب کی جاگیر کے بارے میں نواب اور ان کے بیٹوں کے درمیان کشمکش کے آثار پیدا ہوئے اور اس کے نتیجہ میں ۱۸۲۲ء میں

نواب احمد بخش نے سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو جو ایک میواتی عورت کے بطن سے تھے تمام جائیداد کا وارث قرار دے دیا۔ ۶ شمس الدین احمد خاں سے قرابت داری کا وہ لحاظ جو نواب احمد بخش رکھتے تھے، متوقع نہیں تھا بلکہ شمس الدین کا غالؔب کی جانب رویہ بھی کچھ مخالفانہ تھا۔ ۱۸۲۱ء میں حالات کا رخ دیکھتے ہوئے غالب نے ہوسکتا ہے کسی اور ذریعہ سے مالی امداد حاصل کرنے کی مساعی شروع کی ہوں اور کسی خاص توقع کے پیش نظر انھوں نے اپنا دیوان صاف نقل کرایا ہو۔ غالؔب یہ دیوان کس کو پیش کرنا چاہتے تھے اس کے بارے میں تو کوئی حوالہ نہیں ملتا لیکن بعد میں یہ کسی ایسے شخص کے پاس رہا ہے جسے غالؔب برابر اپنا تازہ کلام بھیجتے رہے ہیں یا وہ خود غالؔب سے ان کا نیا کلام حاصل کرتا رہا ہے، کیوں کہ مخطوطہ کے حاشیے اور خاتمہ پر موجود سادہ اوراق پر کافی بڑی تعداد میں اضافے کیے گئے ہیں۔

یہاں یہ دیکھنا ہے کہ غالؔب کے احباب میں سے وہ کون سے ایسے اشخاص ہوسکتے ہیں جو غالؔب کے کلام کو جمع کرنے میں اتنی گہری دلچسپی رکھتے ہوں کہ وہ ہر نئے اضافے سے پوری طرح باخبر رہنا چاہتے ہوں۔ چناں چہ اس سلسلہ میں سب سے نمایاں نام غالؔب کے برادر نسبتی (امراؤ بیگم کے بھائی) میرزا علی بخش خاں رنجوؔر (۱۸۰۱ء-۱۸۶۳ء) کا ہے جنھوں نے ۱۸۲۵ء میں غالؔب سے فرمائش کی کہ وہ فارسی خط و کتابت میں مستعمل القاب و آداب اور خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے یکجا کردیں۔ ۷ خود رنجوؔر اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حسب الالتماس من ورقے چند از آداب و القاب و شکر رسید خطوط و شکوہ عدم رسی مکاتبات رقم فرمودہ بمن عطا نمود۔ آن اوراق را چوں تعویذ بباز و بستم و آن نگاشتہ ہا را در فن تحریر دستور العمل خود ساختم۔'' ۸

بعد میں رنجوؔر ہی نے غالؔب کی فارسی تحریرات کو یکجا کر کے ''پنج آہنگ'' مرتب کی جس میں مذکورۂ بالا القاب و آداب وغیرہ کے علاوہ انھوں نے مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی، اشعار مکتوبی منتخب از دیوان غالؔب، غالؔب کی تحریر کی ہوئی تقاریظ وغیرہ اور ان کے فارسی خطوط شامل کیے۔ ''پنج آہنگ'' کے ہی ابتدائیے میں رنجوؔر نے غالؔب سے گہرے تعلق اور ان کی تحریرات سے اپنی دلچسپی کا

پورا اظہار کیا ہے۔ خود غالبؔ کو رنجورؔ سے جو خصوصیت تھی وہ ان کے نام لکھے گئے خطوط سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ۹ پنشن کے قضیے میں بھی رنجورؔ، غالبؔ کے خاص ہم راز و معاون تھے اور قیام کلکتہ کے دوران بھی غالبؔ، رنجورؔ کو حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ غالبؔ سے اس قربت اور ان کی تحریرات سے اتنے گہرے شغف کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ علی بخش خاں رنجورؔ کے پاس رہا ہوگا۔

نسخہ میں کیے گئے اضافوں کے بارے میں مفتی انوار الحق اور عرشی صاحب کی رائے ہے کہ وہ غالبؔ نے خود اپنے قلم سے کیے ہیں۔ ۱۰ لیکن ڈاکٹر سید عبداللطیف بعض ماہرین کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اضافے کسی اور خط میں ہیں۔ ۱۱ اس کا امکان ہے کہ یہ اضافے وقتاً فوقتاً یا تو خود رنجورؔ نے کیے ہوں یا انھوں نے کسی سے کروائے ہوں۔ رنجورؔ کا اس زمانے میں قیام فیروز پور میں تھا لیکن جیسا کہ ''پنج آہنگ'' کے ابتدائیے سے معلوم ہوتا ہے، وہ دہلی آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۲ اس لیے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ بعض مواقع پر انھوں نے غالبؔ کی اپنی بیاض کی مدد سے اپنے اس نسخہ کو مکمل بنائے رکھنے کی کوشش کی ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ''حاشیے کی بعض تحریریں خوشنما نستعلیق خط میں ہیں اور بعض شکستہ خط میں'' ۱۳ عرشی صاحب یہ بتاتے ہیں کہ نسخہ کے آخر میں شامل سادہ اوراق میں جو غزلیں اضافہ کی گئی ہیں ان کے خاتمہ پر تحریر ہے ''تمام شد، کار من نظام شد، رب یسر و تمم بالخیر'' ۱۴ یہ خاتمہ کسی پیشہ ور کاتب کا معلوم ہوتا ہے لیکن بعض اضافے بدنما خط میں ہیں اور ان میں املا کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً ''تقاضا'' کی بجائے ''تقضہ''، ''بہانہ'' کو ''بہانے''، ''مضائقہ'' کو ''مضاعقہ''، ''محک'' کو ''مہک'' اور ''بھاگیں گے'' کو ''بھاگے نگے'' لکھا ہے۔ ۱۵ اس کے سوا ڈاکٹر سید عبداللطیف کہتے ہیں ''کاتب نے حاشیے پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کردیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں'' ۱۶ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی وقت رنجورؔ کو غالبؔ کی بیاض سے فائدہ اٹھانے کے لیے خاصا وقت ملا ہے۔ چناں چہ انھوں نے نئی غزلوں کو کاتب سے خوشخط نقل کروالیا ہے لیکن کبھی یہ اضافے بہت عجلت میں کیے گئے ہیں اور کسی کم استعداد والے

شخص کو بول بول کر لکھوایا گیا ہے جس کی وجہ سے املا میں غلطیاں ہوتی رہیں۔ اسی طرح عجلت کی وجہ سے بعض ایسی غزلوں کو دوبارہ لکھ لیا گیا ہے جو پہلے سے درج تھیں لیکن کاتب کو ان کی موجودگی کی تصدیق کرنے کا وقت نہ تھا۔ اس کے علاوہ متن کے اشعار میں اصلاحیں یا حاشیے پر معمولی اضافے خود غالبؔ کے قلم سے بھی ہو سکتے ہیں۔

اس نسخے کے شروع میں موجود سادہ اوراق میں وہ غیر منقوط خط نقل ہے جو غالبؔ نے مولوی فضل حق کو تحریر کیا تھا۔ خط بعد میں غالبؔ نے ''خاتمہ گل رعنا'' میں شامل کیا اور اسی حوالے سے اسے ''پنج آہنگ'' میں درج کیا گیا ہے۔ [۱۷] لیکن دیوان میں منقول خط کے خاتمہ پر ''محمد اسد اللہ'' نام بھی درج ہے۔ [۱۸] جو کلیات نثر میں تحریر نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خط ''پنج آہنگ'' یا ''گل رعنا'' سے نہیں بلکہ بہت ممکن ہے کہ اصل خط یا اس کے مسودہ سے نقل کیا گیا ہے۔ غالبؔ نے یہ خط مولوی فضل حق کو فیروز پور سے لکھا تھا جہاں غالبؔ اپنی پنشن کے معاملے میں بات کرنے کے لیے نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے ہوئے تھے نواب ان دنوں الور میں تھے اس لیے ان کے انتظار میں غالبؔ کو کچھ عرصے فیروز پور ہی میں قیام کرنا پڑا۔ [۱۹] فیروز پور میں اسی قیام کے دوران ہو سکتا ہے کہ مولوی فضل حق کے نام غالبؔ کے خط کو اس کی اصل یا مسودہ سے رنجورؔ نے اپنے دیوان میں نقل کرایا ہو۔ اسی موقع پر ممکن ہے رنجورؔ نے اپنا نسخہ غالبؔ کو پھر پیش کیا ہو اور اس میں مزید اضافوں یا اصلاحوں کی خواہش ظاہر کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حاشیوں وغیرہ پر بے ربط اضافوں اور املا میں غلطیوں وغیرہ کو دیکھتے ہوئے خود غالبؔ نے یا رنجورؔ نے ایک اور صاف نقل تیار کرنے کی تجویز رکھی ہو اور اس کے لیے ان غزلوں پر بھی نشان لگائے گئے ہوں جنھیں نئے نسخے سے حذف کرنے کا خیال تھا۔

عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے:

> ''کچھ غزلوں کے آغاز کی جگہ سادہ جگہوں میں لفظ غلط لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر حرف ''ع'' اس طرح لکھا ہے کہ اس کا سر مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخہ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔'' [۲۰]

یہ نیا صاف کیا ہوا نسخہ وہ نسخہ ہو سکتا ہے جو اب لاہور یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور ''نسخۂ شیرانی'' کے نام سے موسوم ہے۔ عرشی صاحب نے ''نسخۂ شیرانی'' کو ''نسخۂ بھوپال'' کا مبیضہ قرار دیا ہے۔ ۲۱ اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کی تصدیق کی ہے کہ نسخہ شیرانی کے متن میں نسخۂ بھوپال میں موجود ساری اصلاحات و اضافوں کو شامل کر لیا گیا ہے گو آٹھ ایسی غزلیں بھی نسخۂ شیرانی کے متن میں داخل ہیں جو نسخۂ بھوپال میں درج نہیں ہیں۔ ۲۲ اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں موزوں مقام پر گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ان آٹھ غزلوں کو رنجور نے جداگانہ محفوظ کر لیا ہو اور نئے نسخہ کی کتابت کے وقت اس میں انھیں شامل کر دیا گیا ہو۔

غالبؔ نے فیروز پور کا یہ سفر غالباً ۱۸۲۶ء میں کیا ہے کیوں کہ اسی سال ان کے خسر مرزا الٰہی بخش معروفؔ کا انتقال ہوا تھا اور کیوں کہ ان کی پنشن شمس الدین خاں کی جاگیر سے متعلق ہو گئی تھی اور شمس الدین خاں سے غالبؔ کے تعلقات مخالفین جیسے تھے اس لیے پنشن کی ادائیگی میں بے قاعدگی شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے غالبؔ نے نواب احمد بخش خاں سے ملنے کے لیے فیروز پور کا سفر کیا۔ ۲۳ اس طرح اگر یہ فرض کیا جائے کہ ۱۸۲۶ء میں فیروز پور کے اس سفر کے دوران ''نسخۂ شیرانی'' کی کتابت شروع ہو گئی اور نسخۂ بھوپال میں اضافے بند ہو گئے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں اس کی کتابت (یعنی ۱۸۲۱ء) کے بعد سے پانچ سال کے اضافے اور اصلاحات شامل ہیں۔

غالبؔ وسط ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۴ اور لکھنؤ، کانپور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے۔ نسخۂ شیرانی کے حاشیے پر دو غزلیں درج ہیں جن پر ''از باندہ فرستادند'' اور ''از باندہ رسید'' لکھا ہے۔ ۲۵ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک نسخۂ شیرانی کی کتابت مکمل ہو چکی تھی، اسی وجہ سے ان غزلوں نے بجائے متن کے حاشیے میں جگہ پائی۔ یہ بھی گمان غالب ہے کہ یہ غزلیں علی بخش خاں رنجورؔ کو بھیجی گئی ہوں گی۔ رنجورؔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، پنشن کے اس قضیے میں غالبؔ کے ہم راز و خیر خواہ تھے اور اس سلسلے میں ان کے دو خط جو انھیں کلکتہ سے لکھے گئے ہیں ''کلیاتِ نثر غالبؔ'' میں درج ہیں۔ ۲۶ چناں چہ یہ ممکن ہے کہ غالبؔ، رنجورؔ کو اپنے سفر کی دوسری منازل سے بھی خطوط روانہ کرتے رہے ہوں اور کلامِ غالبؔ سے ان کا

شغف دیکھتے ہوئے انھیں اپنی تازہ غزلیں بھی ارسال کی ہوں۔ اسی دوران نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد رنجورؔ نے شمس الدین احمد خاں سے کبیدہ خاطر ہوکر فیروز پور چھوڑ دیا۔ پہلے کچھ روز لکھنؤ میں رہے اور پھر جے پور پہنچے جہاں کافی عرصہ رُکے ۱۸۳۵ء میں شمس الدین خاں کے انتقال کے بعد رنجورؔ دہلی لوٹے اور غالبؔ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ ۲۷ یہ خیال ہوتا ہے کہ فیروز پور چھوڑتے وقت یا اس کے بعد کسی وقت (کیوں کہ ان کے پاس نسخۂ شیرانی کی شکل میں ایک زیادہ مکمل دیوان موجود تھا) رنجورؔ نے دیوانِ غالبؔ کا پہلا نسخہ اپنے سے جدا کردیا جو کسی وسیلہ سے بھوپال پہنچا اور میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں داخل ہوا۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی مفید ہوگا کہ یہ نسخہ خاص فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔ ۲۸ بلکہ ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ فوجدار محمد خاں نے اپنا خاص کاتب بھیج کر اس نسخے کو نقل کروا کے منگوایا تھا۔ ۲۹ یہاں تک کہ مولوی عبدالحق نے بھی یہ تحریر کیا ہے کہ اس نسخے کو غالبؔ نے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا۔ ۳۰ فوجدار محمد خاں جو والیۂ بھوپال قدسیہ بیگم کے چھوٹے بھائی تھے اور بعد میں ۱۸۳۴ء میں خود بھی کچھ عرصہ نائب ریاست رہے۔ ۳۱ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۳۲ اور اس لحاظ سے ۱۲۳۷ھ میں جب نسخۂ بھوپال لکھا گیا، اُن کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ اس لیے ان کا دہلی کاتب بھیجنا اور دیوان نقل کرکے منگوانا کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔ جہاں تک بعد میں غالبؔ سے ملنے کا سوال ہے ابھی تک کوئی بھی ایسے معتبر شواہد میسر نہیں آسکے ہیں جو فوجدار محمد خاں کے غالبؔ سے براہ راست تعلق کو ظاہر کرسکیں۔ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں ان کے ایسے خطوط کی نقول پر مشتمل نو جلدیں محفوظ ہیں جو ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک خط میں بھی براہ راست یا بالواسطہ غالبؔ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا نہ ہی کوئی اور ایسا مستند ثبوت ملتا ہے جو فوجدار محمد خاں کا دہلی جا کر غالبؔ سے ملاقات کرنا ثابت کرسکے۔

فوجدار محمد خاں بہر حال اچھا علمی مذاق رکھتے تھے اور ہر فن پر اچھی کتابوں کو یکجا کرنے کا انھیں شوق تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس کتب خانے سے ہوتا ہے جس کی ایک فہرست اب بھی بھوپال کی سینٹرل لائبریری میں موجود ہے۔ اس فہرست میں ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء اور ۱۲۶۷ھ/

۱۸۵۱ء میں کیے گئے شمار کتب کے مطابق تقریباً ایک ہزار اردو، فارسی اور عربی کی اور تین سو سے زیادہ سنسکرت کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا اندراج ہے۔ اسی فہرست میں غالبؔ کے اس قلمی دیوان کا بھی پتہ چلتا ہے جسے ''دیوانِ اسد غالبؔ قلمی خوشخط'' درج کیا گیا ہے۔ ۳۳؎ اس اندراج کے پیش نظر اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ نسخہ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء تک فوجدار محمد خاں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اس فہرست کتب اور فوجدار محمد خاں کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف ذرائع سے اپنی پسندیدہ کتابیں منگاتے رہتے تھے۔ کتابوں کی فراہمی میں وہ خاص طور پر تین اشخاص سے مدد لیتے تھے یعنی مولوی سید محمد نواز، میاں قطب الدین اور قاضی محمد حنیف سے۔ میاں قطب الدین کے ذریعہ انھوں نے ایک بار دہلی سے جو سامان طلب کیا تھا اس میں دیوانِ ناسخؔ، دیوانِ مومنؔ خاں، غیاث اللغات اور اخلاقِ ناصری بھی شامل تھیں۔ ۳۴؎ مشمولہ جنتری من ابتدائے ربیع آخر ۱۲۵۵ھ تا آخری ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ) قاضی محمد حنیف، فوجدار محمد خاں کے معتمد خاص اور ان کی جاگیر کے منتظم اعلیٰ تھے اور ہر قسم کے مالی اور انتظامی امور ان کے ذریعہ طے پاتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے یہ تحریر کیا ہے کہ نسخہ بھوپال کے پہلے سادہ ورق پر نمبرات کے علاوہ شکستہ خط میں ''محمد حسین'' لکھا ہوا ہے۔ ۳۵؎ میرا قیاس ہے کہ شکستہ خط میں دراصل ''محمد حنیف'' درج ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ یا تو محمد حنیف کی وساطت سے ہی خریدا گیا ہے یا پھر بعد میں اس پر انھوں نے اپنے دستخط کیے ہیں۔

خود نسخے کے اندر کئی جگہ عبدالعلی کے دستخط ملتے ہیں۔ عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ:

''انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے
اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔''

بعض شعروں کے سامنے ''پسند عبدالعلی'' یا ''پسند خاطر عبدالعلی'' بھی درج کیا ہے۔ ۳۶؎ عرشی صاحب کے قیاس کے مطابق یہ عبدالعلی خاندان ریاست رام پور کے ایک فرد عبدالعلی خاں ابن غلام محمد خاں تھے جو نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے۔ ۳۷؎ لیکن یہ عبدالعلی بھوپال کے میر دبیر ریاست عبدالعلی تونگر (۱۸۲۰ء۔۱۸۷۰ء) بھی ہو سکتے ہیں۔

عبدالعلی، عبدالواحد خاں مسکین خیرآبادی کے صاحب زادے تھے۔ مسکین (متوفی ۱۸۵۴ء) پُرگو شاعر تھے اور اس عہد کے تقریباً ہر تذکرے میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ۳۸ شیفتہ کے ''گلشن بے خار'' میں انھیں حکیم مومن خاں کا شاگرد اور اپنا دوست بتایا ہے۔ ۳۹ مسکین ۱۸۲۸ء کے قریب بھوپال آئے۔ بہت ممکن ہے کہ شیفتہ سے قریبی تعلق کی وجہ سے یا کسی اور وسیلے سے وہ یہ قلمی نسخہ علی بخش رنجور سے حاصل کر سکے ہوں اور اپنے ساتھ بھوپال لے آئے ہوں۔ یہاں یہ نسخہ ان کے پاس غالباً اس وقت تک رہا جب تک ان کے صاحب زادے عبدالعلی تونگر اپنے سن شعور کو پہنچ گئے، ان میں ذوق شعر پیدا ہو گیا اور بعض اشعار کو منتخب کر کے ان پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ان پر اپنے دستخط کیے۔ اس مرحلہ پر یا تو فوجدار محمد خاں نے خود اس نسخہ کو دیکھا اور ان سے خرید لیا یا محمد حنیف یا کسی اور شخص کے توسط سے اس کو حاصل کیا۔ ۴۰

اس موقع پر مخطوطہ پر ثبت مہروں کا جائزہ مفید ہوگا۔ مخطوطہ پر دو قسم کی مہریں بتائی جاتی ہیں۔ ایک پر ۱۲۴۸ھ کندہ ہے اور دوسری پر ۱۲۶۱ھ۔ ۴۱ جیسا کہ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں موجود کتب خانہ فوجدار محمد خاں کی باقی ماندہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر چھوٹی ہے اور ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ہے۔ بڑی مہر اس کتب خانہ کی ساری کتابوں پر ثبت ہے۔ چھوٹی مہریں البتہ مختلف سنوں کی ہیں۔ ۱۲۴۴ھ کے علاوہ بعض کتابوں پر ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کی مہریں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہریں ہر سال نہیں بنی ہیں۔ ۴۲ اور ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۵۵ھ کی مہر بنائی گئی ہے۔ جہاں تک ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر کا تعلق ہے، اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسی سال سکندر بیگم کے بیوہ ہونے اور اُن کی نابالغ صاحب زادی شاہجہاں بیگم کے رئیسۂ بھوپال نامزد ہونے کی صورت میں فوجدار محمد خاں نے مختار ریاست (ریجنٹ) کا کام سنبھالا تھا۔ ۴۳ اور دستاویزات وغیرہ پر ثبت کرنے کے لیے چھوٹی مہر بنوائی گئی تھی۔ اسی سال یا اس کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی بھی تنظیم ہوئی اور کتابوں کی جلد بندی کروا کے ان پر کتب خانے کے اندراجات کیے گئے اور ان پر مہریں لگوائی گئیں۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ /۱۸۳۲ء اور ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت آیا اور اگر عبدالعلی تونگر (ولادت ۱۲۳۶ھ)

کی عمر کو مدنظر رکھا جائے اور یہ قیاس کیا جائے کہ یہ نسخہ تو نگر کے سن شعور پر ان سے جدا ہوا تو فوجدار محمد خاں کے پاس اس کے پہنچنے کی تاریخ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کے قریب پہنچ جائے گی۔ غالبؔ کا منتخب دیوان سب سے پہلے شعبان ۱۲۵۷ھ/ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ ۴۴ اس لحاظ سے نسخہ بھوپال، مطبوعہ دیوان کی اشاعت سے قبل کتب خانہ فوجدار محمد خاں میں محفوظ ہو چکا تھا اور اس میں مطبوعہ دیوان کی مدد سے جن غیر مستند (Un Authorised) اضافوں کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس سے وہ بچا رہا۔

فوجدار محمد خاں نے ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا۔ ۴۵ ان کے انتقال کے بعد فوجدار محمد خاں کا کتب خانہ ان کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکتؔ (ولادت ۱۸۴۳ء) کے پاس رہا۔ ۱۹۱۲ء میں یار محمد خاں کے انتقال کے بعد اس کتب خانہ کی کتابیں نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے محل پر منگوالیں۔ ۴۶ اسی سال حمیدیہ لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا افتتاح لارڈ ہارڈنگ نے کیا۔ ۴۷ غالباً اسی موقع پر دیوانِ غالبؔ کا یہ قلمی نسخہ حمیدیہ لائبریری میں منتقل کیا گیا۔

۱۹۱۴ء کے قریب انجمن ترقی اردو نے دیوانِ غالبؔ کا ایک عمدہ اور صحیح ایڈیشن چھاپنے کا منصوبہ بنایا، جس میں غالبؔ کی خصوصیات شاعری پر نامور ادیبوں کے مضامین اور بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی شامل کرنے کا خیال تھا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحلیم شررؔ اور رضا علی وحشتؔ نے مضامین لکھنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ نواب احمد سعید خاں کے پاس سے دیوانِ غالبؔ کا وہ قلمی نسخہ بھی مستعار لیا گیا تھا جسے نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ نے لکھوایا تھا اور جو غالبؔ کی نظر سے گزر چکا تھا۔ اخراجات کے لیے نواب عماد الملک (حسین بلگرامی) نے پانچ سو روپیہ کا عطیہ بھی دیا تھا۔ ۴۸ انجمن کی جانب سے یہ دیوان سید ہاشمی مرتب کر رہے تھے اور اس میں ایسا کلام شامل کرنے کی کوشش جاری تھی جو مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس دیوان کا مبیضہ تیار ہو چکا تھا اور مختلف ذرائع سے جو غیر مطبوعہ کلام مل سکتا تھا اسے شامل کر لیا گیا تھا۔ اس دیوان کے لیے رضا علی وحشتؔ کا مضمون بھی موصول ہو گیا تھا۔ ۴۹ اور ظفر الملک علوی ایڈیٹر ''الناظر'' اس کو پوری صحت اور نفاست سے طبع کروانے کا پورا اہتمام کر رہے تھے۔ ۵۰ لیکن اسی دوران نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا ایک نیا نسخہ

چھپ کر شائع ہوا جو انجمن کے مجوزہ معیار کے مطابق تو نہ تھا لیکن دوسرے مروجہ نسخوں سے بہتر تھا۔ چناں چہ انجمن کے تیار کردہ نسخے کی اشاعت کے لیے پہلی سی سرگرمی نہیں رہی، مگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری یورپ سے واپس آئے، اور انھوں نے اس نسخے میں دلچسپی کا اظہار کیا اور اس پر مقدمہ لکھنے پر بھی آمادہ ہوگئے لہٰذا یہ نسخہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔ ۵۱ ڈاکٹر بجنوری نے سید ہاشمی کے مرتبہ دیوان میں شامل غالبؔ کے غیر مطبوعہ کلام پر خاص توجہ کی اور اس کی صحت کے لیے چھان بین شروع کی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے (غالباً مولوی عبدالحق کو) وہ خط تحریر کیا جس کا عکس انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی ''محاسن کلام غالبؔ'' میں ملتا ہے۔ اس خط میں بجنوری نے ''تکیہ'' والی غزل اور ''طائرِ دل'' والے قطعے کو غالبؔ کا ماننے میں بڑا تامل کا اظہار کیا ہے۔ اسی دوران ڈاکٹر بجنوری کلامِ غالبؔ پر اپنا مقدمہ لکھنے میں مصروف رہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگست ۱۹۱۸ء سے قبل مکمل کر چکے تھے۔

ڈاکٹر بجنوری ۱۹۱۶ء میں بھوپال آئے تھے اور یہاں یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء سے انھوں نے مشیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ۵۲ بھوپال قیام کے دوران ہی وہ دیوانِ غالب کی ترتیب وتدوین کے مسائل اور اس کے لیے مقدمہ کی تیاری میں مصروف رہے۔ وسط ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالسلام ندوی (مولف شعرالہند) بھوپال آئے اور حمیدیہ لائبریری میں ان کی نظر غالبؔ کے اس نادر قلمی دیوان پر پڑی۔ ۵۳ اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی بھی بھوپال آئے اور ان کے ایک مکتوب مورخہ ۱۶، اگست ۱۹۱۸ء سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی عبدالسلام ندوی اس وقت بھوپال میں تھے اور جلد واپس جانے والے تھے۔ ۵۴ ۲۰، اگست ۱۹۱۸ء کو ڈاکٹر بجنوری نے مولوی عبدالحق کو ایک خط لکھا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت یہ نسخہ ان تک پہنچ گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

> ''جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالبؔ کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی نے بھی ایک حملہ (جملہ؟) فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے۔ خواہ جان جائے، نسخہ اب نہیں جاتا، انشاء اللہ۔'' ۵۵

ڈاکٹر بجنوری کا ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوگیا۔ ۵۶؎ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلمی نسخے کی بازیافت کے بعد بجنوری تقریباً تین ماہ زندہ رہے۔ اس عرصے میں وہ اپنے مقدمے میں غالبؔ کے غیر مطبوعہ کلام کی روشنی میں کوئی ترمیم تو نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے ۵۷؎ اس پورے کلام کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔ چناں چہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ اس کے لیے اعلیٰ درجے کے کاتبوں، نفیس کاغذ کی فراہمی اور طباعت کے لیے بلاکوں کی تیاری بھی زیر غور تھی۔ بعض اشعار کی تشریح کے لیے اچھے مصوروں کی خدمات حاصل کرنے کا خیال تھا۔ ۵۸؎ ساتھ ہی ساتھ غالب کے دوسرے نوادرات کی بھی تلاش تھی۔ اسی سلسلے میں غالبؔ کا خود نوشتہ وہ سوانحی نوٹ بھی سید افتخار عالم سے مل گیا جو غالبؔ نے شاید ''تذکرۂ مظہر العجائب'' کے لیے لکھا تھا۔ ۵۹؎ لیکن ڈاکٹر بجنوری کی اچانک موت نے ان سارے منصوبوں کو یکسر ختم کر دیا۔

جیسا کہ ڈاکٹر بجنوری کے خط سے ظاہر ہے خود ان کی زندگی میں اس قلمی نسخے کی اشاعت کے بارے میں خاصی مخالفت تھی۔ اس مخالفت کی صحیح نوعیت کا تو ابھی تک علم نہیں ہو سکا ہے لیکن بعض اعتراضات کا مفتی انوار الحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں جواب دیا ہے اور غالبؔ کے اس نادر سرمایۂ شاعری کی اشاعت کو حق بجانب بتایا ہے۔ ۶۰؎ ایسا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بجنوری کے انتقال کے بعد ایک اور مسئلہ پیدا ہوگیا کہ یہ نسخہ بھوپال سے ہی شائع کیا جائے کیوں کہ بھوپال کو ہی اسے محفوظ رکھنے کا شرف حاصل تھا اور غالباً اسی لیے مفتی صاحب کو ڈاکٹر بجنوری کے احباب سے وہ تعاون حاصل نہ ہو سکا جو وہ چاہتے تھے اور جس کے بارے میں انھوں نے بجنوری پر اپنے مختصر مضمون میں شکایت کی ہے۔ ۶۱؎ اور شاید اسی اختلاف رائے کے نتیجہ میں بجنوری کا لکھا ہوا مقدمہ نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہونے سے پہلے رسالہ ''اردو'' کے جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوگیا۔

ڈاکٹر بجنوری نے غالبؔ کے غیر مطبوعہ اور متداول کلام کے شائع کرنے کا جو خاکہ بنایا تھا اس کی تفصیل سید ہاشمی نے تحریر کی ہے:

> ''ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، ان کے

سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا تاکہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔" ۶۲

سید ہاشمی کا بیان ہے کہ اس نہج پر دیوان کی کتابت شروع بھی ہو چکی تھی۔ بجنوری کے انتقال کے بعد جب مفتی محمد انوار الحق کو جو کہ اس وقت ریاست کے ناظم تعلیمات تھے۔ ۶۳ اس دیوان کی اشاعت کا کام سونپا گیا تو انھوں نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب وضع کی جس کے تحت ہر ردیف کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں وہ غزلیں شامل کیں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں مشترک تھیں۔ دوسرے حصے میں وہ غزلیں رکھیں جو صرف قلمی نسخے میں موجود تھیں اور تیسرے حصے میں ان غزلوں کو جگہ دی جو قلمی نسخے میں موجود نہ تھیں لیکن متداول نسخوں میں ملتی تھیں۔ پہلے حصے کی مشترک غزلوں کے لیے یہ ترتیب رکھی کہ پہلے قلمی نسخے کی غزل تحریر کی گئی۔ اگر اس غزل کے کچھ اشعار مطبوعہ غزل میں مشترک ہوئے تو ان اشعار کے محاذ میں "م" کا نشان بنا دیا گیا اور اگر قلمی اور مطبوعہ اشعار میں کہیں کوئی جزوی اختلاف ہوا تو اختلافی مصرعوں کو تلے اوپر ساتھ لکھ دیا گیا اور جو اشعار صرف مطبوعہ غزل میں موجود تھے انھیں جداگانہ تحریر کر دیا گیا۔ اس ترتیب کا یہ نتیجہ ہوا کہ قلمی نسخے کی اصل شکل برقرار نہیں رہ پائی اور قلمی اور مطبوعہ اشعار خلط ملط ہو گئے۔

اس ترتیب اور مفتی صاحب کی ایک تمہید اور نواب زادہ حمید اللہ خاں کے ایک سرنامہ کے ساتھ یہ دیوان "دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب اور طباعت کا کام تقریباً سرکاری نوعیت سے ہوا اور سرکاری طور پر کیے جانے والے کام میں جو کوتاہیاں ہو سکتی تھیں ان سب کا یہ نسخہ شکار ہوا۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ دیوان کی ترتیب اور نقل کا کام مختلف اہلکاروں سے لیا گیا جن کے سامنے ترتیب وغیرہ کے یکساں اصول نہیں تھے چناں چہ کام کا یکساں ہونا برقرار نہیں رہا۔ مثلاً جیسا کہ عرشی صاحب نے اپنے مرتبہ دیوان میں جا بجا صراحت کی ہے کہیں حاشیے میں درج کلام کے بارے میں نوٹ دیا گیا ہے اور کہیں نہیں دیا گیا اور قلمی نسخے میں موجود ہوتے ہوئے غزل کو صرف مطبوعہ ظاہر کیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ غزل بھی جو اس صفحے کے حاشیے پر درج ہے جس کا عکس شامل کیا گیا، صرف مطبوعہ غزلوں کے ذیل میں شامل کی گئی ہے۔ اسی طرح اصلاحات کے بارے میں کہیں محل

اصلاح بیان کیا گیا ہے اور کہیں نہیں۔ قلمی دیوان کے آخر میں موجود سادہ صفحات پر جو اضافے ہوئے ہیں ۶۴ لیکن ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے مضمون ''دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' میں تحریر کیا ہے کہ نسخہ کے ہر دو جانب چار چار ورق اس قسم کے کاغذ کے ہیں جو متن کا ہے اور ہندوستان ہی میں ہاتھ کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ موجود ہیں، شروع میں انھیں اوراق پر غالب کا غیر منقوط خط درج ہے اور آخر میں اضافہ شدہ غزلیں، وہ اوراق جن پر فوجدار محمد خاں کی مہریں اور کتب خانہ کا اندراج ہے الگ سے چسپاں کیے گئے ہیں۔ (مجلّہ مکتبۂ جلد ۲، شمارہ ۶، ص ۵۵، ۵۶) ان کو بھی قلمی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ کتابت کی غلطیوں پر کوئی توجہ نہ دی گئی اور یہ نسخہ اچھا خاصا مجموعۂ اغلاط بن گیا۔ خود مفتی صاحب نے نہ تو ان کوتاہیوں کی جانب کوئی توجہ کی اور نہ اس کی اصلاح کا کوئی سامان کیا حتیٰ کہ کتاب کے ساتھ کسی غلط نامہ شامل کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی تمہید لکھتے وقت بھی مفتی صاحب نے وہ چھان بین نہیں کی جو انھیں کرنا چاہیے تھی اور اس نسخے کے بھوپال پہنچنے کے بارے میں جو شواہد وہ حاصل کر سکتے تھے ان کے لیے بھی انھوں نے کوشش نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف اپنی تمہید میں انھوں نے خاصی تحقیقی لغزشیں کیں مثلاً کتب خانہ کے اندراج، مہروں اور قلمی نسخوں میں موجود ترقیمے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ نسخہ خاص فوجدار محمد خاں کے لیے ہی لکھا گیا تھا اور اصلاحات کو دیکھتے ہوئے فرض کر لیا کہ یہ نسخہ بار بار غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا جاتا رہا ہے۔ ۶۵ اسی طرح تمہید کے ساتھ نسخے میں شامل اشعار کا جو شمار درج کیا گیا وہ بھی صحیح نہیں ہے۔

جس وقت نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا تقریباً اسی وقت رسالہ ''اردو'' میں ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ چھپا۔ چناں چہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دیوان کے ابتدائی نسخے بغیر مقدمے کے تھے۔ اور جیسا کہ مفتی صاحب کی تمہید سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداً بجنوری کے مقدمہ کو دیوان کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ تھا۔ ۶۶ اور بجنوری کی تصویر اور ان کے حالاتِ زندگی وغیرہ بھی شامل کرنے کا خیال تھا لیکن مفتی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ بجنوری کے اعزہ اور احباب نے ان سے کوئی تعاون نہیں کرنا چاہا اور بجنوری کی وہ تصویر جو انھوں نے فراہم کر لی تھی اُسے بھی واپس لے لیا۔ اسی طرح ہوسکتا ہے بجنوری کا مقدمہ بھی مفتی صاحب کے پاس انجمن والوں نے منگوالیا ہو۔ اس طرح شروع میں جو نسخے تیار ہوئے وہ بغیر مقدمے کے تھے لیکن بعد میں (غالباً رسالہ ''اردو'' میں

اشاعت کے بعد) مفتی صاحب کو یہ مقدمہ حاصل ہو گیا اور انھوں نے مقدمہ کے ساتھ ساتھ نئے سرورق چھپوا کر ۶۷ تازہ جلد بندی کروائی۔ اب کیوں کہ مقدمہ کو درمیان میں شامل کیا جانا تھا اور پورا مقدمہ ۱۰۸ صفحات سے چند صفحات بڑھتا تھا، اس لیے پورے پورے اجزاء قائم رکھنے کی غرض سے مقدمہ میں سے خاموشی کے ساتھ آخر کے چند پیراگراف حذف کر کے اس کو ۱۰۷ صفحات میں محدود کر لیا گیا۔ سرکاری کام کی بے احتیاطی اس نسخہ کی تیاری کے ہر مرحلے میں نمایاں ہے۔ ہر نسخے میں تین تصویریں شامل ہونا چاہیے تھیں۔ ایک تصویر غالبؔ کی، دوسری بجنوری کی اور تیسرا مخطوطہ کا عکس۔ لیکن کہیں کہیں ایک ہی قسم کی دو تصویریں شامل ہیں اور کہیں ایک تصویر بھی نہیں ہے۔ یہی بد نظمی کتاب کی نکاسی میں رکاوٹ بنی اور وہ اچھی خاصی تعداد میں چھپنے کے باوجود پورے ملک میں صحیح طور پر نہیں پہنچ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ عرصہ تک کافی تعداد میں بے ترتیب اجزاء کمروں میں بند پڑے رہے اور ریاست کے انضمام کے بعد ضائع ہو گئے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد قلمی نسخے میں محققین کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چناں چہ سب سے پہلے انجمن ترقی اردو کی جانب سے سید ہاشمی نے اسے بھوپال آکر دیکھا۔ ۶۸ بعد میں جب ڈاکٹر سید عبداللطیف کو دیوانِ غالبؔ تاریخی ترتیب سے شائع کرنے کا خیال ہوا تو انھوں نے سر اکبر حیدری کی سفارش پر بھوپال سے ڈاکٹر ولی محمد کے توسط سے اس نسخے کو حیدر آباد منگوایا اور اس کا تفصیل سے مطالعہ کیا۔ ۶۹ اس کے بعد غالباً ۱۹۴۴ء میں مولانا امتیاز علی عرشی نے اس نسخے کو بھوپال میں دو دن رک کر دیکھا۔ ۷۰ لیکن بعد میں جب عرشی صاحب نے اس مخطوطہ کو دیکھنا چاہا تو وہ گم ہو چکا تھا۔ ۷۱

نسخہ کی گمشدگی کے بارے میں کئی رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون ''غالب اور بھوپال'' میں ایک رائے یہ پیش کی ہے کہ اصل مخطوطہ مولوی عبدالحق لے گئے۔ لیکن مولوی صاحب نے اپنے ایک خط میں اس کی تردید کی ہے۔ ۷۲ اسی طرح بی بی رشیدہ کے نام سے منسوب ایک مضمون ''غالبؔ کے ایک معروف شاگرد'' میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ پہنچ چکا ہے۔ ۷۳ لیکن خود نادم سیتاپوری نے بعد میں پتہ چلایا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ ۷۴

گمان غالب یہی ہے کہ ہندیونین میں ریاست کے انضمام کے وقت یہ نسخہ کہیں گم ہو گیا

ہے۔انضمام کے بعد حمیدیہ لائبریری کی پرانی عمارت کو خالی کرایا گیا اور کچھ عرصہ تک اس لائبریری کی کتابیں انتہائی لاپروائی کے عالم میں ایک اور عمارت میں پڑی رہیں اور لوگوں نے اس سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ ہوسکتا ہے اس کسمپرسی کے عالم میں یہ مخطوطہ بھی گم ہوگیا ہو۔ بعد میں یہ لائبریری موجودہ عمارت میں منتقل ہوئی اور اب اس کو مولانا آزاد سینٹرل لائبریری کہا جاتا ہے۔ اب بھی اس میں کتب خانۂ فوجدار محمد خاں کی خاصی کتابیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں لیکن موجودہ فہرست مخطوطات میں جو غالباً انضمام کے بعد تیار کی گئی ہے، اس قلمی نسخے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ریاست کے انضمام کے بعد بھوپال کی آبادی کے ایک حصے نے نقل مکانی کا فیصلہ کیا اور کتابوں کے اچھے اچھے ذخیرے ردی میں فروخت ہو گئے، یا تو اس نسخہ کو بھی ردی سمجھ کر کہیں ضائع کر دیا گیا یا پھر اب بھی وہ کسی نجی کتب خانہ میں موجود ہے اور کتب خانہ کے ورثاء کو اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ یہ کسی وقت سامنے آئے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ ''دیوانِ غالبؔ قلمی ۱۲۳۷ھ'' از ڈاکٹر سید عبداللطیف مترجمہ جناب سید محمد، مجلّہ مکتبہ (حیدرآباد) جلد۲، شمارہ۶، ص۵۵۔

۲۔ ''دیوانِ غالبؔ'' (نسخۂ عرشی): دیباچہ ص۷۵۔

۳۔ قلمی نسخہ کے ایک صفحہ کا عکس ''نسخۂ حمیدیہ'' کی بعض کاپیوں میں شامل کیا گیا تھا۔ اسی عکس کو ''فروغِ اردو'' (لکھنؤ) کے غالب نمبر میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص۷۸۔

۵۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید ص۶۔

۶۔ ''حیاتِ غالبؔ'' از شیخ محمد اکرم، (دہلی ایڈیشن)، ص۶۷۔

۷۔ کلیاتِ نثر غالبؔ: ص۴۔

۸۔ کلیات نثر غالب: ص۳۔

۹۔ کلیاتِ نثر غالبؔ: ص ۹۸ تا ۱۰۰۔

۱۰۔ نسخۂ حمیدیہ: تمہید ص ۶۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۸۔

۱۱۔ ''دیوانِ غالبؔ قلمی ۱۲۳۷ھ'' مجلّہ مکتبہ جلد ۲، شمارہ ۶، ص ۵۷۔

۱۲۔ کلیاتِ نثر غالبؔ: ص ۲۔

۱۳۔ مضمون محولۂ بالا، ص ۵۶۔

۱۴۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۶۔

۱۵۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۶۔

۱۶۔ مضمون ڈاکٹر عبداللطیف محولہ بالا، ص ۵۷۔

۱۷۔ کلیاتِ نثر غالبؔ: ص ۶۳، ۶۴۔

۱۸۔ ''دیوانِ غالبؔ قلمی ۱۲۳۷ھ'' از ڈاکٹر عبداللطیف محولہ بالا۔ ص ۵۷۔ ڈاکٹر عبداللطیف یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس نام کو ایک زائد واؤ کے ساتھ ''محمد اسد واللہ'' لکھا ہے۔

۱۹۔ ملاحظہ ہو مکتوب بنام رائے چھجمل کھتری، کلیاتِ نثر غالبؔ: ص ۱۵۵، ۱۵۶۔

۲۰۔ نسخۂ عرشی، تمہید ص ۷۶۔

۲۱۔ نسخۂ عرشی: تمہید ص ۷۸۔

۲۲۔ ''غالب اور نسخۂ شیرانی'' از ڈاکٹر وحید قریشی، ''نقوش'' غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء، صفحات ۳۰۷ تا ۳۰۸۔

۲۳۔ ''حیات غالبؔ'' از شیخ محمد اکرام (دہلی ایڈیشن) ص ۶۹۔

۲۴۔ ''حیاتِ غالبؔ'' از شیخ محمد اکرام، ص ۷۱ ''غالب'' از غلام رسول مہر (۱۹۲۴ء) ص ۹۲۔

۲۵۔ ''غالبؔ اور نسخۂ شیرانی'' از ڈاکٹر وحید قریشی ''نقوش'' غالبؔ نمبر، ص ۳۸۷۔

۲۶۔ کلیاتِ نثر غالبؔ، ص ۹۹، ۱۰۰۔

۲۷۔ کلیاتِ نثر غالبؔ: ص ۳۔

۲۸۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید۔ ص ۵۔

۲۹۔ ''غالب کے پانچ شاگرد'' از سید محمد یوسف قیصر مطبوعہ روزنامہ ندیم، بھوپال، ۵، فروری ۱۹۵۶ء، مشمولہ ''نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں'' از نادم سیتاپوری، فروغ اردو (لکھنؤ) غالب نمبر حصہ سوم ص ۵۰۔

۳۰۔ ''چند ہم عصر'' از مولوی عبدالحق (اضافہ شدہ ایڈیشن، کراچی ۱۹۶۶ء) ص ۳۷۸۔

۳۱۔ تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال، مرتبہ شاہ جہاں بیگم، دفتر اول (فارسی) ص ۴۲۔

۳۲۔ تاج الاقبال محولہ بالا، ص ۳۶۔

۳۳۔ جنتری فہرست کتب خانہ وغیرہ سرکار نواب فوجدار محمد خاں (قلمی) ص ۳۳، ۷۶۔

۳۴۔ مکتوب مورخہ ۸، شوال ۱۲۵۷ھ (۲۲، نومبر ۱۸۴۱ء۔

۳۵۔ ''دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' مترجمہ جناب سید محمد، مجلّہ مکتبہ (حیدرآباد) جلد ۲، شمارہ ۶، ص ۵۶۔

۳۶۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۷۔

۳۷۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ، حاشیہ ص ۷۷۔

۳۸۔ تذکرۂ سرور از میر محمد خاں سرور مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، ص ۲۷۷۔ سخن شعراء از عبدالغفور خاں نساخ، ص ۴۳۳، تذکرہ شعراء ہند، از کریم الدین، ص ۳۸۵۔ فہرست اشپرنگر موسومہ یادگار شعراء، مترجمۂ طفیل احمد ص ۱۸۴۔ ''صبح گلشن'' از سید علی حسن خاں، س ۴۰۷، آثار الشعراء، از سید ممتاز علی، ص ۲۰۶۔ تذکرہ فرح بخش از یار محمد خاں شوکت، ص ۴۵، انشائے نوردیدہ (قلمی) از محمد عباس رفعت، ص ۶۴۔

۳۹۔ ''گلشن بے خار'' ص ۱۷۶۔

۴۰۔ عرشی صاحب نے نسخۂ بھوپال پر ایک جگہ عبدالصمد مظہر کے دستخط بھی بتائے ہیں (نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۷) عبدالصمد (۱۸۸۳ء۔۱۹۶۱ء) والیۂ ریاست بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کے لٹریری سیکریٹری تھے۔ ۱۹۲۱ء میں حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں پہلے معتمد حرفت وتجارت رہے پھر معتمد فوج مقرر ہوئے اور نواب صمد یار جنگ خطاب پایا۔ قیاس یہ ہے کہ عبدالصمد مظہر نے ۱۹۱۸ء میں اس نسخہ کی بازیافت کے بعد اس کو دیکھا ہے اور اس پر اپنے دستخط کیے ہیں۔

۴۱۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۵۔
۴۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی کہ کیوں کہ فوجدار محمد خاں صاحبِ ثروت تھے اس لیے انھوں نے ہر سال نئی مہریں بنوائی ہوں گی۔ ''نسخۂ عرشی طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات'' نقوش غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔
۴۳۔ تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال از شاہ جہاں بیگم، دفتر دوم (فارسی) ص ۳۔
۴۴۔ ذکر غالب از مالک رام طبع ثانی ص ۱۳۱۔
۴۵۔ تاج الاقبال محولہ بالا (دفتر سوم) ص ۱۰۰۔
۴۶۔ اس سلسلے کی ایک فائل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دفتر مخطوطات) بھوپال میں محفوظ ہے۔ فائل دفتر تاریخ نمبر ۵ بابت ۱۹۱۶ء۔
۴۷۔ ایڈمنسٹریٹور پورٹ (انگریزی) برائے ۱۳۔۱۹۱۲ء، ص ۲۲۔
۴۸۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو از مولوی عبدالحق مشمولہ رپورٹ متعلق اجلاس بست وہشتم، آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام راولپنڈی، منعقدہ دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۱۴۸، ۱۴۹۔
۴۹۔ تبصرہ نسخۂ حمیدیہ از سید ہاشمی ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۳۔
۵۰۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو از مولوی عبدالحق مشمولہ رپورٹ متعلق اجلاس بست ونہم آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا منعقدہ دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۵۴۔
۵۱۔ تبصرہ نسخۂ حمیدیہ از سید ہاشمی محولہ بالا ص ۷۰۳، ۷۰۴۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو مشمولہ رپورٹ متعلق اجلاس سی ام آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام علی گڑھ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۶ء ص ۸۳۔
۵۲۔ سول لسٹ عہدہ داران مندرجہ جریدہ ریاست بھوپال بابت ششماہی دوم لغایت آخر دسمبر ۱۹۱۷ء ص ۵۸، ۵۹۔
۵۳۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو از مولوی عبدالحق مشمولہ رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس بمقام سورت منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء، حاشیہ ص ۱۰۵۔

۵۴۔ مکتوبات سلیمانی جلد اول مرتبہ عبدالماجد دریابادی، ص ۹۸۔

۵۵۔ مشمولہ ''کچھ رنگین تصویر کے بارے میں'' از خیر بھوروی ''شاعر'' غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۷، جناب خیر بھوروی کا خیال ہے کہ اس خط میں جس دیوانِ غالب کا حوالہ ہے وہ نواب علاؤالدین خاں علائی کے مملوکہ دیوان سے تعلق رکھتا ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ حوالہ نسخۂ بھوپال کا ہے۔ جناب خیر بھوروی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ سید ہاشمی کے مرتبہ دیوان کا قلمی نسخہ ان کے ذخیرۂ نادرات میں محفوظ ہے۔

۵۶۔ سول لسٹ عہدہ داران مندرجہ جریدہ ریاست بھوپال بابت ششماہی دوم 1918ء تصحیح شدہ لغایت یکم جنوری 1919ء، ص ۵۹۔

۵۷۔ مولوی عبدالحق نے انجمن کی ۱۹۱۸ء میں پیش کی گئی رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ بجنوری انجمن کی درخواست پر اس دیوان کی تصحیح وترتیب وطبع کا انتظام کر رہے تھے اور نواب زادہ حمید اللہ خاں نے انجمن کو اس نسخے کے استعمال کی اجازت دے دی تھی (ص ۱۰۵، رپورٹ اجلاس انجمن منعقدہ ماہ دسمبر ۱۹۱۸ء، بمقام سورت)۔

۵۸۔ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق (اضافہ شدہ ایڈیشن، کراچی ۱۹۶۶ء) ص ۳۷۸۔

۵۹۔ ''مرزا غالب کی خودنوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق'' از مولوی عبدالحق مشمولہ ''الشجاع'' (کراچی) غالب نمبر ۱۹۶۹ء، حاشیہ بلاک مابین صفحات ۲۴، ۲۵، یہی بلاک اظہار الحق ملک کے مضمون ''غالب کے خودنوشت حالات'' کے ساتھ ''احوالِ غالب'' مرتبہ مختار الدین آرزو میں مابین صفحات ۲۴، ۲۵ شامل ہے۔ مولوی عبدالحق کا حاشیہ اس میں محذوف ہے۔ اصل عکس رسالہ ''اردو'' میں شائع ہوا تھا۔

۶۰۔ نسخۂ حمیدیہ: تمہید ص ۱۶ تا ۲۳۔

۶۱۔ نسخۂ حمیدیہ: تمہید ص ۲۶، ۲۷۔

۶۲۔ تبصرہ نسخۂ حمیدیہ از سید ہاشمی ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۴۰۷۔

۶۳۔ مفتی انوار الحق پر راقم الحروف کا ایک تفصیلی مضمون ''شاعر'' (بمبئی) کے غالب نمبر میں ملاحظہ فرمایئے ص ۱۴۴ تا ۱۵۲۔

۶۴۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون ''نسخۂ عرشی طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات۔تمہ'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آخری اوراق جن پر بعد میں اضافے کیے گئے ہیں غالباً جلد بندی کے وقت بڑھائے گئے ہیں اور اس لیے ان میں رواج غزلیں ممکن ہے مطبوعہ دیوان سے نقل کی گئی ہوں۔ (''نقوش'' غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۸)۔

۶۵۔ نسخۂ حمیدیہ: تمہید ص ۶، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب غلام رسول مہر نے مفتی صاحب کے بیان سے یہ کس طرح نتیجہ نکالا ہے کہ دیوان ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۴ء میں تصحیح و اضافے کے لیے باہر گیا۔ ''غالب'' (۱۹۴۴ء، ص ۴۵۸)۔

۶۶۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید ص ۱۳۔

۶۷۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کے بعض اوراق بھی دوبارہ چھپوائے گئے تھے مثلاً دو نسخوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ پتہ چلا کہ صفحات ۱۹۱ اور ۱۹۲ کی کتابت اور حاشیے میں کافی فرق ہے۔

۶۸۔ تبصرہ نسخۂ حمیدیہ، از سید ہاشمی، ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔

۶۹۔ ''غالب'' از ڈاکٹر عبداللطیف مترجمہ سید معین الدین قریشی، (دہلی ایڈیشن)، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔

۷۰۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۵۔

۷۱۔ مکتوب عرشی بنام ڈاکٹر ابو محمد سحر مشمولہ ''دیوان غالب کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ۔نسخۂ بھوپال'' از ڈاکٹر ابو محمد سحر، ''نیا دور''، جمہوریت نمبر، ۱۹۵۸ء، ص ۷۸۔

۷۲۔ ''غالب اور بھوپال'' اردوئے معلی، شمارہ اول، غالب نمبر، ۱۹۶۰ء، ص ۹۴۔

۷۳۔ ''نیا دور'' جمہوریت نمبر، ۱۹۵۸ء، ص ۷۸۔

۷۴۔ ''نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں'' از نادم سیتاپوری، فروغ اردو، غالب نمبر ۱۹۶۸ء، حاشیہ صفحہ ۴۹۔

(سہ ماہی ''اُردو ادب'' (غالب نمبر)، شمارہ (۱)۔علی گڑھ۔۱۹۶۹ء۔ص ۱۳۹ تا ۱۵۵)

◆◆◆

ڈاکٹر ابو محمد سحر

دیوانِ غالبؔ کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ

نسخۂ بھوپال

غالبؔ کے اردو دیوان کا ایک قدیم قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) بھوپال میں ۱۹۱۸ء میں دستیاب ہوا تھا۔ چوں کہ اس میں غالبؔ کا وہ ابتدائی اردو کلام موجود تھا جس کو انھوں نے اپنے منتخب اور متداول دیوان سے خارج کر دیا تھا، اس لیے اس کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اس کو متداول دیوانِ غالبؔ کے اشتراک کے ساتھ ایک خاص ترتیب سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ابھی اس جدید دیوانِ غالبؔ کی کتابت شروع ہوئی تھی کہ ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کام کو مفتی محمد انوارالحق، ڈائریکٹر تعلیمات، بھوپال نے اپنے ذمہ لیا اور ان کی ترتیب و تدوین سے ۱۹۲۱ء میں نسخۂ بھوپال، متداول دیوان اور غالبؔ کے کچھ اور مطبوعہ کلام کا وہ مجموعہ شائع ہوا جو دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہے۔

نسخۂ بھوپال کو محفوظ رکھنے کا فخر کتب خانہ حمیدیہ، بھوپال کو حاصل تھا لیکن افسوس ہے کہ یہی کتب خانہ ریاست بھوپال کے انضمام کے موقع پر یا اس سے کچھ قبل اس کی ملکیت سے محروم ہو گیا۔ ایک مدت سے اس کا کہیں پتہ نہیں اور اس کو دوبارہ دریافت کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی میں اس کا ذکر دیکھ کر راقم الحروف نے مولانا امتیاز علی عرشؔی سے

ایک خط میں اس کے متعلق استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انھوں نے اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۸، مارچ ۱۹۶۰ء میں رام پور سے تحریر فرمایا تھا:

''میں نے نسخۂ حمیدیہ کی اصل (یعنی مخطوطۂ دیوانِ غالبؔ) حمیدیہ لائبریری میں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ انجمن کے اجلاس ناگپور سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ سنہ خود مجھے بھی یاد نہیں رہا ورنہ ضرور عرض کرتا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ وہاں کی لائبریری سے غائب ہوگیا۔ نواب صاحب مرحوم سے میں نے اُن کے ایک دوست کے ذریعے معلوم کرایا تھا تو انھوں نے اس نسخے کے اپنے پاس ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ فرمایا تھا کہ خود میرا علم بھی یہی ہے کہ مرجر کی افراتفری میں کسی نے وہاں سے پار کرلیا۔ اب اللہ جانے کہ وہاں سے کہاں گیا۔ وہاں کے لائبریرین نے لکھا تھا کہ نواب صاحب نے منگا لیا تھا۔ اگر اس کا کہیں پتہ چل جائے تو مجھے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ مجھے اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بہت سے الفاظ کی تعین کر سکوں گا۔''

اس مخطوطے کی گمشدگی کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں بلکہ کی گئی ہیں اور اگر یہ مخطوطہ تلف نہیں ہوگیا ہے تو اس طویل و عریض دنیا میں کسی فرد یا ادارے کے پاس سے کبھی نہ کبھی ضرور برآمد ہوگا لیکن فی الحال اس کی حیثیت ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کے ایک گلدستے سے زیادہ نہیں ہے۔

یوں تو نسخۂ حمیدیہ میں اس مخطوطے کی کیفیت اور کمال کے طبع ہوجانے کے بعد اس کی گمشدگی اردو دنیا کے لیے اتنا بڑا حادثہ نہیں رہی جتنا اس کے بغیر ہوسکتی تھی۔ شاید اس کی گمشدگی کا سبب بھی یہی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد اس کی حفاظت کا وہ خیال نہیں رکھا گیا جو اس مخطوطے کے لیے ضروری تھا۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب میں کئی حیثیتوں سے اتنی کوتاہیاں رہ گئی ہیں کہ اب بھی اس مخطوطے کی عدم موجودگی محققین کلامِ غالبؔ کے لیے کچھ کم افسوسناک نہیں ہے۔ تاہم اس کی گمشدگی کی بنا پر یہ غلط فہمی کہ یہ مخطوطہ سرے سے ناپید تھا یا نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے پہلے ہی غائب ہوچکا تھا قطعاً بے بنیاد ہے۔ مفتی انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ کی تمہید میں تو اس کی چشم دید کیفیت بیان بھی کی ہے، لیکن ان کے علاوہ کچھ اور اہلِ قلم نے بھی اس کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا۔

اس مخطوطے کی عدم موجودگی میں ان کی تحریروں اور کام کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس مخطوطے کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی میں سید ہاشمی نے اسے خصوصی طور پر بھوپال آکر دیکھا تھا جس کا بیان انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالبؔ کی عمر صرف پچیس برس تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمۂ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کر لیا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔'' [۱]

ڈاکٹر عبداللطیف نے دیوانِ غالب کی تاریخ اور ترتیب میں اس قلمی نسخے سے پوری مدد لی تھی۔ سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے ان کی ضرورت کے مطابق ماسٹر ولی محمد، معتمد ریاست بھوپال، کو ایک خط لکھا تھا اور اس کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد بھی اس غرض سے بھیجی تھی کہ جو اشعار نسخۂ بھوپال کے حاشیے سے لیے گئے تھے، ان پر نشان لگا دیے جائیں۔ اس کے جواب میں ماسٹر ولی محمد نے اصل مخطوطہ ڈاکٹر عبداللطیف کو روانہ کر دیا تھا۔ [۲] ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب غالبؔ کے دیباچے میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ باب سوم کی تیاری میں جو غزلیات غالبؔ کی تاریخی ترتیب سے بحث کرتا ہے، میں نے دیوان غالبؔ کے اس نسخے سے بہت مدد حاصل کی جو ۱۲۳۷ھ، ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ سرکار بھوپال نے ازراہِ فیاضی مجھے یہ نسخہ مستعار عنایت فرمایا تھا۔ میں اس موقع پر سرکار موصوف کا سپاس گزار ہوں۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کا دلی شکریہ بھی مجھ پر فرض ہے جن کے حسن توسط سے مجھے یہ نسخہ حیدر آباد میں دستیاب ہوا۔'' [۳]

اس اقتباس کے پہلے جملے کے اختتام پر حاشیے میں یہ نوٹ دیا ہے:

''یہ نسخہ دیوانِ غالب کی تاریخ وار تدوین میں میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ دیوان مذکور اس وقت زیرِ طبع ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گا۔'' ۴

چوں کہ یہ دیباچہ ۱۹۲۸ء میں لکھا گیا ہے اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کا مرتبہ دیوان غالب ۱۹۲۸ء میں زیرِ طبع تھا۔ لیکن مطبع میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس کا مسودہ ضائع ہو گیا ۵ اور یہ دیوان شائع نہیں ہوا اس کا صرف ایک حصہ (صفحہ ۱۷ سے صفحہ ۱۲۶ تک) جو ڈاکٹر عبداللطیف کی تحقیق کے مطابق ۱۲۲۵ھ سے ۱۲۳۷ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے، سید تمکین کاظمی کے توسط سے ۱۹۳۷ء میں مولانا امتیاز علی عرشی کو دستیاب ہوا تھا۔ ۶

ڈاکٹر عبداللطیف نے اصل کتاب میں بھی کئی جگہ نسخۂ بھوپال کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نسخۂ حمیدیہ کے مرتب اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ نسخہ کئی مرتبہ دہلی بھیجا گیا تھا تا کہ ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام اس میں شامل ہوتا رہے اور ایسے تمام اضافہ شدہ اشعار قلمی نسخہ کے حاشیے پر موجود ہیں۔ جو صاحب اصل مسودے پر کام کرنا چاہیں انھیں ان بیانات کی تصدیق ذاتی نقد و نظر سے کرنی ہوگی جیسا کہ راقم الحروف کو کرنا پڑا۔ (اس کا اندازہ تاریخ وار دیوانِ غالب کے ضمیمہ کے ملاحظے سے ہو سکتا ہے، اصل نسخے پر کئی جگہ فوجدار محمد غوث خاں کی مہر (۲/۶ سمر x ۸ء ا سمر ۱۲۴۸ھ) لگی ہوئی ہے اسی نام کی ایک اور مہر جو ذرا بڑی ہے (۵/۸ سمر x ۵ء۴ سمر) اول و آخر کے ان سادہ صفحات پر موجود ہے، جو اصل نسخے کے کاغذ سے قسم میں مختلف ہیں اور جو بعد کے لگائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اس مہر میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۴ء) لکھا ہوا ہے لیکن ان دلائل کی بنا پر جو متذکرہ ضمیمہ میں بیان کیے گئے ہیں یہ سنہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس نسخے میں ۱۸۳۲ھ تک کا کلام موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ اس زمانہ کے سارے کلام پر حاوی ہو۔'' ۷

ڈاکٹر عبداللطیف نے صاحب مہر کا نام سہواً فوجدار محمد خاں کے بجائے فوجدار محمد غوث خاں لکھا ہے۔ غوث محمد خاں فوجدار محمد خاں کے باپ کا نام تھا۔ یہ فیصلہ کرنے میں بھی کہ اس نسخے میں

۱۸۲۲ء (۱۲۳۸ھ) تک کا کلام موجود تھا ان سے اس بنا پر سہو ہوا ہے کہ انھیں نسخۂ شیرانی (تاریخ کتابت تقریباً ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء) کا علم نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے مہروں کے ناپ اور نسخۂ بھوپال کی ابتدا اور آخر کے صفحات کے کاغذ کے فرق کے متعلق جو اطلاع دی ہے وہ کسی اور تحریر میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر عبداللطیف کے نسخہ بھوپال پر مسلم ریویو، کلکتہ، بابت ۱۹۲۹ء میں انگریزی میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ سید محمد صاحب نے مجلۂ مکتبہ، حیدرآباد کی جلد ۲، شمارہ ۶ میں شائع کیا تھا۔ ۸ ان کا مرتب کیا ہوا تاریخ وار دیوانِ غالبؔ اگر شائع ہو گیا ہوتا تو نسخۂ بھوپال کے تحقیقی مطالعے کا ایک قابل قدر نمونہ منظر عام پر آجاتا لیکن بدقسمتی سے اس اہم دیوان غالبؔ کی قسمت میں تلف ہونا لکھا تھا۔ ایسی صورت میں یہ بھی غنیمت ہوا کہ مولانا امتیاز علی عرشیؔ کو اس کا ایک مطبوعہ حصہ مل گیا اور اس میں ڈاکٹر عبداللطیف نے نسخۂ بھوپال کے مطالعے کے جو نتائج پیش کیے تھے ان کو دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے حصۂ اختلاف نسخ میں جگہ مل گئی۔

نسخۂ بھوپال کے مشاہدے اور مطالعے کے زیادہ صحیح اور تفصیلی نتائج آج بھی کتاب میں موجود ہیں، وہ دیوانِ غالبؔ اردو نسخۂ عرشیؔ ۹ ہے، حالاں کہ اس دیوان کی ترتیب میں مولانا امتیاز علی عرشی نے نسخۂ بھوپال کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی ان کے جیسے بلند پایہ محقق کو دیوانِ غالبؔ کی تاریخ وار ترتیب میں دینا چاہیے تھی، کیوں کہ انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف کی طرح نہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی نقل فراہم کی، بھوپال آکر انھوں نے اس کا مطالعہ بھی بڑی عجلت اور بے اطمینانی میں کیا۔ پھر بھی انھوں نے اس کے مشاہدے اور نسخۂ حمیدیہ سے اس کے مقابلے کی جو کیفیت نسخۂ عرشی میں محفوظ کر دی ہے۔ وہ اس گمشدہ مخطوطے کی تکنیکی بازیافت اور نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح کے لیے آج سب سے بڑا سہارا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشیؔ نے اس مخطوطے کو انجمن ترقی اردو کے ناگ پور اجلاس سے واپسی میں ملاحظہ فرمایا تھا۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''دیوانِ غالب کے نسخوں میں سب سے پرانا اور اہم مخطوطہ یہی ہے۔ میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے اجلاس ناگپور سے واپسی میں خاص اس نسخے کو دیکھنے

کے لیے بھوپال میں دو دن قیام کیا تھا۔ اس مختصر مدت میں اس گوہر بے بہا کی حالت
بھی دیکھی اور اصل سے مطبوعہ نقل کا مقابلہ بھی کیا۔'' [10]

جیسا کہ عرشی صاحب نے راقم الحروف کے نام اس گرامی نامے میں لکھا ہے جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کو اس واقعے کی تاریخ یاد نہیں رہی لیکن یہ واقعہ جنوری ۱۹۴۴ء کا ہے کیوں کہ انجمن ترقی اردو کا ناگپور اجلاس اسی زمانے میں منعقد ہوا تھا۔ [11] اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ مخطوطہ جنوری ۱۹۴۴ء تک حمیدیہ لائبریری بھوپال میں موجود تھا۔

عرشی صاحب نے اس مخطوطے کی جو چشم دید حالت قلم بند کی ہے وہ مفتی انوار الحق مرتب نسخۂ حمیدیہ کے اسی قسم کے بیان سے زیادہ مفصل بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اس لیے اس کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

''.....اس مخطوطے کا ناپ ۲۲×۲۹، اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے۔ جدولیں رنگین
اور سلائی اور باریکا لاجوردی ہے، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں۔

شروع میں فوجدار محمد خاں بہادر [12] کی مہر ہے جس میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) منقوش ہے۔ ابتدائی سادہ اوراق میں سے پہلے دو ورقوں پر دو فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو مرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کو لکھا تھا۔ [13] ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں جن میں سے پہلے کے رخ ب میں شمسے کے اندر لکھا ہے:

''دیوانِ ہٰذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد، از کتب خانہ سرکار
فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ، قلمی، خوش خط۔''

دوسرے ورق کے رخ الف میں شمسے کے اندر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر ہے جس میں بخط طغراء ''فوجدار محمد خاں بہادر'' منقوش ہے۔ اس مہر کا سنہ ۱۲۶۱ھ ہے۔ اصل دیوان کے ورق الف پر انھیں صاحب کی دو چھوٹی مہریں ثبت ہیں جن میں سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) منقوش ہے۔ یہ مہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے اور شروع میں قصائد درج ہیں۔ سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے مہر ترجیح جناب والی یوم الحساب۔ یہ قصیدہ ورق ۴

الف پر ختم ہوگیا ہے اس کے بعد ۴ الف کی آخری سطر سے ''قصیدۂ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت'' شروع ہوا ہے جس کا آغاز ہے:

''ساز ایک مورہ نہیں فیض چمن سے بیکار''

اس کا انجام ورق ۹ ب کی سطر ۱ پر ہوا ہے۔ اس کے بعد ایضاً فی الحقیقت کے عنوان سے دوسرا اردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے:

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں

یہ قصیدہ ورق ۹ ب کی سطر ۳ سے شروع ہوکر ورق ۱۲ ا پر ختم ہوا ہے اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا آغاز ہے:

جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی

یہ ورق ۱۲ ا ب کی سطر ا سے شروع ہوکر ورق ۱۴ ا الف پر تمام ہوتا ہے۔

ورق ۱۵ ا ب سے دوسری رنگین اور طلائی لون کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔ اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی خطوں میں جو بظاہر خود غالبؔ کا ہے جگہ جگہ واہ لکھا گیا ہے:

آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب، سلمہم ربہم علی
ید العبد المذنب حافظ معین الدین بہ تاریخ پنجم شہر، صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرۃ
النبویہ بہ صورت اتمام یافت۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعہ میں بھی رہ چکا ہے۔ [۱۴] انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔

.... ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں باریکے کے اندر لکھا ہے ''محمد عبدالصمد مظہر'' میرے لیے یہ صاحب بھی انجان ہیں۔ [۱۵]

آخر میں عرشی صاحب نے اس مخطوطے کے بارے میں اپنے چند تحقیقی نتائج بھی پیش کیے ہیں:

''مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپالی کے لیے [۱۶] لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالبؔ کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا۔ اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ۱۲۴۸ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہرحال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی جو دیوانِ غالبؔ کے متداول انتخاب کی تاریخ ترتیب و تالیف ہے۔'' [۱۷]

نسخۂ بھوپال کی کئی خصوصیات اس کے نسخۂ مصنف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا متن ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد غالبؔ نے خود اور دوسروں کی مدد سے اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کر کے اسے نسخۂ شیرانی کے مسودے کے طور پر استعمال کیا کیوں کہ نسخۂ شیرانی کا متن جو تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں تیار ہوا، نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کہنا محال ہے کہ اس کے بعد یہ ان کے پاس نہیں رہا یا عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا۔ خود مولانا عرشیؔ نے دوسرے موقعوں پر یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالبؔ نے نسخۂ بھوپال میں گلِ رعنا کے بعد تک ترمیمیں کی تھیں اور اس مخطوطے کو انھوں نے متداول دیوان کی ترتیب کے وقت بھی سامنے رکھا تھا۔ [۱۸] مولانا عرشیؔ کی پیش کردہ معلومات کے مطابق اس مخطوطے میں عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے ناموں کے اندراجات کسی بھی زمانے کے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ دراصل یہ اندراجات بعد کے ہیں اور ان کا تعلق بھی بھوپال سے ہے۔ بھوپال کے عمائد ریاست میں عبدالعلی نام کے دو اصحاب گزرے ہیں۔ ایک عبدالعلی تونگر فرزند شیخ عبدالواحد مسکینؔ جن کا انتقال ۱۲۹۸ھ میں ہوا، اور دوسرے منشی سید عبدالعلی خاں خلف سید امجد علی رضوی جو ۱۳۰۶ھ میں بقیدِ حیات تھے۔ [۱۹] مخطوطے پر انھیں

دونوں میں سے کسی ایک نے اپنے دستخط کیے ہوں گے۔ عبدالصمد مظہرؔ نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے ملٹری سیکریٹری تھے۔ ۲۰ یہ بات بھی غیر واضح ہے کہ جب اس مخطوطے پر فوجدار محمد خاں کی ۱۲۴۸ھ کی مہر ثبت تھی تو عرشی صاحب نے اس کے بھوپال پہنچنے کی تاریخ اس سنہ کے بعد کیوں قرار دی ہے۔ ۱۲۴۸ھ کی مہر کی روشنی میں یقین سے بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ مخطوطہ اسی سال نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں داخل ہوا تھا۔ چوں کہ یہ سال غالب کے متداول دیوان کی ترتیب کا سال ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ انتخاب کے بعد ہی لیکن اسی سال یہ ان سے کسی طرح الگ ہوا ہو۔

عرشی صاحب نے فوجدار محمد خاں کی ۱۲۶۱ھ والی مہر کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف کی صراحت کے پیش نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مہر نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے کی باقاعدہ تشکیل یا تشکیل نو کے زمانے سے متعلق تھی۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ دیوانِ غالبؔ جدید نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ زیب ہاشمی، اردو سہ ماہی، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۴۔۷

۲۔ ضمیمہ نمبر ۱، غالبؔ از ڈاکٹر عبداللطیف، مترجمہ سید معین الدین قریشی، مطبوعہ جہانگیر بک ڈپو، دہلی، ص ۱۴۸، ۱۲۶۔

۳۔ ص ۷ کے ماخذ میں ہجری ۱۲۲۳ھ ۳ کے بجائے ۱۳۲۷ھ درج ہے۔

۴۔ ص ۸۔

۵۔ دیوان غالبؔ، نسخۂ عرشی، تبصرہ از مالک رام، فکر و نظر، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۵۔

۶۔ دیباچہ نسخۂ عرشی ص ۱۱۴، ماخذ میں ڈاکٹر عبداللطیف کے دیوان کے مذکورہ صفحات کا پہلا نمبر ۱۷ کے بجائے ۱۷ چھپ گیا ہے۔ لیکن پوری عبارت سے اس صفحے کا نمبر ۱۷ ہی متعین ہوتا ہے۔

۷۔ غالبؔ از ڈاکٹر عبداللطیف، ص ۲۶۔

۸۔ غالب از ڈاکٹر عبداللطیف، حاشیہ، ص ۲۵۔

۹۔ اب اس سلسلے میں اہم ترین دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں ہے۔ دیکھیے نسخۂ بھوپال۔ ترمیمیں اور اضافے۔

۱۰۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۷۔

۱۱۔ بحوالہ اردو سہ ماہی، جنوری ۱۹۴۴ء۔

۱۲۔ ''موصوف الذکر نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی الحجہ ۱۲۰۱ھ، مئی ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔'' حاشیہ ماخذ۔

۱۳۔ ''کلیاتِ آہنگ: ۲۳'' (حاشیۂ ماخذ)۔

۱۴۔ خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبدالعلی خاں ابن غلام محمد خاں بہادر تھے۔ یہ نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے مرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں (حاشیۂ ماخذ)۔

۱۵۔ نسخہ عرشی، دیباچہ ص ۷۵ تا ۷۷۔

۱۶۔ مفتی انوار الحق نے مخطوطہ کتابت کے بارے میں اپنا خیال غالباً کے ساتھ ظاہر کیا ہے جس کا لحاظ اس پیرایۂ بیان میں نہیں رکھا گیا۔

۱۷۔ دیوانِ غالب نسخہ عرشی، دیباچہ، ص ۸۔

۱۸۔ دیکھیے، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، اختلاف نسخ، ص ۴۴۸ اور شرح غالب ص ۲۲۱۔

۱۹۔ آثار الشعراء مرتبہ حافظ سید محمد ممتاز علی حافظ، مطبوعہ ۱۳۰۶ھ، ص ۳۵، ۳۶، ۱۵۳، ۱۵۴۔

۲۰۔ اختر اقبال حسینی، حصہ دوم، گوہر اقبال مرتبہ نواب سلطان جہاں بیگم، مطبوعہ ۱۹۱۲ء، ص ۱، ۲۴۲۔

(ماہنامہ ''نیا دور'' (غالب نمبر) لکھنؤ۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ص ۵۹ تا ۶۳)

•••

ڈاکٹر سید حامد حسین

دیوانِ غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دستخط اور مُہریں

دیوانِ غالب کا وہ قلمی نسخہ جو بھوپال میں میاں فوجدار محمد خاں (۱۸۱۱ء۔۱۸۶۵ء) کے کتب خانے میں محفوظ رہا، کلام غالب کے قدیم ترین نسخوں میں سے تھا [۱] اس نسخے کی اہمیت اس وجہ سے بھی تھی کہ اس میں غالب کا ایسا کلام بھی موجود تھا جو انھوں نے طباعت کے لیے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب اس نسخے کو متداول کلام کی شمولیت کے ساتھ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شائع کیا گیا، تو پہلی بار غالب شناس اس محذوف کلام سے متعارف ہوئے۔ یہ مخطوطہ غالباً ۱۹۴۸ء تک بھوپال میں محفوظ رہا، لیکن ریاست کے ہند یونین میں انضمام کے بعد زبردست تبدیلیاں آئیں اور جب حمیدیہ لائبریری کی وہ عمارت جہاں یہ مخطوطہ تھا، خالی کرائی گئی، شاید اُس وقت افراتفری میں یہ نسخہ کہیں ضائع ہو گیا۔ اصل نسخے کی غیر موجودگی میں اس کی کیفیت کا اندازہ کرنے کا واحد ذریعہ وہ تفصیلات ہیں جو ایسے حضرات نے بیان کی ہیں جنھوں نے اس نسخے کو دیکھا ہے۔ ان حضرات میں مفتی محمد انوار الحق، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور جناب امتیاز علی عرشی شامل ہیں۔ مفتی انوار الحق نے اصل نسخے کی مدد سے ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتب کیا اور اس کی تمہید میں مختصراً مخطوطے کی کیفیت بیان کی ہے۔ [۲] ڈاکٹر سید عبداللطیف غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اس

مخطوطے کو سر اکبر حیدری کی سفارش سے انھوں نے حیدر آباد منگوایا تھا اور اپنے ایک مضمون میں جو ''مسلم ریویو'' کلکتہ میں جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا، مخطوطے کے بارے میں بعض اہم تفصیلات درج کی ہیں۔ ۳ جناب امتیاز علی عرشی غالباً ۱۹۴۴ء میں بھوپال آئے تھے اور یہاں دو دن قیام کر کے انھوں نے اس مخطوطے کو دیکھا اور اس کے بارے میں جو معلومات یکجا کیں، انھیں اپنے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب (نسخۂ عرشی) میں شامل کیا ہے۔ ۴

ان بیانات میں مخطوطے کی کتابت اور اس میں موجود اصلاحات اور اضافوں کی کیفیت کے علاوہ ایسی تفصیلات بھی شامل ہیں جن کا کلام غالب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ لیکن تحقیق و تفتیش کے میدان میں کبھی کبھی ایسی الحاقی تفصیلات سے بھی بعض کار آمد نتائج اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ چناں چہ اسی توقع کے ساتھ ان تفصیلات سے اس مضمون میں بحث کی جاتی ہے۔

مفتی انوار الحق، ڈاکٹر عبداللطیف اور عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ مخطوطے کے اندر جا بجا فوجدار محمد خاں کی ایسی مُہریں ثبت ہیں جن پر ۱۲۴۸ھ کندہ ہے۔ لیکن مخطوطے کے شروع اور آخر میں ایسے اوراق پر جو بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں، ۱۲۶۱ھ کی مُہر ثبت ہے۔ مُہروں کے علاوہ مخطوطے پر بعض دستخطوں کی موجودگی کا بھی علم ہوتا ہے۔ عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔'' بعض شعروں کے سامنے ''پسند عبدالعلی'' یا ''پسند خاطر عبدالعلی'' بھی درج ہے۔ ۵ ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی ان دستخطوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور نسخے کے حاشیوں پر اضافوں کو دو مختلف خطوں میں بتاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں، اسی خط میں عبدالعلی کا نام لکھا ہے۔'' ۶ عرشی صاحب نے مخطوطے کے ورق ۱۲۹لف کے حاشیے میں باریکے کے اندر محمد عبدالصمد مظہر کے دستخطوں کا ذکر کیا ہے ۷ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا ہے۔ ۸ ڈاکٹر عبداللطیف اپنے مضمون میں مظہر کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے لیکن یہ بتاتے ہیں کہ متن کی ابتدا سے قبل شامل سادہ اوراق میں سے ورق ۱الف پر نمبرات کے علاوہ

شکستہ خط میں ''محمد حسین'' لکھا ہوا ہے اور نسخے میں حاشیوں پر خط شکستہ میں جو اضافے ہیں وہ انھیں دستخطوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ۹

قلمی نسخے پر ثبت مہروں کی وجہ سے بھی بعض محققین کو کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً مفتی انوارالحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں لکھا ہے کہ ''تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔'' ۱۰ مفتی صاحب نے مزید تحریر کیا ہے: ''جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ کی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں۔'' ۱۱ جناب غلام رسول مہر نے مفتی صاحب کے غالباً اسی بیان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مفتی صاحب کے ارشاد کے مطابق دیوان ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۴ء میں تصحیح و اضافہ کے لیے باہر گیا۔'' ۱۲ بعض محققین نے ۱۲۴۸ھ کی مہر کو دیکھ کر مخطوطے کے کتب خانۂ فوجدار محمد خاں میں داخلے کی بالکل صحیح تاریخ اسی سال کو تسلیم کر لیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر گیان چند اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ''چوں کہ فوجدار محمد خاں اہل ثروت تھے اس لیے...... وہ سال بہ سال نئی مہر بنواتے ہوں گے، اور متن کی مہر یہ ظاہر کرتی ہے کہ مخطوطہ پہلی بار ۱۲۴۸ھ میں کتب خانے میں آیا اور اس پر اس سال کی مہر لگا دی گئی۔'' ۱۳ لیکن اصل صورت ان قیاسات سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ نہ تو (بقول مفتی انوارالحق) یہ مہریں اس کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ خاص فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا، نہ (غلام رسول مہر کے قیاس کے مطابق) ان مہروں کو مفتی صاحب نے اصلاحات کے سنہ سے مطابقت دی ہے اور نہ (بقول ڈاکٹر گیان چند) یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ فوجدار محمد خاں ہر سال مہریں بنواتے ہوں اور ۱۲۴۸ھ کی مہر نسخے کی کتب خانۂ فوجدار محمد خاں میں داخلے کی صحیح صحیح تاریخ بتاتی ہے۔

بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں اب بھی کتب خانۂ فوجدار محمد خاں کی کئی قلمی اور مطبوعہ کتابیں موجود ہیں اور ان پر مہریں ثبت ہیں۔ ان کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر چھوٹی ہے اور ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ہے۔ بڑی مہر اس کتب خانے کی تقریباً ساری کتابوں

پر لگی ہوئی ہے۔ چھوٹی مہریں البتہ مختلف سنوں کی ہیں۔ ۱۲۴۸ھ کے علاوہ ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کی مہریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اور ایسی کتابوں کی تعداد مقابلتہً زیادہ ہے جن پر ۱۲۵۵ھ کی مہر ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہریں ہر سال نہیں بنی ہیں اور ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۵۵ھ کی مہر بنائی گئی ہے۔ جہاں تک ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر کا تعلق ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسی سال سکندر بیگم کے بیوہ ہونے اور ان کی نابالغ صاحب زادی شاہجہان بیگم کے رئیسۂ بھوپال نامزد ہونے کی صورت میں فوجدار محمد خاں نے مختار ریاست (ریجنٹ) کا کام سنبھالا تھا [۱۴] اور دستاویزات وغیرہ پر ثبت کرنے کے لیے بڑی مہر بنوائی گئی تھی۔ اسی سال یا اس کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی تنظیم ہوئی اور کتابوں کی جلد بندی وغیرہ کروا کے ان پر کتب خانے کے اندراجات کیے گئے اور ان پر ۱۲۶۱ھ کی مہریں لگوائی گئیں۔ یہی مہر بعد تک استعمال کی گئی کیوں کہ وہ چند ایسی کتابوں پر بھی ثبت ہے جو ۱۲۶۱ھ کے بعد کی لکھی یا چھپی ہوئی ہیں، یا جن پر اندر ۱۲۴۸ھ کی چھوٹی مہر لگی ہوئی ہے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوانِ غالب کا قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۰ء اور ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت آیا تھا۔ اور چوں کہ ان سات سالوں کے دوران کوئی دوسری مہر تیار نہیں کی گئی اس لیے ۱۲۴۸ھ کی مہر ہی کو استعمال کیا جاتا رہا۔ ۱۲۶۱ھ میں کتب خانے کی تنظیم کے وقت، جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بتایا ہے، متن سے پہلے چار ورقوں میں اوراق ۳ اور ۴ کے درمیان دو انگریزی کاغذ کے ورق (جو اصل نسخے کے کاغذ سے مختلف ہیں) چسپاں کیے گئے اور ان پر کتب خانے کا اندراج کیا گیا اور ۱۲۶۱ھ کی مہر لگائی گئی۔ اسی طرح ترقیمے کے بعد موجود چار اوراق میں اوراق ۲ و ۳ کے درمیان دو نئے ورق لگائے گئے اور ان پر ۱۲۶۱ھ کی مہر ثبت ہے۔ [۱۵] ان تفصیلات سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ متن سے قبل نسخے میں جو غیر منقوط فارسی خط نقل کیا گیا ہے اور ترقیمے کے بعد کے اوراق میں جو اضافے ملتے ہیں وہ اصل نسخے ہی کے کاغذ پر ہیں اور انھیں مخطوطے کی جلد بندی کے وقت شامل نہیں کیا گیا ہے۔ [۱۶]

جہاں تک دستخطوں کا تعلق ہے، عرشی صاحب کا خیال ہے کہ عبدالعلی، خاندان ریاست رام پور کے ایک فرد عبدالعلی خاں ابن غلام محمد خاں، صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے غالب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔ [۱۷] لیکن بھوپال میں بھی اس نام کے دو صاحب حیثیت

حضرات گزرے ہیں۔ان میں سے ایک سید محمد عبدالعلی خاں رضوی تھے اور دوسرے عبدالعلی تونگر۔

اول الذکر، قاضی سید امجد علی رضوی کے صاحب زادے تھے۔ قاضی صاحب پہلے اندور ریذیڈنسی میں میر منشی تھے۔۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں بھوپال آئے اور یہیں ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔ ۱۸ عبدالعلی غالباً ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ پہلے سیہور میں اور پھر بھوپال میں تعلیم حاصل کی۔ ملازمت ریاست کی ابتدا تحصیل داری کے عہدے سے ہوئی۔ بعد میں نائب ناظم، ناظم، مہتمم تحقیقات امثلہ ماضیہ کے عہدوں پر درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے مدار المہام کے عہدے پر فائز ہوئے۔۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں وکیل ریاست کے علاوہ ریاست کے نائب دوم بھی مقرر ہوئے اور انھیں ''خان'' کا خطاب عطا ہوا۔ ۲۰ ۱۸۸۶ء میں نائب وزیر دیوانی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۹ء میں نائب وزیر دیوانی وفوجداری اور ۱۸۹۱ء میں مہتمم دفتر حضور (اکاؤنٹنٹ جنرل) تھے۔ ۲۱ سید عبدالعلی کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتے تھے۔مولف آثار الشعراء نے ان کے ایک قطعۂ تاریخ کو نقل کیا ہے جو انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی عربی تفسیر ''فتح البیان'' پر لکھا تھا۔ ۲۲

لیکن گمان غالب یہ ہے کہ جن عبدالعلی نے مخطوطے پر دستخط کیے ہیں وہ عبدالعلی تونگر تھے۔ تونگر ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۳ ان کے والد سید عبدالواحد خاں مسکین خیر آباد کے رہنے والے تھے۔ بسلسلۂ تلاش معاش کچھ عرصے آگرے میں رہے۔ ۲۴ بعد میں دہلی آئے اور حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ان کا ربط ضبط پیدا ہوا۔

چناں چہ شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں تحریر کیا ہے:

''جوائے حریف وظریف است، ہنگام ورود دہلی سخن کہ می گفت بر مومن خاں میخواند و نیز بافقیر ربطے پیدا کردہ بود۔'' ۲۵

بعد میں مسکین اندور پہنچے۔ وہاں سے ۱۸۲۸ء کے قریب بھوپال آئے کیوں کہ ان کے دیوان میں دیوان ریاست حکیم شہزاد مسیح کی والدہ کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ شامل ہے جس سے ۱۸۲۸ء برآمد ہوتا ہے۔ ۲۶ یہاں مسکین رئیس وقت جہانگیر محمد خاں کے مصاحب ہوئے۔ ۲۷ ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں انھوں نے بھوپال میں انتقال کیا۔ ۲۸ مسکین پُرگو شاعر تھے اور اس عہد کے تقریباً ہر تذکرے میں ان کا ذکر موجود ہے (ملاحظہ فرمائیے گلشن بے خار، ص ۱۷۶، عمدۂ منتخبہ از

میر محمد خان سرور مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، ص ۶۷۷۔ سخن شعرا از عبدالغفور نساخ، ص ۴۳۳۔ طبقات الشعرائے ہند از کریم الدین، ص ۳۸۵۔ فہرست شعراء مرتبہ اشپرنگر مترجمہ طفیل احمد بعنوان ''یادگار شعرا'' ص ۱۸۴۔ صبح گلشن از سید علی حسن خاں، ص ۷۰۴۔ آثار الشعرا از سید ممتاز علی، ص ۲۰۶۔ تذکرۂ فرح بخش از یار محمد خاں شوکت، ص ۴۵۔ نور دیدہ (قلمی) از محمد عباس رفعت، ص ۶۴)۔ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں ان کا دیوان بھوپال کے مطبع سکندری میں طبع ہوا اور ربیع الاول ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں ان کی مثنوی چشمۂ شیریں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ''تالیف الامان'' کے عنوان سے انھوں نے ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء میں پند و نصائح پر مشتمل ایک رسالہ نثر میں بھی تحریر کیا تھا جس کا قلمی نسخہ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں محفوظ ہے۔

عبدالعلی تونگر شعر گوئی میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ ۲۹ نواب سکندر بیگم کے عہد میں دبیر ریاست رہے۔ ۱۸۶۸ء میں سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ان کے اثر و حیثیت میں مزید اضافہ ہوا اور کہا جاتا ہے کہ انھیں ریاست کے سپید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو گیا۔ ۳۰ لیکن ۱۲۷۶ھ میں جب نواب شاہجہاں بیگم ڈیوک آف ایڈنبرا سے ملاقات کر کے کلکتے سے واپس آئیں تو اس وقت بعض کارکنانِ ریاست نے عبدالعلی کے خلاف مزاج متغیر کرا دیا اور میر دبیر کی جانب سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کروا دیں۔ چناں چہ ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کی ابتدا ہوئی۔ ۳۱ بعد میں ان پر سحر سازی اور عملیاتِ سفلی میں دلچسپی کا بھی الزام لگایا گیا ۳۲ اور بالآخر انھیں ملازمت سے برطرف کر کے ۱۳، شعبان ۱۲۸۷ھ/ ۸، نومبر، ۱۸۷۰ء کو ریاست سے خارج کیا گیا۔ ۳۳ اور ان کے بعد مولوی صدیق حسن خاں میر دبیر ریاست ہوئے جنھوں نے بعد میں نواب شاہجہاں بیگم سے نکاح کیا۔ تونگر نے ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۳ء میں بمقام اندور وفات پائی۔ ۳۴ کہا جاتا ہے کہ تونگر اپنے زمانے کے ممتاز شعراء میں سے تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔ ۳۵ لیکن چوں کہ وہ بالآخر معتوب کر کے بھوپال سے نکالے گئے تھے، اس لیے اس عہد کے تذکرے خاص طور پر وہ تذکرے جو نواب صدیق حسن خاں کے زیر اہتمام تیار ہوئے ان کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور سوائے چار چھ اشعار کے ان کا نمونۂ کلام بھی دستیاب نہیں ہوتا۔

عبدالعلی نام کے ان دو اصحاب کو اگر دیوانِ غالب کے اس قلمی نسخے کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ دستخط سید عبدالعلی رضوی کے ہیں تو انھوں نے یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے ہی سے لے کر دیکھا ہے۔ لیکن اگر دستخط عبدالعلی تونگر کے ہیں تو یہ امکان ہو سکتا ہے کہ یہ دیوان فوجدار محمد خاں کے پاس پہنچنے سے پہلے ان کے زیرِ مطالعہ رہ چکا ہو۔ بلکہ ایک قیاس یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان تونگر کے والد مسکین ہی بھوپال لائے ہوں۔ میر محمد خاں سرور مولف عمدۂ منتخبہ، یعنی تذکرۂ سرور نے مسکین کو "شخص ذی عزت و بسیار خلیق" لکھا ہے ۳۶ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین اپنے عہد کے باذاق اصحاب سے اچھے مراسم رکھتے تھے۔ دہلی کے قیام کے دوران انھوں نے مومن کی شاگردی اختیار کی اور شیفتہ سے بھی انھوں نے دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ ہو سکتا ہے کہ شیفتہ کی وساطت سے یا کسی اور وسیلے سے مسکین اس قلمی نسخے کو حاصل کر سکے ہوں۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ غالب کے پاس اُس قلمی نسخے کی کتابت کے وقت تک رہا ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور "نسخۂ شیرانی" کے نام سے موسوم ہے۔ "نسخۂ شیروانی" کی تقریبی تاریخ کتابت ۱۸۲۶ء بیان کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ امکان ہے کہ ۱۸۲۸ء کے قریب بھوپال پہنچنے سے پہلے مسکین "نسخۂ بھوپال" حاصل کر چکے تھے۔ نسخے پر عبدالعلی کا اظہار پسندیدگی اور ان کے دستخط یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نسخہ مسکین کے پاس اس وقت تک رہا ہے جب تک تونگر سن شعور تک پہنچ گئے اور اس کے اہل ہو گئے کہ اشعار کو منتخب کر کے ان پر نشانات لگائیں اور ان پر رائے لکھیں (ان رایوں کو ڈاکٹر عبداللطیف نے "طفلانہ" کہا ہے) ۳۷ جیسا کہ نسخوں پر ثبت مہروں کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء اور ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت آیا۔ اب اگر عبدالعلی تونگر (ولادت ۱۲۳۶ھ) کی عمر کو اور ان کے سن شعور تک پہنچنے کو پیش نظر رکھا جائے تو اس نسخے کے تونگر یا مسکین سے جدا ہونے اور فوجدار محمد خاں کے پاس پہنچنے کی تاریخ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء کے قریب پہنچ جائے گی۔

نسخۂ بھوپال پر عرشی صاحب کے قول کے مطابق دوسرے دستخط محمد عبدالصمد مظہر کے ہیں اور ان کے لیے یہ صاحب انجان ہیں۔ ۳۸ لیکن عبدالصمد مظہر بھوپال کے معززین میں سے تھے اور عرصے تک والیۂ ریاست نواب سلطان جہاں بیگم کے ملٹری سیکریٹری رہے۔ مظہر ۲۲، دسمبر

۱۸۸۲ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۳۹ ۲۶، مئی ۱۹۰۶ء کو نواب زادہ محمد عبداللہ خاں، کرنل انچیف کے ملٹری سیکریٹری کی حیثیت سے ریاست بھوپال میں ملازم ہوئے۔ ۴۰ بعد میں ۲۲، مارچ ۱۹۰۸ء سے نواب سلطان جہاں بیگم کے ملٹری سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۴۱ ۱۴، اگست ۱۹۱۸ء سے پولٹیکل سیکریٹری دربار اور وکیل ریاست کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۴۲ ۱۹۲۲ء میں سر علی امام نے انھیں حیدرآباد بلایا اور وہاں ۵، اپریل ۱۹۳۲ء کو بحیثیت معتمد حرفت وتجارت ان کا تقرر ہوا۔ ۴۳ بعد میں ۱۹۲۷ء سے معتمد فوج کے منصب پر فائز رہے اور نواب صدر یار جنگ کا خطاب پایا۔ ۴۴ ۱۹۴۱ء میں معتمد دفاع مقرر ہوئے اور اسی زمانے میں پرنس آف برار کے کنٹرولر بھی رہے۔ ۴۵ ۱۷، جنوری ۱۹۶۱ء کو انھوں نے وفات پائی۔ ۴۶ عبدالصمد مظہر کو علم وادب سے گہرا شغف تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور حافظہ حیرت انگیز تھا۔ نہ صرف انگریزی، فرانسیسی، اردو، فارسی اور پشتو زبانوں سے انھیں اچھی واقفیت تھی بلکہ ان زبانوں کے شعروادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ شہنشاہ حسین رضوی نے ''دیوانِ ثاقب'' کے مقدمے میں اگست ۱۹۱۸ء میں ثاقب لکھنوی کی بھوپال میں آمد اور مظہر کی ان کے کلام سے گرویدگی کا اظہار کیا ہے۔ ۴۷ اسی طرح مظہر حیدرآباد کی فرنچ سوسائٹی اور انگلش پوئٹری سوسائٹی کے سرگرم ممبر تھے۔ ۴۸ تاریخ، خصوصاً ہندوستانی اور اسلامی تاریخ سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی اور حیدرآباد کے سہ ماہی انگریزی رسالے ''اسلامک کلچر'' کو ان کی سرپرستی حاصل تھی۔ شعروادب سے اس دلچسپی کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مظہر نے ''نسخۂ بھوپال'' کو دیکھا ہوگا۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں جب یہ پتہ چلا کہ بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں موجود اس قلمی نسخے میں غالب کا محذوف کلام بھی شامل ہے، اس وقت یہ نسخہ مظہر کی نظر سے گزرا ہو۔ چوں کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے مضمون میں ان کے دستخطوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے قریب جب ڈاکٹر عبداللطیف نے اس نسخے کو حیدرآباد منگوایا، اس وقت مظہر نے اس کو دیکھا ہو اور اس پر دستخط کیے ہوں۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے پہلے ورق پر شکستہ خط میں جن دستخطوں کو ''محمد حسین'' پڑھا ہے، میرا قیاس ہے کہ وہ دراصل ''محمد حنیف'' ہے۔ قاضی محمد حنیف، میاں فوجدار محمد خاں کے معتمد خاص

اور بڑے خیر خواہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی جاگیر کے منتظم اعلیٰ بھی تھے اور ہر قسم کے مالی اور انتظامی معاملات میں ان ہی کے ذریعے طے پاتے تھے۔ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں فوجدار محمد خاں کے ایسے خطوط کی نقول پر مشتمل نو جلدیں محفوظ ہیں جو ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں سے تقریباً نصف قاضی محمد حنیف کے نام ہیں اور ان خطوط میں نہ صرف انتظامی امور کے بارے میں ہدایات شامل ہیں بلکہ بعض خطوط میں بعض کتابوں کی فراہمی کے بارے میں بھی ان کو لکھا گیا ہے۔ ''نسخۂ بھوپال'' پر قاضی صاحب کے دستخطوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یا تو یہ نسخہ ان کی وساطت سے خریدا گیا ہے یا خریداری کے بعد انھوں نے اپنی ذاتی منظوری کے طور پر اس کے پہلے صفحے پر اپنے دستخط کر دیے ہیں۔

ان مہروں اور دستخطوں کی مدد سے جو نتائج اخذ یا جو قیاسات قائم کیے جا سکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ''نسخۂ بھوپال'' جو کہ ۱۸۲۶ء کے قریب غالب سے جدا ہوا، ۱۸۲۸ء کے قریب عبدالواحد خاں مسکین کے ساتھ بھوپال پہنچا اور ان کے پاس یہ اس وقت تک رہا جب تک ان کے صاحب زادے عبدالعلی تونگر سن شعور تک پہنچ گئے۔ اور اس لحاظ سے، جیسا کہ مہروں کی مدد سے قیاس کیا جا سکتا ہے، یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۵۵ھ کی مہر تیار ہونے سے کچھ قبل پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نسخے کی خریداری قاضی محمد حنیف کے ذریعے کی گئی ہو۔ اس امر میں بہر حال کسی شک کی گنجائش نہیں کہ عبدالصمد مظہر نے اس نسخے کو اس کی بازیافت کے بعد ہی دیکھا اور اس لحاظ سے ''نسخۂ بھوپال'' کی کہانی میں ان کا کوئی اہم حصہ نہیں ہے۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ کچھ عرصہ قبل تک اس نسخے کو سب سے قدیم نسخہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن اپریل ۱۹۶۹ء میں امروہے کے ایک قلمی کتابوں کے تاجر توفیق احمد کے پاس دیوانِ غالب کا ایک ایسا نسخہ دریافت ہوا ہے جسے کہا جاتا ہے کہ غالب نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔ مخطوطے پر ترقیمے کے طور پر یہ عبارت درج ہے مگر اس میں سنہ نہیں لکھا گیا: ''تمت تمام شد۔ بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز

باقیماندہ فقیر بیدل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط''۔ جناب نثار احمد فاروقی کے قیاس کے مطابق یہ نسخہ ۱۸۲۰ء کے قریب تحریر کیا گیا ہے (''دیوانِ غالب کا ایک اہم ترین مخطوطہ''، ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲، اپریل، ۱۹۶۹ء، ص ۲۔ مزید ملاحظہ فرمائیے، مراسلہ بعنوان ''دیوانِ اردو بقلم مرزا غالب'' از جلال الدین، روزنامہ قومی آواز، لکھنؤ، ۱۶، اپریل، ۱۹۶۹ء، ص ۳۔

۲۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید ص ۵ تا ۸۔

۳۔ اس انگریزی مضمون کا ترجمہ جناب سید محمد نے کیا تھا جو کہ مجلہ مکتبہ (حیدر آباد) کے شمارہ ۶ میں صفحات ۵۳ تا ۵۷ پر ''دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کے مضمون کے سارے حوالے اسی ترجمے سے ماخوذ ہیں۔

۴۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۵ تا ۷۸۔

۵۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ ص ۷۷۔

۶۔ ''دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' مترجمہ جناب سید محمد، مجلۂ مکتبہ (حیدر آباد)، جلد ۲، شمارہ ۶، ص ۵۷۔

۷۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ، ص ۷۷۔

۸۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ، ص ۷۸۔

۹۔ مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مترجمہ جناب سید محمد مذکورہ بالا، ص ۵۶۔

۱۰۔ ''نسخۂ حمیدیہ''، تمہید، ص ۶۔

۱۱۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید، ص ۶۔

۱۲۔ ''غالب''، (۱۹۴۴ء ایڈیشن)، ص ۴۵۸۔

۱۳۔ نسخۂ عرشی، طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات (تتمہ)، نقوش، 'غالب نمبر'، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔

۱۴۔ تاج الاقبال، تاریخ ریاست بھوپال از شاہجہاں بیگم (فارسی)، دفتر دوم، ص ۳۔
۱۵۔ مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مذکورہ بالا، ص ۵۵ و ۵۶۔
۱۶۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون محولہ بالا میں اس شک کا اظہار کیا ہے کہ ترقیمے کے بعد درج شدہ غزلیں ۱۲۶۱ھ کے بعد اضافہ کی گئی ہوں گی کیوں کہ اس وقت تک غالب کا دیوان چھپ چکا تھا۔ نقوش، غالب نمبر، ص ۲۰۸۔
۱۷۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ، حاشیہ ص ۷۷۔
۱۸۔ آثار الشعراء، از ممتاز علی، ص ۱۵۲ و ۱۵۳۔
۱۹۔ عبدالعلی نے اپنے ایک بیان مورخہ ۳، جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ میں اپنی عمر تخمیناً ۵۷ سال بتائی ہے۔ ''فیصلہ مورخہ ۲۲ جمادی الثانی، ۱۳۰۱ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۹۴ء پمفلٹ کے معاملات پر'' ص ۳۹۔
۲۰۔ آثار الشعراء، از ممتاز علی، ص ۱۵۳ و ۱۵۴۔
۲۱۔ تزک سلطانی، از سلطان جہاں بیگم، ص ۲۸۷ و ۳۰۴۔
۲۲۔ آثار الشعراء، از ممتاز علی میں ۱۵۴ و ۱۵۵۔
۲۳۔ مطابق قطعۂ تاریخ مشمولہ ''دیوان مسکین'' ص ۲۱۵ و ۲۱۶۔
۲۴۔ عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور)، از میر محمد خاں سرور، ص ۶۷۷۔
۲۵۔ گلشن بے خار، ص ۱۷۶۔
۲۶۔ مصرعہ تاریخ: ''ہائے مریم بزیر خاک رفت'' (کذا)، دیوان مسکین، ص ۲۱۷۔
۲۷۔ صبح گلشن، از سید علی حسن خاں، ص ۴۰۷۔
۲۸۔ تذکرۂ فرح بخش، از یار محمد خاں شوکت، ص ۴۵۔
۲۹۔ آثار الشعراء، از ممتاز علی، ص ۳۶۔
۳۰۔ تاریخ اُنکہ، از سید مہدی علی سہوانی، ص ۷۰۔
۳۱۔ تاریخ اُنکہ، از سید مہدی علی سہوانی، ص ۷۱۔
۳۲۔ تذکرۂ فرح بخش، از یار محمد خاں شوکت، ص ۸۳۔ آثار الشعراء از ممتاز علی، ص ۳۶۔ خمخانۂ جاوید (جلد دوم) از لالہ سری رام، ص ۱۵۸۔

۳۳۔ قلمی بیاض، ازمولانا محمد عباس رفعت (مملوکہ کتاب گھر بھوپال)۔

۳۴۔ آثارالشعراء، ازممتاز علی، ص ۲۶۔

۳۵۔ ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' ازڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ص ۱۳۷۔

۳۶۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۶۷۷۔

۳۷۔ مضمون ڈاکٹر عبداللطیف مذکورہ بالا، ص ۵۷۔

۳۸۔ نسخۂ عرشی، ص ۷۷۔

۳۹۔ اسٹارڈائریکٹری مملکت حیدرآباد دکن، ص ۵۰۲۔

۴۰۔ اخترالاقبال، ازسلطان جہاں بیگم، ص ۱۰۔

۴۱۔ سول لسٹ عہدہ داران مندرجہ جریدہ ریاست بھوپال، بابت ششماہی دوہم لغایت آخر دسمبر ۱۹۱۷ء، ص ۱۴۔

۴۲۔ تذکرہ سالانہ ریاست بھوپال، بابت ۱۸۔۱۹۱۷ء، ص ۱۳۱۔

۴۳۔ لسٹ آف لیڈنگ آفیشلز، نوبلس اینڈ پرسونیجز، حیدرآباد ریذیڈنسی گورنمنٹ پریس (۱۹۳۷ء)۔ص ۲۹۔

۴۴۔ اسٹارڈائریکٹری، ص ۵۰۲ و ۵۰۳۔

۴۵۔ ہسٹری آف سروسز آف گزیٹڈ آفیسرز آف دی حیدرآباد اسٹیٹ کیرڈ اپ تو مارچ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۱۷۔

۴۶۔ ''اسلامک کلچر'' (انگریزی سہ ماہی، حیدرآباد) اپریل ۱۹۶۱ء۔

۴۷۔ دیوان ثاقب، ص ۶۴۔

۴۸۔ ''اسلامک کلچر''، مذکورہ بالا۔

(ماہنامہ ''صحیفہ'' (غالب نمبر)، (حصہ سوم)۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۹ تا ۳۹)

•••

پروفیسر حمید احمد خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ)

مرزا غالب کی وفات کے پچاس سال بعد بھوپال کے کتب خانۂ حمیدیہ میں دیوان غالب کا سب سے پہلا نسخہ ۱؎ ایک خوشنما مخطوطے کی صورت میں دستیاب ہوا۔ اس دریافت نے اُس زمانے کے ادبی حلقوں میں ایک سنسنی سی پیدا کردی کیوں کہ غالب کا پہلا دیوان اُس بے دریغ قطع و برید کے باعث، جس کا ذکر حالی، آزاد اور خود غالب نے کیا ہے، محض ایک ادبی حکایت بن کر رہ گیا تھا۔ اب جو یہ پورا دیوان غیر مترقبہ طور پر میسر ہوگیا تو اکثر اہلِ ذوق نے اس کی طباعت و اشاعت کا خیر مقدم کیا، اگرچہ بعض لوگوں کو اعتراض ہوا کہ جو اشعار مرزا غالب نے خود رد کردیے تھے، اُنھیں اِس طرح نشر کر کے گڑے مردے اُکھیڑنا کیا ضرور ہے۔ بایں ہمہ بھوپال کے ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق، کے فہم سلیم نے صحیح فیصلہ کیا اور دیوانِ غالب کا یہ نسخہ جو نواب محمد حمید اللہ خاں ۲؎ کے اعزاز میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کہلایا، مفتی صاحب کے اہتمام سے مخطوطے کی کتابت کے ٹھیک ایک صدی بعد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوگیا۔

قلمی دیوان کی کتابت نومبر ۱۸۲۱ء میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس دیوان کے آخری صفحے پر دیوان کی آخری رباعی کے بعد سرخ روشنائی میں یہ خوشخط تحریر ملتی ہے:

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب و ۳؎ قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہ

ربہم علیٰ ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ ؐ صورت اتمام یافت۔"

دیوان کے آغاز سے پہلے جلد کے اندر حسبِ دستور جو سادہ اوراق لگائے گئے ہیں، اُن میں سے دو پر مولوی محمد فضل حق کے نام مرزا غالب کے فارسی مکتوب بہ صنعتِ تعطیل (مشمولہ پنج آہنگ) کی بد خط نقل ہے۔ دیوان کے مندرجات کی ترتیب یوں ہے: پہلے ۴ر قصائد ہیں، پھر ۲۷۵ر غزلیات اور ان کے بعد ۱۱ر رباعیات۔ آخری رباعی ہے: "مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل۔" چوں کہ صرف یہی رباعی اور اس کے نیچے حافظ معین الدین کی مندرجہ بالا اختتامی تحریر آخری صفحے پر آئی ہے اس لیے صفحے کا تقریباً دو تہائی حصہ خالی رہ گیا ہے۔ خالی جگہ میں فوجدار محمد خاں ۵ کی ۱۲۴۸ھ کی مہر ثبت ہے۔ جس سے کم از کم یہ واضح ہوتا ہے کہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں یہ دیوان تاریخ کتابت کے گیارہ بارہ برس بعد پہنچا۔ اسی بنا پر مفتی انوار الحق کا یہ قیاس محلِ نظر ہے کہ قلمی دیوان "غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔" ۶ یہ امر بھی مشتبہ، بلکہ بعید از قیاس ہے کہ دیوان کے حاشیے کے اضافے اور متن کی اصلاحیں ۱۲۴۸ھ کے بعد معرضِ تحریر میں آئیں، یا دیوان کا یہ نسخہ بھوپال پہنچنے کے بعد مزید اندراجات کے لیے پھر کبھی دہلی بھیجا گیا۔ گمانِ غالب ہے کہ قلمی دیوان میں حاشیے کے اضافے اور متن کی ترمیمات ۱۲۳۷ھ اور ۱۲۴۸ھ کے درمیان درج ہو چکی تھیں اور دیوان ان ترمیمات و حواشی کے ساتھ ہی بھوپال پہنچا۔ بھوپال کے نسخے اور دیوان غالب کے اُس مخطوطے کو، جو حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے مجموعۂ کتب میں شامل ہے ۷ اگر ملا کر پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال کے قلمی نسخے میں حاشیے کے اضافے غالب کے سفرِ کلکتہ پر روانہ ہونے سے پہلے، یعنی ۱۸۲۶ء تک، تصنیف ہو چکے تھے۔ معنوی طور پر بھی ان میں بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جو غالب کی پختگیِ فکر کے کسی دور (مثلاً ۳۳-۱۸۳۲ء کے بعد) سے منسوب نہیں کیے جا سکتے۔

مفتی انوار الحق کا نسخہ شائع ہوا تو یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مطبوعہ نسخہ قلمی نسخے کی صحیح نقل نہیں ہے۔ اس بارے میں شاید سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے نسخے میں کئی جگہ

حاشیے کے اندراجات اور متن کے درمیان ضروری امتیاز قائم نہ رہ سکا۔ چناں چہ صحیح صورتِ حال کی دریافت کے لیے قلمی نسخے کا معائنہ ضروری ہو گیا۔ اواخرِ اگست ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک سفر سے واپس لاہور آتے ہوئے میں بھوپال ٹھہر گیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ نہ رہنے سے قطع نظر، مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً مخطوطے کی پچیسویں غزل (بسکہ جوشِ گریہ سے زیروزبر ویرانہ تھا) مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۳۲ پر شروع ہوتی ہے اور اس غزل سے اگلی، یعنی چھبیسویں، غزل (نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا) مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۱۲ پر۔ یہ صورت حال دیکھ کر میرے لیے لازم ہوا کہ میں اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھوں، اوّل یہ کہ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب معین کر دوں اور دوم یہ کہ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان جہاں جہاں اختلاف ہے، اُس کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لوں۔ افسوس ہے کہ وقت کی کوتاہی کے باعث میرے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ مخطوطے کے ہر شعر اور مصرع کو لفظ بہ لفظ دیکھ لیتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ترتیب منظومات کی تصحیح اور حواشی کی تشخیص کرتے ہوئے مطبوعہ نسخے کے کاتب کی لفظی فروگذاشتوں پر جابجا نظر پڑی۔ ان کا ذکر قارئین کو حسبِ موقع دیوان کے متعلقہ صفحات پر حاشیے کے اشارات میں ملے گا۔

۱۹۲۱ء کا نسخۂ حمیدیہ بھوپال کے قلمی دیوان کی پہلی مطبوعہ نقل ہے۔ افسوس ہے کہ قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصور میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہیں، بجز اس ایک صورت کے کہ قلمی دیوان کا شاید کوئی شعر مطبوعہ نسخے سے حذف نہیں ہوا۔ تاہم قلمی دیوان کے پیشِ نظر نہ ہوتے ہوئے مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے پر تکیہ ناگزیر ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے نسخے کی تیاری میں مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے متن کو بنیادی متن قرار دیا ہے لیکن قلمی نسخے سے لی ہوئی یادداشتوں کی روشنی میں یا کسی دوسری قابلِ اعتماد شہادت کے سہارے مطبوعہ نسخے سے جابجا انحراف کیا ہے۔ اس قسم کے انحراف کے حوالے قارئین کو آیندہ صفحات میں بہ کثرت ملیں گے۔ ان حوالوں کی موجودگی سے درگزر کیجیے تو اس زیرِ نظر نسخے کا متن بھوپال کے

مخطوطے کی ہو بہو نقل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں نہ صرف بعد کی سب اصلاحیں بلکہ وہ پوری کی پوری غزلیں بھی شامل ہیں جن کا بھوپال کے مخطوطے میں سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ اس طرح گو قارئین کو متداول دیوان کا الگ نسخہ مقابلے کے لیے پاس رکھنے کی ضرورت نہ رہی لیکن ابتدائی اور آخری دَور کے کلام کے ساتھ ساتھ چھپنے کی وجہ سے بھوپال کے مخطوطے کے علیحدہ وجود کا تصور وضاحت سے قائم نہ رہ سکا۔ میں نے آیندہ اوراق میں بھوپال کے مخطوطے کی نقل پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور متداول دیوان سے اس ابتدائی متن کا مقابلہ خود قارئین کی بینش و دانش پر چھوڑا ہے۔

اس نسخے کی تیاری کے کام میں مجھے اپنی ۱۹۳۸ء کی یادداشتوں کے ناکافی ہونے کا بار بار احساس ہوا۔ بعض موقعوں پر مجھے مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتبہ دیوان (علی گڑھ، ۱۹۵۸ء) اور پروفیسر محمود شیرانی کے دریافت کردہ قلمی دیوان سے گراں قدر مدد ملی، جس کا میں بصد شکریہ اعتراف کرتا ہوں۔ قارئین کو آیندہ صفحات میں ''نسخۂ عرشی'' اور ''نسخۂ شیرانی'' کے جو حوالے ملیں گے، ان سے علی الترتیب یہی مطبوعہ اور قلمی دیوان مراد ہیں۔

آج سے تیس برس قبل میں جب غالب کے پہلے اُردو دیوان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بھوپال پہنچا تو یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزری تھی کہ اس مخطوطے کی صحیح نقل مرتب کرنے کی ذمے داری کبھی مجھ پر آ پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں قلمی دیوان کے معائنے کے بعد جو یادداشتیں میں نے قلم بند کیں، ان کی اصل حیثیت ذاتی حوالے کے اشارات سے زیادہ نہ تھی۔ ان اشارات کا مصرف اُس وقت میرے نزدیک محض یہ تھا کہ میں اپنی اطلاع کے لیے کبھی کبھی حسب ضرورت انھیں دیکھ سکتا۔ سالہا سال میں اسی خیال میں رہا مگر کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کے بعض غالب شناس احباب نے مجھے لکھا کہ بھوپال کا مخطوطہ کتب خانۂ حمیدیہ سے غائب ہو گیا ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ جن یادداشتوں کو میں نے ذاتی ذخیرۂ معلومات کی حیثیت دے رکھی تھی، وہ دوسروں کے لیے بھی موجبِ دلچسپی ہوں گی، کم از کم اُس وقت تک کہ بھوپال کا گمشدہ مخطوطہ دوبارہ ہاتھ نہ آ جائے۔ یہ نسخہ جو اب شائع ہو رہا ہے اس لحاظ سے بھوپال کے مخطوطے کی صحیح نقل ہے کہ اس کے متن میں صرف وہی مضمون آیا ہے جو حافظ معین الدین کے لکھے ہوئے دیوان

کے متن میں ملتا ہے اور قلمی دیوان کے حاشیے کے اندراجات یہاں بھی حواشی کی صورت میں دیے گئے ہیں۔ قصائد، غزلیات اور رباعیات کی ترتیب اور پھر ہر رباعی، غزل اور قصیدے میں اشعار کی ترتیب بعینہٖ بھوپال کے قلمی نسخے کے اندراجات کے مطابق ہے۔ املا میں البتہ قلمی نسخے کے بجائے مفتی انوارالحق کے مطبوعہ نسخے کا تتبع کیا گیا ہے۔ قلمی نسخے کے کاتب یا کاتبوں کے ڈیڑھ سو برس پرانے املا کا بجنسہٖ اختیار کرنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا، اگرچہ کہیں کہیں میں نے حسب ضرورت ان کاتبوں کی خصوصیات تحریر کا ذکر کیا ہے۔ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں بڑی حد تک جدید اُصولِ کتابت ملحوظ رکھے گئے ہیں اور جا بجا اضافت کا استعمال ہوا ہے جو بجائے خود قلمی نسخے کے املا سے انحراف ہے۔ مگر بحالاتِ موجودہ انحراف کی یہ صورت قبول کیے بغیر چارہ گر نہ تھا۔ تجدیدِ املا سے قطع نظر، میں نے لفظی اختلاف کے معاملے میں ہر موقع پر قلمی نسخے کے اندراج کا لحاظ کیا ہے۔ مثلاً متداول دیوان کی مشہور غزل: ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'' کے اکثر اشعار قلمی دیوان کے متن میں موجود ہیں، مگر قلمی دیوان میں اس غزل کی ردیف ''ہوتے تک'' ہے۔ میں نے مطبوعہ نسخے سے اختلاف کر کے یہی آخرالذکر صورت اختیار کی ہے، کیوں کہ گو اکثر قارئین غالب کے لیے اب ''ہونے تک'' کے بجائے ''ہوتے تک'' کہنا ناگوارِ خاطر ہے لیکن بآثارِ ظاہر اس ردیف کی اصلی صورت وہی تھی جو بھوپال کے قلمی دیوان میں ملتی ہے۔

بھوپال کے مخطوطے کے مطالعے سے قاری کے ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سلسلۂ سوالات قدرتاً مخطوطے کی اس مطبوعہ نقل میں بھی منتقل ہو گیا ہے۔ ان سوالات میں سے بعض کی نوعیت محض ادبی ہے اور بعض کی خالصتاً تحقیقی۔ ادبی نوعیت کے سوالات اُن مغلق فارسی ترکیبوں (مثلاً ''ہوس گستاخیِ آئینہ'' یا ''وادیِ جوہر غبار'') کے متعلق پیدا ہوتے ہیں جن کی ابتدائی کلام میں کثرت ہے اور جن کی جگہ قلمی دیوان ہی کے متن میں بتدریج غالب کے نئے اندازِ بیان کو ملنے لگتی ہے۔ ان ادبی سوالات سے قطع نظر، کچھ اور سوالات ذہن میں آتے ہیں جن کا جواب مل جائے تو ممکن ہے کچھ نئے نتائج مستنبط ہوں۔ مثلاً دیوان کے متن میں کتنی غزلیں ''اسد'' تخلص کی ہیں اور کتنی ''غالب'' تخلص کی؟ ۸ حاشیے کے اندراجات میں غالب یا اسد تخلص کتنی بار استعمال ہوا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا جواب قلمی نسخے ہی میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ مگر بعض اور مسائل

ہیں جن کی تفتیش کے لیے یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دیے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔ ''عبدالعلی''، ''عبدالصمد مظہر'' اور ''آغا علی''، جنھوں نے گاہ بہ گاہ دیوان کے کسی شعر پر صاد کیا ہے، کون حضرات ہیں؟ اور پھر حافظ معین الدین، جنھوں نے پورا دیوان خوشخط لکھا، کون تھے؟ ان لوگوں سے غالب کو دورِ شباب میں کیا اور کس قسم کا تعلق رہا؟ غالب نے بعض مقطعوں میں اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ ظاہر کیا ہے، لیکن کسی جگہ دہلی میں اپنے قیام کو عارضی اور مسافرانہ بھی قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی کون سی غزلیں قیامِ آگرہ کے دوران میں لکھی گئیں اور کون سی اُس زمانے میں جب مرزا غالب بالآخر آگرہ چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی چلے آئے؟ اس قسم کے کئی پیچیدہ مسائل ابھی تک حل طلب ہیں اور عجب نہیں کہ ہمیشہ حل طلب رہیں۔ میری رائے میں یہ دیباچہ، جس کا مقصد بھوپال کے قلمی نسخے کا تعارف ہے، ان دقیق مسائل اور تفصیل طلب مباحث کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ گتھیاں سلجھانے کے لیے تنقید و تحقیق کے علیحدہ باب کھولنے کی ضرورت ہے۔

دیوان کے مطبوعہ اوراق سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ صحت طباعت کے لیے پوری کوشش کے باوجود متن میں، اور خود اپنے لکھے ہوئے حواشی میں، جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ایک ''صحت نامۂ اغلاط'' دیوان کے آخر میں دیا جا رہا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ صحت نامہ سامنے رکھ کر غلطیوں کی تصحیح فرمالیں۔

اس نسخے کی ترتیب و اہتمام میں عزیزم گوہر نوشاہی جس طرح میرا ہاتھ بٹاتے رہے اس سے کام کی ہر منزل میرے لیے آسان اور خوشگوار بن گئی۔ نسخۂ شیرانی اور نسخۂ عرشی میں سے اکثر حوالے میرے لیے گوہر نوشاہی صاحب نے تلاش کیے اور شروع سے آخر تک سب پروف بڑی احتیاط سے دیکھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مشکل اشعار کے معنی سمجھنے کی پُر لطف کوشش میں وہ برابر میرے ساتھ شریک رہے۔ محبِ مکرم سید امتیاز علی تاج کا شکریہ بھی واجب ہے جن کی تحریک اور ترغیب و اصرار کے بغیر یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

حمید احمد خاں

(فروری، ۱۹۶۹ء)

اوپر میں نے کتاب کے غلط نامے کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں میری ایک خطا ایسی ہے جسے

منجملۂ اغلاطِ فواحش قرار دیے بغیر چارہ نہیں۔ بھوپال کے قلمی نسخے میں بعض غزلیں ایسی ہیں جو متن میں شامل ہونے کے باوجود کسی مغالطے کے باعث حاشیے پر بھی نقل کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ غزل: ''نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا'' متن میں یہ چونتیسویں غزل ہے۔ اسے غزل ۳۳ (کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا) اور غزل ۳۵ (زبس خوں کشتۂ رشکِ وفا تھا وہم بسمل کا) کے درمیان آنا چاہیے تھا مگر اس غزل کے ساتوں شعر اس سے پہلے غزل ۲۰ (نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا) کے حاشیے میں بھی درج ملتے ہیں۔ میں نے اس صورتِ حال سے دھوکا کھا کر اس غزل کو (کسی عالم سرگشتگی میں) متن سے حذف کر دیا۔ اب دیوان کے طبع ہو جانے کے بعد اس پر پھر نظر ڈالی تو یہ غلطی علم میں آئی۔ حضرات قارئین میری اس لغزش سے درگزر فرما کر صفحہ ۴۷ر کے حاشیے کے ساتوں اشعار صفحہ ۵۹ر پر متن میں بھی درج فرمالیں۔

ان سب کوششوں کے باوجود (دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ!) دیوان کی عبارت غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکی۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ قلمی دیوان کے متن میں حافظ معین الدین نے جو اغلاط کتابت ابتداء داخل کیں، اور دیوان کے حواشی پر موٹے قلم والے بدخط کاتب (غالباً عبدالصمد مظہر) نے اپنی بے بضاعتی اور بے احتیاطی کے باعث جو گل کھلائے، ان سب پر مفتی انوار الحق کے نسخے کے کاتب نے وہ چند اضافے کیے۔ با ایں ہمہ، میں نے بدرجۂ مجبوری اس اُصول کی پابندی کی ہے کہ جب تک بھوپال کا مخطوطہ دوبارہ دستیاب نہ ہو، مفتی انوار الحق کے شائع کردہ نسخے کی عبارت سے بلاوجہِ موجہ انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

ح۔ا۔خ

حوالہ وحواشی:

۱۔ دورانِ تحریر میں اطلاع ملی ہے کہ اُنھیں دنوں ہندوستان میں ایک قدیم تر مخطوطے کا پتا چلا ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ابھی وہ خصوصیت جو گزشتہ نصف صدی میں بھوپال کے قلمی دیوان کو حاصل رہی، اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

۲۔ اُس وقت: نواب زادہ محمد حمید اللہ خاں، چیف سیکریٹری، ریاست بھوپال۔

۳۔ کذا۔

۴۔ مطابق یکم نومبر ۱۸۲۱ء۔

۵۔ فوجدار محمد خاں، بھوپال کے نواب غوث محمد خاں کے بیٹے تھے۔

۶۔ دیکھیے مفتی انوار الحق کے شائع کردہ نسخے کا صفحہ ۵۔

۷۔ اس قلمی دیوان کی تاریخ کتابت معلوم نہیں ہے، لیکن بھوپال کے مخطوطے کے حاشیے کے اندراجات اس کے متن میں ملتے ہیں۔ خود اس قلمی دیوان کے حاشیے پر ایسی غزلیں درج ہیں جو غالب نے دہلی سے کلکتے جاتے ہوئے لکھیں۔ بالفاظِ دیگر اس دیوان کے متن کی کتابت غالب کے کلکتے روانہ ہونے سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔

۸۔ میرے شمار کے مطابق ۲۳۵ / غزلوں میں تخلص ''اسد'' آیا ہے اور ۳۸ / میں ''غالب''۔ ایک غزل (غزل ۱۵۷) میں بجائے تخلص کے پورا نام ''اسد اللہ خاں'' آیا ہے اور ایک غزل (غزل ۲۲۴) تخلص کے بغیر ہے۔

(دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۷ تا ۲۹)

◆◆◆

غلام رسول مہر

نسخۂ حمیدیہ
طباعت و تحقیق کی داستان

فارسی اور اردو میں جتنے عظیم القدر شاعر گزرے ہیں ان میں سے میرے علم کی حد تک کسی کا ابتدائی کلام محفوظ نہیں رہا، جسے سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکے کہ شعر گوئی کے آغاز میں اس کے رنگ اور آہنگ کی کیا کیفیت تھی اور ارتقائے فکر و نظر کے بلند ترین زینوں پر پہنچ کر اس نے کیسے شعر کہے۔ کلامِ اساتذہ کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں، ان کا مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو کہیں کہیں لطافت ذوق کا سرمایہ کم محسوس ہوتا ہے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید یہ ابتدائی دور کا کلام ہو۔ تاہم اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ بعض اوقات کسی زمین سے شاعر کی طبیعت کو مناسبت نہیں ہوتی لیکن وہ خاص حالات کی بنا پر شعر گوئی کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، لہٰذا اچھے شعر نہیں نکال سکتا اور اس زمین میں اپنے خاص فطری جوہر نمایاں نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے ہم ایسے کلام کو دور ناپختگی کا کلام سمجھ لیں اگرچہ وہ آخری دور میں کہا گیا ہو۔

علامہ اقبال کی مثال:

ہمارے سامنے ایک قریبی مثال حضرت علامہ اقبال مرحوم کی ہے۔ جنھوں نے ''بانگ درا'' مرتب کرتے وقت اپنے چھپے ہوئے اشعار کا بڑا حصہ قلمزد کر دیا، کیوں کہ وہ خاص درجے ہی کے

اشعار محفوظ رکھنا چاہتے تھے، جنھیں ان کی مقاصد تعلیم و تربیت سے مناسبت تھی۔ اس وجہ سے ان کے ابتدائی ہی نہیں درمیانے دور کا بھی خاصا کلام خارج ہوگیا، اگر چہ رسالوں اور اخباروں میں محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح حضرت علامہ مرحوم نے فارسی کلام کا بھی ایک حصہ حذف کر دیا، اگر چہ اس کلام کو ہم بالکل ابتدائی دور کا کلام نہیں کہہ سکتے۔

غالب کا ابتدائی کلام:

مرزا غالب کو اس اعتبار سے بھی شعرائے شہیر میں یگانہ حیثیت حاصل ہے کہ مختلف اسباب و احوال کی بنا پر ان کا بالکل ابتدائی کلام بھی محفوظ رہ گیا، جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ آغازِ شعر گوئی کی مشقوں کا بڑا حصہ اس میں شامل ہے۔ آج سے کم و بیش پچاس سال پیشتر یہ کلام نواب حمید اللہ خان مرحوم کے زیر سرپرستی ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے چھپ گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب حمید اللہ خان ریاست بھوپال کے چیف سیکریٹری تھے۔ بعد میں مسند فرمانروئی کی زینت بنے۔ اس نسخہ کی کتابت حافظ معین الدین خوش نویس نے ۵، صفر ۱۲۳۷ھ (یکم نومبر ۱۸۲۱ء) کو مکمل کی تھی جب مرزا غالب کی عمر کے چوبیس مرحلے پورے ہو رہے تھے۔

مرزا نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ انھوں نے پندرہ برس کی عمر سے اپنا کلام قابل حفاظت سمجھا ہوگا تو ''نسخۂ حمیدیہ'' کو ابتدائی دس سالوں کی مشقوں کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نسخۂ امروہہ:

حال ہی میں مرزا کے ابتدائی کلام کا ایک اور مجموعہ منظر عام پر آیا ہے، جسے بالفعل ''نسخۂ امروہہ'' قرار دیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کی دریافت کا سہرا امروہہ کے ایک تاجر کتب کے سر ہے۔ یہ خود مرزا کا لکھا ہوا ہے اور اس کے آخر میں ۱۴، رجب تاریخ ثبت ہے، سنہ درج نہیں۔ لیکن قرائن کی بنا پر سنہ ۱۲۳۱ھ ہونا چاہیے۔ گویا یہ ۱۱، جون ۱۸۱۶ء کا مجموعہ ہے۔ جزوی ترمیموں یا مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اسد کی جگہ غالب تخلص بنا دینے کو نظر انداز کر دیا جائے تو فی الجملہ اس نسخے

کو ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اصل واساس سمجھا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے ابتدائی چار پانچ سال کا کلام قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس پہلو پر مفصل بحث اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ نسخہ چھپ کر سامنے نہ آ جائے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت:

غرض ''نسخۂ حمیدیہ'' کو ابتدائی آٹھ نو سال کے کلام کا مجموعہ سمجھا جائے یا چار پانچ سال کے کلام کا، اس کی اشاعت سے مرزا کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے نئی بنیادیں مہیا ہوتی ہیں، مثلاً:

(۱) پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مرزا نے جتنا کلام مستند قرار دے کر شائع کیا اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا ہی کلام حذف بھی کر دیا۔

(۲) مرزا کے متداول دیوان میں جن زمینوں کے ایک ایک دو دو شعر ملتے ہیں ان زمینوں میں پوری غزلیں موجود تھیں، لیکن مرزا نے باقی شعر قابل اشاعت نہ سمجھے۔

(۳) یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مرزا نے اردو شعر کہنے شروع کیے تھے تو ان کا انداز واسلوب کیا تھا اور یہ اسلوب اختیار کرنے کے اسباب کیا ہو سکتے تھے۔ زیادہ تر یہی اشعار تھے، جن کے متعلق طنز وتعریض کی روایتیں تذکروں میں راہ پا گئیں۔ کور ذوقی اور بے مائیگی فکر و نظر کی یہ کتنی افسوسناک مثال تھی کہ بعض لوگ ان تعریضات کو مرزا کے پورے اردو کلام سے وابستہ کرتے رہے۔

(۴) اس مجموعے کی اشاعت نے مرزا کی شاعری کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لینے کے لیے خاصا سامان فراہم کر دیا۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ میرے اندازے کے مطابق انتخاب اشعار میں دقت نظر یا غور وتوجہ سے کام نہ لیا گیا۔ قلمزدہ اشعار میں سے خاصی تعداد مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے قابل انتخاب تھی، وہ نظر انداز ہو گئی اور بعض وہ شعر لے لیے گئے جن میں فکر یا اسلوب بیان کی کوئی خاص خوبی نہ تھی اور ان کا ترک موجب افسوس ہرگز نہ ہوتا۔

فوجدار محمد خاں:

جو مخطوطہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شہرت پذیر ہوا وہ پہلے ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں فوجدار محمد خاں بھوپالی کے کتب خانے میں پہنچا تھا جیسا کہ پہلی مہر سے ثابت ہوتا ہے۔ فوجدار محمد خاں، نواب غوث محمد خاں والی بھوپال کے فرزند، نواب قدسیہ بیگم مرحومہ کے بھائی اور نواب سکندر بیگم مرحومہ کے حقیقی ماموں تھے۔ جب سکندر بیگم مرحومہ کے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوا (۱۸۴۴ء) تو ان کی اکلوتی صاحب زادی نواب شاہ جہاں بیگم کو والیۂ بھوپال تسلیم کر لیا گیا۔ وہ کم سن تھیں، اس لیے نیابت کے فرائض فوجدار محمد خاں کو سونپے گئے تھے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ انتظام تبدیل ہو گیا اور نواب سکندر بیگم مرحومہ ہی کو نیابت کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ بعد ازاں مرحومہ اپنی صاحب زادی کی رضامندی سے ذاتی حقوق کی بنا پر مستقل فرمانروا قرار پائیں اور ریاست بھوپال کے حسن انتظام کا پہلا زریں دور نواب سکندر بیگم ہی کا عہد حکومت ہے۔

غالب اور فوجدار محمد خاں کے مراسم:

معلوم ہوتا ہے کہ نواب فوجدار محمد خاں اور مرزا غالب کے درمیان ابتدا ہی سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ نواب سرکاری کاموں کے سلسلہ میں دہلی آتے تھے تو مرزا سے ضرور ملتے تھے۔ مولوی عبدالقوی دسنوی نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مرزا کے لیے شدید مالی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ نواب سکندر بیگم کو ان کا علم ہوا تو فوجدار محمد خاں ہی کو اس پیشکش کے ساتھ مرزا غالب کے پاس دہلی بھیجا کہ آپ بھوپال آ جائیں ریاست آپ کے تمام مصارف کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اغلب ہے یہ تحریک فوجدار محمد خاں ہی نے کی ہو جو نہ محض مرزا کے حالات سے آگاہ ہی تھے بلکہ ان کے لیے دل میں خاص درد بھی رکھتے تھے۔

بھوپال کی طرف سے دعوت:

یوں مرزا کے تمام قرضے ادا ہو جاتے جو ان کے لیے مدت العمر باعث مصیبت بنے رہے اور بالکل اوائل حیات سے اس دنیا میں نفس بازپسیں تک انھیں قرضوں سے نجات نہ مل سکی۔ خدا

ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی آمدنی کا کتنا بڑا حصہ سود اور سود در سود کی نذر ہوا۔ جب ریاست مصارف کی ذمہ داری قبول کر رہی تھی تو ظاہر ہے کہ آئندہ قرض لینے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مگر مرزا یہ پیشکش قبول نہ کر سکے۔ اس کے مختلف وجوہ ذہن میں آتے ہیں:

(۱) مرزا پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کا الزام لگ چکا تھا جو حقیقتاً بالکل بے اصل و بے بنیاد تھا۔ مرزا نہیں چاہتے تھے کہ اس الزام سے کامل برأت حاصل کیے بغیر دہلی سے کہیں جائیں۔ ظاہر ہے کہ برأت حاصل کیے بغیر جانا بجائے خود اصل الزام کے اثبات کی ایک قوی دلیل بن سکتا تھا۔

(۲) مرزا یہ بھی جانتے تھے کہ الزام قائم رہا تو انگریز جب چاہیں گے انھیں پکڑوا دیں گے اور کوئی ریاست انگریزی دار و گیر سے انھیں بچانے کی جسارت نہ کر سکے گی۔

(۳) نواب یوسف علی خان مرحوم والیٔ رام پور نے مرزا کے لیے ایک سو روپے ماہوار کی رقم مستقل طور پر مقرر کر دی تھی جو ہنڈی کے ذریعے مرزا کو پہنچتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نواب مختلف اوقات میں رقمیں بھیجتے رہتے تھے جن کے لیے مرزا نے ''فتوح'' کی اصطلاح وضع کر رکھی تھی اور نواب مرحوم مرزا کو رام پور بلاتے بھی رہتے تھے۔ اگر مرزا بھوپال چلے جاتے تو سو روپے ماہوار کے وظیفے اور ''فتوح'' کی بندش کے علاوہ نواب کو ملال بھی ہوتا کہ ان کی دعوت مرزا نے قبول نہ کی، حالاں کہ ان کے ساتھ دوستانہ روابط بہت پہلے سے استوار تھے۔

مرزا کی مصلحتیں:

مرزا گوشہ و توشہ کے بارے میں امن و اطمینان کے خواہاں تھے اور خانہ داری کے مصارف کی پریشانیوں نیز سود خوار مہاجنوں کے تقاضوں سے بچنے کے لیے دوزخ میں جانے کو بھی ترجیح دیتے تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

داں کہ نہ باشد دراں مضیق مصیبت
در طلب جامہ و ناں کشمکش از زن

واں کہ نہ باشد دراں مقام صعوبت
شور ناروائے تقاضائے مہاجن

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ مرزا دہلی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ذوقؔ کو حیدرآباد دکن کے دیوان، مہاراجہ چندولال نے بلایا تھا تو انھوں نے کہا تھا:

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

مرزا غالب کو بھی ناسخ نے حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں انھوں نے کہا تھا:

عالم توفیق را غالبؔ سوادِ اعظم
مہر حیدر پیشہ دارم، حیدرآباد خودم

دہلی سے محبت کا مسئلہ:

بلاشبہ مرزا کو دلی کے در و دیوار سے انتہائی محبت تھی جو مسلمانوں کی ہفت صد سالہ تہذیب و تمدن اور علوم و ثقافت کا آخری بڑا مأمن تھی اور جہاں مرزا کی عمر کا بڑا حصہ گزرا تھا، لیکن ہمیں علم ہے کہ ۱۸۴۶ء میں نصیر الدولہ معین الملک نواب تجمل حسین خان بہادر حشمت جنگ والیٔ فرخ آباد نے مرزا کو بہ اصرار بلایا تھا تو وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور اپنے عزیز شاگرد میر احمد حسین میکش کو بھی پاٹودی سے بلا لیا تھا کہ ساتھ لے جائیں، جیسا کہ ان کے ایک فارسی مکتوب سے واضح ہوتا ہے۔ اس اثنا میں اچانک تجمل حسین خان بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں وفات پائی۔ یوں یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آ سکا۔

مرزا دانستہ اطمینان و دل جمعی کا شیرازہ لامتناہی مدت تک منتشر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ریاست بھوپال کی پیشکش ضرور قبول کر لیتے، مگر خصوصی مصلحتیں ہی اسے قبول نہ کرنے کی متقاضی ہوئیں، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی مہریں:

بہر حال فوجدار محمد خان کے دوستانہ روابط موجود تھے۔ جب انھیں قلمی دیوان کا علم ہوا تو اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ یوں یہ نسخہ کتابت سے کم و بیش گیارہ سال بعد فوجدار محمد خان کے کتب خانے میں شامل ہوا، جیسا کہ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء کی مہر سے ثابت ہے۔ یہ دعویٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خان کے لیے لکھوایا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو بعد اتمام کتابت یہ گیارہ سال تک مرزا کے پاس کیوں رہتا؟

علاوہ بریں نسخے پر ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء کی مہر بھی ثبت ہے اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ مہر ۱۲۴۸ھ والی مہر سے بڑی ہے، جو بداہتہً اس زمانے میں بنوائی گئی جب فوجدار محمد خاں کو نواب شاہ جہاں بیگم کی نیابت سپرد ہوئی تھی اور وہ نسباً بڑے ہونے کے علاوہ منصباً بھی بڑے ہو گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض بڑی مہر لگانے کے شوق میں تو یہ نہیں لگائی گئی ہوگی۔ اس کا کوئی نہ کوئی معقول سبب ہونا چاہیے۔

''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں مذکور ہے کہ اصل مخطوطہ:

''کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کئی مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں......''

لیکن یہ دعویٰ محض قیاس پر مبنی ہے۔ بے شک ایک مرتبہ کتب خانے سے باہر جانے کے ثبوت میں ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۶۱ھ کی مہر پیش کی جا سکتی ہے۔ تاہم اس کی حیثیت زیادہ محکم نہیں۔ اس کے لیے وزنی ثبوت درکار ہے۔

اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو ۱۲۶۱ھ کی مہر لگانے کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ جب فوجدار محمد خان نے نائب ریاست کی حیثیت سے بڑی مہر بنوالی تو یہ مہر اپنی تمام کتابوں پر بھی لگوادی۔ یوں مخطوطہ دوسری مرتبہ مہر سے مزین ہوا، جو پہلی مہر کی طرح مختلف اوراق پر لگائی گئی ہوگی لیکن یہ کوئی اچھی اور زیبا توجیہ نہیں بلکہ بدیہی طور پر نازیبا توجیہہ ہے جسے قبول کرنے سے طبیعت ابا کرتی ہے۔

ترمیمیں اور اضافے:

اس طرح یہ کہنا بھی قیاس ہی کا کرشمہ ہے کہ مرزا غالب نے اس مخطوطے میں جتنے اضافے کیے یا ترمیمیں فرمائیں وہ اسے فوجدار محمد خاں کے حوالے کرنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ یہ مان لینے میں کیوں تامل ہو کہ فوجدار محمد خاں کبھی دہلی جاتے وقت نسخہ اپنے ساتھ لے گئے اور اصرار کیا کہ مرزا پہلے کی طرح مزید ترمیمیں اور اضافے کر دیں۔ مرزا نے حقِ دوستی کی پاسداری میں یہ مطالبہ بھی قبول کر لیا۔ چناں چہ اوقات فراغت میں جو بھی پڑھا لکھا مرزا کے پاس آتا رہا، اس کے خط کی خوبی و ناخوبی سے قطع نظر کرتے ہوئے کچھ بڑھوایا یا بدلوا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے ترمیموں کے متعلق جا بجا مختلف تصریحات فرمائی ہیں، مثلاً:

۱۔ باریک قلم، شکستہ۔

۲۔ باریک قلم، خوشخط۔

۳۔ موٹا قلم، بدخط تحریر۔

۴۔ موٹا قلم، شکستہ۔

۵۔ یہ بجنسہٖ غالب کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

گویا مرزا غالب دوسرے لوگوں سے بھی ترمیم کراتے رہے اور کبھی خود بھی کچھ لکھ دیا۔ یہ صورت قرین قیاس ہے اور اسے یک قلم رد نہ کر دینا چاہیے۔

نسخۂ حمیدیہ کی گمشدگی:

فوجدار محمد خاں کا انتقال ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ مخطوطہ مرحوم کے فرزند یار محمد خاں شوکت کی تحویل میں آیا، جو مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۸، اگست ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ اس کے بعد یہ نادر نسخہ کتب خانہ عالیہ بھوپال میں منتقل ہوا۔ صدیق مکرم مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رام پوری کا بیان ہے کہ جس زمانے میں ریاست بھوپال دوسری ریاستوں کی طرح ہندوستان میں ضم ہوئی یعنی تقسیم سے سال دو سال بعد، اس وقت یہ گوہر نایاب گم ہو گیا۔ کچھ پتا نہ

چل سکا کہ کہاں گیا اور کون لے گیا۔ اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، گویا اب اصل نسخہ سامنے رکھ کر مطبوعہ نسخے سے اختلافات کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ وہی سرمایہ باقی رہ گیا ہے جو بعض اصحاب نے یادداشتوں کی شکل میں مہیا کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب علم ونظر پروفیسر حمید احمد خاں بھی تھے، جنھوں نے اواخر اگست ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد سے لوٹتے ہوئے چند روز بھوپال میں گزارے اور پورے نسخے کے مقابلے سے ضروری نوٹ فراہم کر لیے تھے۔

ترتیب واشاعت کی کہانی:

نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب واشاعت کی کہانی بھی اختصاراً سن لیجیے:

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں فیصلہ کیا تھا کہ مرزا غالب کے دیوان اردو کا ایک صحیح نسخہ پورے اہتمام سے چھاپا جائے۔ چناں چہ دیوان کی ترتیب ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے سپرد ہوئی اور انھوں نے 1915ء میں دیوان کا مبیضہ تیار کر دیا، جس کے مطابق طباعت ہونے والی تھی۔ اس اثنا میں نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا ایک عمدہ اور خوبصورت نسخہ چھپ کر منظر عام پر آ گیا۔ یہ غالباً سید راس مسعود مرحوم ومغفور کی سعی وکوشش کا نتیجہ تھا۔ اس سے انجمن ترقی اردو کے ولولۂ اشاعت دیوان پر اوس پڑ گئی۔

بجنوری مرحوم کا عزم:

اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے واپس آئے اور بھوپال میں مشیر تعلیم مقرر ہوئے۔ انھیں کلامِ غالب سے انتہائی شیفتگی تھی۔ انجمن کی تجویز اشاعت دیوان کا ذکر ان کے گوش زد ہوا تو وہ خود یہ کام انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی وجہ سے انجمن ترقی اردو اپنی تجویز کو از سر نو لباسِ عمل پہنانے کے لیے آمادہ ہو گئی۔

بجنوری مرحوم نے ترتیب دیوان کے ساتھ ساتھ اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھنا شروع کیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ دیوان کی معنوی قدر وقیمت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے اور حق یہ ہے کہ یہی مقدمہ ہے، جس کے آئینے میں پہلی مرتبہ عظمت غالب کے گوناگوں جلوے روشناس اہل

نظر ہوئے۔ یقیناً عظمت غالب کی اصل بنیاد خواجہ حالی مرحوم کی ''یادگار'' سے استوار ہوئی تھی، لیکن بجنوری مرحوم کے مقدمہ نے سوچنے سمجھنے والوں کے دل و دماغ میں جو ہمہ گیر ہلچل پیدا کر دی تھی، اس کا رنگ اور تھا۔

اشاعت کا مجوزہ نقشہ:

اچانک بجنوری مرحوم کو سرکاری کتب خانۂ بھوپال میں دیوانِ غالب کے مخطوطے کا علم ہوا۔ اسے نکلوا کر دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ چناں چہ مرحوم نے متداول دیوان اور مخطوطے کو اکٹھا چھاپنے کا ایک نقشہ تیار کر لیا اور اسی کے مطابق کتابت شروع کرا دی۔

اس نقشے کی کیفیت ایک روایت کے مطابق یہ تھی:

(۱) مخطوطے کے اشعار ایک طرف کے صفحات پر چھاپے جائیں۔ مقابل کے صفحات پر ان زمینوں میں متداول نسخے کے اشعار شائع کیے جائیں۔

(۲) قلمی یا مطبوعہ نسخے کے جو اشعار صرف ایک نسخے میں ہوں، ان کے مقابل کے صفحات سادہ چھوڑ دیے جائیں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح دیوان کی ضخامت بہت بڑھ جاتی، لیکن قلمی اور متداول یا قدیم و جدید کا اندازہ خوانندگان کرام کو بہ آسانی ہو جاتا اور مخطوطے کی اشاعت کا اہم مقصد اور فائدہ یہی تھا۔ دونوں کو بعد میں جس طریق پر چھاپا گیا اس سے اصل مقصد تو فوت ہو گیا، البتہ مخطوطے کے اشعار محفوظ ہو گئے۔

ڈاکٹر بجنوری کی وفات:

بجنوری مرحوم کی یہ تجویز ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھی کہ ۱۹۱۸ء کے وبائی انفلوائنزا میں پہلے ڈاکٹر بجنوری کی بیگم کا انتقال ہوا، چند روز بعد ے، نومبر ۱۹۱۸ء کو وہ خود بھی عین عالم شباب میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے اور دیوان کی طباعت کا معاملہ معرض اختلال میں پڑ گیا:

آن قدح بشکست و آن ساقی نہ ماند

مفتی انوار الحق مرحوم:

نواب حمید اللہ خان مرحوم اس زمانے میں ریاست بھوپال کے چیف سیکریٹری تھے۔ انھوں نے دیوان کا کام مفتی محمد انوار الحق مرحوم کے سپرد کر دیا، جو ناظم سررشتۂ تعلیمات تھے، لیکن جو نقشہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے تیار کیا تھا، اس کی پابندی کی توقع مفتی انوار الحق مرحوم سے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہت بڑے فاضل تھے۔ ذوقِ شعر سے بھی بہرہ مند تھے۔ مگر پیشِ نظر کام کی اہمیت اور مجوزہ نقشہ کے بدیہی فوائد سے آگاہ نہ تھے۔ نیز اس کے لیے جس جان کاوی کی ضرورت تھی اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکتے تھے۔

پھر ایک مصیبت یہ آن پڑی کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم دیوانِ غالب پر جو مقدمہ لکھ رہے تھے، وہ نامکمل رہ گیا۔ ان کا شروع کیا ہوا کام، وہی پایۂ تکمیل پر پہنچا سکتا تھا، جسے وسعتِ علم ونظر اور لطافت وحسنِ ذوق کے علاوہ کلامِ غالب کے ساتھ خاص شیفتگی اور لگن ہوتی۔ مرحوم نے جو کچھ لکھا تھا وہ متداول دیوان کے ایک حصے پر مبنی تھا۔ مخطوطے پر وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکے تھے۔

مفتی انوار الحق مرحوم خود کچھ نہ کر سکے کہ جو کچھ جس حالت میں انھیں ملا، اسے اسی حالت میں مختصر سی تمہید کے ساتھ حوالۂ طباعت کر دیا۔ غالباً وہ متن پر بھی پوری توجہ نہ فرما سکے، بلکہ متن کی ترتیب بھی ملحوظ نہ رکھ سکے۔

یہ حقائق ان اصحاب کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آتے رہے جنھوں نے اس زمانے میں مطبوعہ نسخے کا مقابلہ مخطوطے کے متن کیا تھا اور ان میں ایک ہمارے گرامی منزلت دوست پروفیسر حمید احمد خاں بھی تھے۔

پریشان خاطری کی مثال:

حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ مفتی صاحب کو ''نسخۂ حمیدیہ'' کا کام اطمینان ودلجمعی سے پورا کرنے کی مہلت نہ مل سکی، شاید اس لیے کہ ان کے اپنے واجبات وفرائض خاصے وقت طلب اور پریشان کن تھے۔ نیز یہ کام ناخواستہ ان پر آ پڑا تھا اور اس کے ساتھ انھیں کوئی دلی وابستگی نہ تھی۔

پریشان خاطری کی مثالیں ان کی تمہیدی تحریر میں بھی موجود ہیں، مثلاً ایک مقام پر انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ احباب واقربا نے بجنوری مرحوم کے حالات بہم پہنچانے میں دریغ کیا بلکہ ان کی تصویر بھی واپس لے لی گئی جیسے نسخے کے ساتھ چھاپنا منظور تھا (ص ۲۶۔۲۷) حالاں کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے اس ایڈیشن میں بجنوری مرحوم کی تصویر موجود ہے، جس میں مقدمہ شائع ہوا ہے۔ گویا تمہید کا یہ حصہ چھپ گیا تھا۔ بعد میں تصویر ملی تو اُسے بھی شائع کر دیا گیا، مگر نہ متعلقہ عبارت تبدیل کی گئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

پھر ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں......یعنی بامقدمہ اور بے مقدمہ نسخوں میں کئی اختلافات ہیں۔ جن کی تفصیل یہاں پیش کرنا محض تکلف ہوگا۔

چند نامعلوم افراد:

پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنے مرتبہ نسخے کے دیباچے میں تین اصحاب کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے مخطوطے کو دیکھا اور بعض اشعار پر صاد کرنے کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا۔ نام یہ ہیں:

۱۔عبدالعلی، ۲۔عبدالصمد مظہر، ۳۔آغا علی۔

عبدالعلی: ان میں سے عبدالعلی کے متعلق عرشی صاحب کا خیال ہے کہ فرمانروایانِ رام پور کے خاندان سے عبدالعلی بن غلام محمد خاں ہوں گے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے خود بھوپال سے دو ''عبدالعلی'' پیش کر دیے۔ اول سید عبدالعلی رضوی جو قاضی سید امجد علی رضوی کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۶ء کے قریب پیدا ہوئے۔ ریاست میں ملازمت کی ابتدا تحصیل داری سے ہوئی۔ پھر مختلف مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۸۹۱ء میں وہ مہتمم دفتر حضور یعنی اکاؤنٹنٹ جنرل ہو گئے تھے۔

دوسرے عبدالعلی تونگر بن عبدالواحد خاں مسکین خیر آبادی۔ یہ ۱۸۲۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ نواب سکندر بیگم مرحومہ کے عہد میں دبیر ریاست رہے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد میں وسیع اختیارات حاصل کر لیے۔ بعد میں کارکنان ریاست کی دراندازیوں سے تونگر کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ وہ پہلے ملازمت سے برطرف ہوئے، ۸، نومبر ۱۸۷۰ء کو انھیں ریاست سے نکال دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں بمقام اندوران کا انتقال ہوا۔

ایک قیاس:

ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب کا خیال ہے کہ ممکن ہے عبدالواحد خاں مسکین خیر آبادی مرزا غالب کا یہ مجموعۂ کلام دہلی سے بھوپال لائے ہوں اور عبدالعلی تونگر نے اسے اس زمانے میں دیکھا ہو، جب یہ ان کے والد کے پاس تھا۔

میرے نزدیک اغلب یہی ہے کہ یہ مجموعہ فوجدار محمد خاں خود مرزا غالب سے لائے۔ مسکین مومن کے شاگرد تھے اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ انھوں نے ربط ضبط پیدا کرلیا تھا، لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ شیفتہ کے ذریعے سے وہ اس مجموعۂ کلام کو حاصل کرلیتے، جو مرزا نے بظاہر اپنے لیے خوش نویس سے لکھوا کر رکھ لیا تھا؟ بہرحال قیام بھوپال کے دوران میں ممکن ہے تونگر نے خود فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں یہ مجموعہ دیکھ لیا ہو۔

عبدالصمد مظہر:

عبدالصمد مظہر ۲۲، دسمبر ۱۸۸۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۲۶، مئی ۱۹۰۶ء کو نوابزادہ عبیداللہ خاں کرنل انچیف بھوپال کے ملٹری سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں نواب سلطان جہان بیگم والیۂ بھوپال کے ملٹری سیکریٹری بنادیے گئے۔ ۱۴، اگست ۱۹۱۸ء کو پولیٹیکل سیکریٹری دربار اور وکیل ریاست کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں سر علی امام نے انھیں حیدرآباد بلالیا، جہاں وہ معتمد حرفت وتجارت اور معتمد فوج ہوئے اور صدیار جنگ کا خطاب پایا۔ ۱۷، جنوری ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔

ان صاحب نے یہ نسخہ یا تو زمانۂ قیامِ بھوپال دیکھا یا اس وقت دیکھا جب ۱۹۲۸ء کے قریب ڈاکٹر سید عبداللطیف نے یہ نسخہ حیدر یار جنگ سر اکبر حیدری کی وساطت سے حیدرآباد منگوایا تھا۔

ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے نسخے کے پہلے ورق پر شکستہ خط میں جن دستخطوں کو ''محمد حسین'' پڑھا، وہ دراصل ''محمد حنیف'' ہے۔ قاضی محمد حنیف فوجدار محمد خاں کے معتمد خاص اور خیر خواہ ہونے کے ساتھ ان کی جاگیر کے منتظم اعلیٰ بھی تھے۔

گویا جن اصحاب کا ذکر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے کیا ہے ان میں سے صرف آغا علی کا کوئی سراغ اب تک نہیں ملا۔

حمید احمد خاں کی محنت و کاوش:

پروفیسر حمید احمد خاں نے جو محنت و کاوش فرمائی، علمی نقطۂ نظر سے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب بھوپال کے نسخۂ حمیدیہ کا مقابلہ مجلس ترقی ادب کے نسخۂ حمیدیہ سے صفحہ بہ صفحہ کر لیا جائے اور یہ کام چند گھنٹوں یا چند دنوں کا نہیں۔

آخر میں قدرت کی اس عجیب اندازہ فرمائی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ کلامِ غالب کے مخطوطے کو اس وجہ سے ''نسخۂ حمیدیہ'' کہا گیا ہے کہ یہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی سرپرستی میں چھپا تھا۔ اس زمانے میں وہ ریاست بھوپال کے چیف سکریٹری تھے۔ بعد میں مسند فرمانروائی کی زینت بنے۔ جس بالغ نظر محقق نے اس مخطوطے کے متن کی تحقیق و تصحیح اب درجۂ اتمام پر پہنچائی، اس کے نام کا جزوِ اعظم بھی ''حمید'' ہی ہے۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم پہلی طباعت کے سرپرست تھے، چھان بین اور جانچ پڑتال کے اہتمام تام کو پایۂ اتمام پر پہنچانے والے ''حمید احمد خاں'' ہیں۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' پہلے انتسابا ''نسخۂ حمیدیہ'' تھا، اب تحقیقاً ''نسخۂ حمیدیہ'' بن کر منظر عام پر آیا ہے۔ گویا اب ہم اسے زیادہ وثوق و اعتماد سے ''نسخۂ حمیدیہ'' قرار دے سکتے ہیں۔ یا سمجھ لیجیے کہ پہلی اشاعت صرف صوری و ظاہری حیثیت سے ''نسخۂ حمیدیہ'' تھی اور اب باطن و معنویت کے اعتبار سے بھی ''نسخۂ حمیدیہ'' بن گئی ہے۔

الہامی نام:

غرض ''نسخۂ حمیدیہ'' الہامی نام تھا جو پچاس سال پیشتر بھی صحیح، موزوں اور جاذب قلب و نظر تھا اور اب بھی ہر اعتبار سے صحیح، موزوں اور جاذب قلب و نظر ہے۔ کسی بھی پہلو اور کسی بھی وجہ سے اسے بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یک چراغے است درین بزم کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(سہ ماہی ''اقبال''۔ لاہور۔ اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۵۲ تا ۶۴)

•••

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف

نسخۂ بھوپال کی گمشدگی کی وجہ سے وہ تحریریں خاص اہمیت اختیار کر گئی ہیں جن میں اس مخطوطے کی چشم دید کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا اہم بیان نسخۂ حمیدیہ کی تمہید میں مفتی محمد انوار الحق کا ملتا ہے۔ اس کے اختصار اور تشنگی کی بہت کچھ تلافی مولانا امتیاز علی عرشؔی کی اس تحریر سے ہوتی ہے جو دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے دیباچے کا ایک جزو ہے۔ نسخۂ بھوپال کے متعلق نتائج اخذ کرنے میں عموماً یہی دو تحریریں زیرِ بحث آتی ہیں۔ مفتی انوار الحق کے مقابلے میں مولانا امتیاز علی عرشؔی نے قلمی نسخے کی حالت کے بیان میں زیادہ پہلوؤں کا لحاظ رکھا ہے مگر جو پہلو دونوں حضرات نے لیے ہیں ان میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ اس کی کتابت اور ملکیت کے باب میں مولانا امتیاز علی عرشؔی نے جو مختلف نتائج پیش کیے ہیں ان میں بھی صرف مفتی انوار الحق کے قیاسات زیر بحث آئے ہیں۔

ڈاکٹر عبد اللطیف کی کتاب ''غالبؔ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان غالبؔ کی تاریخ وار ترتیب کے دوران نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کی سفارش پر یہ قلمی نسخہ انھیں بھوپال سے حیدر آباد بھیج دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبد اللطیف نے اس کے نہایت مختصر ضمنی تذکرے میں نواب فوجدار محمد خاں کی ان مہروں کا ناپ درج کیا گیا ہے جو اس پر لگی ہوئی تھیں اس کے علاوہ انھوں نے اس کے اول و آخر کے سادہ صفحات اور اصل صفحات کے کاغذ کے فرق کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اول و آخر کے صفحات بعد کے لگائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کی ندرت کا ذکر میں نے

اپنے مضمون ''دیوانِ غالب کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ: نسخہ بھوپال'' میں کیا ہے، کیوں کہ مہروں کا ناپ تو کسی نے درج ہی نہیں کیا اور مولانا عرشی نے بھی کاغذ کے مذکورہ فرق کو دوسرے الفاظ میں بیان کرنے کے باوجود یہ بات تحریر نہیں کی کہ اس مخطوطے کے اول و آخر کے صفحات بعد کے لگائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ موخر الذکر شہادت سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ (اصلی مخطوطے کے بعض صفحات پر نواب فوجدار محمد خاں کی ۱۲۴۸ھ کی چھوٹی مہر کے برخلاف شروع کے سادہ صفحات پر ان کی ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ان کے ذاتی کتب خانے کی باقاعدہ تشکیل یا تشکیل نو سے متعلق تھی۔

''غالب'' کے ایک حاشیے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نسخۂ بھوپال پر ڈاکٹر عبداللطیف نے انگریزی میں ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا جو مسلم ریویو، کلکتہ بابت ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا اور اس کا اردو ترجمہ سید محمود صاحب نے مجلّہ مکتبہ حیدرآباد، جلد۲، شمارہ ۶ میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا انگریزی مضمون تو مجھے نہیں مل سکا مگر جناب محمد اکبر الدین صدیقی کی عنایت سے سید محمد صاحب کے ترجمے کی نقل دستیاب ہوگئی۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نسخۂ بھوپال کے بارے میں یہ اہم مضمون مطبوعہ ہونے کے باوجود پردۂ خفا میں پڑا ہوا ہے۔

مجلّہ مکتبہ میں ڈاکٹر عبداللطیف کے مضمون سے قبل دو نوٹ ہیں۔ پہلا نوٹ مجلّہ مکتبہ کا ہے اور دوسرا سید محمد صاحب کا۔ دونوں سے اس ردِ عمل کا اندازہ ہوتا ہے جو نسخۂ حمیدیہ خصوصاً ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے کی اشاعت سے اس وقت بعض ادبی حلقوں میں پیدا ہوا تھا۔ مجلّہ مکتبہ کے نوٹ کے آخری پارے میں غالب کے ایک قلمی دیوان کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''ہمارے ایک محترم دوست نے ہم سے بیان کیا کہ غالب نے اپنے دکنی شاگرد مولوی حبیب اللہ ذکا کے پاس تحفتہً اپنا اردو دیوان بھیجا تھا شاگرد نے اس کا انتخاب کر کے فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیوان ان کے پاس آیا اور انھوں نے نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ بھی کیا بعض بعض ردیفوں میں کئی کئی غزلیں زائد ہیں۔ اب ان کے پاس سے دیوان واپس ہوگیا ہے ہمارے اصرار پر پھر منگوانے کی کوشش میں ہیں۔ اگر یہ دیوان ہمارے قبضہ میں آجائے تو ممکن ہے کچھ اور بھی حقیقت کھل جائے۔'' (مجلۂ مکتبہ، ص ۵۴)

سید محمد صاحب کے نوٹ کے مطابق، ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی ریویو بابت جنوری ۱۹۲۹ء سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے جب نسخۂ بھوپال کو دیکھا تو یہ بڑی خستہ حالت میں تھا۔ انھوں نے اس کے متن کا حجم ۷۵ اوراق بتایا ہے جس کا اظہار نہ مفتی انوار الحق نے کیا ہے اور نہ مولانا عرشی نے۔ غزلوں کی مجموعی تعداد انھوں نے ۲۷۶ لکھی ہے جبکہ مفتی انوار الحق نے کل تعداد ۲۷۵ درج کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنے مضمون میں غالباً سب سے پہلے مفتی انوار الحق کے ان قیاسات کی تردید کی ہے کہ یہ مخطوطہ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا اور بعد کے کلام کے اضافے کے لیے وقتاً فوقتاً غالبؔ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس حد تک مولانا امتیاز علی عرشی بھی دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے دیباچے میں ان کے ہم خیال ہیں۔ مگر مفتی انوار الحق اور مولانا عرشی کی صراحتوں کے برعکس ڈاکٹر عبداللطیف نے اس کو بالکل غلط قرار دیا ہے کہ اس نسخے کی اصلاحیں اور اضافے غالبؔ کے خط میں تھے۔ ان کی تحقیق کی رو سے یہی نہیں کہ یہ غالبؔ کے خط میں نہ تھے بلکہ دو مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے تھے۔

مولانا عرشی نے اس نسخے پر عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے دستخطوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ میں نے ''دیوانِ غالب کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ۔ نسخۂ بھوپال'' میں ان دونوں اصحاب کا تعلق بعد کے زمانے سے ظاہر کیا ہے اور اس بنا پر مولانا عرشی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ یہ نسخہ ان دونوں کے پاس ہوتا ہوا نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں پہنچا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے عبدالصمد مظہر کا ذکر نہیں کیا مگر انھوں نے اس سلسلے میں عبدالعلی کے ساتھ ایک نیا نام لکھا ہوا تھا اور شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کے دستخط سے بہت مشابہ تھیں۔ انھوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ دونوں اصحاب میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار رہوں گے جنھوں نے تازہ غزلیں وقتاً فوقتاً غالبؔ کے ۱۲۴۸ھ کے منتخب (متداول) دیوان کے کسی نسخے سے نقل کی ہوں گی۔

چوں کہ ڈاکٹر عبداللطیف کے اس مختصر مضمون سے نسخۂ بھوپال کے بارے میں کچھ ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جنھیں محققین کلامِ غالبؔ نے اب تک استفادہ نہیں کیا ہے اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مزید بحث و تمحیص کے بجائے اسے یہاں من و عن درج کر دیا جائے

دیوان غالبؔ قلمی ۱۲۳۷ ہجری

مترجمہ جناب سید محمد صاحب ایم۔اے مددگار سٹی کالج

راقم الحروف جن دنوں غالبؔ کی اردو نظموں کو تاریخی سلسلہ سے ترتیب دے رہا تھا مرزا غالبؔ کے اس مخطوطہ دیوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا تھا اور حکومت بھوپال کی عنایت سے مجھے مستعار ملا تھا۔ ۱ جس وقت یہ دیوان قلمی ہوا مرزا کی عمر (۲۴) برس کی تھی اور اگر ہم یہ باور کرلیں کہ مرزا نے (۱۵) برس کے سن سے ریختہ یا اردو غزل گوئی شروع کی تو اس مخطوطہ دیوان میں ان کی شاعرانہ زندگی کے دس برس کا سرمایہ مندرج ہونا چاہیے۔ ۲

یہ قلمی دیوان ریاست بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ میں اس عنایت پر کہ یہ نسخہ میرے مطالعے کے لیے حیدرآباد بھیجا گیا اظہار امتنان کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کو اچھی حالت میں نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کی جلد اس قدر فرسودہ ہوگئی ہے کہ اوراق نہایت آسانی سے علیحدہ کرلیے جاسکتے ہیں اس کی موجودہ جلد صرف یہ بتاتی ہے کہ کبھی یہ مجلد تھا۔

مفتی انوار الحق صاحب ساکن بھوپال کا جنھوں نے کلامِ غالبؔ کے ایک جامع ایڈیشن میں اس نسخے کی تمام نظمیں شریک کرلی ہیں۔ ۳ یہ بیان ہے کہ یہ نسخہ ابتداً میاں فوجدار محمد خاں رئیس بھوپال کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ بیان بظاہر مندرجہ ذیل عبارت پر مبنی ہے جو ایک سادہ ورق (۴)، (۲) متن کے آغاز میں جلد بندی کے کچھ دن بعد لکھی گئی ہے:

''دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوشخط۔''

اس عبارت کے بالمقابل ایک اور ملحقہ ورق پر میاں فوجدار محمد خاں کی مہر مورخہ ۱۲۶۱ھ ثبت ہے اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات اخذ کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ یہ نسخہ اس تاریخ سے کوئی (۲۴) برس پہلے ان کے لیے قلمی ہوا تھا۔

نسخہ کا متن (۷۵) اوراق (۷×۱۱/۲) پر مشتمل ہے اور اس کے ہر دو جانب چار چار ورق اسی قسم کے کاغذ کے جو متن کا ہے اور ہندوستان ہی میں ہاتھ کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے موجود ہیں۔

ان چار ورقوں کے علاوہ ہر ایک جانب دو دو ورق انگریزی کاغذ کے ہیں۔ ابتدا میں یہ ورق اوراق (۳) اور (۴) کے درمیان اور آخر میں اوراق (۲) اور (۳) کے درمیان ہیں۔ متن کے ہر صفحہ پر (۱۰) سے (۱۱) تک ابیات صاف نستعلیق خط اور چینی روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے چار قصیدے ہیں۔ پھر غزلیات ہیں جن کی تعداد (۲۷۶) ہے آخر میں (۱۱) رباعیات درج ہیں۔ قصیدوں اور غزلوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دو لوحیں ہیں جو سنہری کام سے مزین ہیں۔ سارا متن بھی سنہری حاشیہ کے خط سے آراستہ ہے۔ متن کے آخر میں کاتب نے اپنا اختتامی نوٹ اس طرح لکھا ہے:

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسدؔ و غالبؔ سلمہم ربہم علی ید
العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرۃ النبویہ بہ
صورت انجام یافت۔''

متن کا حاشیہ گونا گوں اصلاحوں اور اضافوں سے مملو ہے۔ بعض جگہوں پر نئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں، چند جگہوں پر کئی غزلیں متن سے دوبارہ نقل کی گئی ہیں۔ حاشیہ کی تحریریں بعض خوشنما نستعلیق خط میں ہیں اور بعض شکستہ خط میں۔ حاشیہ پر متعدد جگہوں پر فوجدار محمد خاں کی ایک چھوٹی مہر مورخہ ۱۲۴۸ھ (۲،۶سم×۱،۸) ثبت ہے۔

متن کے ورق سے پہلے سادہ اوراق میں سے ورق (۱الف) کے بائیں گوشہ کے سرے پر ۶۶ء/ق درج ہے۔ اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے ادب (۱۱) اردو اور پھر کچھ نیچے (۵۸ء) اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں (محمد حسین) لکھا ہوا ہے اوراق (۱ب)، (۲الف) اور (۲ب) خالی ہیں۔

ورق (۳الف) پر غالبؔ کا ایک مکتوب (؟) بے نقط فارسی میں کسی قدر ناصاف شکستہ خط میں درج ہے۔ یہ مکتوب ورق (۳الف) پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ورق (۶) تک مسلسل ہے اور وہاں محمد اسدواللہ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ یہاں نام میں حرف و کا اضافہ قابل غور ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اوراق (۳)، (۴) کے درمیان دو ملحقہ ورق ہیں۔ یہ جلد کے مستقل ورقوں سے چسپاں کردیے گئے ہیں۔ یہ ورق کب شریک کیے گئے اور کس نے شریک کیے معلوم نہیں ہوسکتا۔ ان

ورقوں میں سے جو (۴) اور (۵) کہلائے جاسکتے ہیں (۴ الف) اور (۵ ب) بالکل خالی ہیں (۴ ب) پر صاف نستعلیق میں وہ عبارت درج ہے جو ہم نے ابتدا ہی میں نقل کی ہے۔

ورق (۵ الف) پر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر (۸٫۵سم × ۴٫۵) ثبت ہے اور انگریزی کے چکنے کاغذ سے محفوظ کی گئی ہے۔ یہی مہر آخر کے ملحقہ ورقوں میں سے ایک پر بھی ثبت ہے۔ متن کے بعد جو چار سادہ ورق شریک ہیں ان پر غالبؔ کی کئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں اور ان کے اختتام پر کاتب نے اسی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا۔

نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوار الحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالبؔ کے ہاں ان نظموں کے اندراج کے لیے روانہ کیا جاتا تھا جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مگر مفتی صاحب اس استدلال کے لیے کوئی سند اور ثبوت پیش نہیں کرتے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیہ کے اضافہ اور اصلاحیں خود مرزا غالبؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے سرکارِ عالی کے محکمۂ اسنادات تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تنقیح کی اور غالبؔ کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اور ان اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں یہ اغلاط غالبؔ جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں اس کے سوا کاتب نے حاشیے پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں۔ نیز کئی ابیات کے آگے طفلانہ رائیں بھی درج ہیں۔

ان واقعات کے پیش نظر راقم ہرگز اس نظریہ کو باور کرنے کو تیار نہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے مدیر نے قائم کیا ہے۔ حاشیہ کے اضافے یقیناً غالبؔ کے خط میں نہیں بلکہ یہ دو مختلف ہاتھوں کے ہیں بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں اسی خط میں عبدالعلی کا نام لکھا ہوا ہے۔ شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کے دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق (۱) پر ثبت ہے بہت ہی مشابہ ہیں۔ یہ دونوں کون تھے معلوم نہیں۔ شاید میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار ہوں گے جنھوں نے غالبؔ کی تازہ غزلیں جیسے ہی وقتاً فوقتاً ملتی گئیں حاشیہ پر درج کر دیں۔ یہ یقینی ہے کہ

۱۲۴۸ھ میں جو فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے، غالبؔ نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ ناممکن نہیں اگر حاشیہ کی غزلیں اسی انتخاب مرتبۂ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخہ سے نقل کی گئی ہوں۔"

حوالہ وحواشی:

۱۔ یہ دیوان زیر طبع سے عنقریب شائع ہوگا (حاشیہ ماخذ)۔

۲۔ غالبؔ از مولوی سید عبداللطیف حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ء ص ۶، نیز نسخہ حمیدیہ، ۱۴، یادگار غالبؔ کریمی پریس، لاہور ۱۹۹۴ء۔

۳۔ نسخۂ حمیدیہ۔

(ہفتہ وار "ہماری زبان"۔ علی گڑھ۔ یکم مئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۷ تا ۹)

ڈاکٹر ابو محمد سحر

کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں

غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا انحصار تو اُسی متداول دیوان پر ہے جس کے متعلق دہلی کے ایک دل جلے شاعر نے کہا تھا کہ:

ڈیڑھ جُز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

لیکن ایک تو اُن کے قصرِ عظمت کے کچھ کنگرے اُن کے قلم زد کلام میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ دوسرے اُس کے مدارجِ تعمیر کی مکمل روداد بھی اُن کے قلم زد کلام میں پنہاں تھی۔ دیوانِ غالبؔ کے جتنے نسخے طبع ہوئے اُن میں نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت اسی لیے زیادہ ہے کہ اُس کے ذریعہ سے پہلی مرتبہ اُن کی اُردو شاعری کے ابتدائی دور کا تقریباً سارا قلم زد کلام منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ اس نسخے کے توسط سے متداول دیوان کے اس کلام کا بھی پتا چلا جو ابتدائی دور کی تخلیق تھا اور ترمیم و اضافہ کی وہ گوناگوں کیفیتیں بھی آئینہ ہوئیں جو خود غالبؔ نے اپنے کلام میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں روا رکھی تھیں۔

غالبؔ کے ابتدائی اُردو کلام کے سلسلے میں تین مخطوطے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سب سے قدیم معلوم قلمی دیوان مکتوبہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) جو پہلے نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے اور پھر بھوپال کے ریاستی کتب خانے میں محفوظ رہا، نسخۂ بھوپال کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا قلمی دیوان جو نسخۂ بھوپال کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے، تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۹ء) میں مرتب

ہوا، یہ حافظ محمود خاں شیرانی کے پاس رہ چکا ہے، اس لیے نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے۔ تیسرا قلمی نسخہ ''گلِ رعنا'' اُردو فارسی کلام کا مختصر انتخاب ہے جو غالبؔ نے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) کے لگ بھگ مرتب کیا تھا۔ ان قلمی نسخوں میں زمانۂ ترتیب، ابتدائی کلام کی نوعیت اور بعد کے اضافوں وغیرہ کے اعتبار سے نسخۂ بھوپال سب سے زیادہ اہم تھا۔ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت اسی قلمی نسخے کی دریافت کی رہینِ منّت تھی۔ بعض محققین نے جن میں مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام صاحب شامل ہیں، ان تحریروں میں نسخۂ بھوپال کو نسخۂ حمیدیہ کی اصل قرار دیا ہے، یا یہ لکھا ہے کہ نسخۂ بھوپال ہی نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کا یہ دیوان نسخۂ بھوپال متداول دیوان اور اُن کے کچھ دوسرے مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے جسے مفتی انوار الحق، ڈائریکٹر تعلیمات بھوپال نے مرتب کیا تھا اور جو ۱۹۲۱ء میں مفید عام پریس، آگرہ میں طبع ہو کر شائع ہوا۔

نسخۂ بھوپال کی دریافت اور نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت کے ساتھ کچھ ایسے حالات وابستہ رہے اور ان کے اظہار میں مفتی انوار الحق نے کچھ اتنے رمز و ایماء سے کام لیا کہ چند ضروری اُمور جو مرتب کے معمولی بیانات سے واضح ہو سکتے تھے، بظاہر عقدۂ لاینحل بن کر رہ گئے تھے، صحیح معلومات اور نتائج تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بعض محققین نے اُن کے بارے میں اتنی قیاس آرائیاں کی ہیں کہ ان سب کا جائزہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان اُمور سے بحث کرنے میں صرف فیصلہ کُن شواہد کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بارے میں نسخۂ حمیدیہ طبع اوّل کی تمہید میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

> ''مگر زمانے نے بقائے اصلح کے اُصول کو شعر و سخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالبؔ کے انتقال کے پورے پچاس برس کے بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا۔'' [1]

اس بیان کے پہلے ٹکڑے سے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال ۱۹۱۹ء قرار پاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں ''پوری ایک صدی'' کی ابتدا۔ اگر نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت یعنی ۱۸۲۱ء سے شمار کی جائے تو ۱۹۲۱ء کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک واقعہ کی دو تاریخوں کو تسلیم کرنے میں

جو قباحت ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر ۱۹۱۹ء کو صحیح تاریخ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک دوسرے دقت سامنے آتی ہے۔ مفتی انوار الحق نے اپنی تمہید میں تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ''عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم'' کے عنوان سے اُنھوں نے جو تعزیتی تعارف سپردِ قلم کیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی طباعت کا اہتمام ڈاکٹر بجنوری کر رہے تھے۔ لیکن موت نے ان کو اس کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ مفتی انوار الحق رقم طراز ہیں:

> ''آہ کیا انقلاب لیل و نہار ہے، کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے، آج اُن کی یادگار کے طور پر شائع کی جا رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحاتِ قلم سے روکشِ گلنار ہونے والا تھا، اس وقت معناً اُن کا کتابۂ مزار ہے۔'' ۲

ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا۔ اگر وہ نسخۂ حمیدیہ کے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال اس سے پہلے دستیاب ہو چکا تھا اور اُس کی دریافت کی وہ پہلی تاریخ بھی جو مفتی انوار الحق کے قول سے نکلتی ہے، غلط ہے۔ لیکن یہ محض مفتی انوار الحق کا سہو ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا، جو واقعے کے خلاف تھا۔ اس سے یہ شبہ کرنا صحیح نہیں کہ اُنھوں نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال قصداً غلط بتایا ہے، کیوں کہ حقیقت کا اظہار تو اُنھوں نے خود اپنے دوسرے بیان میں صاف طور سے کر دیا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے دوسرے بیان کی تائید کچھ اور شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً معارف بابت ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ نَو دریافت نسخۂ بھوپال اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری کے مطالعے میں تھا۔ ۳

مولوی عبدالحق محاسنِ کلامِ غالب طبع اوّل (۱۹۲۱ء) کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''انجمن ترقیِ اُردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کا ایک نفیس ایڈیشن طبع کرے۔ چناں چہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا .... اس اثناء میں اتفاق سے بھوپال

کے سرکاری کتب خانے میں میرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا، لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی۔"

جہاں تک نسخۂ حمیدیہ کا تعلق ہے، اس تحریر سے مفتی انوار الحق کے قول پر بس اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ بھوپال کو انجمنِ ترقی اُردو کے لیے ترتیب دینا شروع کیا تھا۔

مفتی انوار الحق نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب کے سلسلے میں تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے کام کی تفصیل نہیں بیان کی۔ لیکن انجمن ترقی اُردو کے لیے دیوان غالبؔ کی ترتیب کے بارے میں اُنھوں نے اُن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"جب انجمن ترقی اُردو نے دیوانِ غالبؔ اُردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی اور اُنھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیب خاطر قبول کیا۔ ....

مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوانِ غالبؔ کے مختلف متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی غالبؔ کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔" [۲۴]

اگرچہ مولوی عبدالحق نے اپنی اس تحریر میں جس کا اقتباس اس سے پہلے گزر چکا ہے، انجمن ترقی اُردو کے دیوانِ غالبؔ کے مرتب کا نام ظاہر نہیں کیا، لیکن یہ مفتی انوار الحق کے بیان کی تردید کے لیے کافی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ ڈاکٹر بجنوری اپنی وفات سے قبل کسی نہ کسی حیثیت سے دیوانِ غالبؔ کی تدوین میں مصروف تھے۔ محاسنِ کلامِ غالبؔ میں اُن کے ایک خط کے کچھ حصے کا جو عکس شائع ہوا ہے، اُس میں یہ عبارت موجود ہے:

"تکیہ والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اُس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں میرزا صاحب کے کلام

اُردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں، لیکن یہ اُن کا کلام نہیں ہوسکتا۔
اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ اگر یہ غزل ان غزلوں میں جو بعد میں حاشیے پر
اضافہ کی گئی ہیں، موجود ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کسی شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے اور
وہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں۔ دوسرے نواب صاحب کو اس کے بارے میں ذاتی علم
کیا ہے۔ تیسرے نواب صاحب کی اس کے بارے میں رائے کیا ہے۔ طائرِ دل جو
قطعہ ہے، وہ بھی مرزا کا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو
کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہوسکے نوٹ کر لیجیے گا۔'' ۵

اس خط کے مکتوب الیہ کے نام و مقام اور تاریخ کتابت وغیرہ کے متعلق عکس سے کوئی واقفیت حاصل نہیں ہوئی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے صاحب کے نام لکھا گیا ہے جو اس وقت دہلی میں تھے۔ نواب صاحب سے مراد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں کے صاحب زادے اور غالبؔ کے شاگرد نواب احمد سعید خاں طالبؔ، ہلوی ہیں، کیوں کہ ''تکیہ'' کی ردیف کی غزل اُنھیں کی قلمی بیاض سے منقول ہے اور اُن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ وہ کلام جس کے متعلق ڈاکٹر بجنوری نے اس خط میں استفسارات کیے ہیں، نسخۂ بھوپال کا نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی اُس کا وجود نہیں۔ تاہم اُن کی یہ تحریر متداول دیوان کے سوا غالبؔ سے منسوب کلام کے بارے میں اُن کی چھان بین کا ثبوت ہے۔ غالبؔ کے نو دریافت کلام کو متداول دیوان کے نسخوں کے ساتھ شامل کرنے کا اُس زمانے میں عام رجحان تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کام پہلے پہل سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مسودہ تیار کر لیا تھا۔ اس دوران نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالبؔ کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوگیا اور انجمن ترقی اُردو کا منصوبہ سرد پڑ گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ڈاکٹر بجنوری ولایت سے واپس آئے۔ اُنھوں نے اس منصوبے سے اتنی دلچسپی دکھائی کہ انجمن ترقی اُردو نے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ہاشمی جو اُن اُمور سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

''انجمن ترقی اُردو نے اوّل ہی اوّل ۱۳ء یا ۱۴ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نسخہ

چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوانِ غالبؔ کو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔...

دیوان کو صحیح اور جدید اُصولِ تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہو گیا تھا۔

انجمن کی تجویز اسی منزل پر تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالبؔ کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ صحت یا حسنِ طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا کہ جیسا انجمن چھاپنا چاہتی تھی لیکن مروّجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سَرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی، مگر ان مرحوم کو کلامِ غالبؔ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اس (ان) کے سُپرد کر دیا۔" ۶

ڈاکٹر بجنوری کے عکسِ تحریر مطبوعہ محاسنِ کلامِ غالبؔ میں سید ہاشمی کے ایڈٹ کیے ہوئے نسخے کا جو ذکر ہے، اس سے دیوانِ غالبؔ کا وہی نسخہ مراد ہے جسے سید ہاشمی نے انجمن ترقی اُردو کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس نسخے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر بجنوری متداول دیوانِ غالبؔ مرتب کر چکے تھے کہ نسخۂ بھوپال دستیاب ہو گیا۔ سید ہاشمی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کلامِ غالبؔ پر جو تبصرہ لکھا ہے، وہ رسالۂ اُردو میں شائع ہو چکا ہے اور اُن کے علمی کمالات کی ممتاز یادگار رہے گا۔ لیکن اسے بھی مرحوم کے شوقِ مخلصانہ کا منجانب اللہ انعام سمجھنا چاہیے کہ جس وقت وہ غالبؔ کے متداول دیوان کی طبع کا انتظام کر رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے خود بھوپال میں مرزا صاحب مرحوم کا گمشدہ کلام دستیاب ہو گیا جسے مرزا نے خود اپنے دوستوں کے مشورے سے تلف کر دیا تھا۔" ۷

نسخۂ بھوپال کے مل جانے کے بعد ڈاکٹر بجنوری دیوانِ غالبؔ کو نئے طریقے سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اُمید تھی کہ وہ اپنے تبصرے میں بھی ضروری اضافے کریں گے لیکن اُن کی مرگِ

ناگہاں نے اس کی مہلت نہ دی۔ اس کی تفصیل سید ہاشمی نے یوں بیان کی ہے:

> ''ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے خارج کردیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے۔ اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، اُن کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دِقت قدیم وجدید کا فرق اور بعد کی اصلاح وتنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔
>
> یہ بھی اُمید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے، لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہوگیا اور وہ سب اُمیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں، خاک میں مل گئیں۔'' ۸

نسخۂ بھوپال ڈاکٹر بجنوری کی وفات سے کچھ پہلے دستیاب ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اُسے دیکھا تھا بلکہ متداول دیوانِ غالبؔ کے اشتراک کے ساتھ اس کو طبع کرانے کا ایک مخصوص خاکہ بھی بنالیا تھا اور اس کے مطابق دیوان کی کتابت بھی شروع کرادی تھی۔ اُنھوں نے غالبؔ کے کلام پر اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ قابلِ قبول خارجی شواہد کے علاوہ اس کی سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں اُنھوں نے نسخۂ بھوپال یا غالبؔ کے ابتدائی قلم زد کلام کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ چوں کہ یہ تبصرہ طوالت کے باوجود ابھی ناتمام تھا، اور اسی اثناء میں نسخۂ بھوپال مل گیا، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اُنھوں نے یہ تبصرہ نسخۂ بھوپال کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا تھا۔ ۹ حالاں کہ جب اُنھوں نے اس میں کسی نہج سے نسخۂ بھوپال کا ذکر نہیں کیا تو یہ غلط فہمی بے بنیاد ہی نہیں، بے نتیجہ بھی تھی۔ توقع تھی کہ نسخۂ بھوپال کی روشنی میں ڈاکٹر بجنوری اپنے تبصرے پر نظرِ ثانی کریں گے، لیکن قبل اس کے کہ اُن کے ارادے پورے ہوتے یا کسی قدر آگے بڑھتے، اُنھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد ریاست بھوپال نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب پر مفتی انوار الحق کو مامور کیا اور اُنھوں نے اسے اپنے

طریقے سے سرانجام دیا۔ قطعِ نظر اس کے کہ اُنھوں نے ڈاکٹر بجنوری کے مجوزہ اندازِ ترتیب کی کیفیت نہیں لکھی، اُن کے تمام بیانات اپنی تشنگی یا اُلجھاؤ کے باوجود صداقت پر مبنی ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ پر ڈاکٹر بجنوری کی مرگِ ناگہانی کا سب سے بڑا اثر تو یہی پڑا کہ یہ دیوان اُن کی ترتیب وتنقید سے محروم رہ گیا۔ لیکن اُن کی بے وقت اور نہایت افسوسناک موت اس دیوان کی اشاعت پر کچھ اور حیثیتوں سے بھی اثر انداز ہوئی۔ اس دیوان کو بجا طور پر اُن کی یادگار بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اعزا و احباب کے عدم تعاون کی وجہ سے مفتی انوارالحق کو اُن کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ اور دیوان کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر کے باوجود اس سلسلے میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چناں چہ ڈاکٹر بجنوری پر جو مضمون اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اُن کے سوانح کے بجائے اُن کے اعزا اور احباب کی شکایتوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بجنوری کے اس طویل تبصرے کو بھی نسخۂ حمیدیہ کا مقدمہ بنایا گیا جو صرف متداول دیوانِ غالبؔ سے متعلق تھا۔

ڈاکٹر بجنوری کا تبصرہ رسالہ اُردو، بابت جنوری ۱۹۲۱ء میں ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اسی سال انجمن ترقی اُردو نے اسے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا۔ چناں چہ بقول سید ہاشمی:

> ''اس تبصرے کو نسخۂ حمیدیہ میں شامل کرنا غیر ضروری، بلکہ کسی قدر ناموزوں ہوا۔'' [۱۰]

لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے اسے اپنے طور پر شامل کیا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ میں اس تبصرے کا کوئی عنوان نہیں ہے اور یہ تبصرہ اس مقطع پر ختم ہو جاتا ہے:

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جبکہ ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' میں اس کے بعد نو صفحات اور ہیں۔ مزید یہ کہ نسخۂ حمیدیہ میں مسئلہ وحدت الوجود پر ڈاکٹر بجنوری کے خیالات سے شدید اختلاف ظاہر کرتے ہوئے مفتی انوار الحق نے ایک اتنا طویل حاشیہ لکھا ہے کہ وہ اس موضوع پر اچھے خاصے جوابی مضمون کی شکل اختیار

کر گیا ہے۔

بعض شواہد سے اس دیوان کی طباعت و اشاعت کے مراحل میں بھی کچھ پیچیدگیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک ہی ایڈیشن کے تین سرورق ملتے ہیں۔ دو سرورق مفیدِ عام اسٹیم پریس آگرہ کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سرورق میں جسے پہلا سرورق سمجھنا چاہیے، دیوان کے نام کے بعد صرف:

"بہ تدوین:
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے مُنشی فاضل
ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم
بھوپال"

لکھا ہوا ہے۔ مقدمۂ دیوان اور ڈاکٹر بجنوری کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ مطبع کے اندراج میں "اسٹیم" کے اوپر خفی قلم سے ۱۹۲۱ء درج ہے۔ اس سطر کے نیچے داہنی طرف "قیمت مجلّد ہے۔" بائیں طرف "قیمت غیر مجلّد ۸" اور درمیان میں "منتظر امروہوی کتابت نمود" لکھا ہوا ہے۔ لیکن مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے دوسرے سرورق میں دیوان کے نام کے نیچے:

"مع مقدمۂ دیوان
فخر قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم بی اے ایل ایل بی
بیرسٹرایٹ لاء۔ ڈی۔ جے"

کا اضافہ کیا گیا ہے اور اُس کے بعد:

"مرتبۂ
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے مُنشی فاضل
ڈائریکٹر تعلیمات ریاست بھوپال"

لکھا گیا ہے۔ مطبع کے اندراج میں ۱۹۲۱ء ندارد ہے اور مجلّد کی قیمت پانچ روپے اور غیر مجلّد کی چار روپے ہوگئی ہے۔

تیسرے سرورق میں "مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا"

کے بجائے ''صرف ٹائیٹل گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا'' درج ہے اور کاتب کا نام نصیر الدین لکھا ہے۔ دیگر اندراجات مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے مطابق ہیں۔ یہ سرورق تو محض سرورق کم پڑ جانے کی بنا پر بھوپال میں چھپوالیا گیا ہوگا۔ لیکن مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے چھپوانے کا سبب قیمت کے تغیر کے علاوہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سرورق میں ڈاکٹر بجنوری سے متعلق اندراج نہ تھا جس کا ہونا بعد میں ضروری سمجھا گیا۔ [11]

سوءِ اتفاق کہ اس ردوبدل میں دیوان کی تاریخِ طباعت نہیں برقرار رکھی گئی اور چوں کہ کسی دوسری جگہ بھی اس کا ذکر نہیں تھا اس لیے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ نسخۂ حمیدیہ کی اکثر جلدوں سے اس کی تاریخ طباعت کا پتا چلنا ناممکن ہوگیا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس نسخے کی تمام جلدیں مفید عام پریس آگرہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خفیف تغیر و تبدل کا عمل متن کی طباعت میں بھی جاری رکھا گیا ہے اور اس طرح ایک ہی ایڈیشن کی جلدوں میں کہیں کہیں معمولی سا فرق ہوگیا ہے۔ اس کی دو پیشِ نظر جلدیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک جلد میں ص ۱۹۱ر پر آخری مصرع کے داہنی طرف ''مطبوعہ'' لکھا ہوا ہے لیکن دوسری جلد میں یہ اندراج غائب ہے۔ اس صفحے کے بعض خطوط کی کشش میں بھی دونوں جلدوں میں فرق ہے۔ اسی طرح ص ۱۹۲ کے حاشیے کی عبارت میں بھی دونوں جلدوں میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ اگرچہ یہ تغیرات معمولی ہیں اور شاید بہت کم کیے گئے ہیں لیکن کسی تحقیقی کتاب میں بغیر اظہار کے اس طرح کی تبدیلیاں سخت غلط فہمی کا باعث ہوسکتی ہیں کیوں کہ کوئی محقق کسی مطبوعہ کتاب کے تمام نسخوں کا جائزہ نہیں لے سکتا۔

تصویروں کی اشاعت میں بھی نسخۂ حمیدیہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ مفتی انوارالحق نے ڈاکٹر بجنوری پر اپنے مضمون میں شکایتاً لکھا ہے کہ اُن کی ایک تصویر جو انھیں دی گئی تھی، وہ بھی اُن سے واپس لے لی گئی تھی جس کی وجہ سے اس دیوان کو تصویروں سے مزین کرنے کا خیال مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ لیکن دراصل اس دیوان میں غالبؔ، ڈاکٹر بجنوری اور نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کی تصویریں شائع کی گئیں۔ اس کے باوجود مرتب نے نہ تو اس سلسلے میں اپنے بیان پر نظرِ ثانی کی اور نہ کسی اور طرح تصویروں کی شمولیت کا اظہار کیا۔ اب اگر کسی کو اس دیوان کا کوئی ایسا نسخہ

ملے جس میں سے تصویریں غائب کردی گئی ہوں اور آج کل عموماً اس کے ایسے ہی نسخے دیکھنے میں آتے ہیں تو مرتب کے بیان کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ اس دیوان میں تصویریں سرے سے شامل ہی نہیں کی گئیں، بلکہ اس پر اس کو تاسف بھی ہوگا کہ مرتب کو ڈاکٹر بجنوری کی تصویر سے مستقلاً محروم رکھا گیا، حالاں کہ یہ باتیں خلافِ واقعہ ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیاں نسخۂ حمیدیہ کے ہر متجسس قاری کو بڑی اُلجھن میں ڈالتی ہیں اور اس کے لیے معاملات کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں رہتا۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید از مفتی انوار الحق، ص ۳۔

۲۔ مفتی انوار الحق کی اس عبارت کی روشنی میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ:

> ''اُنھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو چکا تھا، بلکہ اُن کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔''

(دیکھیے نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، مطبوعہ نیادور، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۱ء، ص ۸)

۳۔ بحوالہ نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، نیادور، لکھنؤ، بمبئی ۱۹۶۱ء، ص ۸۔ عرشی صاحب نے یہ اطلاع اور ڈاکٹر بجنوری کی تاریخِ وفات ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے توسط سے فراہم کی ہے۔)

۴۔ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم از مفتی انوار الحق نسخۂ حمیدیہ ص ۲۸۔

۵۔ عکسِ تحریر مطبوعہ محاسنِ کلامِ غالب، طبعِ ششم، انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ۔

۶۔ نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، رُکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۳۔۷۰۴۔

۷۔ نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، رُکن دارالترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔

۸۔ نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، رُکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔۷۰۵۔

۹۔ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے پاس نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد ہے جو غالباً محمد احتشام الدین دہلوی کے پاس رہ چکی ہے۔ اس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے آخر میں محمد احتشام الدین دہلوی نے ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا ہے کہ:

> ''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالبؔ کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر اُن کو مکمل کلامِ غالبؔ کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا اُن کے پاس موجود تھا اور اُنھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔''

(دیکھیے پروفیسر سید احتشام حسین کا مراسلہ مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ، ۱۹۶۱ء)

۱۰۔ نسخۂ حمیدیہ، تبصرہ از سید ہاشمی، اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۵۔

۱۱۔ نسخۂ عرشی طبعِ اوّل کے دیباچے میں عرشی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کی تقریبی تاریخ ۱۹۲۸ء لکھی ہے (ص ۱۱۶) لیکن اس کے بعد انھیں آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۲۱ء کے سرورق والا نسخہ مل گیا جس کا ذکر اُنھوں نے اپنے مراسلے مطبوعہ ''ہماری زبان'' علی گڑھ، ۸، اگست، ۱۹۶۱ء میں کیا ہے۔ تاہم چوں کہ اُنھوں نے اس کو نظر انداز کر دیا کہ اس سرورق پر ڈاکٹر بجنوری کا نام نہیں ہے، اس لیے دوسرا سرورق چھپوانے کے اس سبب کی طرف بھی ان کا خیال نہیں گیا۔

(ماہنامہ ''شاعر'' (غالب نمبر)۔ بمبئی۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ص ۹۶ تا ۱۰۲)

•••

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ حمیدیہ

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

(۱)

دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق کے بارے میں ایک غلط فہمی محض اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ اس قسم کا دیوان پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرتب کر رہے تھے۔ باقیات بجنوری کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ مرتب نسخۂ حمیدیہ درج کیا گیا ہے۔ حضرت نیاز فتح پوری مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی اپنی بعض تحریروں میں ان کو نسخۂ حمیدیہ کا مرتب لکھا ہے۔ [۱]
بظاہر یہ بیانات کسی ثبوت یا غور و خوض پر مبنی نہیں ہیں میں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے ڈاکٹر بجنوری کے متعلق کچھ استفسارات کیے تھے جن میں یہ سوال بھی تھا کہ کیا آپ نے کسی معتبر شہادت کی بناء پر ان کو مرتب نسخۂ حمیدیہ لکھا ہے۔ جواب میں موصوف اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں تو قائل ہو گیا آپ کے حسن ظن شاعرانہ کا!

سوالنامہ میرے سر پر ایسا رسید کر دیا کہ جیسے میں بجنوریات کا ماہر اعلیٰ نہ سہی جب بھی ماہر ادنیٰ تو ضرور ہوں! حالاں کہ میں نے مرحوم کی شکل تک نہیں دیکھی اور نہ ایک بار بھی مراسلت رہی، اور نہ اب دماغ پر زور دینے پر بھی یاد پڑا کہ مرحوم کا ذکر میں نے کہاں اور کس سیاق میں کیا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے دیکھنے کا گناہگار بس اس حد تک ہوا ہوں کہ کہیں مانگے تانگے ان کی زیارت کر لی ہوگی، ورنہ موجود تو میرے پاس وہ بھی نہیں۔

مرحوم مجھ سے بہت سینئر تھے۔ میں ان کا نام ہی سنتا رہا۔ اگر کہیں میرے قلم سے ان کا مرتب نسخۂ حمیدیہ ہونا نکلا ہے تو محض شہرت عام کی بناء پر ہوگا، تحقیق سے اسے ادنیٰ تعلق بھی نہیں۔" ۲

نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے بارے میں اس طرح کے شکوک ہر اس مؤلف کے حصے میں آ سکتے ہیں، جس نے کسی مرحوم مؤلف کے مجوزہ یا زیر ترتیب کام کو سرانجام کیا ہو۔ نسخۂ بھوپال ڈاکٹر بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہوگیا تھا، وہ اسے متداول دیوان غالبؔ کے ساتھ ایک خاص ترتیب سے شائع کرانا چاہتے تھے، لیکن ان کے انتقال کے بعد مفتی انوار الحق نے اس سے مختلف انداز ترتیب اختیار کیا اور یہی ترتیب نسخۂ حمیدیہ سے موسوم ہو کر مفتی انوار الحق کے نام سے شائع ہوئی۔ صرف نسخۂ بھوپال اور متداول کلام کا اشتراک دونوں اصحاب کی ترتیب کو ایک قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ اس زمانے میں غالبؔ کے نو دریافت کلام کو متداول کلام کے ساتھ شائع کرنے کا عام میلان تھا۔ یہ ڈاکٹر بجنوری کی کوئی خاص تجویز نہ تھی۔ چناں چہ ان کو نسخۂ بھوپال اور غالبؔ کے مطبوعہ کلام کے ایک مجموعی لیکن نامکمل اور معدوم دیوانِ غالبؔ کا مرتب تو کہا جا سکتا ہے لیکن نسخۂ حمیدیہ کا مرتب اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ نسخۂ حمیدیہ وہی دیوان ہے جس کو انھوں نے مرتب کیا تھا مگر مفتی انوار الحق نے اپنے نام سے شائع کرا دیا۔

(۲)

نسخۂ حمیدیہ کے متعلق دوسری غلط فہمی اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ اس کے تین سرورق ملتے ہیں۔ اس کا ذکر میں نے اپنے مضمون "کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں" میں بھی کیا ہے لیکن ایک ضروری حوالے کے بروقت نہ ملنے کی وجہ سے یہ بحث تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

نسخۂ حمیدیہ کے تین مختلف سرورقوں میں سے دو مفید عام پریس آگرہ کے چھپے ہوئے ہیں اور ایک گورنمنٹ پریس بھوپال کا۔ موخر الذکر سرورق تو جیسا کہ مولانا امتیاز علی عرشیؔ نے قیاس کیا ہے

محض سرورق کم پڑ جانے کی وجہ سے بھوپال میں چھپوالیا گیا ہوگا۔ ۳؎ لیکن حل طلب مسئلہ مفید عام پریس کے دوسرورقوں کا ہے کیوں کہ ان میں سے ایک سرورق پر سال طباعت ۱۹۲۱ء درج ہے تو ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کا ذکر ندارد ہے اور دوسرے سرورق پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کا ذکر ہے تو سال طباعت کا پتہ نہیں۔ قیمت بھی دونوں میں مختلف لکھی گئی ہے۔ جناب مالک رام نے غالباً ۱۹۲۱ء والا سرورق دیکھا تھا چناں چہ اُنھوں نے نسخۂ حمیدیہ کا سالِ اشاعت صحیح لکھا ہے۔ ۴؎ مولانا عرشی نے پہلے اس کی اشاعت کی تقریبی تاریخ ۱۹۲۸ء قرار دی تھی۔ ۵؎ لیکن اس کے بعد انھیں ۱۹۲۱ء کے سرورق والے ایک نسخے کا بھی علم ہوگیا جو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود ہے، چناں چہ اُنھوں نے تحریر فرمایا ہے:

"اس صراحت کے بعد شبہ نہیں رہتا کہ نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا تھا نیز معلوم ہوتا ہے کہ پھر کسی وجہ سے (جو قیمت کا معاملہ ہوسکتا ہے) دوسرا سرورق آگرے ہی میں چھپوایا گیا ہے۔" ۶؎

اس تحریر سے نسخۂ حمیدیہ کا سال اشاعت تو طے ہوگیا لیکن دوسرا سرورق چھپوانے کی مناسب توجیہ اس وجہ سے نہ ہوسکی کہ قیمت کے فرق کے ساتھ ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے سے تعلق اندراج کے فرق کی طرف توجہ نہیں فرمائی گئی۔ اس سلسلے میں ایک اہم شہادت نسخۂ حمیدیہ کا وہ اشتہار ہے جو رسالہ اُردو اپریل ۱۹۲۳ء کی پشت پر شائع ہوا تھا۔ اس کی اطلاع پہلے ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے مجھے ایک خط میں دی تھی۔ پھر اس کا اقتباس اُنھوں نے اپنے مضمون "نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ بھوپال" مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، مورخہ ۲۲، جنوری ۱۹۶۹ء میں پیش کیا جو حسبِ ذیل ہے:

"معہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غیر مجلد، مجلد، کلدار بلا مقدمہ غیر مجلد کلدار، مجلد کلدار۔"

ڈاکٹر جین صاحب نے اس کے بعد بھی کچھ قیاسات کیے ہیں جن کی روشنی میں نسخۂ حمیدیہ بلا مقدمہ قدیم اور مع مقدمہ بعد کا قرار پاتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ اشتہار اس معاملہ میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چوں کہ نسخۂ حمیدیہ بلا مقدمہ کی قیمت مفید عام پریس آگرہ کے اس سرورق (۱۹۲۱ء) کے مطابق ہے جس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کا ذکر نہیں ہے اور مع مقدمہ کی قیمت

اس سرورق کے مطابق ہے جس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کا ذکر ہے اس لیے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ نسخۂ حمیدیہ کی دو قسم کی جلدیں شائع کی گئی تھیں، ایک مع مقدمہ جن کی قیمت زیادہ رکھی گئی تھی اور دوسری بلا مقدمہ جن کی قیمت کم رکھی گئی تھی۔ مع مقدمہ دو جلدوں کے سرورق پر سالِ طباعت کے درج نہ ہونے اور کسی جلد میں سرورق کے اندراج کے برعکس مقدمے کی شمولیت یا عدم شمولیت وغیرہ کو طباعت اور جلد بندی کی معمولی بد نظمی سے زیادہ اہمیت دینا تحصیل حاصل ہے۔

(۳)

نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال، متداول دیوان اور غالبؔ کے کچھ اور مطبوعہ کلام کو ردیف وار ترتیب سے یکجا کر کے چھاپا گیا ہے۔ اس طرح یہ نسخۂ بھوپال کے قلمی کلام اور متداول و مطبوعہ کلام کا ایک ملا جلا دیوان ہے۔ سرسری اندازے کے مطابق اس میں ایک ہزار سے زیادہ اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں نہ تھے۔ کلامِ غالبؔ پر تحقیقی نظر رکھنے والے اس کیفیت سے عموماً واقف ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے جا بجا نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ کے ذکر میں ایسے پیرائے اختیار کیے ہیں جن سے دونوں کے ایک ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اختصار کے خیال سے اس سلسلے میں کچھ پرانے بیانات سے قطع نظر کر کے مالک رام صاحب کے مضمون ''گلِ رعنا (غالبؔ کا گمشدہ انتخابِ کلام)'' مطبوعہ ''نذر ذاکر'' (۱۹۶۰ء) کے حوالے پر اکتفا کروں گا۔ اس مضمون میں تعجب خیز حد تک ''نسخۂ حمیدیہ'' کو ''نسخۂ بھوپال'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ گلِ رعنا غالبؔ کا وہ ''گمشدہ'' انتخاب کلام ہے جس کا مخطوطہ ایک عرصے سے مالک رام صاحب کے پاس موجود ہے اور جس سے انھیں کے توسط سے مولانا عرشیؔ دیوان غالبؔ نسخۂ عرشیؔ کی تدوین کا کام لے چکے ہیں۔ مالک رام صاحب کے مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اس کی تائید نسخۂ حمیدیہ سے بھی ہوتی ہے جو ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا تھا۔'' ۷

''اب مرزا کے کلام کا سب سے پرانا مخطوطہ جو منظرِ عام پر آیا ہے، وہی ہے جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔'' ۸

''نسخۂ حمیدیہ میں بہت سا کلام حاشیے میں درج ہے۔'' ۹

''تاریخی ترتیب سے نسخۂ حمیدیہ کے بعد وہ قلمی نسخہ آتا ہے جو حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ چوں کہ نسخۂ حمیدیہ کے متن اور حاشیے کا تمام کلام اس کے متن اصلی میں ملتا ہے اس لیے اسے نسخۂ حمیدیہ کا مبیضہ کہا گیا ہے۔'' ۱۰

ان اقتباسات میں جو باتیں نسخۂ حمیدیہ سے منسوب کی گئی ہیں، وہ سب نسخۂ بھوپال سے متعلق ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ کی کتابت کی تاریخ اگر قیاس کی جائے تو ۱۸۲۱ء کے بجائے ۱۹۲۱ء یا اس سے کچھ قبل قرار پائے گی۔ مرزا کے کلام کا سب سے پرانا مخطوطہ ۱۱ جو منظر عام پر آیا ہے، (نسخۂ بھوپال) وہی نہیں ہے جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے بلکہ نسخۂ حمیدیہ میں اس مخطوطے کے کلام کے ساتھ غالبؔ کا متداول و مطبوعہ کلام بھی شریک ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بہت سا کلام حاشیہ میں درج نہیں ہے بلکہ اس میں مفتی انوار الحق کے لکھے ہوئے حواشی ہیں جن میں کہیں کہیں شعر بھی آ گئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیوان غالبؔ کا وہ قلمی نسخہ جو حافظ محمود شیرانی کے پاس رہ چکا ہے نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب سے تقریباً ۹۲ برس پہلے کا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کا تمام کلام اس میں نہیں مل سکتا۔ مالک رام صاحب کے اس بات کے لیے کہ ''اسے نسخۂ حمیدیہ کا مبیضہ کہا گیا ہے'' حاشیے میں دیوانِ غالبؔ (نسخۂ عرشی): ۱۲۰ دیباچہ)'' کا حوالہ دیا ہے مگر یہ حوالہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا عرشیؔ نے اسے نسخۂ حمیدیہ نہیں بلکہ نسخۂ بھوپال کا مبیضہ قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''نیز مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا۔''

نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ میں مکمل اشتراک تو ہے ہی نہیں اور جزوی اشتراک کے باوجود دونوں کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔ ان کو ایک سمجھنا یا کہنا ''غلطی ہائے مضامیں'' ہی کے قبیل کی چیز ہے۔ (۱۹۶۹ء)

حوالہ وحواشی:

۱۔ دیکھیے گا لکھنؤ، فروری ۱۹۳۱ء مکمل شرح کلام غالبؔ مرتبہ عبدالباری آسی، مقدمہ ص ۳۶ اور مکتوبات سلیمانی جلد اول مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی، حاشیہ ص ۶۵۔

۲۔ اقتباس از مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲، فروری ۱۹۶۹ء۔

۳۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۱۲۰۔

۴۔ دیوانِ غالبؔ مرتبہ مالک رام، آزاد کتاب گھر، مقدمہ ص ۱۴۔

۵۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۱۱۶۔

۶۔ دیوان غالبؔ (نسخۂ حمیدیہ) کی اشاعت کا سال، ہماری زبان، علی گڑھ، مورخہ ۸، اگست۔

۷۔۸ نذرِ ذاکر، ص ۴۰۱۔

۹۔ نذرِ ذاکر، ص ۴۰۱، ۴۰۲۔

۱۰۔ نذرِ ذاکر، ص ۴۰۲۔

۱۱۔ اب سب سے پرانا مخطوطہ نسخۂ بھوپال بخط غالبؔ ہے۔

(سہ ماہی ''اُردو ادب'' (غالب نمبر) علی گڑھ۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۵ تا ۲۹)

•••

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ حمیدیہ اور اُس کی اہمیت

غالبؔ نے دیوان کی شکل میں اپنے اُردو کلام کے وقتاً فوقتاً کئی قلمی نسخے مرتب کیے تھے۔ اور آخر میں وہ قلمی دیوان ترتیب دیا تھا جو پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں سید المطابع، دہلی میں چھپ کر شائع ہوا تھا...... اُنھوں نے اس مطبوعہ دیوان میں اپنے پچھلے کلام کا ایک بڑا حصہ شامل نہیں کیا تھا اور بہت سے اشعار ردو بدل کے بعد داخل کیے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ان کا سب سے قدیم معلوم قلمی دیوان پہلے نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے میں اور پھر ریاست بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں محفوظ رہ گیا۔ یہ قلمی دیوان جو آج کل نسخۂ بھوپال کہلاتا ہے، بدقسمتی سے ایک بار پھر دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ ۱۹۴۸ء میں یا اس کے آس پاس حمیدیہ لائبریری بھوپال سے کسی صورت میں غائب ہو گیا، کیوں کہ اتنا یقینی ہے کہ یہ نسخہ ۱۹۴۴ء میں اس کتب خانہ میں موجود تھا۔

نسخہ بھوپال کے عینی شاہدین مفتی محمد انوار الحق، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور مولانا امتیاز علی عرشیؔ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متن کی کتابت ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں تمام ہوئی تھی۔ حاشیوں اور آخر کے اوراق پر اس کے بعد کے قریبی زمانے کی غزلیں اور اشعار درج تھے۔ جگہ جگہ ترمیم واصلاح بھی کی گئی تھی جو بعض موقعوں پر خود غالبؔ کے قلم میں تھی۔ دیوان کے اندر کئی جگہ نواب فوجدار محمد خاں کی ۱۲۴۸ھ (مطابق ۱۸۳۲ء) کی چھوٹی مہر ثبت تھی اور شروع کے اوراق میں سے دو اوراق پر جن کا کاغذ اصل دیوان کے کاغذ سے کسی قدر مختلف تھا، انھیں کی ۱۲۶۱ھ (مطابق ۱۸۴۵ء) کی بڑی مہر لگی ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ قلمی دیوان نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت رہ چکا تھا۔

اسی لیے ایک عرصہ تک یہ خیال رہا کہ اسے غالبؔ نے ان کے لیے تیار کرایا تھا اور انھیں نذر کیا تھا لیکن اس کی جو کیفیت ہم تک پہنچی ہے اس کی روشنی میں قرین صحت یہی ہے کہ یہ غالبؔ ہی کے لیے تیار کیا گیا تھا اور کم از کم اس کے بعد کے ایک اور قلمی دیوانِ غالبؔ (نسخۂ شیرانی) مکتوبہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء کی تسوید تک غالبؔ ہی کے پاس رہا تھا بلکہ بعض شواہد سے پتا چلتا ہے کہ یہ متداول دیوان کی ترتیب کے وقت (۱۲۴۸ھ) بھی ان کے استعمال میں تھا۔

1918ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو جو اس زمانے میں بھوپال میں مشیر تعلیم تھے اور انجمن ترقیٔ اُردو کے لیے دیوانِ غالبؔ کا ایک نیا ایڈیشن ترتیب دے رہے تھے، نسخۂ بھوپال کا علم ہوا۔ چوں کہ اس کی دریافت سے دیوانِ غالبؔ کی تدوین کا ایک نیا اور وسیع میدان سامنے آ گیا تھا، اس لیے اُنھوں نے اس قلمی دیوان کے کلام کو متداول دیوان کے اشتراک کے ساتھ طبع کرانے کا ایک خاص منصوبہ بنایا لیکن ابھی اس جدید دیوانِ غالبؔ کی کتابت کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ۷، نومبر 1918ء کو مختصر علالت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یہ کام مفتی محمد انوار الحق، ڈائریکٹر تعلیمات، بھوپال کے سپرد ہوا۔ اُنھوں نے نسخۂ بھوپال، متداول دیوان اور غالبؔ کے کچھ اور مطبوعہ کلام کو یکجا کر کے ایک دیوان مرتب کیا۔ اس کے لیے ایک تمہید لکھی۔ ڈاکٹر بجنوری کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا اور بطور مقدمہ ڈاکٹر بجنوری کا وہ مشہور تبصرہ شامل کیا جو اُنھوں نے متداول دیوانِ غالبؔ کو مدِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ سرنامہ نواب زادہ محمد حمید اللہ خاں نے سپردِ قلم کیا۔ جو اس وقت ریاست بھوپال کے چیف سیکریٹری تھے۔ یہ کتاب انھیں کے نام نامی سے منسوب کرائی گی اور 1921ء میں مطبعِ مفید عام، آگرہ، میں طبع ہو کر دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہاں اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ اس کی کچھ جلدیں ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے بغیر بھی شائع کی گئی تھیں۔ ان کے سرورق پر ڈاکٹر بجنوری سے متعلق اندراج نہیں تھا اور ان کی قیمت مع مقدمہ جلدوں سے کم رکھی گئی تھی۔

اکثر محققین نے نسخۂ بھوپال (قلمی) اور نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) کے فرق کا علم رکھنے کے باوجود دونوں کو ایک ہی نام یعنی نسخۂ حمیدیہ سے موسوم کیا ہے اور جو اصحاب اس موضوع سے براہِ راست واقف نہیں ہیں وہ تو دونوں نسخوں کو عموماً ایک ہی سمجھتے ہیں، مگر جیسا کہ اوپر صراحت کی گئی یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کے کلام کے علاوہ بھی غالبؔ کے متداول

ومطبوعہ کلام کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں کئی اور غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ مفتی انوار الحق نے اس کی ترتیب وطباعت وغیرہ کے باب میں کئی ایسی باتیں قلم انداز کر دی ہیں یا گول مول پیرائے میں لکھی ہیں جن کا صاف صاف اظہار مرتب کی حیثیت سے ان کے لیے ضروری تھا۔ ایک غلط فہمی کا سبب محض یہ ہے کہ اس قسم کا دیوان پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ترتیب دے رہے تھے۔ چناں چہ کہیں کہیں ان کے نام کے ساتھ مرتب نسخۂ حمیدیہ لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر بجنوری بھی نسخۂ حمیدیہ اور غالب کے دیگر کلام کا ایک مجموعی دیوان مرتب کر رہے تھے، مگر ان کی اچانک وفات کے بعد مفتی انوار الحق نے اس سارے کلام کو ان سے جداگانہ انداز میں ترتیب دیا اور یہی ترتیب نسخۂ حمیدیہ سے موسوم کی گئی۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' فی الحقیقت ڈاکٹر بجنوری نے مرتب کیا تھا، مگر اس کو مفتی انوار الحق نے اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ [1]

یوں تو نسخۂ حمیدیہ میں غالب کا متداول دیوان اور ان کا کچھ دوسرا مطبوعہ کلام بھی شریک ہے، لیکن اس دیوان کی اہمیت اسی کلام کی وجہ سے ہے جو نسخۂ بھوپال میں شامل تھا۔ نسخۂ بھوپال میں غالب کا وہ تقریباً سارا ابتدائی کلام تھا جو اُنھوں نے متداول دیوان سے خارج کر دیا تھا، اس میں ابتدائی دور کے وہ اشعار بھی تھے جو اُنھوں نے مروجہ دیوان میں برقرار رکھے تھے۔ اُنھوں نے جابجا اصلاحیں بھی کی تھیں اور متعدد اشعار مزید اصلاح کے بعد متداول دیوان میں شائع کیے تھے۔ چناں چہ نسخۂ حمیدیہ کے ذریعہ سے نہ صرف ان کا وہ ابتدائی کلام منظرِ عام پر آ گیا جو اُنھوں نے قلم زد کر دیا تھا۔ بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متداول دیوان کی کون کون سی غزلیں اور اشعار ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں اور اُنھوں نے اپنے کلام میں کیا کیا ترمیمیں اور اصلاحیں کی ہیں۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کے پیشِ نظر چوں کہ ان کے کلام کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں یہ اُمور غیر معمولی اہمیت کے مالک تھے، اس لیے نسخۂ حمیدیہ کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔

گزشتہ ۴۸ سال میں کلامِ غالب کی تحقیق وتدوین کا جو اہم کام ہوا ہے اس کی روشنی میں آج نسخۂ حمیدیہ میں کئی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اس کی ترتیب غالب کے قلمی دیوان کے صرف ایک نسخے سے واقفیت پر مبنی ہے اور ترتیب کے وقت اس کی اہمیت کا بھی بھرپور اندازہ نہیں لگایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قلمی دیوان اور متداول دیوان کو مخلوط کر دیا گیا۔ یہ قلمی دیوان اتنا اہم تھا کہ اسے علیحدہ

ترتیب دے کر شائع کر دینا ہر اعتبار سے بہتر ہوتا۔ مفتی انوار الحق کی نظر زیادہ تر اسی پر رہی کہ:

''ناظرین کے سامنے غالبؔ کے کلام کا ایک مکمل مجموعہ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی قلمی اور مروّجہ دیوانوں کے شعر بھی پہلو بہ پہلو دکھائے جائیں تاکہ یہ بات آئینہ ہو جائے کہ اصل دیوان میں سے کون کون سے شعر حذف کر دیے گئے تھے اور بعد میں غالبؔ نے ان میں کیا کیا ردو بدل کیا۔'' ۲

یہ باتیں اپنی جگہ پر یقیناً اہم تھیں، لیکن ان کو سامنے لانے کے لیے ہر ردیف کی غزلوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلے قلمی نسخے کی وہ ہم طرح غزلیں درج کی گئیں جن کے اشعار قلمی اور متداول دیوانوں میں مشترک یا جزوی طور پر مشترک تھے۔ متداول دیوان کی ہم طرح غزلوں کے غیر مشترک اشعار کو ان کے بعد لکھا گیا، اس کے بعد وہ غزلیں درج کی گئیں جو صرف قلمی دیوان میں تھیں اور آخر میں وہ غزلیں جو صرف متداول دیوان میں تھیں۔ اس ترتیب میں قلمی نسخے کی انفرادیت بالکل گم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ تاریخی شعور بھی مبہم ہو گیا جو اس قلمی نسخے سے حاصل ہوتا تھا۔ نسخۂ بھوپال کی اہمیت یہی نہ تھی کہ اس میں غالبؔ کا ابتدائی کلام اور خود اپنے کلام پر ان کی اصلاحیں وغیرہ موجود تھیں بلکہ اس سے ان کے کلام اور اس میں حذف و اضافہ کے ایک بڑے حصے کا تقریبی زمانہ بھی متعین ہوتا تھا کیوں کہ جو کلام اس کے متن میں درج تھا وہ یقینی طور پر اس نسخے کی تاریخ کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) تک کا کہا ہوا تھا جو غزلیں یا اشعار حاشیے پر بڑھائے گئے تھے یا آخر کے اوراق میں درج تھے وہ اس کے بعد کے تھے۔ اس کے علاوہ چوں کہ نسخۂ شیرانی کا متن مکتوبہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) نسخۂ بھوپال کی ترمیم و اضافہ کے مطابق تھا۔ اس لیے نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کی آخری حد بھی معلوم ہو سکتی تھی، لیکن نسخۂ حمیدیہ کے انداز ترتیب سے یہ باتیں صاف طور پر آشکار نہ ہو سکیں۔

ترتیب کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اتنی توجہ صرف نہیں کی جا سکی جتنی ان کے لیے لازمی تھی، چناں چہ جیسا کہ مولانا امتیاز علی عرشی نے نسخۂ بھوپال سے مقابلے کے بعد نشاندہی کی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں ہر طرح کی غلطیاں بھی راہ پا گئیں مثلاً قلمی دیوان کے بہت سے اشعار چھوٹ گئے، متداول دیوان میں شعر تھا، لیکن اس پر مشترک کی علامت نہیں بنائی گئی، قلمی دیوان کا متن چھوڑ کر صرف متداول دیوان کا متن نقل کر دیا گیا، قلمی دیوان میں شعر نہیں تھا لیکن اسے قلمی ظاہر کر دیا

گیا۔ قلمی دیوان کے حاشیے میں شعر تھا لیکن اس کی صراحت نہیں کی گئی، محل اصلاح غلط بتایا گیا۔ کتابت کی غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ ان اغلاط کے پیشِ نظر مولانا عرشی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

''غرض کتاب میں اتنی غلطیاں ہیں کہ اس کی اشاعت ثانی اصل سے مقابلہ کیے بغیر سخت ادبی جرم ہوگا۔'' ۳

اسی طرح نسخۂ حمیدیہ میں شامل متداول دیوان کے کلام کے متعلق مالک رام صاحب لکھتے ہیں:

''میرزا کی وفات کے بعد خدا معلوم دیوان کتنی مرتبہ چھپا اور اس میں کتابت کی غلطیاں داخل ہوتی گئیں۔ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے جب مطبوعہ کلام اپنے ہاں شامل کیا تو ان اغلاط کو جوں کا توں لے لیا اور ان کی درستی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لحاظ سے نسخۂ حمیدیہ جامع الاختلافات بلکہ جامع الاغلاط کہلانے کا مستحق ہے۔'' ۴

قلمی نسخے کی کیفیت کے بیان اور متن کے تعین وغیرہ میں مختلف وجوہ سے ہر شخص سے سہو ولغزش ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک ہر جگہ صحیح اور دوسرا ہر جگہ غلط ہو۔ متداول دیوان کے کلام میں بھی اختلاف متن کو ہر جگہ غلطیوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ بعض موقعوں پر اختلاف متن نے غالب کی مختلف اوقات کی اصلاحوں کی وجہ سے بھی مستقل حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں دو متن ملتے ہیں اور دونوں صحیح ہو سکتے ہیں وہاں ایک متن کا تعین دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عرشی اور مالک رام صاحب کے مرتب کیے ہوئے دیوانوں میں بھی اشعار کا متن ہر جگہ ایک نہیں، حالاں کہ دونوں محققین اپنے اپنے قائم کردہ متن کو صحیح ترین سمجھتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ نسخۂ حمیدیہ میں غلطیاں کثرت سے ہیں۔ چناں چہ ان کی درستی کے لیے سید ہاشمی نے اس کے شائع ہوتے ہی یہ معقول تجویز پیش کی تھی۔

''راقم الحروف کی بہ تاکید گزارش ہے کہ خود جناب مفتی صاحب یا انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے کوئی اور صاحب نسخۂ حمیدیہ پر احتیاط سے نظر ثانی کریں اور اب بھی ایک غلط نامہ تیار کر کے دیوان کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔'' ۵

افسوس ہے کہ اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا...... تاہم نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت نے غالبؔ کی اُردو شاعری کے ارتقاء کے مطالعے کے لیے پہلی بار جو مواد فراہم کیا وہ آپ اپنی مثال تھا۔

غالبؔ نے اپنی ابتدائی اُردو شاعری کے متعلق عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔'' ۶

لیکن نسخۂ حمیدیہ سے معلوم ہوا کہ نہ تو اُنھوں نے اپنے ابتدائی دیوان کے اوراق یک قلم چاک کیے تھے اور نہ اس کے صرف دس پندرہ شعر دیوانِ حال میں رہنے دیے تھے۔ ان کے متداول دیوان میں ایک سرسری شمار کے مطابق اس زمانے کے تقریباً پانچ سو شعر موجود ہیں، جن میں ان کے بہت سے مشہور اور اعلیٰ درجے کے اشعار ہی نہیں۔ کئی مشہور اور اعلیٰ درجے کی غزلیں بھی ہیں مثلاً:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

☆

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

☆

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک ۷

اسی طرح اس زمانے کے قلمرو کلام میں جہاں بہت سی فارسی زدہ، خیالی اور عجیب وغریب اشعار تھے، مثلاً:

نزاکت سے فسونِ دعویٰ طاقت شکستن ہا
شرار سنگ اندازِ چراغ از جسم جستن[۵] ہا

صبح قیامت ایک دم گرگ تھی اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

☆

زخم دل پر باندھیے حلوائے مغز استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

وہیں ایسے اشعار کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جو منتخب دیوان میں شامل ہونے کے لائق تھے بلکہ بعض اشعار تو ایسے تھے کہ انھیں غالبؔ کے بہترین اشعار کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے مثلاً:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☆

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

☆

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

☆

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

چناں چہ نسخۂ حمیدیہ سے یہ اہم نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غالبؔ کی ابتدائی اُردو شاعری صرف فارسی زدگی اور مضامین خیالی کی شاعری نہ تھی بلکہ اُنھوں نے اپنے فن کی انتہائی منزل بھی اسی دور

یعنی پچیس برس کی عمر میں پائی تھی۔ اس کے علاوہ ان اصلاحوں سے جو خود غالبؔ نے اپنے کلام میں کی ہیں ان کے فنی ارتقاء کی نہایت دلچسپ اور کار آمد تفصیلات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اکثر اُنھوں نے ایک طرف فارسی کے ثقیل اور غریب پیرایوں کو صاف اور مانوس پیرایوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اُردو الفاظ و تراکیب کو فارسی الفاظ و تراکیب پر ترجیح دی ہے۔ جابجا خفیف سے لفظی ردو بدل سے اشعار کو زیادہ صاف اور دل نشیں بنا دیا ہے۔ مثلاً:

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا ہے عرض
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

☆

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

☆

ہے لختِ دل سے جوں مژہ خارِ شاخِ گل
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خارِ شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

☆

تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے
دل وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

نسخۂ حمیدیہ کلام غالبؔ کے سلسلۂ تحقیق کی ایک لازوال کڑی ہے۔ بھوپال نے اُردو زبان وادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کی روشن ترین مثال بھی اگر کوئی ایک تالیف قرار دی جاسکتی ہے تو وہ غالبؔ کا یہی دیوان ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھیے راقم الحروف کے مضامین ''دیوان غالبؔ کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ...... نسخۂ بھوپال'' (نیا دور، لکھنؤ، غالبؔ نمبر، ۶۹ء) کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں (شاعر، غالبؔ نمبر، ۶۹ء) ''نسخۂ حمیدیہ...... چند غلط فہمیوں کا ازالہ'' اور ''نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبداللطیف'' جو بالترتیب اُردو ادب اور ہماری زبان، علی گڑھ میں شائع ہو رہے ہیں۔

۲۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید، ص ۱۔

۳۔ دیوانِ غالبؔ، نسخۂ عرشیؔ، دیباچہ، ص ۱۱۳۔

۴۔ دیوانِ غالبؔ، مرتبہ مالک رام، آزاد کتاب گھر، دہلی۔ مقدمہ، ص ۳۳۔

۵۔ دیوانِ غالبؔ جدید (نسخۂ حمیدیہ)، تبصرہ از سید ہاشمی، رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، مطبوعہ اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۶۔

۶۔ مکتوبِ غالبؔ مورخہ یکم اگست ۱۸۵۶ء، خطوطِ غالبؔ مرتبۂ غلام رسول مہرؔ، طبع دوم، کتاب منزل، لاہور۔ ص ۵۳۲۔

۷۔ اس غزل کی ردیف ہونے تک مشہور ہوگئی ہے، مگر غالبؔ کی زندگی کے چھپے ہوئے دیوانِ غالب کے نسخوں میں نیز پرانے قلمی نسخوں میں ''ہوتے تک'' ہی ہے۔

۸۔ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ عرشیؔ میں اسی طرح چھپا ہے، لیکن فارسی محاورہ ''چراغ از چشم جستن'' ہے جس کے معنی خود غالبؔ نے آتش از چشم بریدن کے ساتھ عبارت اس حالیست کہ در وقت رسیدن صدمۂ قوی بر دماغ روے دہد'' لکھے ہیں۔ کلیاتِ نثر غالبؔ، طبع چہارم، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۸۸۸ء، ص ۳۳۔

(ماہنامہ ''نگار''۔ کراچی۔ جون ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۳ تا ۳۷)

◆◆◆

مولانا امتیاز علی عرشی

نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں

(نسخۂ بھوپال کی روشنی میں)

مرزا غالب نے اپنا منتخب دیوانِ ریختہ مرتب کر کے خارج اشعار کے متعلق دیباچے میں حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:

''امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستائی، پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازین اوراق یابند، از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ این نامہ سیاہ نہ شناسند و چامہ گرد آور را در ستایش ونکوہش۔ اان اشعار ممنون و ماخوذ نہ سگالند۔''

لیکن اُن کی اس ہدایت کے باوجود جب ملک میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا اور مرزا صاحب کے دیوانِ قدیم کے نظری اشعار اہل ذوق کے سامنے لائے گئے تو ان کی عمومی بے لطفی کے باوجود اس اکتشاف کو بہت بڑا ادبی کارنامہ تسلیم کیا گیا۔

فی الحقیقت ریاست بھوپال کے ''کتاب خانۂ حمیدیہ'' کا یہ شرف لائقِ صد تحسین و آفرین ہے کہ اُس نے اس مجموعے کو عرصۂ دراز تک محفوظ رکھا، ورنہ آج اس عدیم المثال شاعر کی تدریجی ترقی کا مطالعہ ناممکن تھا۔ اور ریاست بھوپال مستحقِ تبریک ہے کہ اُس نے مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے مرحوم، خلف مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی مرحوم کو اس کی ترتیب کا ذمہ دار قرار دیا۔ مفتی صاحب جدید اصولِ ترتیب سے بڑی حد تک واقف تھے۔ انھوں نے اس کام کو محنت سے انجام

دیتے ہوئے ترتیب کا اچھوتا مگر قدرے مشکل انداز اختیار کیا۔ لیکن وہ ریاست کے اعلیٰ عہدیدار تھے اور بہرحال اُس عہدے کے فرائض اہم اور زیادہ توجہ کے مستحق تھے، اس بناء پر ہمہ تن محقق و منقش کا سا کام نہ کر سکے اور چھوٹی بڑی کوتاہیاں راہ پا گئیں۔

مجھے عرصے سے دیوانِ غالب اردو کے نسخوں میں اس سے قدیم اور اہم نسخے کی زیارت کا شوق تھا۔ خوش قسمتی سے کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاس، ناگپور، منعقدہ ۱۹۔۲۰۔۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء سے واپسی میں دو روز بھوپال میں قیام کا موقع مل گیا۔ اس بہانے سے میں نے نسخۂ بھوپال یعنی نسخۂ حمیدیہ کے اصل کی زیارت اور اصل و نقل کا مقابلہ کرنے کا کچھ وقت نکال لیا۔ اس مختصر سے وقت میں جو کچھ نوٹ میں نے لے لیے تھے، انھیں نسخۂ عرشی کے دیباچے اور حواشی میں پیش کر چکا ہوں۔ لیکن نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان یادداشتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس لیے علیحدہ مضمون کی شکل میں یکجا پیش کرنا مناسب جانتا ہوں، تاکہ وہ حضرات جن کے پاس نسخۂ حمیدیہ ہے، اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح و اضافہ کر سکیں۔ پہلے اس گمشدہ متاعِ بے بہا کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

اس مخطوطے کا ناپ ۲۲/۸×۲۹ اور کاغذ عمدہ کشمیری ہے۔ جدولیں رنگین اور طلائی اور باریکا لاجوردی ہے۔ روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں۔

شروع میں فوجدار محمد خاں بہادر [1] کی مہر ہے جس میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) منقوش ہے۔ ابتدائی سادہ اوراق میں سے پہلے دو ورقوں پر جو کھردرے کاغذ کے ہیں، وہ فارسی غیر منقوط خط نقل کیا گیا ہے جو میرزا صاحب نے مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کو لکھا تھا۔ [2] ان دونوں ورقوں کے بعد دو اور انگریزی کاغذ کے ورق ہیں جن میں سے پہلے کے رخ ''ب'' میں شمسے کے اندر لکھا ہے:

''دیوان ہٰذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد۔ از کتب خانۂ سرکار
فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوج دار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ، قلمی، خوش خط۔''

دوسرے ورق کے رخ الف میں شمسے کے اندر فوجدار محمد خاں کی بڑی مُہر ہے جس میں بہ خطِ طغرائے عربی ''فوجدار محمد خاں بہادر'' منقوش ہے۔ اس مُہر کا سنہ ۱۲۶۱ھ ہے۔ اصل دیوان کے ورق ۱، الف پر انھیں صاحب کی دو چھوٹی مُہریں ثبت ہیں جن میں سنہ ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) منقوش

ہے۔ یہ مُہر کتاب کے اندر بھی کئی جگہ نظر آتی ہے۔

دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے، اور شروع میں قصائد درج ہیں۔ سب سے پہلا قصیدہ فارسی کا ہے جس کا آغاز ہے:

''بہر ترویج جنابِ والیِ یوم الحساب۔'' ۳؎ یہ قصیدہ ورق ۱ ب سے شروع ہو کر ۴ الف پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ۴ الف کی آخری سطر سے ''قصیدہ حیدری بہ تمہید بہارِ مغفرت'' شروع ہوا ہے جس کا آغاز ہے: ''ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار''۔ اس کا انجام ورق ۹ ب کی سطر ۲ پر ہوا ہے۔ اس کے بعد ''ایضاً فی المنقبت'' کے عنوان سے دوسرا اردو قصیدہ ملتا ہے جس کا آغاز ہے: ''توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روی زمیں'' یہ قصیدہ ورق ۹ ب کی سطر ۳ سے شروع ہو کر ورق ۱۲ ب پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد اسی عنوان سے تیسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے: ''جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی۔'' یہ ورق ۱۲ ب کی سطر ۶ سے شروع ہو کر ورق ۱۴ الف پر تمام ہوتا ہے۔

ورق ۱۵ ب: دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔ اس پورے حصے میں دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے۔ ان سادہ جگہوں میں معمولی خط میں جگہ جگہ ''ولہ'' لکھا ہے۔ میری رائے میں یہ بدمذاقی میرزا صاحب سے ممکن نہ تھی۔

آخر میں کاتبِ نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے: ''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد وغالب، سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ من الہجرۃ النبویہ بہ صورت اتمام یافت۔''

اس عبارت کے نیچے پھر فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر ہے۔

دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں اور اضافے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم، روشنائی اور روشِ خط تینوں مختلف ہیں جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے۔ دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی کہی ہوئی غزلیں لکھی ہیں، مگر یہ سب ردیف ''یا'' کی ہیں۔ حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اُس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے کسی وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔

کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ ''غلط'' لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر صرف ''غ'' اس طرح لکھا گیا ہے کہ اُس کا سر، مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخۂ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ چند غزلوں کے مقابل حاشیے پر ''مکرر نوشتہ شدہ'' لکھا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ ؏ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسند کے اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھا ہے۔ پہلی غزل کے شعر ''آتشیں پا ہوں'' الخ کے مقابل حاشیے پر لکھا ہے ''عبدالعلی''۔ اسی طرح ''نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا'' کے مقابل بھی یہی لکھا گیا ہے۔ نیز اسی غزل کے تیسرے شعر کے مقابل لکھا ہے: ''ص منہ''۔

ردیف غ کی پہلی غزل: ''عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ'' کے متعدد شعروں کے مقابل ''پسند عبدالعلی منہ'' لکھا ہے۔ اس ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے: ''پسند خاطر عبدالعلی''۔

ورق ۲۸ ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے: ''مقابلہ کردہ شد''۔ یہ جس قلم میں ہے وہ اندرونی تغیرات کے قلم سے مشابہ ہے۔

ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں بارکیے کے اندر لکھا ہے: ''محمد عبدالصمد مظہر۔'' میرے لیے یہ صاحب بھی انجان ہیں۔

آخری سادہ اوراق میں جو غزلیں بہ خطِ بد اضافہ کی گئی ہیں، ان میں کی آخری غزل: ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' کے آخر میں اسی قلم سے لکھا ہے: ''دیکھ تو عکس قد یار لب جو پر سے۔ تمام شد، کار من نظام شد۔ رب یسر وتمم بالخیر۔''

بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً: ''فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے'' میں ''تقاضا'' کو ''تقھا'' لکھا ہے۔ یا ''وارستگی بہانہ سنگی دلی نہیں'' میں ''بہانیے'' یا ''بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے'' میں ''مضاعقہ'' یا ''ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست'' میں ''زرہ'' یا ''رنگ ہے سنگ محک دعوای مینائی عبث'' میں ''سنگِ مہک'' یا ''خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں'' میں ''بھاگے نگے''۔ یا ''آگہی گر نہیں

غفلت ہی سہی'' میں ''غلفت'' لکھ دیا ہے۔

اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں۔ اس لیے اس کے باوجود کہ عام طور پر اس انداز کا حک و اضافہ بالعموم بخطِ مصنف ہوا کرتا ہے اور اندرونِ کلام میں قلم زدگی و اصلاح خود میرزا صاحب کے قلم سے ہونا چاہیے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخط غالب نہیں ہیں۔

مفتی صاحب کی رائے میں یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپالی کے لیے لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور اُن کی نظر سے گزرا۔ ۵ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ فی الحقیقت یہ میرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا۔

اس کے بعد عبد العلی صاحب اور عبد الصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں بہادر کے کتب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن ۱۲۴۸ھ والی مُہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی، جو دیوانِ غالب کے متداول انتخاب کی تاریخِ ترتیب و تالیف ہے۔

اب وہ تمام اغلاط جو اس مختصر سے وقت میں نوٹ کی جا سکتی تھیں، نسخۂ حمیدیہ کے صفحات کے مطابق پیش کرتا ہوں۔ چوں کہ یہ سب مفتی صاحب مرحوم کے اختیار کردہ اصول پر مبنی ہیں اس لیے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بجز اس کے کہ انھیں اپنے اپنے نسخوں میں درج کر لیں۔ ملاحظہ ہو:

ص ا۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یہ دونوں شعر اصل میں حاشیے پر خوش خط قلم سے لکھے ہوئے ہیں مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ یہ خط متن کے خط سے جدا ہے۔

ص۲۔

جنوں گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیر سے دودِ سپند آیا

اصل میں کاتب نے ''زنجیر دود سپند'' لکھ دیا تھا۔ غالباً میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ی'' بڑھا کر ''زنجیری'' بنا دیا ہے۔ اس کو مرتب نے ''زنجیر سے'' نقل کیا ہے۔ (نسخۂ شیرانی میں یہ لفظ ''زنجیری'' لکھا ہے۔ وحید)

ص۲۔

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اصل نسخے میں: ''برنگ لالہ جامِ بادہ پر محمل پسند آیا''۔

ص۲۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، خونِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ، غم خوارِ جانِ درد مند آیا

اصل کے اندر پہلے مصرع میں ''داغ جگر'' ہے۔

ص۳۔

عالم جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا
چوں صبح چاک جیب مجھے تار و پود تھا

دوسرے مصرع میں ''جوں صبح'' ہے۔

ص۳۔ اس غزل کا حسب ذیل شعر مرتب نے چھوڑ دیا ہے:

عالم طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سربسر
یا میں غریب کشورِ گفت و شنود تھا
تو یک جہاں قماش ہوس جمع کر کہ میں
حیرت مطاع عالمِ نقصان و سود تھا

ص۵۔ اصل نسخے میں ''حیرت متاع'' ہے اور یہی درست ہے۔

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اُس کا
صبح موجۂ گل کو نقش بوریا پایا

اس شعر کے لفظ ''نقش'' پر مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''متن میں ''وقف'' لکھا ہوا ہے مگر اسے کاٹ کر حاشیے پر ''نقش'' بنایا ہے۔'' پہلے یہ عرض کردوں کہ اصل نسخے میں یہ ترمیم حاشیے پر نہیں ہے بلکہ بین السطور میں لفظ ''وقف'' کے اوپر پائی جاتی ہے۔ بعدازاں یہ گزارش کرنا ہے کہ مرتب نے مصرع اول میں لفظ ''خرام'' کی جگہ ''خیال'' چھاپ دیا ہے، جس سے شعر کا مطلب کہیں کا کہیں جا پڑا۔ اصل نسخے میں یہ اس طرح ہے:

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اُس کا

ص ۵۔

ہے مکیں کی پاداری نامِ صاحبِ خانہ
ہم نے تیرے کوچے سے نقشِ مدعا پایا

اصل نسخے میں ''مکیں'' کی جگہ ''نگیں'' اور ''ہم نے'' کے عوض ''ہم سے'' ہے۔

ص ۵۔

نے اسد جفا سائل، نے سمِ جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا اُلفت آزما پایا

اصل میں ''سمِ جنوں'' کی جگہ ''ستم جنوں'' ہے۔

ص ۵۔

عشرت ایجاد چہ بوی و گل و گسو دودِ چراغ
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

اصل میں ''چہ بوی گل'' ہے اور یہی درست بھی ہے۔ نیز مصرع پر ''لا'' نہیں لکھا گیا بلکہ نسخے کی علامت ''ن'' بنا کر نیا مصرع لکھ دیا ہے۔ مرتب نے یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ اضافہ اصل کے حاشیے پر ہے۔

ص ٦۔

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے سے بھی عریاں نکلا

اصل میں ہے: ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا'' اور یہی تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔

ص ٦۔

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کے یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا، پھر وہی عریاں نکلا

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''پر وہی عریاں نکلا'' ہے اور یہی صحیح ہے۔

ص ۷۔

دل گزرگاہِ خیالِ مَی و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

یہ شعر اصل نسخے کے حاشیے پر خوش خط قلم سے بڑھایا گیا ہے مگر مرتب نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

ص ۷۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ، گلبانگِ تسلی نہ ہوا

اصل میں پہلا مصرع اس طرح ہے: ''ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں راضی کہ کبھی''۔ دوسرے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخے ''کرنے میں بھی'' پر متفق ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کاتب سے لفظ ''بھی'' چھوٹ گیا ہے۔ مطبوعہ میں ''کرنے میں بھی'' کی جگہ ''کرنے پہ بھی'' مرتب کا سہو ہے۔

ص۷۔

حیف اے تنگِ تمنا کہ پئے عرضِ حیا
یک عرق آئینہ بر جبۂ سائل باندھا

مرتب نے اس شعر کے پہلے مصرع پر یہ حاشیہ لکھا ہے: ''پہلے یہ مصرع یوں تھا: 'داغ اے حاجتِ بے درد کہ در عرضِ حیا' پھر اسے کاٹ کر اس صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔'' حالاں کہ میرزا صاحب نے متن کے مصرع اول کو قلم زد نہیں کیا ہے بلکہ اسی پر ''نسخہ'' کا ''ن'' بنا کر حاشیے پر دوسرا مصرع لکھ دیا ہے۔

ص۸۔

حسن آشفتگی جلوہ سے عرضِ اعجاز
دستِ موسیٰ بہ سرِ دعویٔ باطل باندھا

اصل میں ہے ''حسنِ آشفتگی جلوہ ہے عرضِ اعجاز''۔

ص۸۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مرتب نے یہ شعر نقل کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اصل مخطوطے میں نہیں پایا جاتا۔

ص۹۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ رشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

اصل میں ''ہجومِ اشک میں'' ہے۔ دیگر قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بھی اسی طرح ہے، لہٰذا اسے مرتب کا سہو مانا جائے گا۔

ص ۱۰۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

اس غزل کے تمام اشعار مطلع کے علاوہ ''شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بے تاب تھا'' والی غزل (ص ۹) کے حاشیے پر خوش خط مگر قدرے شکستہ آمیز قلم سے مندرج ہیں۔ چناں چہ ان میں صفحہ ۹ کی اسی زمین کی غزل کے ان دونوں شعروں کو بھی شامل کر لیا تھا:

(۱) دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا۔ الخ

(۲) موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار۔ الخ

مگر بعد میں شعروں پر ترتیبی نمبر شمار ڈالتے وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ زیرِ بحث غزل کے حسب ذیل شعر دو بار لکھے گئے ہیں۔ ایک بار شکستہ آمیز اچھے خط میں اور دوبارہ بُرے خط میں:

(۱)

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو

(۲)

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو

(۳)

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی

(۴)

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

ص ۱۰۔

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

یہ غزل حاشیے پر مذکورہ بالا خوش خط قلم سے لکھی گئی ہے۔ مرتب نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

نیز اس کے دوسرے شعر:

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا
چراغِ گل سے ڈھونڈے سے چمن میں شمع خار اپنا

کے دوسرے مصرع میں ''ڈھونڈے ہے'' کی جگہ ''ڈھونڈے سے'' غلط چھپ گیا ہے، جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

ص ۱۱۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بددماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

اصل میں ''بے دماغی'' ہے۔

ص ۱۱۔

نہ ہو وحشت کشِ درسِ شوابِ سطر آگاہی
میں گردِ راہ ہوں، بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

اس شعر کے دوسرے مصرع پر مرتب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''حاشیہ پر 'میں گردِ راہ ہوں' کی بجائے 'غبارِ راہ ہوں' بنایا ہے۔'' حالاں کہ میرزا صاحب بین السطور میں ''میں گرد'' کے اوپر ''غبار'' بنایا ہے۔

ص ۱۱۔

اسد وحشت پرستِ گوشۂ تنہائی دل ہے
برنگِ موجِ مے خمیازۂ ساغر ہے دم میرا

اصل میں پہلے مصرع کا آخری لفظ ''ہوں'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

ص ۱۲۔

بعجز آبادِ وہمِ مدعا تسلیم شوخی ہے
تغافل کو نہ کر مصروفِ تمکیں آزمائی کا

مرتب نے ''مصروف'' پر یہ حاشیہ لکھا ہے: ''حاشیے پر 'مصروف' کی جگہ 'معزول' لکھا ہے۔''

اولاً تو یہ مناسب تھا کہ مرتب حسب دستور خود اصلاحی لفظ متن میں اور قلم زد لفظ حاشیے پر لکھتے، ثانیاً یہ کہ اصل نسخے میں حاشیے پر 'معزول' نہیں ''مغرور' بنایا گیا ہے۔ نیز اصل کے کاتب سے مصرع اول کا آخری لفظ 'ہے' چھوٹ گیا ہے، جو لفظ 'شوخی' کے اوپر بعد کو بڑھایا گیا ہے۔

ص ۱۳۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یہ شعر بخطِ خوش مذکورہ بالا اُس غزل کے حاشیے پر مندرج ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے: ''نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا'' مگر مرتب نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۱۴۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اصل میں ہے: ''عجز سے اپنے میں جانا'' الخ۔ اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۱۴۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

اصل میں ہے ''ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا''۔ اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۱۴۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

اصل میں مصرع ثانی کے اندر ''ستم زدہ'' کی جگہ ''جنوں زدہ'' ہے، مگر اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۵۔

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

اصل میں ''پیچتاب'' ملا کر لکھا ہے۔

ص ۱۵۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ
اگرچہ گم شدہ ہے کاروبار دنیا کا

اصل میں اس مقطعے کے نیچے برے خط میں یہ دوسرا مقطع لکھا ہے:

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

مرتب نے اس مقطعے میں ''کرتا ہوں'' چھاپا ہے۔

ص ۱۵۔ اس مقطعے کے قبل دو اور شعر بعنوان مطبوعہ درج کیے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس غزل کے یہ شعر اصل میں نہیں ہیں حالاں کہ اصل کے حاشیے پر چار شعر قدرے اچھے خط میں مندرج ہیں جن میں سے یہ شعر بالکل ترک کر دیا ہے:

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اور اس شعر کو:

ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

صرف جدید مصرع اول کے ساتھ متن کے اندر لکھا ہے اور قدیم مصرع حاشیے میں نقل کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے دستور کے مطابق دونوں مصرعے متن میں درج ہونا چاہیں تھے۔

ص ۱۶۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اصل میں یہ دو شعر اگلے اشعار کے ساتھ حاشیے پر بخطِ قدرے خوش تحریر ہے، مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۱۶۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں ہوں خمیازہ ساحل کا

اصل میں ''خمارِ تشنہ کامی ہا'' تھا۔ اس میں میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ہا'' کو ''بھی'' بنایا ہے۔

ص ۱۶۔

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خانہ بیدلؔ کا

مرتب نے ''گمراہی'' پر حاشیہ لکھا ہے: ''متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا: ''مجھے اس قطع رہ میں'' الخ، اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی ہے۔'' اس حاشیے میں لفظ ''کاٹ کر'' قابل نظر ہے۔ اس لیے کہ اصل نسخے میں کسی لفظ کو قلم زد نہیں کیا ہے۔ نئے الفاظ بین السطور میں پرانے لفظوں کے نیچے لکھ دیے گئے ہیں اور پرانے لفظ بھی جوں کے توں موجود ہیں۔

ص ۱۷۔

غریبِ بدرجستۂ باز گشتن
سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا

اصل میں ''بدرجستہ'' کی جگہ حاشیے پر ''ستم دیدہ'' تجویز کیا ہے۔ یہ بخطِ معمولی ہے۔ مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص۱۹۔

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
ہر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

یہ دونوں شعر اصل نسخے کے حاشیے پر مذکورہ قدرے خوش خط قلم سے مندرج ہیں۔ اس کو ظاہر کرنا چاہیے تھا جیسا کہ صفحہ ۲۰ کے حاشیہ نمبر ا میں کیا ہے۔

ص۱۹۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یہ شعر آئندہ دو شعروں کے ساتھ اصل کے حاشیے پر بخطِ مذکورہ بالا تحریر ہے، اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۲۱۔

گر وہ مستِ ناز تمکیں دے صلائے عرضِ حال
خارِ گل، بہرِ دہانِ گل زباں ہوجائے گا

میرزا صاحب نے پہلے مصرع کے لفظ ''تمکیں'' اور ''لا'' علامت نفی بنا کر داہنے حاشیے پر ''دے گا'' لکھا ہے، گویا اس مصرع کو یوں بنایا ہے: ''گر وہ مست ناز دیوے گا صلائے عرض حال''۔ اس کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔ نیز دوسرا مصرع پہلے یوں تھا: ''خار گلبن در دہان گل زباں ہوجائے گا''۔ اس میں گلبن کو متن کے اندر ہی ''گل'' بنا دیا ہے اور ''در'' کو قلمزد کر کے اوپر ''بہر'' لکھا ہے۔ مرتب نے اس ترمیم کا بھی ذکر نہیں کیا۔

ص۲۲۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں در رگ نہاں ہوجائے گا

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''مثلِ خوں در رگ'' ہے۔ مرتب نے اس کو غلط نقل کیا ہے۔

ص۲۲۔

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی ہے دانا اسد
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہوجائے گا

اصل میں ہے: ''تو بھی دانا ہے اسد'' اوراسی طرح دیگر قلمی ومطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ مرتب نے اس کو غلط نقل کر دیا ہے۔ نیز اصل میں ''سونچ'' ہے۔ ہاں یہ تمام شعر حاشیے پر بخطِ مذکورہ بالا مندرج ہیں۔ مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص۲۳۔

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو
خانۂ حاتم میں یاقوتِ نگیں اختر ہوا

اصل میں ''اخگر ہوا'' درج ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

ص۲۳۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

یہ شعر مرتب نے ''مطبوعہ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے حالاں کہ یہ شعر اُس برے خط میں، جس میں اکثر اصلاحیں نظر آتی ہیں، حاشیے پر مندرج ہے۔

ص۲۳۔

تا کجا افسوس گرمی ہاے صحبت اے خیال
دل ز آتش خیزیِ داغِ تمنا چل گیا

مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ ''حاشیے پر 'آتش خیزی' کی بجائے 'سوزِ آتش' بنایا ہے'' حالاں کہ اصل نسخے میں ''آتشخیزی'' کے نیچے بغیر اُسے قلمزد کیے ''بہ سوزِ آتش'' تحریر ہے۔ مرتب نے سہواً 'بہ' کو 'ز' سے بدل دیا ہے۔

ص۲۳۔

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بے کسی
دل ز اندازِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا

اصل میں ''بیگانہ ای افسردگی ای بیکسی'' لکھا ہے۔ میرے خیال میں دونوں جگہ ''ای'' علامتِ اضافت کے لیے کاتب نے استعمال کیا ہے۔ مرتب نے دوسرے کو حرف ندا قرار دیا ہے۔ نیز اس مقطع پر اصل کے اندر ''لالا'' تحریر ہے۔ گویا اس کو کالعدم ٹھہرایا ہے۔ مگر مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا۔

ص۲۳۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہ شعر مع آئندہ ۴ اشعار کے قدرے خوشخط قلم سے حاشیے پر ہے۔ اور اس شعر:

ص۲۴۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

کے مصرع اول میں ''تجھ کو دکھاتا'' کی جگہ ''تجھ کو دکھاؤں'' ہے۔ اس فرق کو بھی ظاہر کرنا چاہیے تھا۔

ص۲۴۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: ''تھا میں صحرا میں کہ گھر یاد آیا''۔ مرتب نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

ص ۲۵۔

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اصل میں ہے: ''وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا'' اور یوں ہی تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ص ۲۶۔

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اصل میں مصرع اول پر ''ن'' بنا کر بائیں حاشیے میں لکھا ہے: ''بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا ہوں پر اسدؔ''۔ مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۲۶۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوے
ہوں شمعِ کشتہ در خورِ محفل نہیں رہا

یہ شعر مع باقی اشعار کے اصل کے حاشیے پر مندرج ہے لیکن اس کے مصرع ثانی میں ''ہوں شمع کشتہ'' کی جگہ ''جوں شمع کشتہ'' ہے۔

ص ۲۶۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے: ''اب لائقِ توجہِ قاتل نہیں رہا''۔ مرتب نے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۲۷۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یہ شعر اصل کے حاشیے پر مندرج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۲۸۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

یہ بھی اصل کے حاشیے پر مندرج ہے، مگر وہاں ''مشہدِ عاشق کے کوسوں تک'' لکھا ہے۔

ص ۲۹۔

غمِ مجنوں عزادارانِ لیلیٰ کا پرستش گر
خمِ رنگِ سیہ اس حلقہ ہای چشمِ آہو تھا

اس کے دوسرے مصرع کے الفاظ ''از حلقہ ہای'' کو قلمزد کر کے اوپر ''لالا'' لکھا ہے اور نیچے بین السطور میں بنایا ہے: ''پیمانہ ہر''۔ گویا مصرعے میں اصلاح کر کے یوں قرار دیا ہے:

خمِ رنگِ سیہ پیمانہ ہر چشمِ آہو تھا

نیز اس غزل کا مقطع پہلے یہ تھا:

ص ۲۹۔

اسدؔ خاکِ درِ میخانہ ہا بر فرق پاشیدن
خوشا روزی کہ آب از ساغرِ مے تا بزانو تھا

اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔ اصل میں بین السطور کے اندر پہلے مصرع کو اس طرح بنایا ہے: ''اسد خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں'' اور بین السطور ہی میں دوسرے مصرع کو اصلاح دے کر یوں بنایا ہے: ''گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے زانو زانو تھا'' مگر چوں کہ کاتب نے ''زانو زانو'' کو ''رنو رنو'' لکھ دیا ہے، مرتب اس غلطی کو سمجھ نہیں سکے اور مصرع یوں قرار دیا:

''گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے تا بزانو تھا''

ص ۲۹۔

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیِ مژگاں
مگر یک دست دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ یہ تھے: ''مگر دستے بدامان نگاہ'' الخ مرتب نے اس حقیقت کو بھی ظاہر نہیں کیا۔

ص۳۰۔

نزاکت سے فسون دعویٔ طاقت شکستن ہا
شرارِ سنگ انداز چراغ از جسم خستن ہا

اصل میں ہے: نزاکت ہے فسون دعوی طاقت شکست ہا

ص۳۱۔

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

اصل میں پہلے دوسرا مصرع اس طرح تھا: ''نگیں میں جوں شرر در سنگ الخ''۔ مرتب نے اس اصلاح کو ظاہر نہیں کیا۔

ص۳۱۔

مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ پیدا ہے
کہ داغ آرزوے بوسہ لایا ہے پیام اُس کا

شعر کے دوسرے مصرع میں ''لایا ہے'' پر نشان دے کر حاشیے پر لکھا ہے: ''دیویگا''۔ گویا اس مصرع میں تغیر کیا ہے، مگر اس کو بھی مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۳۳۔

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا
تو کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

اس دوسرے مصرع میں پہلے ''تو کہے'' کی جگہ ''گویا'' تھا۔ مرتب نے اس اصلاح کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

ص۳۴۔

جوش مے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسدؔ
ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزشِ مستانہ تھا

پہلے مصرع میں ''اضطراب آرا'' کی جگہ ''اضطراب اندیش'' اور ''تڑپنا'' کی جگہ ''طپیدن'' تھا۔ مرتب نے دوسری اصلاح کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے، مگر پہلی کو چھوڑ دیا ہے۔

ص ۱۴۱۔

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

یہ غزل اصل کے حاشیے پر (ورق ۱۱۹ الف) قدرے خوشخط قلم سے درج ہے، مگر مرتب نے اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۱۴۱۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

اصل میں ''موت'' کی جگہ ''مرگ'' ہے۔

ص ۱۴۱۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اصل میں کاتب نے پہلے مصرع کے اندر ''دل تھا جگر'' سہواً لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

ص ۱۴۲۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ غزل بھی حاشیے میں درج ہے مگر مرتب نے اسے اُن غزلوں کے زمرے میں رکھا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں۔

ص ۱۴۴۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

یہ غزل بھی ورق ۱۱۸ الف کے حاشیے پر موجود ہے مگر اس کا خط برا ہے۔ نیز دوسرے مصرع میں ''بھرتے تلک'' ہے۔ اس کو مرتب نے موجودہ مطبوعہ نسخوں کے مطابق چھاپا ہے۔ ہاں اصل میں ہر جگہ فرماویں، جاویں وغیرہ ہے۔

ص۴۴۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

اصل میں اس کے دوسرے مصرع کا لفظ ''گے'' کاتب سے چھوٹ گیا ہے۔ مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا۔

ص۴۴۔

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

اس کے دوسرے مصرع میں ''بلا'' کی جگہ ''وفا'' ہے جو دیگر تمام نسخوں کے مطابق ہے، مگر مرتب نے غلطی سے لفظ بدل دیا ہے۔ نیز اصل میں کاتب نے پہلے مصرع میں ''بھاگیں گے'' کو اس طرح لکھا ہے ''بھاگے نگے۔''

ص۴۴۔

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

اصل میں ہے ''دلّی میں رہے''۔ اسی طرح دیگر نسخوں میں ہے۔ صرف نظامی ایڈیشن میں ''رہیں'' چھپ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے مرتب نے نقل کیا ہے۔

ص۵۱۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

یہ غزل ورق ۱۳۵ الف و ب کے حاشیے پر موجود ہے اور بڑے خط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کا عکس بھی نسخۂ حمیدیہ میں شائع ہو چکا ہے۔ مگر مرتب نے اسے ان غزلوں میں شامل کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں۔

ص۵۱۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہوجانا

اصل کے کاتب نے مصرع اول میں ''کشکش'' اور ''رحمت'' لکھا ہے۔ نیز اصل میں ''عقدیکا'' املا ہے، ''عقدہ کا'' نہیں جو مرتب نے اختیار کیا ہے۔

ص۵۱۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''پانی کا جدا ہوجانا'' لکھا ہے۔

ص۵۲۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

یہ غزل اصل کے حاشیے پر درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۵۲۔

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موج گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

اصل میں پہلا مصرع ''موجِ گل'' سے شروع ہوتا ہے۔ بظاہر یہ کاتب اصل کی غلطی ہے لیکن مرتب کو حاشیے میں یہ فرق بتانا چاہیے تھا۔

ص۵۲۔

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

اصل میں دوسرا مصرع یوں ہے: ''سر سے گزری تھی یہی بال ہما موجِ شراب'' یہ اصل کے کاتب کا سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۵۲۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

اصل میں دوسرے مصرع کی ردیف کو کاتب نے بدل کر ''ہو جانا'' لکھ دیا ہے یعنی ''ہے تصور میں زبس جلوہ نما ہو جانا'' جو مرزا غالب کو نظر بھی نہ پڑا اور جوں کا توں باقی رہا۔ مرتب نے اس کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص۵۳۔

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

اصل میں ہے ''ایک عالم میں ہے''۔ مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص۵۴۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ہنگامہ'' کی جگہ ''کیفیت'' ہے اور دوسرا مصرع اس طرح ہے ''رہبر قطرہ بدریا ہے، خوشا موجِ شراب''۔ یہاں مرتب نے مصرع ثانی نقل کرتے وقت غلطی کی ہے کیوں کہ اسی غزل میں یہ مصرع آچکا ہے۔

ص۵۵۔

گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں
ہے شمع شہادت کے لیے سربسر انگشت

اصل میں پہلے یونہی تھا لیکن بعد کو دوسرے مصرع میں ''ہے'' کو ''ہر'' بنادیا ہے۔ مرتب نے اصلاح کا تذکرہ نہیں کیا۔

ص۵۵۔

خوں دل میں جو میرے نہیں باقی، تو عجب کیا
جوں ماہی بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت

اصل میں ''تو عجب کیا'' کی جگہ ''تو پھر اوس کی'' ہے۔

ص۵۵۔

کسی رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل
آتی نہیں پنجے میں بس اُس کی نظر انگشت

لیکن اصل میں ''اس کی نظر'' کی بجائے ''اوس کے نظر'' ہے۔

ص۵۵۔

افسوس کہ زنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کے تھے درخورِ عقدِ گہر انگشت

یہاں مرتب نے ''کی تھی'' کی جگہ ''کے تھے'' چھاپ دیا ہے حالاں کہ انگشت بالاتفاق مونث ہے، نیز اصل کے کاتب نے بجائے ''گہر'' ''گوہر'' لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس کا بھی اظہار نہیں کیا۔

ص۵۵۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''ترا چھلے کا نہ دینا'' ہے، یونہی دیگر نسخوں میں بھی ہے۔ صرف نظامی میں ''تری'' چھپ گیا ہے۔ مرتب نے بلا تحقیق اسی سے نقل کر دیا ہے۔ نیز اصل کے کاتب نے سہواً ''بموقت'' لکھ دیا ہے جو مرزا صاحب کی نظر سے بھی چوک گیا اور جوں کا توں باقی رہا۔ مرتب نے اس غلطی کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

ص ۵۷۔

جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

اصل کے کاتب نے پہلے مصرع میں ''خونبابہ مشرب'' لکھا ہے۔ اس غلطی کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا اور خود بھی غلط لکھا۔ صحیح لفظ ''خونابہ'' ہے۔

ص ۵۷۔

دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ
دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

دوسرے مصرع میں اصل کے کاتب نے سہواً ''دل و دوست'' لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس غلطی کو نہیں بتایا۔

ص ۵۷۔

نہیں گریہ کامِ دلِ خستہ گردوں
جگر خواہی جوشِ حسرت سلامت

اصل کے کاتب نے ''گریکام'' لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس سہو کو ''گریہ کام'' پڑھا۔ صحیح ''گر بکام'' ہے۔

ص ۵۷۔

نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی
سر خستہ دشوارِ وحشت سلامت

اصل میں دوسرے مصرع کے اندر ''دشوار وحشت'' کی جگہ ''وشورِ وحشت'' ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

ص ۵۹۔

نازِ لطفِ عشق باوصفِ توانائی عبث
رنگ ہے سنگِ مہک دعوائے مینائی عبث

دوسرے مصرع میں ''سنگ مہک'' چھاپ دیا ہے حالاں کہ اصل میں ''محک'' ہے۔

ص۵۹۔

ناخنِ دلِ عزیزاں یک قلم ہے لقب زن
پاسبانِ طلسمِ کنجِ تنہائی عبث

شعر کے دوسرے مصرع میں ''کنج تنہائی'' کو ''گنج تنہائی'' لکھ دیا ہے۔

ص۶۰۔

یک نگاہ گرم ہے جوں شمع سرتاپا گداز
بہرِ از خود رفتگاں رنجِ خود آرائی عبث

پہلے ''نازخودآرائی'' تھا، بعد میں ''رنج خودآرائی'' بنایا ہے، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔

ص۶۱۔

حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار
سر رشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج

اصل میں ''ہر رشتہ'' ہے۔

ص۶۱۔

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظار چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

اصل میں ہے ''اے انتظام چل'' اور یوں ہی دیگر تمام نسخوں میں بھی ہے۔ مرتب نے سہواً ''انتظار'' چھاپ دیا ہے۔

ص۶۲۔

اے اسؔد ہے مستعدِ شانہ گشتن بہرِ زلف
پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

اصل میں پہلے یونہی تھا مگر پھر ''شانہ گشتن بہرزلف'' کے نیچے ''گیسوشدن'' اصلاح کی ہے، یعنی مصرع اصلاح کے بعد یوں ہوا: ''اے اسد ہے مستعد شانۂ گیسوشدن''۔ مرتب نے اس اصلاح کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۶۵۔

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بس کہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

اصل میں پہلے ''یکسر'' کی جگہ ''تجھ سے'' تھا، بعد میں یہ تغیر کیا گیا ہے۔ مرتب نے اسے بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔

ص ۶۶۔

کون ہوتا ہے حرفِ مَی مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اصل میں 'لبِ ساقی میں' ہے۔ دیگر نسخوں میں بھی سوائے نظامی ایڈیشن کے اسی طرح ہے۔ مرتب نے اسی سے نقل کر دیا ہے اور اصل کی قرأت کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۷۲۔

فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیداد دشمن پر
کہ وجدِ برق جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر

اصل میں ''چوں پروانہ'' ہے۔

ص ۷۳۔

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھا ہے بالِ یک تپیدن پر

اصل میں ''باندھے'' ہے۔

ص ۷۳۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ تمنا میری گردن پر

اصل میں پہلے مصرع کے اندر ''کہتا تھا'' کو مرزا صاحب نے ''کہتا ہے'' بنایا ہے۔ مرتب نے دوسرے مصرع کو تو لکھا مگر اس فرق کو ظاہر نہیں کیا۔

ایک بات اور ذکر کے قابل تھی مگر مرتب نے چھوڑ دی۔ وہ یہ کہ اس غزل کے وہ تین شعر جو بعنوان مطبوعہ نقل کیے گئے ہیں، اصل کے حاشیے پر تحریر ہیں۔ ان میں سے:

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اصل میں مصرع اول میں ''تقضا'' سہوِ کاتب ہے۔ مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ نیز ''قرض'' کی جگہ ''فرض'' چھاپ دیا ہے۔

ص ۷۹۔

اے شعلہ! فرصتی کہ سویدا ے دل سے ہوں
کشت سپند صد جگر اندوختن ہنوز

اصل نسخے میں ''شعلہ'' ساقط ہے، اس لیے ''شعلہ'' بڑھا کر حاشیے میں اس کا اظہار لازم تھا۔

ص ۸۰۔

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوۂ ناز

لیکن اصل کے کاتب نے ''زرہ'' سہواً لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس غلطی کا اظہار نہیں کیا۔

ص ۸۳۔

اضطراب نارسائی مایۂ شرمندگی
ہے عرق ریزیِ خجلت جوششِ طوفانِ عجز

اصل میں پہلے ''موجد شرمندگی'' تھا۔ اسے قلم زد کر کے غالب نے ''مایۂ شرمندگی'' بنایا ہے۔ مرتب نے اصلاح کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۸۵۔

میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا ہے مرے غم خوار کے پاس

حسبِ تصریحِ مرتب اصل کے حاشیے پر یہ شعر بھی موجود ہے مگر اصل کے کاتب نے ''ترے غمخوار'' لکھا ہے۔ اس کا اظہار ضروری تھا۔

ص ۸۵۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خودبخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

اصل کے کاتب نے نمو کے واوٗ پر تشدید لگادی ہے۔ مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۹۲۔

وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسدؔ
دکھلاوے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

اصل میں پہلا مصرع ابتداءً یوں تھا: ''در عالمِ تصورِ روے بتاں اسدؔ''۔ بعد میں مرزا صاحب نے اس کو بدل دیا مگر مرتب نے اس اصلاح کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۹۶۔

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اصل میں ہے ''سینۂ بلبل کا زخم''۔ مرتب نے اس فرق کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

غیر کی منت نہ چھوڑوں گا پئے توقیر درد
زخمِ دل جوں خندۂ خوباں ہیں سر تا پا نمک

اصل میں دوسرے مصرع میں ''خوباں ہے'' لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس کو مرتب نے غلط چھاپ دیا ہے۔

ص ۹۶۔

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسدؔ
زور نسبت مے سے رکھتا ہے اضارا کا نمک

اصل میں ''نصارا کا نمک'' ہے اور یہی درست ہے۔

ص ۹۷۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

اصل میں اس غزل کی ردیف ہر جگہ ''ہوتے تک'' ہے۔ خود مرزا صاحب نے اس کو ''ہوتے تک'' ہی لکھوایا ہے اور چھپوایا ہے۔ مگر مرتب نے ناقابلِ اعتبار جدید مطبوعہ نسخوں سے ''ہونے تک'' نقل کر دیا ہے جو کسی طرح مستحقِ قبول نہیں۔

ص ۹۸۔

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسدؔ
ہے برسرِ مژہ نگراں دیدبانِ اشک

پہلے مصرع اول اس طرح تھا: ''در حالِ انتظارِ قدومِ بتاں اسد''۔ اس کے ابتدائی الفاظ قلم زد کر کے اوپر بین السطور میں اصلاح کی گئی ہے۔ مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۰۱۔

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

پہلے مصرع اول اس طرح تھا: ''نورِ حیدر سے ہے اس کی روشنی''۔ اس میں سے حیدر کو قلم زد کر کے نیچے موجودہ الفاظ بڑھائے ہیں۔

ص ۱۰۳۔

خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستاں اسدؔ
حسرتیں کرتی ہیں میری خاطرِ ایجاد گل

اصل میں دوسرا مصرع پہلے یوں تھا ''آرزوئیں کرتی ہیں'' الخ۔ مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۱۰۵۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُر خوں کو زنداں خانہ ہم

اس کے حاشیے میں مرتب نے لکھا ہے کہ دوسرا مقطع کہہ کر حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ حالاں کہ پہلے مصرع ''شامِ غم میں سوزِ عشقِ شمع رویاں سے اسدؔ'' کی بجائے دوسرا مصرع دونوں غزلوں کے درمیان کی سادہ جگہ میں لکھا گیا ہے۔

ص ۱۰۹۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

اصل میں پہلا مصرع اس طرح ہے: ''تھی وہ خوباں ہی کے تصور سے''۔ مرتب نے مطبوعہ سے مصرع نقل کیا اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۰۹۔

بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے
پر مجھے طاقتِ سوال کہاں

اصل میں کاتب نے ازراہِ سہو ''مضاعقہ'' لکھا ہے۔

ص ۱۱۱۔

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

یہ شعر مع آئندہ دو شعروں کے بعنوان مطبوعہ لکھا ہے حالاں کہ یہ تینوں شعر حاشیۂ اصل پر بخطِ بد موجود ہیں مگر مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۱۳۔

آئینہ دام کو پردے میں چھپاتا ہے عبث
کہ پری زاد نظر قابل تسخیر نہیں

اصل میں ''آئینہ'' اور ''پریزاد'' ہے۔ نیز پہلے کاتب نے سہواً ''قابل تقریر'' لکھ دیا تھا، پھر لفظ ''تقریر'' کاٹ کر اس کے نیچے ''تسخیر'' لکھا ہے۔

ص ۱۱۳۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اصل میں ''اوس کا دیوان'' ہے۔

ص ۱۱۵۔

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں

اصل میں ''اپنے دردِ دل'' کی جگہ ''اپنی بے کسی'' ہے اور یہی تمام مطبوعہ نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خدا جانے کہاں سے مرتب نے ''دردِ دل'' چھاپ دیا ہے۔ نیز اس غزل کے تمام شعروں کی ردیف ''یہاں'' اصل میں بہ ہائے مخلوط التلفظ لکھی ہے۔

ص ۱۱۶۔

ہے مری وحشت عدوے اعتباراتِ جہاں
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

یہ شعر اصل کے حاشیے پر بخطِ بد درج ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۱۶۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

یہ شعر بھی اصل کے حاشیے پر درج ہے۔

ص ۱۱۹۔

برشکالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گُل سو جا سے دیوارِ چمن

اس شعر کا پہلا مصرع اصل میں یوں ہے: ''برشکال گریۂ عشاق دیکھا چاہیے''۔ مرتب نے مصرع مطبوعہ نسخے سے نقل کرایا ہے اور اس فرق کو ظاہر نہیں کیا، نیز ''کھِل گئی'' کو ''کھُل گئی'' چھاپا ہے، جو صراحتہً غلط ہے۔

ص ۱۲۲۔

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

مرتب نے اسے اس طرح لکھا ہے گویا یہ اصل دیوان کے متن کا شعر ہے۔ حالاں کہ ص ۱۲۲ کی غزل ''خوں در جگر نہفتہ بزردی رسیدہ ہوں'' کے حاشیے پر اسی مطلع کے ساتھ لکھا ہے۔

ص۱۲۲۔ اس شعر کے ساتھ وہ شعر بھی اُسی غزل کے حاشیے پر تحریر ہے جس کو مرتب نے حاشیے میں سابق غزل کے حاشیے پر لکھا ہونا ظاہر کیا ہے، یعنی:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

نیز اصل میں ''ہو گرمیِ نشاط الخ'' لکھا ہے، نون سہواً چھوٹ گیا ہے۔

ص۱۴۷۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع سہواً یوں لکھا گیا ہے: ''چھوڑا نہ مجھ ضعیف نے رنگ اختلاط کا'' مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔ نیز اس غزل کو اُس کلام کے زمرے میں درج کیا ہے جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں اور حال یہ ہے کہ اصل کے حاشیے میں یہ غزل موجود ہے جس کا اقرار خود مرتب نے اپنے حاشیے میں کیا ہے۔

ص۱۴۷۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں ''جارہ'' ہے جو سہو ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۱۴۷۔

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

اصل کے دوسرے مصرع میں سہواً لفظ ''سے'' ترک ہو گیا ہے، مرتب نے اسے ظاہر نہیں کیا۔

ص۱۴۸۔

وارستگی بہانۂ بے گانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں پہلا مصرع یوں ہے ''وارستگی بہانہ سنگی دلی نہیں'' اور ''بہانہ'' کو ''بہانئے'' لکھا ہے۔ مرتب نے نہ اس اصلاح کا ذکر کیا نہ کاتب کے سہو کا۔

ص۱۴۸۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اصل میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: ''ہر چند عمر صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو''۔اس کو ظاہر نہیں کیا گیا۔

ص۱٦۸۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اصل میں ہے: ''کھلتے کسو پہ کیوں مرے دل کے معاملے''۔

ص۱۷۰۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمکِ پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

اصل میں ''گر'' کی جگہ ''گو'' ہے،اس فرق کو مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص۱۸۹۔

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

اصل میں کاتب نے ''فزائے حیرت آباد'' سہواً لکھ دیا تھا،مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا۔

ص۱۸۹۔اسی طرح اس غزل کے دوسرے شعر:

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں،قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کو اصل میں ''وہ ہم ہیں'' سے شروع کیا گیا ہے جو سہو ہے۔مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۱۹۸۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

اصل میں ''ہاں'' کی جگہ ''جوں'' ہے۔

ص ۲۴۲۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

یہ غزل اصل کے حاشیے پر بخطِ بد موجود ہے اور اس میں یہ شعر زائد ہے:

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہمنشیں کو کرامات چاہیے

ص ۲۴۲۔ اصل میں یہ شعر بھی دوسرے مطبوعہ نسخوں کی طرح موجود ہے مگر مرتب سے چھوٹ گیا ہے:

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

ص ۲۴۲۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

اصل میں کاتب سے لفظ ''مہ'' سہواً چھوٹ گیا ہے مگر مرتب نے ظاہر نہیں کیا۔

ص ۲۴۲۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اصل میں دوسرے مصرع کا لفظ ''کا'' سہواً ترک ہوگیا ہے مگر مرتب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۲۴۲۔

سرپائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رو سوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

اصل میں مصرع اول کے اندر ''چاہیے'' کی جگہ ''کھینچیے'' ہے۔ نیز لفظ ''پہ'' کاتب سے ترک ہوگیا ہے۔ مرتب نے ان دونوں کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۲۴۳۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

یہ غزل بھی حاشیے پر بخطِ بد درج ہے مگر مرتب نے اسے اُن غزلوں میں شمار کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں ہے۔

ص ۲۴۳۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اصل میں کاتب نے دوسرے مصرع میں سہواً ''غفلت'' لکھ دیا ہے۔ مرتب نے اس سہو کو ظاہر نہیں کیا۔

ص ۲۴۳۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گو نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اصل میں ہے ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ''۔

ص ۲۴۴۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یہ غزل اصل دیوان کے آخر میں بخطِ بد مندرج ہے۔ مرتب نے اسے اُن غزلوں کے زمرے میں شمار کیا ہے جن کا کوئی شعر اصل میں نہیں ہے۔

ص ۲۴۵۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اصل میں ''پری وش'' متن میں اور اس کے اوپر بغیر ''وش'' کو قلم زد کے ''رخ'' لکھا ہے۔

ص ۲۴۶۔

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

یہ غزل بھی اصل کے آخر میں مذکورہ بالا غزل کے بعد درج ہے۔ مرتب نے اسے بھی انھیں غزلوں میں شمار کیا ہے جو اصل میں نہیں ہیں۔ اصل میں درج ذیل شعر تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے زائد ہیں۔ مرتب نے انھیں نقل نہیں کیا:

زندگی میں بھی رہا ذوقِ فنا کا مارا
نشہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
بس کہ ہے فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن
رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالبؔ
کھو دیا سطوتِ اسماے جلالی نے مجھے

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ دوسرے شعر میں اصل نسخے کے اندر ''نہ دیا'' کی جگہ ''نادیا'' کاتب کے سہوِ قلم ہے:

ص ۲۵۲۔

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویا ے زخمِ کاری ہے

یہ غزل اصل کے آخر میں درج ہے، اور اس کے شعر:

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

کے دونوں مصرعوں میں ''وہی'' کی جگہ ''وہ ہی'' لکھا ہے:

ص۲۵۳۔

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''بے قراری کا حکم'' ہے اور پہلے مصرع میں ''ہوے ہے''۔

ص۲۶۶۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

یہ غزل آخر میں چوتھے نمبر پر درج ہے اور مصرع اول میں ''اچھوں'' کی جگہ ''خوباں'' لکھا ہے:

ص۲۶۶۔ یہ شعر اصل میں زیادہ ہے:

دل تو ہو، اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسباب تمنا چاہیے

ص۲۶۶۔ نیز ''غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے'' والا شعر مقطع کے بعد لکھا ہے اور اسی طرح دیوان مطبوعہ منشی شیونرائن میں بھی ہے:

ص۲۶۸۔

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

یہ غزل اصل کے آخر کی غزلوں میں پانچویں نمبر پر درج ہے، اور حسب ذیل نئے شعر پر مشتمل ہے:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں، لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

ص ۲۷۳۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یہ غزل چھٹے نمبر پر درج ہے۔ اس میں ایک تو "تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی" والا شعر متروک ہے اور دوسرے "نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے" میں دونوں جگہ "مجھ سے" لکھ دیا ہے۔

ص ۲۸۴۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

یہ غزل ساتویں نمبر پر درج ہے مگر "پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس" والا شعر متروک ہے۔

ص ۲۸۴۔

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں پہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

اصل میں اور دیگر تمام نسخوں میں "بھر رہا ہوں" ہے۔

ص ۲۸۵۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

اصل میں پہلے مصرع کے الفاظ "پھر ہر" سہواً ترک ہو گئے ہیں۔

ص ۲۸۵۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اصل میں ہے "ڈھونڈے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس"۔

ص ۲۸۵۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''مانگے ہے پھر کسو کو''۔

ص ۲۸۶۔

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''چاہے ہے پھر نگاہ''۔

ص ۲۸۶۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں''۔

ص ۲۸۶۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''بیٹھے رہے'' الخ۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی نئی ترتیب اور تصحیح میں کس قدر مدد ملتی۔ اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا نا قابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ موصوف الذکر، نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ (مئی ۱۸۶۵ء) میں انتقال کیا ہے۔

۲۔ کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، صفحہ ۶۳۔

۳۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ فارسی، ص ۴۷، جہاں یہ بعنوان قطعہ ۶۰ فاتحہ مندرج ہے۔

۴۔ خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبدالعلی خاں بہادر ابن نواب غلام محمد خاں بہادر تھے۔ یہ نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے میرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔

۵۔ تمہید نسخۂ حمیدیہ، ۶۔

(ماہنامہ ''صحیفہ'' (حصہ سوم)، (غالب نمبر)۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱ تا ۲۸)

◆◆◆

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

کے دونوں مصرعوں میں ''وہی'' کی جگہ ''وہ ہی'' لکھا ہے:

ص ۲۵۳۔

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

اصل کے اندر دوسرے مصرع میں ''بے قراری کا حکم'' ہے اور پہلے مصرع میں ''ہوے ہے''۔

ص ۲۶۶۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

یہ غزل آخر میں چوتھے نمبر پر درج ہے اور مصرع اول میں ''اچھوں'' کی جگہ ''خوباں'' لکھا ہے:

ص ۲۶۶۔ یہ شعر اصل میں زیادہ ہے:

دل تو ہو، اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیے

ص ۲۶۶۔ نیز ''غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے'' والا شعر مقطع کے بعد لکھا ہے اور اسی طرح دیوان مطبوعہ منشی شیونرائن میں بھی ہے:

ص ۲۶۸۔

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

یہ غزل اصل کے آخر کی غزلوں میں پانچویں نمبر پر درج ہے، اور حسب ذیل نئے شعر پر مشتمل ہے:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں، لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

ص ۲۷۳۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یہ غزل چھٹے نمبر پر درج ہے۔ اس میں ایک تو ''تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی'' والا شعر متروک ہے اور دوسرے ''نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے'' میں دونوں جگہ ''مجھ سے'' لکھ دیا ہے۔

ص ۲۸۴۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

یہ غزل ساتویں نمبر پر درج ہے مگر ''پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس'' والا شعر متروک ہے۔

ص ۲۸۴۔

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

اصل میں اور دیگر تمام نسخوں میں ''بھر رہا ہوں'' ہے۔

ص ۲۸۵۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

اصل میں پہلے مصرع کے الفاظ ''پھر ہر'' سہواً ترک ہو گئے ہیں۔

ص ۲۸۵۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''ڈھونڈے ہے پھر کسو کو لبِ بام پر ہوس''۔

ص ۲۸۵۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''مانگے ہے پھر کسو کو''۔

ص ۲۸۶۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''چاہے ہے پھر نگاہ''۔

ص ۲۸۶۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

اصل میں ہے: ''پھر دل میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں''۔

ص ۲۸۶۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اصل میں ہے ''بیٹھے رہے'' الخ۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر نسخۂ بھوپال کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوتا تو نسخۂ حمیدیہ کی نئی ترتیب اور تصحیح میں کس قدر مدد ملتی۔ اور نسخۂ بھوپال کے ضائع ہو جانے سے کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ موصوف الذکر، نواب غوث محمد خاں بہادر کے بیٹے اور نواب سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے ماموں تھے۔ انھوں نے ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ (مئی ۱۸۶۵ء) میں انتقال کیا ہے۔

۲۔ کلیاتِ نثر، پنج آہنگ، صفحہ ۶۳۔

۳۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ فارسی، ص ۴۷، جہاں یہ بعنوان قطعہ ۶۰ فاتحہ مندرج ہے۔

۴۔ خاندان ریاست رام پور کے ایک صاحب عبدالعلی خاں بہادر ابن نواب غلام محمد خاں بہادر تھے۔ یہ نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے میرزا صاحب کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔

۵۔ تمہید نسخۂ حمیدیہ، ۶۔

(ماہنامہ ''صحیفہ'' (حصہ سوم)، (غالب نمبر)۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱ تا ۲۸)

◆◆◆

ڈاکٹر سید حامد حسین

میاں فوجدار محمد خاں اور غالبؔ

۱۹۲۱ء میں بھوپال سے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے غالبؔ کا وہ مجموعۂ کلام شائع ہوا جس میں متداول کلام کے ساتھ ساتھ غالبؔ کا وہ سرمایۂ سخن بھی پہلی بار طبع ہوا جسے غالبؔ نے طباعت کے لیے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کی بنیاد دیوان غالبؔ کا وہ قلمی نسخہ تھا جو میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی زینت تھا۔

میاں فوجدار محمد خاں ریاست بھوپال کے پانچویں فرمانروا نواب غوث محمد خاں (متوفی ۱۲۴۲ھ) (۱۸۳۶ء) کے صاحب زادے تھے۔ ان کی والدہ ایک افغانی خاتون چاندنی بیگم تھیں جن کے بطن سے فوجدار محمد خاں کے علاوہ ان سے بڑے ایک بھائی معزمحمد خاں اور ایک بہن گوہر بیگم تھیں۔ گوہر بیگم (ولادت ۹، رجب ۱۲۱۶ھ/ ۱۷۹۶ء وفات ۲۴، محرم ۱۲۹۹ھ، ۱۷، دسمبر ۱۸۸۱ء) اپنے شوہر نواب نظر محمد خاں کے ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء میں انتقال کے بعد نواب قدسیہ بیگم کے نام سے مختار ریاست ہوئیں اور ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء تک زمامِ سلطنت سنبھالے رہیں۔

فوجدار محمد خاں غالباً ۱۲۲۷ھ/ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے کیوں کہ جب ۲۲، محرم ۱۲۳۵ھ/ ۱۲، نومبر ۱۸۱۹ء کو اچانک طپنچہ چل جانے سے ان کے بہنوئی نواب نظر محمد خاں کی موت ہوئی اس وقت فوجدار محمد خاں کی عمر آٹھ سال بتائی جاتی ہے اور طپنچہ سر ہو جانے کے سلسلے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نظر محمد خاں اپنی ایک سالہ بچی سکندر بیگم کو محل کی مسجد میں بیٹھے کھلا رہے تھے، پہلو میں طپنچہ بھرا ہوا رکھا تھا۔ فوجدار محمد خاں نے اُسے اٹھا لیا اور عمداً یا سہواً وہ سر

ہوگیا اور گولی نظر محمد خاں کے سر کو پار کرتی ہوئی نکل گئی۔

نواب نظر محمد خاں کی موت کے بعد قدسیہ بیگم مختار ریاست ہوئیں اور جب ابتدائے ۱۲۵۰ھ /۱۸۳۴ء میں ان کے نائب الریاست کرم محمد خاں کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی فوجدار محمد خاں کو کچھ عرصہ کے لیے نائب بنایا لیکن پھر خوش وقت رائے کو راجگی کا خطاب دے کر عہدۂ نیابت دیا۔ ۲۸، ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ/ ۱۸، اپریل ۱۸۳۵ء کو سکندر بیگم سے نکاح کے بعد یکم رمضان ۱۲۵۳ھ/ ۳۰، نومبر ۱۸۳۷ء کو جہانگیر محمد خاں مسند آرائے سلطنت ہوئے۔ لیکن ۲۸، ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ/ ۹، دسمبر ۱۸۴۴ء کو ان کے انتقال کے بعد ایک بار پھر جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ سکندر بیگم اور جہانگیر محمد خاں کی صاحب زادی شاہجہاں بیگم کی عمر اس وقت صرف چھ سال کی تھی چناں چہ ۱۲، محرم ۱۲۶۱ھ/ ۲۱، جنوری ۱۸۴۵ء کو پولیٹیکل ایجنٹ نے بھوپال میں دربار کر کے گورنر جنرل کے یہ احکامات سنائے کہ جب تک ان کی شادی نہ ہو شاہجہاں بیگم رئیسہ بھوپال ہوں گی اور میاں فوجدار محمد خاں جو کہ بڑے لائق، امانت دار اور دیانت دار ہیں، مختار ریاست ہوں گے۔ لیکن اسی دوران یہ محسوس کیا گیا کہ فوجدار محمد خاں خود دعویدار ریاست ہیں اور پولیٹیکل ایجنٹ بھی ان کی حمایت میں ہے اس لیے سکندر بیگم نے ایجنسی کو اپنے حقوق و اختیارات کے متعلق ایک مراسلہ بھیجا۔ اس کے بعد ملازمان ریاست کا ایک وفد پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا اور اس سے شکایت کی کہ فوجدار محمد خاں انھیں دربار رئیسہ تک پہنچنے نہیں دیتے اور بے سبب پرانے نوکروں کو نکال کر اپنے نوکروں کو بڑے منصبوں پر مامور کر رہے ہیں۔

فوجدار محمد خاں اس وقت ایک خود مختار رئیس کی طرح حکومت کرتے تھے، ان کا دربار ہوتا تھا اور انھیں نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ چناں چہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اس اندیشے سے کہ کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ ولیم فریڈرک ایڈن اور منشی شہامت علی کو بھیجا اور عید الاضحیٰ ۱۲۶۱ھ/ ۹، دسمبر ۱۸۴۵ء کی تقریب پر نواب شاہجہاں بیگم نے پہلا دربار کیا اور ملازمانِ ریاست نے انھیں نذریں پیش کیں۔ اسی درمیان ایک نئے پولیٹیکل ایجنٹ جوزف ڈی کنگھم آئے اور اُنھوں نے فوجدار محمد خاں کے ساتھ ساتھ سکندر بیگم کو بھی مساوی حیثیت سے انتظامِ ریاست میں شمولیت کے احکام صادر کیے۔ لیکن بہت جلد کنگھم نے ان مشکلات کا جو اس دوعملی اور نااتفاقی سے پیش آسکتی تھیں، اندازہ کر لیا

اور اُنھوں نے گورنر جنرل کو سفارش کی کہ سکندر بیگم ہی مختار ریاست بنائی جائیں۔ اس تجویز کی منظوری پر ۱۵، محرم ۱۲۶۳ھ/ ۴، جنوری ۱۸۴۷ء کو پولیٹیکل ایجنٹ نے فوجدار محمد خاں سے استعفیٰ حاصل کر لیا اور راجہ خوشوقت رائے کو نائب ریاست بنا دیا گیا۔ اس طرح تقریباً دو سال فوجدار محمد خاں نے مختار ریاست کی حیثیت سے اپنے پورے اختیارات سے کام لیا اور اپنے صرف کثیر کی وجہ سے ریاست پر قرض کا ایک بھاری بوجھ ڈال دیا۔ اس قرض کی مالیت تین لاکھ پچاسی ہزار ایک سو تیرہ روپے آٹھ آنے بتائی جاتی ہے۔

ریاست کی مختاری سے سبکدوشی کے بعد بھی فوجدار محمد خاں کے اعزاز میں سکندر بیگم نے کوئی کمی نہیں آنے دی۔ چناں چہ ان کی سلامی اور استقبال کے حدود متعین رہے۔ فوجدار محمد خاں سکندر بیگم کے حقیقی ماموں کی حیثیت سے ممتاز اخوان ریاست میں سے تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں ان کا ایک اہم مقام تھا۔ چناں چہ سکندر بیگم نے بیرونِ ریاست جتنے سفر کیے، ان میں فوجدار محمد خاں ان کے ساتھ تھے۔ نومبر ۱۸۶۱ء میں الٰہ آباد میں وہ تاریخی دربار ہوا جس میں سکندر بیگم کو ملکہ وکٹوریا کی جانب سے ''اسٹار آف انڈیا'' کا تمغہ دیا گیا۔ اس دربار میں شرکت کے لیے سکندر بیگم کے ہمراہ جو عمائدین گئے تھے ان میں فوجدار محمد خاں بھی شامل تھے۔ دربار میں شرکت کے دوران سکندر بیگم نے گورنر جنرل سے شمالی ہند کے اہم شہروں کی سیر کی اجازت طلب کی اور اپنے ہمراہیوں کے بنارس، فیض آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، متھرا ہوتی ہوئی ۲۰، رجب ۱۲۷۸ھ/ ۲۲، جنوری ۱۸۶۲ء کو دہلی پہنچیں اور ایک ہفتہ وہاں رکنے کے بعد ۲۷ رجب کو وہاں سے روانہ ہوئیں۔ ۱۲۸۰ھ/ ۶۴-۱۸۶۳ء میں سکندر بیگم نے سفر حج کا ارادہ کیا اور اپنی والدہ قدسیہ بیگم اور ماموں فوجدار محمد خاں کے ہمراہ ۲۲، جمادی الاول ۱۲۸۰ھ/ ۵، نومبر ۱۸۶۳ء کو بھوپال سے روانہ ہوئیں اور ۳، جمادی الاول ۱۲۸۱ھ/ ۵، اکتوبر ۱۸۶۴ء کو واپس آئیں۔ اسی سال ۱۶، ذی الحجہ/ ۱۲ مئی ۱۸۶۵ء کو فوجدار محمد خاں نے انتقال کیا اور باغ نواب معز محمد خاں میں (جو کہ اب نواب یٰسین محمد خاں کے باغ کے نام سے مشہور ہے) دفن ہوئے۔

فوجدار محمد خاں علوم عقلی و نقلی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکت نے اپنی تصنیف ''انشائے نور چشم'' (مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ) میں تحریر کیا ہے

کہ فوجدار محمد خاں، ''علم نحو وصرف ومنطق وفقہ وہیئت وہندسہ وجغرافیہ وعلم طب وعلم ادب میں ذی استعداد وعلم موسیقی کے استاد تھے'' (ص ۴۲) ان علوم سے ان کی دلچسپی کا مزید اندازہ ان کے اس کتب خانہ سے ہوسکتا ہے جس میں ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں اُردو، فارسی اور عربی کی تقریباً ایک ہزار اور سنسکرت کی تین سو سے زیادہ کتابیں تھیں۔ اس کتب خانہ کی ایک فہرست بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں ۱۴، شوال ۱۲۶۵ھ/ ۲، ستمبر ۱۸۴۹ء اور یکم محرم ۱۲۶۷ھ/ ۶، نومبر ۱۸۵۰ء کو کیے گئے شمار کے مطابق کتابوں کی تفصیلات درج ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں کو ۳۳ فنون پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر فن کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ کیا گیا تھا۔ ان میں مطبوعات کے ساتھ ساتھ مخطوطات کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ انھیں مخطوطات میں سے غالبؔ کا وہ نادر مجموعہ کلام تھا جس کا ان فہرستوں میں ''دیوان اسد غالبؔ قلمی خوشخط'' کے عنوان سے اندراج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے قلمی دیوان اس کتب خانہ میں موجود تھے وہ ان شعراء کے تھے۔ حافظؔ، انوریؔ، رافتؔ، ظہیرؔ فاریابی، بلیغؔ، عرفیؔ، دردؔ، جعفرؔ زٹلی، جلال، صائبؔ، سوداؔ، جراتؔ، انشاؔ، مومنؔ، فوجدار محمد خاں کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ ان کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکتؔ کے پاس رہا۔ ۱۹۱۲ء میں یار محمد خاں کے انتقال کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتب خانے کی کتابیں اپنے محل پر منگوالیں۔ بعد میں یہ کتابیں ریاستی کتب خانہ حمیدیہ لائبریری، میں شامل کردی گئیں۔ حمیدیہ لائبریری اب مولانا آزاد سینٹرل لائبریری کے نام سے موسوم ہے اور اس میں اب بھی فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی مطبوعات ومخطوطات کافی تعداد میں موجود ہیں۔

سینٹرل لائبریری بھوپال میں فوجدار محمد خاں کے خطوط پر مشتمل سات جلدیں بھی محفوظ ہیں یہ خطوط ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۵۷ھ/ ۱۲۶۱ھ، ۱۲۶۳ھ سے ۱۲۶۵ھ اور ۱۲۸۰ھ، ۱۲۸۱ھ کے دوران لکھے گئے ہیں۔ عام طور پر ان خطوط کا موضوع سیاسی یا انتظامی معاملات ہیں لیکن بعض خطوط فوجدار محمد خان کے علمی ذوق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چناں چہ مولوی محمد نواز کے نام خطوط میں بعض کتابوں کی فراہمی کا اسرار ہے اور اگر وہ قیمتاً دستیاب نہیں ہیں تو انھیں عاریتاً حاصل کرنے کے لیے لکھا گیا ہے تاکہ اس کی نقل کرائی جاسکے۔ ایک خط میں جس پر ۸، شوال ۱۲۵۷ھ/ ۲۲، نومبر ۱۸۴۱ء کی تاریخ

ہے، انھوں نے میاں قطب الدین کی معرفت دہلی سے جو سامان طلب کیا ہے، اس میں دیوانِ ناسخ، دیوانِ مومن خاں، غیاث اللغات اور اخلاق ناصری بھی شامل ہیں۔ ۸، رجب ۱۲۶۴ھ/ ۱۱، جون ۱۸۴۸ء کا ایک خط دہلی کے حضرت کالے صاحب کے نام ہے اور اس میں ان کی خیریت دریافت کی گئی ہے۔ اس خط کے علاوہ ان جلدوں میں دہلی کی کسی دوسری ممتاز شخصیت کے نام کوئی خط نہیں ملتا۔ نہ کسی خط میں کوئی غالبؔ کا بالواسطہ تذکرہ دیکھنے میں آیا ہے۔

عام طور پر یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ جو فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں تھا، وہ غالبؔ نے خود فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا کیوں کہ غالبؔ اور فوجدار محمد خاں کے دوستانہ تعلقات تھے اور آپس میں مراسلت کا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن فوجدار محمد خاں کے خطوط کی نقلوں پر مشتمل ان جلدوں میں جواب تک محفوظ ہیں، فوجدار محمد خاں کا ایک خط بھی غالبؔ کے نام سے نظر نہیں آتا اور پھر جب ان کے صاحب زادے یار محمد خاں اپنی تصنیف ''انشائے نور چشم'' شائع کرتے ہیں تو وہ غالبؔ کے صرف ایسے خطوط شامل کرتے ہیں جن میں سے ایک کا خطاب والیِ ٹونک سے ہے اور دوسرے کا یار محمد خاں کے استاد مولانا عباس رفعت سے۔ ظاہر ہے کہ اگر غالبؔ اور فوجدار محمد خاں کے درمیان کوئی خط و کتابت ہوتی تو ضرور اس کا کوئی نہ کوئی حوالہ کہیں ملتا۔

یار محمد خاں سے منسوب مثنوی ''شہنشاہ نامہ'' کے خاتمہ پر ایک تحریر میں یہ ذکر ملتا ہے کہ جب نواب سکندر بیگم آگرہ کے دربار میں شرکت کے لیے گئیں (یہ دربار ۱۷، فروری ۱۸۶۳ء کو منعقد ہوا) یار محمد خاں بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بعد میں سیر کی غرض سے دہلی پہنچے اور غالبؔ سے ملاقات کی، ان کے شاگرد ہوئے اور شوکتؔ تخلص پایا (''شہنشاہ نامہ'' مطبوعہ مطبع حسنی رامپور ۱۲۹۲ھ ص ۱۰۵، ۱۰۶) اس واقعہ کے ساتھ بھی کوئی ایسی تفصیلات مندرج نہیں ہیں جو غالبؔ اور فوجدار محمد خاں کے ربط پر روشنی ڈال سکیں نہ ہی جنوری ۱۸۶۲ء میں سکندر بیگم کے ساتھ فوجدار محمد خاں کے دہلی میں قیام کے دوران غالبؔ سے ملاقات کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔

ان حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیوانِ غالبؔ کا قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کو براہ راست غالبؔ سے نہیں ملا ہے بلکہ انھوں نے غالباً کسی وسیلہ سے حاصل کیا ہے۔

فوجدار محمد خاں کے ذوقِ مطالعہ کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یا تو انھوں نے کلامِ غالبؔ کا یہ نسخہ کسی کے پاس دیکھا ہو اور اس کو خرید لیا ہو یا پھر انھوں نے اپنے کسی کارندہ کو دیوانِ غالبؔ کا کوئی بھی نسخہ حاصل کرنے کی ہدایت کی ہو اور اس نے کسی ذریعہ سے یہ نسخہ حاصل کر کے فوجدار محمد خاں کو پیش کیا ہو۔

جناب امتیاز علی عرشی نے اس قلمی دیوان کے سلسلہ میں ایک اہم تفصیل درج کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ [1]

عرشی صاحب نے حاشیے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ عبدالعلی غالباً خاندان ریاست رام پور سے تعلق رکھتے تھے اور میرٹھ کے صدر الصدور، نواب عبداللہ خاں کے بھائی تھے اور صدر الصدور سے غالبؔ کے تعلقات ہمیں معلوم ہیں۔ لیکن جن عبدالعلی کے یہ دستخط ہیں وہ بھوپال کے عبدالعلی تونگر بھی ہو سکتے ہیں۔ تونگر (ولادت ۱۲۶۲ھ، ۱۸۲۰ء) (وفات ۱۲۹۹ھ، ۱۸۸۲ء) بھوپال کے اچھے شاعروں میں سے تھے، نواب شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں ان کی مزید ترقی ہوئی لیکن کہا جاتا ہے کہ بعد میں یہ فسوں خوانی اور عملیاتِ سفلی کی جانب مائل ہوئے اور انھیں ریاست سے نکال دیا گیا۔

عبدالعلی تونگر کے والد سید عبدالواحد خاں مسکینؔ (متوفی ۱۲۷۱ھ، ۱۸۵۴ء) کا شمار بھی بھوپال کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ وفات کے بعد ان کا دیوان اور ان کی مثنوی ''چشمۂ شیریں'' شائع ہوئی۔ شیفتہؔ نے اپنے تذکرہ ''گلشن بے خار'' میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دہلی میں قیام کے دوران یہ حکیم مومن خاں مومنؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کا خود شیفتہؔ سے بھی ربط تھا۔ [2]

مسکین ۱۸۲۸ء سے قبل بھوپال آچکے تھے کیوں کہ ان کے دیوان میں بھوپال کے دیوانِ ریاست حکیم شہزاد مسیح کی والدہ کی وفات پر قطعہ تاریخ شامل ہے جس سے ۱۸۲۸ء برآمد ہوتا ہے۔

ایک قیاس یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ دیوان غالبؔ کا یہ مخطوطہ مسکین نے اپنے دہلی میں قیام کے

دوران کسی ذریعہ سے حاصل کیا ہو یا انھیں شیفتہ کی وساطت سے ملا ہو اور اپنے ساتھ بھوپال لیتے آئے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ ۱۲۴۴ھ، ۱۸۲۸ء سے پہلے کسی وقت غالب سے علیحدہ ہوا اور کیوں کہ یہ نسخہ ۱۲۳۷ھ، ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا تھا، اس میں تقریباً چھ سات سال کی اصلاحات و اضافے شامل ہیں۔ لاہور یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ دیوانِ غالب کا مخطوطہ موسوم بہ ''نسخۂ شیرانی'' اسی بھوپالی نسخہ کی اصلاح و اضافہ شدہ شکل ہے۔ اسی بنا پر عرشی صاحب کا خیال ہے کہ نسخۂ بھوپال ''نسخۂ شیرانی'' کی ترتیب کے بعد کسی وقت غالب سے جدا ہوا ہے۔ ۳

عرشی صاحب نے نسخۂ شیرانی کی تقریبی تاریخ ترتیب ۱۲۴۲ھ، ۱۸۲۶ء متعین کی ہے (ص ۱۱۵) اس لحاظ سے یہ بات کافی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مسکین نے ۱۸۲۷ء کے قریب کسی وقت یہ نسخہ حاصل کیا اور اسی زمانے میں بھوپال پہنچے۔ بھوپال پہنچنے کے بعد یہ نسخہ ان کے پاس غالباً اس وقت تک رہا جب تک ان کے صاحب زادے عبدالعلی تونگر سن شعور تک پہنچ گئے ہیں، ان میں ذوقِ شعر پیدا ہو گیا اور انھوں نے اشعار پسند کر کے ان پر دستخط کیے ہیں۔

مخطوطہ پر فوجدار محمد خاں کی دو قسم کی مہریں بتائی جاتی ہیں۔ ایک پر ۱۲۴۸ھ کندہ ہے اور دوسری پر ۱۲۶۱ھ جیسا کہ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی باقی ماندہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، ۱۲۴۸ھ کی مہر چھوٹی ہے اور ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ہے۔ بڑی مہر اس کتب خانے کی ساری کتابوں پر ثبت ہے۔ چھوٹی مہریں البتہ مختلف سنوں کی ہیں۔ ۱۲۴۸ھ کے علاوہ بعض کتابوں پر ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کی مہریں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مہریں غالباً ہر سال نہیں بنی ہیں اور ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۵۵ھ کی مہر بنائی گئی ہے۔ جہاں تک ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسی سال فوجدار محمد خاں نے مختار ریاست کا کام سنبھالا تھا اور اسی سلسلے میں یہ بڑی مہر بنوائی گئی تھی۔ اسی سال یا اس کے بعد کتب خانہ کی تنظیم کی گئی اور کتابوں کی جلد بندی وغیرہ کروا کے شروع اور آخر میں جو سادہ اوراق اضافہ کروائے گئے تھے ان پر شمسے میں ایک جانب کتاب مصنف اور کتب خانہ کا نام اور قیمت درج کی گئی اور دوسری جانب بڑی مہر لگائی گئی ہے، آخری صفحات پر شمسے میں عموماً چھوٹی مہر لگائی گئی ہے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان غالب کا یہ قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں

۱۲۴۸ھ،۱۸۳۲ءاور۱۲۵۵ھ، ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت آیا۔ اگر عبدالعلی تونگر کی عمر کو مدِ نظر رکھا جائے اور یہ قیاس کیا جائے کہ یہ نسخہ تونگر کے سن شعور پر پہنچنے کے بعد ان سے جدا ہوا ہے تو فوجدار محمد خاں کے پاس پہنچنے کی تاریخ ۱۲۵۵ھ سے زیادہ قریب پہنچ جائے گی۔

ان قیاسات کی بنیاد پر یہ نتائج نکالے جاسکتے ہیں کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے پاس براہِ راست نہیں آیا، بھوپال میں یہ مسکین کے ساتھ ۱۸۲۸ء سے قبل پہنچ چکا تھا اور ان کے پاس شاید ۱۲۵۳۔۵۴ھ/ ۳۸۔۱۸۳۷ءتک رہا اور ۱۲۵۵ھ، ۱۸۳۹ء سے پہلے فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی زینت بنا۔

حوالہ وحواشی

۱۔ دیباچہ نسخہ عرشی، ص ۷۷۔
۲۔ گلشن بے خار، مطبع نول کشور، ۱۸۷۴ء، ص ۱۷۶۔
۳۔ دیباچہ نسخہ عرشی، ص ۷۸۔

(ماہنامہ "سب رس" (غالب نمبر)۔حیدرآباد، دکن۔ ستمبر واکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ۶۹ تا ۷۴)

◆◆◆

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال...... چند انکشافات

نسخۂ بھوپال کے متعلق بعض حقائق اس پر کام کرنے والوں کے سہو ونسیان کی نذر ہو گئے۔ بعض حقائق کا اظہار قصداً نہیں کیا گیا۔ کچھ حقائق مخطوطے کی دریافت کے وقت منظر عام پر آئے لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کے حافظے سے محو ہو گئے۔ ان تمام امور کی زیادہ تر ذمہ داری نسخۂ حمیدیہ کے مرتب مفتی انوار الحق پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی تمہید میں ان کو محفوظ کرنے کا خیال نہیں رکھا۔ جب کوئی نادر چیز دریافت ہوتی ہے تو لازمی طور پر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ کیوں کر دریافت ہوئی اور اس کو کس نے دریافت کیا۔ نسخۂ حمیدیہ سے بالواسطہ قیاس ہوتا ہے کہ نسخۂ بھوپال کو ڈاکٹر بجنوری نے دریافت کیا ہوگا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مضمون ''نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری'' مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۱ء میں معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء کے حوالے سے اس زمانے میں نسخۂ بھوپال کا ڈاکٹر بجنوری کے زیر مطالعہ ہونا بیان فرمایا ہے، اسی مضمون میں انھوں نے معارف، نومبر ۱۹۱۸ء کے حوالے سے ڈاکٹر بجنوری کی تاریخ وفات بھی درج فرمائی ہے۔ یہ حوالے انھیں ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب نے بہم پہنچائے تھے۔ حال ہی میں راقم الحروف کی گزارش پر ڈاکٹر عبدالعلیم نامی صاحب نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کتب خانے سے ان پرچوں کے متعلقہ اقتباسات مرحمت فرمائے۔ انھوں نے مزید احتیاط کے طور پر معارف ستمبر ۱۹۱۸ء کے اقتباس کا فوٹو بھی ارسال فرمایا جس کے لیے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا خاص طور سے ممنون ہوں۔

معارف ستمبر ۱۹۱۸ء میں شذرات کے تحت صفحہ ۱۱۶ پر جو کچھ شائع ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال میں دیوانِ غالبؔ کے اس مخطوطے کی دریافت مولانا عبدالسلام ندوی کا کارنامہ تھی۔ نیز یہ کہ معارف نے ڈاکٹر بجنوری سے اس قلمی دیوان پر ''تقریظ'' لکھنے کی درخواست کی تھی۔ ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں اسی سلسلہ میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانۂ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا یعنی مرزا غالبؔ کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔
>
> یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعہ میں ہے۔ موصوف آج کل دیوانِ غالبؔ کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں عنقریب ان کے نتائج فکر ترقی اردو کے ذریعہ سے منظر عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے سو اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔''

معلوم نہیں بجنوری کو اس مخطوطے پر تقریظ لکھنے کا موقع ملا یا نہیں لیکن ان کی اچانک وفات کی خبر کے ساتھ معارف میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا:

> ''۷، نومبر ۱۸ء کو علی گڑھ کالج کے ایک نوجوان فرزند کا داغ مفارقت بھی ہمیں اٹھانا پڑا یعنی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بھوپال میں انتقال کیا مرحوم نہایت علم دوست شخص تھے۔ حال ہی میں جب ہم بھوپال گئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے شعرالہند کے متعلق ہمیں مفید مشورے دیے تھے۔''[1]

نسخۂ بھوپال کی گمشدگی کا چرچا اس بنا پر ہے کہ یہ مخطوطہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال

(سابقاً حمید لائبریری) میں ایک عرصے سے دستیاب نہیں ہے۔ چوں کہ یہ بات بھی صرف اس کتب خانہ کے اہل کاروں کے بیان پر منحصر تھی اور یہ سرکاری کتب خانہ ایسے حالات سے گزر چکا ہے کہ یہ ناممکن نہ تھا کہ مخطوطہ اسی کتب خانے میں دوسری کتابوں کے ساتھ خلوط ہو گیا ہو یا دوسرے خاص مخطوطات کے ساتھ کسی اور سرکاری ادارے میں منتقل ہو گیا ہو اس لیے میں نے حمیدیہ کالج بھوپال میں اپنے رفیق کار ڈاکٹر سید حامد حسین کے ساتھ اس کی تلاش کا ایک سنجیدہ منصوبہ بنایا مقصد یہ تھا کہ اگر مخطوطہ دستیاب نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو طے ہو جائے کہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال یا کچھ دوسرے سرکاری اداروں میں جہاں اس کے ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے یہ موجود نہیں ہے اور آخر میں کسی قدر یقین کے ساتھ یہ قیاس کیا جا سکے کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ چناں چہ اس مشترکہ چھان بین سے اب تک جو تفصیلات سامنے آئی ہیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال میں قلمی کتابوں کی جو فہرستیں موجود ہیں ان میں اس مخطوطے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن یہ فہرستیں بعد میں بنائی گئی ہیں اور جگہ جگہ کتابوں کے ابتدائی نمبر حک کر کے دوسرے نمبر لکھے گئے ہیں۔ اس مخطوطے پر ڈاکٹر سید عبداللطیف کے مضمون مشمولہ مجلۂ مکتبہ جلد ۲، شمارہ ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نمبر ادب اردو قلمی ۱۱/ تھا لیکن کتب خانے کی موجودہ فہرست مخطوطات، اردو میں ۱۱/ پر اب دوسری کتاب درج ہے اور دوسری کتاب پر اصل نمبر کاٹ کر ۱۱ درج کر دیا گیا ہے۔ اس کتب خانے میں اس مخطوطے کا نام و نشان اب صرف اس قدر باقی ہے کہ نواب فوجدار محمد خاں کی املاک کی ایک قلمی فہرست میں ان کے کتب خانے کی کتابوں کے ساتھ ایک جگہ ''دیوانِ اسد قلمی خوشخط'' درج ہے۔ یا پھر فارسی کی ایک قلمی کتاب ''اجزائے متفرقہ علم انشاء'' کے آخر میں جلد سے ملحق موٹے کاغذ کے ورق الف کے بالائی حصے کے وسط میں شکستہ خط میں ''دیوانِ اسد غالب'' لکھا ہوا ہے۔ غالباً کتابوں کی جلد بندی میں کسی وقت اس مخطوطے کے جلد سے ملحق موٹے کاغذ کے اوراق ''اجزائے متفرقہ علم انشا'' میں لگا دیے گئے ہیں۔ اس قسم کے موٹے اور بادامی کاغذ کے اوراق نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کے ان اکثر مخطوطات کی جلدوں سے ملحق ہیں جو مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں موجود ہیں۔ ''اجزائے متفرقہ علم انشا'' کے آخر کے ایک صفحہ پر فوجدار محمد خاں کی ۱۲۵۵ھ کی ایک چھوٹی مہر ثبت ہے، حالاں کہ روشنائی

پھیل جانے کی وجہ سے اس کا سنہ صاف طور پر نہیں اُبھرا ہے۔

مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں کتب خانۂ حمیدیہ کا قدیم ریکارڈ موجود نہیں ہے اتفاق سے یہ ریکارڈ حکومت مدھیہ پردیش کے محکمۂ آثار قدیمہ، بھوپال میں دستیاب ہوا۔ ریاست بھوپال کے ایڈورڈ میوزیم کے نوادر اور آثار قدیمہ کے ریکارڈ کے ساتھ یہ ریکارڈ اس محکمے کو دے دیا گیا تھا۔ چناں چہ یہ نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ حالت میں اس محکمے میں ایک ٹوٹے ہوئے چیڑ کے بکس میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں کتب خانہ حمیدیہ کا حسب ذیل مفید مطلوب ریکارڈ موجود ہے:

۱۔ فہرست کتب اردو قلمی (جلد پھٹ جانے کی وجہ سے اس فہرست کا عنوان موجود نہیں لیکن پہلے صفحہ سے جس پر ''ادب اردو قلمی'' درج ہے۔ (صفحات محفوظ ہیں)

۲۔ ''رجسٹر کتب مستعار اردو من ابتدائے اکتوبر ۱۷ء لغایۃ مارچ ۲۱ء مطابق ۲۵ف لغایت ۲۸ف۔''

۳۔ ''فہرست کتب السنۂ مشرقی وصول طلب بابتہ ۲۲۔۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۳۱ف۔'' (صفحہ ۱۰۱تا۱۸۶)

۴۔ فائیل جس میں مخصوص کتابوں کے اجراء کے متعلق درخواستیں اور ان کی منظوری وغیرہ کے کاغذات چسپاں ہیں۔

۵۔ ''رجسٹر کتب مستعار السنۂ مشرقی بابتہ ۳۵۔۱۳۳۴ف''

۶۔ فہرست کتب فارسی قلمی (صفحہ ۳ تا ۱۱۰)

امندرجۂ بالا میں ادب اردو قلمی کے تحت اپر نسخۂ بھوپال کے متعلق مختلف خانوں میں یہ اندراجات ملتے ہیں۔

''نمبر شمار: ۱۱۔ نام کتاب: دیوان غالبؔ۔ نام مصنف: مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ۔ نام کاتب مع سنہ کتابت: حافظ معین الدین ۱۲۳۷ھ، تعداد جلد: ۱۔ تعداد نسخ: ۱۔''

اس کے علاوہ کیفیت کے خانے میں ''نادرات'' الماری ۲۴، (سرخ روشنائی سے) اور ''مطلا و مذہب'' درج ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے ''۴، اگست ۱۸ء کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کو بطور مستعار برائے چندے دیا گیا۔ رسید رجسٹر مستعار پر موجود ہے'' نام کتاب کے خانے میں داہنی

طرف پنسل سے اور بائیں طرف روشنائی سے بالترتیب یہ اندراجات بھی ہیں۔

وصول شدہ کتاب آ گئی اور پھر ماسٹر ولی محمد کو یہ اخذ دی گئی

AQ 12/2/28

AQ 15/12/32

۲ مندرجہ بالا میں ''جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب ایجوکیشنل ایڈوائزر'' کے نام پر ۴، اگست ۱۸ء کی تاریخ میں دیوان غالب مطلا قلمی، اردو ادب ۱۱ کا اجراء درج ہے اور کیفیت کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''حسب مراسلہ ۷ (. . .) اعلان . . . یہ کتاب رکھ لی گئی۔ واپس نہیں. ...

اس سے دوسری کتاب ڈائریکٹر صاحب تیار فرما دیں گے۔''

۳ مندرجہ بالا کے صفحہ ۱۱۳، ۲ پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے نام کے آگے ''دیوانِ غالب، ادب اردو قلمی ۱۱'' اور کیفیت کے خانے میں ''۱۱ وصول شد عبدالقدوس ۹، مارچ ۲۴ء'' درج ہے۔

۴ مندرجہ بالا میں یہ درخواست ملتی ہے۔

''بخدمت مہتمم صاحبِ کتب خانہ

مکرمی تسلیم

دیوان غالب قلمی (حمیدیہ ایڈیشن جس سے لیا گیا ہے) دو ہفتہ کے لیے مطلوب ہے۔ براہ کرم اس کو مستعار دے دیجیے۔ بعد دو ہفتے کے باحتیاط تمام واپس کر دیا جائے گا۔

۳، نومبر ۲۷ء خاکسار

ولی محمد''

اس درخواست پر منظوری یوں درج کی گئی ہے۔

''دے دی جائے

B.G

3/XI/27''

۵ مندرجہ بالا میں ۲۳ پر ماسٹر ولی محمد صاحب سیکریٹری اسٹیٹ کونسل کے نام پر ۳، نومبر

۱۹۲۷ء کو اس مخطوطے کا اجرا اور ۲۱، جنوری ۱۹۲۸ء کی تاریخ میں ریاض الدین کے دستخط سے واپسی درج ہے ''نام فن اور زبان'' کے خانے میں سہواً ''ادب فارسی قلمی'' اور ''حالت کتاب'' کے خانے میں ''جلد شکستہ'' لکھا گیا ہے۔

ان تمام اندراجات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مخطوطے کو ڈاکٹر بجنوری نے حمیدیہ لائبریری سے ۴، اگست ۱۹۱۸ء کو مستعار لیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد سرکاری طور پر یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے لیے مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس رہا اور پھر ۹، مارچ ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر بجنوری ہی کے نام پر واپس کیا گیا۔ اس کے بعد ۳، نومبر ۱۹۲۷ء کو ماسٹر ولی محمد نے اس کو جیسا کہ دیگر حوالوں سے معلوم ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کو حیدرآباد بھیجنے کے لیے کتب خانے سے اخذ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد ۲۱، جنوری ۱۹۲۸ء کو کتب خانے میں واپس کر دیا۔ فہرست کتب اردو قلمی (مندرجہ بالا ۱) میں موخر الذکر دونوں کیفیتیں بالترتیب ۱۵، نومبر ۱۹۲۷ء اور ۱۲، فروری ۱۹۲۸ء کو درج کی گئیں۔

پہلے خیال تھا کہ یہ مخطوطہ حمیدیہ لائبریری میں دوسرے عام قلمی نسخوں کے ساتھ رکھا گیا ہوگا۔ اسی لیے یہ قیاس ہوتا تھا کہ کتب خانے کی ایک عمارت سے دوسری بلکہ تیسری عمارت میں منتقلی میں یہ گم یا تلف ہو گیا لیکن اس ریکارڈ کے دستیاب ہونے سے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوئی کہ یہ مخطوطہ ''نادرات'' کے ساتھ الماری ۴۷ میں رکھا ہوا تھا اور نادرات کو کتب خانے میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ فہرست اردو قلمی (مندرجہ بالا ۱) سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے دو اور مخطوطے ''کتاب نامعلوم الاسم باتصویر'' (قصص اردو قلمی ۹) اور قصیدہ در مدح نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مصنفہ مظفر علی بیگ تسکینؔ، ۱۳۸۸ھ بخط ناخونی (مناقب و مدح اردو قلمی ۱۱) بھی اسی الماری میں تھے۔ فہرست کتب فارسی قلمی (مندرجہ بالا ٦) سے پتا چلتا ہے کہ یہ مخطوطے بھی جن کے نام کے آگے ''نادرات'' لکھا ہوا ہے اسی الماری میں تھے:

> ''کریما پر پوسٹ کارڈ (اخلاق فارسی قلمی ۳۷)، گلستاں بخط معکوس (اخلاق فارسی قلمی ۴۸)، مقیمان نوشتہ بر یک کارڈ (ادب فارسی قلمی ۲۹)، دیوان حافظ قلمی مطلا تختی خورد (ادب فارسی قلمی ۲۸) رسالہ دہ نصیحت حکیم ارسطو (پند و نصائح فارسی

قلمی ۴)، وصیت نامہ شاہ بابر مکتوبہ ۹۳۷ھ (پند ونصائح فارسی قلمی ۲۲)، شاہ نامہ ابوالقاسم فردوسی، ۲ جلد (تاریخ فارسی قلمی ۵۱) وغیرہ۔"

جہاں تک مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں جائزہ لیا جاسکا ہے ان میں سے کوئی مخطوطہ اب اس کتب خانے میں نہیں ہے۔ چوں کہ اس سارے ذخیرے کے گم ہونے یا تلف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہ زبانی روایت پہلے سے موجود ہے کہ "نادرات" نواب صاحب مرحوم نے حمیدیہ لائبریری سے واپس لے لیے تھے اس لیے راقم الحروف کی ناقص رائے میں نسخۂ بھوپال کے گم یا تلف ہونے کا قیاس جس نسبت سے کمزور ہوتا ہے اسی نسبت سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ مخطوطہ یا تو نواب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے یا انھیں کے توسط سے کسی اور کے قبضے میں چلا گیا۔

حوالہ:

۱۔ معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۹۸ء، شذرات، ص ۳۲۶۔

("غالب کے چند مباحث"۔ ۱۹۷۳ء۔ ص ۸۵ تا ۹۴)

◆◆◆

عصمت جاوید

نسخۂ حمیدیہ......ایک جائزہ

نسخۂ حمیدیہ کو منظرِ عام پر آئے ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یعنی آج سے تقریباً گیارہ سال قبل اس کا مصحح ماہرِ غالبیات مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب اُردو'' کے ایک حصہ گنجینۂ معنیٰ میں شائع کر دیا ہے اور دیباچے کے علاوہ، اختلاف نسخ کے تحت ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو نسخۂ حمیدیہ میں اس کے مرتب مفتی انوار الحق کی مصروفیات یا سہل انگاری کی بدولت راہ پا گئی تھیں۔ چوں کہ مخطوطہ بھوپال، جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، ایک عرصے تک پردۂ خفا میں تھا اس لیے اس کے منظر عام پر آنے سے غالبیات میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن چوں کہ مخطوطۂ مذکورہ تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہ تھی اس لیے نسخۂ حمیدیہ میں معمولی سی معمولی غلطی کا راہ پانا گمراہ کن اور خطرناک ثابت ہوتا، اس لیے مولانا عرشی کا بطور خاص بھوپال جا کر وہاں دو روز تک قیام کرنا اور مذکورہ مخطوطے کا مطبوعہ نسخے سے موازنہ کر کے خفیف سے خفیف غلطی کی طرف اشارہ کرنا ایک ایسی ادبی خدمت ہے جسے ہم ان کے حسنات ادبی میں شمار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان غالب اردو کے دیباچے میں اس مخطوطے سے متعلق ضروری تفصیلات درج کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس نسخۂ حمیدیہ کی تفصیلات بیان کی ہیں جو ان کے پیشِ نظر تھا۔ مولانا عرشی نے اس کتاب کے دو علیحدہ نسخوں کا ذکر کیا ہے جو ایک ہی ایڈیشن کی، سرورق کی حد تک، بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا تیسرا نسخہ بھی ہے جو اسی ایڈیشن کی خفیف تبدیلی کے ساتھ، تیسری

شکل ہے۔ یہ نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ جسے میرے عزیز دوست عبدالحلیم صدیقی نے عاریۃً مرحمت فرمایا ہے۔ چوں کہ نسخۂ بھوپال کا اس نسخۂ حمیدیہ سے موازنہ بھی اس مضمون میں مقصود ہے، اس لیے اس کی کچھ تفصیلات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں سہولت کے پیش نظر اسے نسخۂ سوم کہیں گے اور عرشی نے جن دو نسخوں کا ذکر کیا ہے، انھیں بالترتیب نسخۂ اول اور نسخۂ دوم کا نام دیں گے۔

نسخۂ اوّل اور نسخۂ سوم میں صرف اس قدر فرق ہے کہ موخرالذکر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا نہ تو مقدمہ شامل ہے، نہ ان کی تصویر اور نہ مرتب کے قلم سے لکھا ہوا ڈاکٹر بجنوری کا تعارف البتہ کاتب وہی ''منتظر امروہی'' ہیں اور اس میں غالبؔ کی وہی تصویر شامل ہے جس کا ذکر نسخۂ اول کے سلسلے میں مولانا عرشی نے کیا ہے۔ یعنی اس تصویر پر خفی قلم سے، مرزا غالبؔ بھی مرقوم ہے۔ نسخۂ اول کے متعلق مولانا عرشی لکھتے ہیں، اس میں صفحہ ۳۳ سے بجنوری مرحوم کا دیباچہ شروع ہو کر صفحہ ۱۳۹ پر ختم ہوا ہے، ''نسخۂ سوم'' میں یہ دیباچہ نہیں۔ لیکن نسخۂ اول کی دوسری تفصیلات جو مولانا عرشی نے بیان کی ہیں۔ ان کا نسخۂ سوم پر پورا پورا اطلاق ہوتا ہے یعنی ''صفحہ نمبر ا'' پر سرنامہ ہے جس کے آخر میں ''محمد حمیداللہ خاں بھوپال'' درج ہے۔ صفحہ ۳ سے ۲۴ تک مفتی صاحب کی تمہید ہے پھر اصل دیوان نئے صفحہ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۴۲ پر ختم ہوا ہے، البتہ نسخۂ سوم کی مطبوعہ قیمت مختلف ہے۔ عرشی صاحب نے نسخۂ اول کی قیمت مجلد ۵ روپے اور غیر مجلد ۴ روپے لکھی ہے۔ اس کے برخلاف نسخۂ سوم پر قیمت مجلد ۴ ہے اور غیر مجلد ۸ درج ہے۔ نسخۂ اول اور نسخۂ سوم کے سرورق کے اندراجات میں تھوڑا سا اختلاف ہے جس کا اندازہ دونوں اوراق کے مندرجہ ذیل اندراجات سے کیا جا سکتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اختلاف عبارت کو ظاہر کرتے ہیں۔

نسخۂ سوم	نسخۂ اوّل (بحوالہ عرشی)
باسمہٖ تعالیٰ	باسمہٖ تعالیٰ
دیوانِ غالبؔ جدید	دیوانِ غالبؔ جدید
المعروف بہ	المعروف بہ
نسخۂ حمیدیہ	نسخۂ حمیدیہ
بہ تدوین	مع مقدمہ دیوان

احقر العباد ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم اے منشی فاضل، ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم بھوپال مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام سے چھپا، قیمت مجلد ۴ ہے، منتظر امروہی کتابت نمود قیمت ۸ ہے۔

فخر قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، بی اے، ایل ایل بی بیرسٹرایٹ لاء، ڈی جے مرتبہ خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق، ایم اے، منشی فاضل، ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست بھوپال مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادری علی خاں صوفی طبع ہوا قیمت مجلد ۵ روپے منتظر امروہی تحریر نمود غیر مجلد ۴ روپے

مولانا عرشی نے اس کے جس دوسرے نسخے کا ذکر کیا ہے (اور جسے نسخہ دوم سے موسوم کیا گیا ہے) وہ رضا لائبریری میں موجود ہے، یہ بھی نسخۂ اول، سے قدرے مختلف ہے یعنی اس میں صرف سرورق پر مطبع اور کاتب کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ نسخۂ اول میں مطبع کا نام مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، اور نسخۂ دوم میں گورنمنٹ پریس بھوپال ہے۔ اسی طرح نسخۂ اول میں کاتب کا نام منتظر امروہی اور نسخۂ دوم کے سرورق پر قیصر الدین لکھا ہے۔ اس سے مولانا عرشی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دونوں نسخے مختلف ایڈیشن نہیں بلکہ ''سرورق کم پڑ گئے تو انھیں دوبارہ بھوپال ہی میں طبع کرالیا گیا تھا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس پر یہ صراحت کردی گئی ہے کہ صرف ٹائٹل پیج بھوپال میں طبع ہوا ہے۔'' مولانا عرشی کے بیان کے مطابق نسخۂ دوم میں بجنوری مرحوم کا مقدمہ، ان کی تصویر اور تعارفی نوٹ خارج کر کے اوراق دیوان کی شیرازہ بندی ہوئی ہو۔ اس قیاس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نسخۂ سوم سے ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ خارج کرنے کے باوجود، مقدمے میں اس عبارت کو سہواً قائم رکھا گیا ہے۔ ''اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا مبسوط مقدمہ شائع ہو رہا ہے جس میں غالبؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے ......'' اور مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نسخۂ اول کی جن غلطیوں کی مولانا عرشی نے نشاندہی کی ہے وہ نسخۂ سوم میں بھی موجود ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل مقامات پر اختلافات ہے۔ اگر ہمارا قیاس صحیح ہے کہ نسخۂ سوم نسخۂ اول سے مختلف نہیں تو ہم اسے ''مرتب دیوانِ غالبؔ اردو'' کے تسامح سے تعبیر کرنے کی جرأت کریں گے۔ اگر نسخۂ سوم نسخۂ اول سے مختلف ہو تو اسے ان کے تسامح سے تعبیر

نہ کیا جائے۔ نسخۂ حمیدیہ میں مرتب نے یہ التزام کیا ہے کہ "جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہے ان کے سامنے "م" لکھ دیا ہے، تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ فلاں فلاں اشعار...... مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں، لیکن فاضل مرتب نے مندرجہ ذیل اشعار جو مروجہ دیوان میں شامل ہیں انھیں حرف م سے ممتاز نہیں کیا ہے۔

جز قیس اور کونہ ملا عرصہ تپش/کوئی نہ آیا بروے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا ہے عرض/درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ درد تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
مژگاں جو وا ہوئی/ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا
لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

ان اشعار سے متعلق جناب عرشی نے اس فروگذاشت کا ذکر نہیں کیا ہے اگر چہ انھوں نے کچھ اشعار سے متعلق اس نوع کی فروگذاشت کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل شعر کو آ گے:

کارخانہ سے جنوں کے بھی عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

م لکھ کر مطبوعہ ظاہر کیا ہے جو غلط ہے مولانا نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

علاوہ بریں نسخۂ دیوان غالبؔ اردو (جسے ہم اختصار کی خاطر نسخۂ عرشی کہیں گے) کے صفحہ ۲۲ پر یہ شعر نہیں ملتا۔ اگر چہ نسخہ سوم میں موجود ہے اور نہ کہیں اس کی توجیہہ کی ہے:

تکلف عافیت میں ہے ولا بند قبا وا کر
نفس ہا بعد وصل دوست تاوانِ گسستن ہا

نسخۂ سوم کے صفحہ ۹۶ پر اضارا کا نمک درج ہے۔ اس کے برخلاف نسخۂ عرشی میں نصارا کا نمک ہے۔ نسخۂ عرشی میں اس سہو کتابت کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ نسخہ عرشی کے صفحہ ۴۰۵ پر یہ اندراج ہے ۲۹:۱۴ا ب (مصرع ثانی) ح (نسخۂ حمیدیہ) ان کو نستر لکھا ہے''اگر چہ نسخہ سوم میں رگ نستر ہے (نسخۂ عرشی کے غلط نامے میں اس کی تصحیح نہیں ہے) اسی صفحہ پر ۳۰: ۱۵ کے محاذی لکھا ہے'' ب۔ح، اژدہام، سہود کاتب، نسخۂ سوم میں بجائے'' اژدہام'' کے'' ازدہام'' ہے (غلط نامے میں ذکر نہیں) اسی صفحے پر ۱۳۱: ۱۰ کے محاذی تحریر ہے۔'' ب۔ح اختر کنی۔'' لیکن نسخۂ عرشی کے صفحہ ۳۱ پر شعر نمبر دس میں'' اختر کنی'' ہی درج ہے۔ نسخہ سوم میں بھی اس شعر میں اختر کنی ہے۔ جب اختلافات قرأت نہیں تو کیوں حوالہ دیا گیا۔ اسی طرح نسخۂ عرشی کے صفحہ ۲۰ پر یہ شعر درج ہے:

تا کجا افسوس گرمی ہائے صحبت اے خیال
دل نہ سوز آتش داغ تمنا جل گیا

اس سے متعلق صفحہ ۴۰۲ پر یہ نوٹ دیا ہے۔ ۲۰: ۱۱ا ب۔ق۔ پہلے دل ز آتش خیزی۔ بقول مرتب ح یہ اصلاح حاشیے میں ہے۔ حالاں کہ ق میں آتش خیزی کے نیچے بغیر اس کے کاٹے ہوئے بہ سوزِ آتش لکھا ہے (نسخہ سوم میں فٹ نوٹ کی عبارت یہ ہے: حاشیے پر آتش خیزی کی بجائے سوزِ آتش (بہ سوز آتش نہیں جیسا کہ عرشی صاحب نے نسخۂ اول کے تعلق سے فرمایا ہے) بنایا ہے) اور اسی کو قا میں نقل کیا گیا ہے۔ ج میں کاتب نے سہواً بہ کو ز سے بدل دیا ہے۔'' ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر'' ز'' سہو کاتب ہے تو عرشی کے صفحہ ۲۰ پر جو شعر درج ہے (جسے ہم نے اوپر لکھا ہے) اس میں بھی بہ سوز آتش ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں ز سوز آتش چھپا ہے جو عرشی کے قول کے مطابق غلط ہے (غلط نامے میں تصحیح نہیں)

بہر حال یہ مضمون قلمبند کرنے سے پہلے ہم نے مولانا عرشی نے جن جن فروگذاشتوں کی طرف اشارے کیے ہیں (اور وہ ہمیں نسخہ سوم میں بھی ملی ہیں) ان کی روشنی میں نسخہ سوم میں تصحیح کرنی ہے۔ البتہ ضمناً ہم ایک مقام کی طرف جو ہماری ناقص رائے میں مرتب نسخۂ عرشی کا سہو ہے اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ تحقیق کا مسلمہ اصول ہے کہ اختلاف نسخ کے سلسلے میں ایک نسخہ کو بنیاد بنانے کے باوجود ترجیح اس قرأت کو دی جاتی ہے جو زیادہ صحیح ہو۔ ہم جس مقام کی طرف اشارہ

کرنے والے ہیں وہاں کم صحیح نہیں بلکہ غلط قرأت کو ترجیح دی گئی ہے۔ گنجینۂ معنی میں یہ شعر نسخۂ بھوپال سے نقل کیا گیا ہے:

عدم ہے خیر خواہِ جلوۂ زندان بے تابی
خرام ناز، برق خرمن سعی پسند آیا

اور اختلاف نسخ کے تحت یہ لکھا ہے ب قار یعنی مصرع ثانی نسخہ شیرانی پسند آیا، ہمارے خیال میں، پسند کے مقابلے میں ''سپند'' بہتر ہی نہیں بلکہ پسند غلط اور سپند صحیح ہے۔ اس غزل کی ردیف پسند آیا نہیں بلکہ صرف آیا ہے۔ اور سپند، پسند، گزند وغیرہ قوافی ہیں۔ نسخۂ شیرانی جیسا کہ خود مولانا عرشی نے بتایا ہے۔ نسخۂ بھوپال کا مبیضہ ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ نسخۂ بھوپال میں پسند سہوِ کاتب ہو جسے مبیضہ میں درست کر کے ''سپند'' لکھا گیا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ''پسند'' شعر کو مہمل بنا دیتا ہے اور سپند سے اس کے یہ معنی نکلتے ہیں: عدم زندان بیتابی کا خیر خواہ ہے۔ یعنی بیتابی کو ختم کر کے اس کے حق میں خیر خواہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مثال سپند ہے جو آگ میں پڑنے کے بعد چیخ کر بے تابی کے عالم میں اڑتا اور معدوم ہو جاتا ہے۔ شاعر سپند کے اڑنے کو خرام ناز، سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی خرامِ ناز اس کے لیے عدم کا پیام بنتا ہے یا شاعر کے الفاظ میں ''برق خرمن'' بنتا اور اسے معدوم کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی بیتابی ختم ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے عدم ''زندان بیتابی'' کے حق میں خیر خواہ، بنتا ہے۔ سعی کے لغوی معنی دوڑنے کے ہیں اور سپند کے اڑنے کی رعایت سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ پسند سے شعر کے کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔ اس سہو کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے مولانا عرشی نے نسخۂ شیرانی کو متن کی بنیاد بحالت مجبوری نہ بنا سکے کیوں کہ ''اس نسخے کا عکس گنجینے کے چھپ جانے کے بعد دستیاب ہوا۔ اس لیے متن نسخہ بھوپال کا رہا اور اختلاف نسخ میں نسخہ شیرانی کے الفاظ مندرج ہوئے۔''

بہر حال جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے غالبیات میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ ہوا ہے تمہید میں مفتی صاحب اپنے ان دوستوں کے اندیشوں کا ذکر کرتے ہیں جو اس دیوان کی اشاعت کے اس لیے خلاف تھے کہ ان کی رائے میں اس کی اشاعت سے غالبؔ کی مقبولیت کو نقصان پہنچے گا۔ وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں، ''لیکن اس احتمال سے ہم کو اتفاق

نہیں ہے کہ ان (کذا) کی وجہ سے غالبؔ کی موجودہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کمی ہو جائے گی، پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کیا کسی کے بچپن کی کج مج زبانی سے اس کی آئندہ کی فصاحت و بلاغت پر حرف آ سکتا ہے کیا کسی مصور کی ابتدائی مساعی اس کے عہد کمال کی صناعی کی قدر و قیمت کم کر سکتی ہیں!'' یہ توضیح ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ خود جناب مرتب نے غالبؔ کے اس ابتدائی کلام کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ اگر وہ اس حقیقت پر توجہ دیتے کہ غالبؔ نے اپنے متداول دیوان کا تقریباً نصف حصہ پچیس سال کی عمر میں مکمل کر لیا تھا اور اس عمر میں بلکہ اس سے قبل ہی وہ لافانی اشعار لکھے تھے جس کی تخلیق کے لیے ایک عمر کا تجربہ، بڑھاپے کا شعور، فنی بلوغت اور سلیقہ درکار ہے تو بجائے اعتذار کے وہ اس دیوان کو فخر کے ساتھ شائع کرتے۔ اگر غالبؔ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۶۹ء تک یعنی اپنی فنی مشق کے اڑتالیس سال تک ایک بھی شعر نہ کہتے تو اس صورت میں بھی زمانہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتا۔ اگر جواں مرگ کیٹس کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ جواں سالی ہی میں وہ شیکسپیئر اور ملٹن کی بلندیوں کو چھوتا تھا تو پھر غالبؔ کیوں اس خراج عقیدت سے محروم رہیں۔ اگر نسخۂ بھوپال میں یہ تحریر کاتب کہ ''بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت'' مرقوم نہ ہوتی تو وہ کون کافر ہے جو آنکھ بند کر کے اس بات پر ایمان لے آتا کہ غالبؔ نے یہ اشعار اوائل عمری میں کہے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزر گاہِ خیال مئے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا
سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
حریف جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا
غافل جو ہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا
ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے
گردش مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا (پوری غزل)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

تو دوست کسو کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا (پوری غزل)

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ
حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
(دوشعر چھوڑ کر پوری غزل مروجہ دیوان میں ہے)

بلا سے، میں جو یہ ؏ پیش نظر درودیوار (مطلع میں خفیف تغیر کے ساتھ پوری غزل صرف ایک شعر چھوڑ کر)

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک (ایک شعر چھوڑ کر پوری غزل)

گر تجھ کو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ کیوں (مقطع میں خفیف تغیر ہے اور یہ اشعار بڑھائے گئے ہیں)

(۱) غیر سے رات ......الخ

(۲) مجھ سے کہا جو یار نے ..... الخ

(۳) کب مجھے کوئے یار میں ......الخ

(۴) گر ترے دل میں ہو خیال ......الخ

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مئے پرستی ایک دن (صرف ایک شعر غرہ اوج بنائے .... میں حقیقت تغیر کے بعد)

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے[۱] محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے وا شد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں (دو شعر کو چھوڑ کر جو قلم زد کیے گئے پوری غزل)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

(صرف مصرع اولیٰ بدلا ہے)

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق
یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے
دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
درد سے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے (پورا مرثیہ۔ صرف مقطع بدل دیا گیا ہے)
سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے (ایک شعر چھوڑ کر پوری غزل)
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
(مقطع چھوڑ کر پوری غزل)
رفتار عمر قطع رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
آکہ میری جان کو قرار نہیں ہے
(پوری غزل)
تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی (پوری غزل)

رہا آبادِ عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
آغوش گل کشو وہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو یاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے
غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں
کس[۸] قدر خانہ، آئینہ ہے ویراں مجھ سے
ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
(پوری غزل)
ابھی[۹] آتی ہے بو بالش سے اس کے زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عار بستر ہے
(مصرع اولیٰ بعد کا ہے)
نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مئے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے
۱۰ ہم نشیں مت کہہ کہ ہم کو نہ بزم عیش دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے
حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے
جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
(چار اشعار خارج کر کے پوری غزل)

بیضہ[۱۱] آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے
کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے
اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے
غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط [۱۲]
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظا رہے
سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
شبنم بہ گل لالہ نہ خالی زادا ہے
داغ دل بے درد نظر گاہِ حیا ہے
دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار [۱۳]
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے
مجبوری دعوئ گرفتاریٔ الفت
دست تہہ سنگ آمدہ[۱۴] پیمان وفا ہے
(خفیف تغیر کے ساتھ)
اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سایے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو یہ جان خدا ہے

ہم نے بہ خوف طوالت یہ فہرست بہت مختصر کی ہے ورنہ غالبؔ کا تقریباً آدھا دیوان یہاں لکھنا پڑتا۔ مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالبؔ ابتدا میں مہمل نہیں کہتے تھے اور نہ ان کے اسلوب میں دوستوں کے مشوروں سے اچانک یہ تبدیلی پیدا ہوئی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ وہ مرزا خانی ہوں، صدرالدین آزردہ جیسا جید عالم یا فضل حق خیر آبادی جیسا فاضل اجل ہو کوئی بھی اس عظیم شاعر کی تخیل کی بلندیوں اور فکری گہرائیوں کا احاطہ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس دور کے کلام کا ایک بڑا حصہ ژولیدہ بیانی پر مشتمل ہے۔ جسے غالبؔ نے اپنی فنی پختگی کے زمانے میں بجا طور پر رد کردیا تھا لیکن اس ابتدائی دور میں بھی ہمیں ان کے کلام میں خیرگی Flashes ملتے ہیں ان میں نہ صرف خیال کی بلوغت کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اسلوب بھی کافی منجھا ہوا اور شستہ نظر آتا ہے۔ اکثر و بیشتر اشعار کی زبان بول چال کے قریب ہے جس سے یہ عام غلط فہمی دور ہوجانی چاہیے کہ غالبؔ ابتدا میں زبان پر مطلق توجہ نہیں دیتے تھے۔ اس زمانے کے منتخبہ اشعار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ادبی نوعمری کے زمانے میں بھی شاعر کی عبقریت فکر و فن کی بلندیوں کو چھونے اور زبان و بیان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی جدوجہد میں لگاتار مصروف تھی۔ اس حقیقت سے کوئی غالبؔ شکن بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اس دور کے کلام کا معتدبہ حصہ منجھا ہوا شستہ، اور قابل فہم ہونے کے علاوہ شاعر کی دقت نظر، فلسفیانہ تعمق، فنی پختگی، قادر الکلامی اور حکیمانہ بصیرت کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے جو دوسری حیرت انگیز بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ نے انتخاب کرتے وقت ایسے متعدد اشعار پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو منتخبہ نسخے میں جگہ پانے کا پورا پورا حق رکھتے تھے۔ حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ یہ اشعار اکثر منتخبہ اشعار کے مقابلے میں نہ تو انتہائی دقیق اور پیچیدہ کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ انھیں کسی معیار سے ادنیٰ درجہ کا کہا جاسکتا ہے۔ کچھ نقادوں کا یہ خیال ہے کہ ۱۸۳۲ء میں جب دوسری بار انھوں نے اپنے دیوان کے لیے غزلیں منتخب کیں اس وقت ان کے سامنے ان کا پورا کلام موجود نہیں تھا اور بظاہر اس قیاس کو تقویت غالبؔ

کے اس قول سے پہنچتی ہے کہ ''میرا کلام'' کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔'' بقول مالک رام ''مرزا نے کبھی اپنا کلام اپنے پاس نہیں رکھا۔ نہ کوئی بیاض ہی اس مقصد کے لیے بنائی'' لیکن مولانا عرشی کو غالبؔ کے قول مذکور کی صداقت پر بجا طور پر شبہ ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں خود انھوں نے اپنا کلام جمع کیا تھا اور انھیں کے مسودات سے دیوانِ ریختہ مرتب ہوا اور انھیں سے ''گلِ رعنا'' کی ترتیب عمل میں آئی۔'' ۱۵

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

> ''نسخہ رامپور قدیم (جو بقول عرشی، متداول دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے) مرتب کرتے وقت ان کے سامنے گلِ رعنا کا نسخہ نہ تھا''

مولانا عرشی یہ بات وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ انتخاب کے وقت غالبؔ کے پیش نظر نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی دونوں تھے۔ ہمیں نسخۂ بھوپال کے پیشِ نظر کے متعلق شبہ ہے۔ مولانا عرشی نے نسخۂ رامپور قدیم کی تاریخ تدوی ۱۸۳۲ء تعین کی ہے اور نسخہ بھوپال میاں فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) سے لے کر ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) تک تھا کیوں کہ اس نسخے پر جو مہریں فوجدار محمد خاں کی ثبت ہیں، ان میں یہ دونوں تاریخیں مرقوم ہیں۔ یہ گمان ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے یہ نسخہ اسی سال یعنی ۱۸۳۲ء میں غالبؔ کے پاس رہا ہو لیکن اس قیاس کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی کیوں کہ اس بات کی داخلی شہادت موجود ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۳۲ء سے قبل ہی عبدالعلی خاں بہادر اور عبدالصمد مظہر وغیرہ کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا میاں فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں ۱۸۳۲ء میں پہنچا تھا اور مولانا عرشی کے قول کے مطابق عبدالعلی خاں بہادر کا تعلق ریاست رامپور سے تھا جو نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور کے جن کے غالبؔ سے مراسم تھے، بھائی تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ نسخہ انھیں کے لیے تیار کیا گیا ہو اور ۱۸۳۲ء سے قبل یا ۱۸۲۱ء کے بعد ہی سے غالبؔ کے پاس نہ رہا ہو اور صرف چند مرتبہ نظر ثانی کے لیے ان کے پاس پہنچا ہو البتہ نسخہ شیرانی کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ نسخہ غالبؔ کے پاس رہتا تھا یا نہیں یا یہ کہ یہ کس کے لیے تیار کیا

گیا تھا۔ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ سفر کلکتہ کے دوران یہ نسخہ ان کے پاس نہیں تھا اور باندھ سے انھوں نے دو غزلیں روانہ کی تھیں جو اس نسخے میں ''از باندہ فرستادند'' اور از باندہ رسید کے اندراجات کے ساتھ شامل ہیں، انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران جب گل رعنا کے لیے اردو غزلوں کا انتخاب کیا تو اس میں اردو اشعار کی تعداد ۴۲۵ تھی۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالبؔ نے محض اپنے حافظے کی مدد سے یہ اشعار لکھے تھے یا ان کے پاس کلکتے میں کوئی بیاض تھی۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں شاعر کو اپنے ہی کلام کے بڑے حصے کا یاد ہونا کوئی مافوق الفطرت بات نہیں ہے۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ نسخہ شیرانی ان کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہا کیوں کہ اس میں بقول عرشی غالبؔ کے قلم کی اصلاحیں بھی ملتی ہیں۔ بہر حال غالبؔ ۱۸۲۹ء تک کلکتہ میں رہے۔ وہاں سے آنے کے بعد اُنھوں نے بقول عرشی ۱۸۳۲ء میں اپنے دیوان کا انتخاب کیا اور چند غزلوں کے اضافے کے ساتھ اشاعت کے لیے ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار دہلی کو دے دیا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ ۱۸۲۹ء سے ۱۸۳۲ء تک نسخہ شیرانی کس کے پاس تھا۔ اگر گل رعنا جس کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے حصہ اردو کا انتخاب حافظے کی مدد سے کیا گیا تھا، اپنے طور پر مکمل ہوتا تو غالبؔ کو دوسری بار اپنا دیوان منتخب کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ اس انتخاب کے وقت ان کے پاس یقیناً کوئی نہ کوئی نسخہ رہا ہوگا اور جب تک کہ کوئی اور نسخہ دریافت نہ ہو یہ قیاس کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے سامنے نسخۂ شیرانی (جو بہر حال نسخہ بھوپال کا مبیضہ تھا) رہا ہوگا۔ لیکن یہ معمہ پھر بھی حل طلب رہتا ہے کہ غالبؔ نے کیوں اکثر غزلوں کے کچھ اشعار ہی نہیں بلکہ متعدد غزلیں پوری کی پوری حذف کردی ہیں، یہ غزلیں دس پندرہ نہیں بلکہ جملہ (۱۴۵) مکمل غزلیں ہیں، جن کے مجموعی اشعار کی تعداد (۹۷۲) ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح ان اشعار میں سے جو نسخہ حمیدیہ کے جملہ اشعار (۱۹۸۰) کا تقریباً نصف ہیں، ایک شعر بھی غالبؔ کی نظر انتخاب پر نہ چڑھ سکا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان میں ایسے کئی بے پناہ اشعار بھی شامل ہیں جن کے متعلق یہ گمان کرنا مشکل ہے کہ غالبؔ نے انھیں عمداً نظر انداز کر دیا۔ یہ تو وہ غزلیں ہوئیں جن میں سے ایک شعر بھی نہیں چنا گیا۔ دوسری غزلوں میں سے جن سے غالبؔ نے اپنے دیوان کے لیے اشعار منتخب کیے (کہیں تو مکمل غزلیں لے لیں، کہیں صرف ایک شعر حذف کیا،

کہیں صرف ایک شعر چنا) جو اشعار نظری کیے ہیں ان کی تعداد ۵۳۷ ہے۔اس طرح غالبؔ نے نسخہ حمیدیہ کے جملہ اشعار (جو میری گنتی کے مطابق) ۱۹۸۰ء ہیں، ان میں سے ۱۵۰۹ اشعار قلم زد کر دیے اور صرف ۴۷۱ اشعار اپنے دیوان کے لیے منتخب کیے ہیں جو مسترد اشعار کے ایک تہائی سے کچھ کم ہی ہیں۔

ان اعداد وشمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انتخاب کے وقت ان کے پیش نظر کوئی نسخہ ضرور رہا ہوگا۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے بلکہ قرائن بتاتے ہیں کہ وہ نسخہ، نسخۂ شیرانی ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان کے سامنے وہ ایک سو پینتالیس غزلیں بھی یقیناً رہی ہوں گی جن میں سے ایک شعر بھی منتخب نہیں کیا گیا۔ یہ بات انتہائی تعجب انگیز اس لیے ہے کہ ان غزلوں میں مندرجہ ذیل اشعار بھی موجود ہیں:

یک گام بے خودی سے لوٹیں بہار صحرا
آغوش نقش پا میں کیجیے فشار صحرا

ہے تنگ و وامانده شدن حوصلہ پا
جو اشک گرا خاک میں ہے آبلہ پا

حیرت انداز رہبر ہے عناں گیر اے اسد
نقش پائے خضر یاں سد سکندر ہوگیا

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آسان کن یک قلق تغافل تا چند

یہ کام دل کریں کس طرح[۱۶] گم رہاں فریاد
ہوئی ہے لغزش پا لکنت زباں، فریاد

جواب سنگدلی پائے دشمناں ہمت
زدست شیشۂ دلہائے دوستاں فریاد

چاک گریباں کو ہے ربط تامل ہنوز
غنچہ میں دل تنگ ہے حوصلہ گل نیوز

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دست سوال
از آنجا کہ حسرت کش یار ہیں ہم
رقیب تمنائے دیدار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرین گنہ گار ہیں ہم
اسد شکو کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم
گل غنچگی میں غرقہ دریائے رنگ ہے
اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں
دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
کس دل پہ ہے عزم صف مژگان خود آرا
آئینہ کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں
ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصل تگ و تاز جستجو
مانند موج آب زبان بریدہ ہوں
اسد بزم تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویر عریاں ہیں
فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگ جادہ سر کوئے یار رکھتے ہیں
طلسم مستی دل آنسوئے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

بے دماغی حیلہ جوئے ترک تنہائی نہیں
ورنہ کیا موج نفس زنجیر رسوائی نہیں
زلف خیال نازک و اظہار بے قرار
یارب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو
کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ
شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ
نے سرو برگ آرزوئے رہ و رسم گفتگو
ہائے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ
اسد بند قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے
اسد جمعیت دل درکنار بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی سامان یک خواب پریشاں ہے
ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستم گر، نا خدا ترس، آشنا کش ماجرا کیا ہے
کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
پر افشاں ہوگئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے
رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر، اسد
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے
ہم نشینیٔ رقیباں گرچہ ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوار تر ہے بدنامی تری

غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہوگئی
خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
بادشاہی[18] کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے
صبح[19] سے معلوم آثار ظہور شام ہے
غافلاں آغاز کار آئینہ انجام ہے
بہ این ضبط ہے آئینہ بندی گوہر
وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشم پرنم ہے
اگر نہ ہوے رگِ خواب صرفِ شیرازہ
تمام دفتر و ربط مزاج برہم ہے
اسدؔ پہ نازکی طبع آرزو، انصاف
کہ ایک وہم ضعیف و غم دوعالم ہے
کشود غنچہ دلہا عجب نہ رکھ غافل
صبا خرامی خوباں بہار ساماں ہے
تاچند ناز مسجد[20] و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کرلیں کہ وہ تمام غزلیں جن میں مذکورہ بالا اشعار شامل ہیں غالبؔ کے پیش نظر نہیں تھیں تو مندرجہ ذیل اشعار کے متعلق کیا کہا جائے گا جو ایسی غزلوں میں شامل ہیں جن سے غالبؔ نے اشعار منتخب کیے ہیں اور ہمارے خیال میں یہ قلم زدہ اشعار انتخاب کا پورا حق رکھتے تھے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا
تب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا
صبح موجہ گل کو نقشِ بوریا پایا
اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بیتابی
نثار گردش پیمانہ ہے روزگار اپنا
اسدؔ یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون تو اَم ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا
ملی نہ وسعتِ جولان یک جنوں ہم کو
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا
نگاہِ چشم حاسد دام لے، اے ذوق خود بینی
تماشائی ہوں وحدت خانہ آئینہ و دل کا
سراپا یک آئینہ دار شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا
بصورت تکلف، بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا
خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
بے دماغی شکوہ سنجِ رشک ہم دیگر نہیں
یار تیرا جام مے خمیازہ میرا آشنا
ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے
یاں عرصۂ تپیدن بسمل نہیں رہا

اے آہ، میری خاطر وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدہ مشکل نہیں رہا

خمار منت ساقی، اگر یہی ہے اسدؔ
دل گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

زیب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھو
نگاہ عکس فروش و خیال، آئینہ ساز

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے[1] آبگینہ گداز

بیش از نفس بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محملِ نگاہ بدوش شرار حیف

اے آرزو شہید وفا، خوں بہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوے قاتل دعا نہ مانگ

مژگاں تلک رسائی لخت جگر کہاں
اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

اسدؔ فریفتۂ انتخاب طرز جفا
وگرنہ دلبریٔ وعدۂ وفا معلوم

تمیز زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بعکس آئینہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوئ چمن نسبی ہے

بے چشمِ دل نہ کہہ دوں لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں خوش خراب سے جام لبریز خالی ہے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

چند قلم زدہ اشعار کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ نے یہ اشعار اس لیے خارج کر دیے کہ انھوں نے انھی مضامین پر لکھے ہوئے بہتر اشعار منتخبہ دیوان میں شامل کیے ہیں یا بعد میں اضافہ کیے ہیں یا پھر انھیں فارسی میں منتقل کر کے فارسی دیوان میں محفوظ کر دیا ہے مثلاً یہ قلم زدہ اشعار:

یار نے تشنگئ شوق کے مضموں چاہے
ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

حسن خود آراء کو ہے مشقِ تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاط میں آئینہ گل ہنوز
فریب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فراش و خیال آئینہ ساز
ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا
حیرت[۲۲] اندازِ رہبر ہے عناں گیر اے اسدؔ
نقش پائے خضر یاں سد سکندر ہوگیا
تنگی رفیق رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالع چشم حسود تھا
نگہ معمار حسرت ہا چہ آبادی چہ ویرانی
کہ مژگاں جس طرف وا ہو کف دامانِ صحرا ہے
اسرار باب فطرت قدر داں لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسین کا
ہم مشق فکر و وصل و غم ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غم روزگار کے
آتش افروزی یک شعلۂ ایما تجھ سے
آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

مذکورہ بالا اشعار میں جو مضامین ادا ہوئے ہیں وہ علی الترتیب متداول دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار میں باندھے گئے ہیں:

نہ بند سے تشنگی شوق کے مضمون غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے
پر تو خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
کیا کیا خضر نے سکندر سے
کس کو اب[۲۳] رہنما کرے کوئی
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا
جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشق نے ہم کو نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

خلوت شبہا، تسبیح کوکب ہا، عالی غزل کو نظری کردیا اور اسے فارسی میں کہہ کر فارسی دیوان میں محفوظ کرلیا۔ مندرجہ ذیل اشعار کو بھی قلم زد کر کے فارسی میں منتقل کردیا:

عالم[۲۴] طلسم ہند خموشاں ہے سر بسر
یا(ں)[۲۵] میں غریب کشورِ گفت و شنود تھا

(بیادرید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد)
تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد
(نگہم نقب بھی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم)

مندرجہ ذیل اشعار غالباً صرف اس لیے شہید کیے گئے کہ غالبؔ یا ان کے دوستوں نے خط کشیدہ الفاظ میں صوتی تنافر دیکھا اور اس اصطلاحی نقص پر خصوصاً اول الذکر شعر کو جس پر اردو ادب کو ناز ہو سکتا ہے، قربان کر دیا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردش گردونِ دوں رہ بھی

نسخۂ حمیدیہ کے مطالعے سے یہ اہم بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ غالبؔ نے صرف انتخاب کے خیال سے اپنے اشعار میں اصلاحیں نہیں کیں بلکہ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب انھیں دیوان منتخب کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس نسخہ میں ایسے اشعار بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں جو اصلاح کے عمل سے گزرنے کے باوجود انتخاب میں جگہ نہ پا سکے۔ اس کے علاوہ چوں کہ انھوں نے بعض زمینوں میں دو غزلیں کہی تھیں اس لیے انتخاب کے وقت ہر غزل سے کچھ اشعار چن کر انھیں صرف ایک غزل میں ترتیب دیا۔ مثلاً طوفاں نکلا، عریاں نکلا، والی زمین میں انھوں نے دو غزلیں کہی تھیں۔ پہلی غزل کا مطلع تھا:

کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

اور دوسری غزل کا مطلع تھا:

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

دونوں غزلوں کے ملا کر کل چودہ اشعار تھے جن میں سے صرف چھ اشعار انتخاب کیے گئے اور وہ اس طرح کہ اس میں پہلی غزل کے تین شعر ہیں اور دوسری غزل کے تین ہم متداول دیوان کی اس مشہور غزل کو نیچے درج کر کے ہر شعر کے محاذی یہ لکھ دیتے ہیں کہ کون سا شعر کس غزل کا ہے:

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
(دوسری غزل)

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پُرافشاں نکلا
(پہلی غزل)

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
(پہلی غزل)

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا
(دوسری غزل)

تھی نو آموز فنا ہمت[۲۶] دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
(دوسری غزل)

(تیسرے شعر کا مصرع اولیٰ پہلے یوں تھا ''عشرت ایجاد چہ بودی وگل وکو دود چراغ'' لیکن نسخہ بھوپال میں اس پر ''لا'' لکھا ہے اور اس کی جگہ مذکورۂ بالا مصرع درج کیا ہے):

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا
(پہلی غزل)

یہی عمل انھوں نے دوسری غزلوں میں بھی کیا ہے۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے:

پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدن صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

اس زمین میں دو غزلیں ہیں، پہلی غزل میں سات اور دوسری میں چھ یعنی کل تیرہ اشعار تھے جن میں سے صرف چھ شعر منتخب کیے گئے۔ پہلی غزل سے چار شعر چنے گئے اور دوسری سے صرف دو اور دونوں قطعے قلم زد کر کے دو نئے اشعار یعنی وہی اک بات ہے...... الخ اور نہ دے نامے کو اتنا طول...... الخ کا اضافہ کیا گیا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

نسخۂ حمیدیہ اور متداول دیوان کی غزلوں کے تقابلی مطالعے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ نے کچھ غزلیں بغیر تحریف کے من وعن منتخبہ دیوان کے لیے قبول کی ہیں اور بعض کی ترتیب بھی وہی رکھی ہے، کچھ غزلوں کے صرف مقطعے بدل دیے، کچھ غزلوں میں سے صرف ایک ایک شعر حذف کیا اور کچھ غزلوں میں سے صرف ایک شعر یا دو شعر منتخب کیے۔

غالبؔ کے قلم نے اکثر و بیشتر عمدہ اشعار کیوں شہید کیے اس کا جواب ٹھوس ثبوت نہ ملنے کی صورت میں صرف قیاس آرائیوں سے دیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے اپنے اشعار میں جو جو تبدیلیاں کی ہیں، اس کا دستاویزی ثبوت ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر ہم غالبؔ کے عمل اصلاح و ترمیم کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بوقت اصلاح ان کے سامنے کئی باتیں رہی ہوں گی جن میں سے کچھ غالباً یہ ہیں۔

غالبؔ اپنے زمانۂ نومشقی میں فارسی سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان ابتدائی شعری تخلیقات میں فارسی تراکیب کا غلبہ تھا یہ پیوندکاریاں نہ صرف یہ کہ اردو کے مزاج کے خلاف تھیں بلکہ شعر فہمی میں بھی مخل ہوتی تھیں، جیسے جیسے غالبؔ کا فنی شعور پختہ ہوتا گیا اور وہ اظہار بیان پر قدرت حاصل کرنے کی جدوجہد بغیر کسی استاد کی مدد کے کرتے گئے خود انھیں اپنے انداز بیان کی

اجنبیت کا احساس ہوتا گیا۔ مثلاً مندرجہ ذیل مصرعوں میں ان کی اصلاح کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو میں فارسی علامت جمع ''ہا'' کو محاورۂ اردو کے لیے اجنبی سمجھنے لگے تھے مثلاً یہ مصرع ابتدا میں یوں تھا:

(۱) اسدؔ خاک در میخانہ ہا بر فرق پاشیدن

(۲) لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر

(۳) سرشک سر بہ صحرا دادہ نور العین داماں ہا

(۴) بہ طوفاں گاہ جوش اضطراب وحشت شبہا

(۵) ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کش انجام گل

(۶) شوخی اظہار دندانہا برائے خندہ ہے

غالبؔ نے علی الترتیب ان مصرعوں کو اس طرح بدلا ہے:

(۱) اسدؔ خاک در میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں

(۲) لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

(۳) سرشک سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے

(۴) بہ طوفاں گاہ جوش اضطراب وشام تنہائی

(۵) ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل

(۶) عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے، وغیرہم۔

غالبؔ نے مذکورہ بالا مصرعوں میں توائی اضافات کو قائم رکھا ہے لیکن فارسی علامت جمع کو خارج کر دیا بعض مصرعوں میں فارسی حرف استفہام آ گیا تھا۔ مثلاً عشرت ایجاد چہ بوی وگل وکو دود چراغ، اسے بذریعہ اصلاح دور کر دیا بعض اشعار میں حرف جر کو علامت اضافت سے بدل دیا مثلاً ''نگیں میں جوں شرر در سنگ ناپیدا ہے نام اس کا'' اس مصرع میں شرر و سنگ بنا دیا۔ کسی مصرع میں ''گویا'' کو ''تو کہے'' سے بدل دیا۔ بعض اشعار میں اردو روزمرہ اور محاورے کی پابندی کے خیال سے ترمیم کی مثلاً اردو میں ''نمک باندھنا'' کوئی نہیں کہتا۔ اس کی جگہ ''نمک چھڑکنا'' بولتے ہیں۔

اس لیے غالبؔ نے ان مصرعوں:

(۱) زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک

(۲) شور پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا

غالبؔ نے ان مصرعوں کو بالترتیب اس طرح بدل دیا ہے:

(۱) زخم پر چھڑکیں کہاں طوفان بے پروا نمک

(۲) شور پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا

اگر چہ غالبؔ نے حرف نفی ''مت'' کو بالکل متروک تو قرار نہیں دیا مثلاً: ان مصرعوں میں پوچھ مت رسوائی...... الخ، ہستی کے مت فریب میں...... الخ، ہاں کھائیو مت...... وغیرہ۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''مت'' کے مقابلے میں ''نہ'' کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ مصرعے پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں پہلے مت استعمال ہوا تھا لیکن بعد میں اسے شعوری طور پر نکال کر اس کی جگہ ''نہ'' رکھ دیا گیا، مثلاً

(۱) غمِ فراق میں تکلیف سیر گل مت دو

(۲) پوچھ مت بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں

(۳) بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت مت پوچھ

غالبؔ نے ان مصرعوں کو علی الترتیب اس طرح بدل ڈالا:

(۱) غمِ فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو

(۲) کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں

(۳) بے کسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے

کہیں لفظ ''جوں'' کو نکال دیا مثلاً:

(۱) وہ تپ عشق تمنا ہے کہ جوں رشتۂ شمع

اس مصرع کو اس طرح بدل دیا گیا:

(۱) وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع

کہیں مصرعوں کی بندش چست نہیں تھی مثلاً اس شعر کو:

اسدؔ اے بے تحمل، عربدہ بے جا ہے ناصح سے
کہ آخر بے کسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

اس طرح بدل دیا:

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

پہلے مصرع یوں تھا: مر گیا صدمۂ آواز سے قُم کی غالبؔ
اسے یوں کر دیا گیا: مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
پہلے مصرع یوں تھا: شعر اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
اسے یوں کر دیا گیا: گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
پہلے مصرع یوں تھا: اُف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
اسے یوں کر دیا گیا: دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
پہلے مصرع یوں تھا: ہوئی تقریب منع شوق دیدن خانہ ویرانی
اسے یوں کر دیا گیا: ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی

کہیں ایک لفظ یا ترکیب کے بدلنے سے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مندرجہ ذیل اشعار میں جہاں دو الفاظ ایک دوسرے کے نیچے لکھے گئے ہیں۔ اوپر کا لفظ ابتدا کا ہے اور نیچے کا لفظ بعد کی تبدیلی ہے:

بلا سے ہیں جو بہ / یہ پیش نظر درودیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر درو دیوار
اے عافیت کنارہ کرائے انتظار چل
سیلاب گریہ دشمن / درپے دیوار و در ہے آج
جلوہ / عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوشش فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں
آرزو/کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
دل خوں شدۂ کشمکش کثرت اظہار/حسرت دیدار
آئینہ بدست بتِ بدست حنا ہے
نہیں گر سرد برگ سودائے / ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت
حجاب/ ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا
جنوں/ وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار
بقدر حسرت دل چاہیے عیش/ ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو
لیکن خفیف سی تبدیلی سے شعر کو آسمان پر پہنچا دیا:
اب میں ہوں اور خون دو عالم معاملہ /
ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
لیکن مطلع کو سادہ شعر میں بدل دیا:
نہیں بند زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر/
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے بھی یاں خانہ آرائی
سفیدی دید کا یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
عیادت بسکہ تجھ سے گرمیٔ بازار بستر ہے/
خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے تو
فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے

کہیں پورا مصرع بدل کر مفہوم میں تبدیلی کی بلکہ ایک نئے تجربے کا اظہار کیا:

اسدؔ جوش بہار دیدۂ بیدار کے صدقے/
ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

ان اصلاحات سے صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ نہ صرف شعر کہتے وقت یا اس کے فوراً بعد بلکہ تخلیقی عمل کے ایک طویل عرصے بعد تک حک واصلاح سے کام لیتے تھے اور ان کا خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والا تحت الشعور اپنے ہی اشعار کے بارے میں صحیح ومناسب لفظ، بہتر لب ولہجہ، بہتر خیال اور بہتر انداز بیان کی تلاش میں شبانہ روز بیدار رہا کرتا تھا اور نہ حک واصلاح کے یہ تحریری ثبوت ہمیں نہ ملتے۔ مختصر یہ کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' غالبیات میں ایک نئے بُعد کا اضافہ ہے جو غالبؔ کے ارتقائی سفر کے نشیب وفراز کی اس تیقن کے ساتھ نشاندہی کرتا ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں اور اس کی اشاعت سے غالبؔ کی قدآور شخصیت اور زیادہ قدآور ثابت ہوتی ہے۔

حواشی وحوالہ

۱۔ آدہ۔ نسخۂ عرشی۔
۲۔ ابتدا میں بجائے مرہون کے پابند تھا۔
۳۔ بعد میں ''کسی''۔
۴۔ ابتدا میں ''بہ''۔
۵۔ ابتدا میں مرے گنہ کا حساب کی جگہ حساب بے گنہی۔
۶۔ تماشا کہ نسخۂ اس قرأت کی توجہ نہیں کی گئی۔ غالباً سہو کتابت۔ غلط نامہ میں ذکر نہیں۔
۷۔ ابتدا میں ''غم'' کی جگہ لفظ ''دل'' تھا۔
۸۔ پہلے مصرع یوں تھا ''آرزو خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے''۔
۹۔ پہلے مصرع یوں تھا ''اسد جوشِ بہار دیدۂ بیدار کے صدقے''۔

۱۰۔ پہلے یار تھا۔
۱۱۔ نسخہ عرشی بال و پر پہ ہے، تعجب ہے کہ عرشی نے یہ قرأت کیوں پسند کی۔
۱۲۔ پہلے مصرع اولیٰ بجائے نشاط کے لفظ ''وفا'' تھا۔
۱۳۔ پہلے مصرع اولیٰ میں بجائے حسرت دیدار کے کثرت اظہار تھا۔
۱۴۔ پہلے مصرع ثانی میں بجائے پیان کے احرام تھا۔
۱۵۔ دیوان غالب اُردو، ص ۱۸، بارِ اول۔
۱۶۔ قافیے میں ارطیا ہے۔
۱۷۔ نسخہ بھوپال کے حاشیے پر بقول عرشی۔
۱۸۔ شاید سیاسی حالات نے یہ شعر حذف کرنے پر مجبور کیا ہو۔
۱۹۔ شاید اس لیے نظری کر دیا کہ مصرع اولیٰ میں ردیف ''ہے'' غلط ہے ''ہیں'' ہونا چاہیے تھا
۲۰۔ ایطائے جلی ہے۔
۲۱۔ صہبائے کی بجائے ''صہبا ہے'' ہوتا تو نقص دور ہو جاتا۔
۲۲۔ حیرت ہے کہ یہ شعر نسخہ شیرانی میں نقل نہیں کیا گیا۔
۲۳۔ اب کسے۔
۲۴۔ یہ شعر مرتب نسخہ حمیدیہ نے نسخہ بھوپال سے سہواً نقل نہیں کیا تھا۔ اس کی نشاندہی دیباچے میں مولانا عرشی نے کی ہے پھر بھی تعجب ہے کہ انھوں نے یہ شعر ''گنجینۂ معنی'' کے متن میں شامل کیوں نہیں کیا اور اس طرح حقیقت سے واقف ہو کر بھی اسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے جو مرتب نسخۂ حمیدیہ سے سرزد ہوئی تھی۔
۲۵۔ مولانا عرشی نے مصرع ثانی میں یا نقل کیا ہے۔ قوسین میرا اضافہ ہے۔
۲۶۔ پہلے ہمت دشواری شوق تھا۔

(ماہنامہ ''سب رس'' (غالب نمبر)۔ حیدرآباد، دکن۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ۲-۱۷ تا ۱۹۲)

◆◆◆

ڈاکٹر گیان چند

''نسخۂ بھوپال'' کی اصلاحیں اور اضافے

اس مضمون میں ''نسخۂ بھوپال'' سے مراد ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اصل ۱۲۳۷ھ کا ''نسخۂ بھوپال'' ہے، غالب کا خودنوشت مخطوطۂ بھوپال نہیں۔ عرشی صاحب کی تقلید میں ''نسخۂ بھوپال'' کے لیے مخفف ''ق'' اور ''نسخۂ شیرانی'' کے لیے مخفف ''قا'' استعمال کیا جائے گا۔

راقم الحروف نے اپنے مضمون ''نسخۂ عرشی، طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات'' ۱ میں خیال ظاہر کیا تھا، ''ق'' کے آخر کی غزلیں (آخر ''ق'') جن سادہ اوراق پر لکھی ہیں وہ عرشی صاحب اور ڈاکٹر عبداللطیف کے بیانات کے مطابق متن سے مختلف کاغذ کے ہیں۔ فوج دار محمد خاں کے کتب خانے کی ۱۲۶۱ھ میں تنظیم نو ہوئی اور اسی سال یا اس کے کچھ ہی بعد ''نسخۂ بھوپال'' کی جلد بندی ہوئی۔ اس میں آخری سادہ اوراق اسی جلد بندی کے وقت کے اضافے ہیں۔ اس لیے کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب میں انھیں کوئی اہمیت نہ دینی چاہیے۔ حال ہی میں ڈاکٹر ابومحمد سحر نے ڈاکٹر عبداللطیف کا ایک قدیم مضمون دریافت کر کے ''ہماری زبان'' میں شائع کیا ہے۔ ۲ ڈاکٹر لطیف نے اصلاً یہ مضمون ''مسلم ریویو'' کلکتہ، جنوری ۱۹۲۹ء میں انگریزی میں لکھا تھا۔ سید محمد صاحب نے اس کا اُردو ترجمہ کر کے مجلّہ مکتبہ، حیدرآباد میں بہ عنوان ''دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ'' شائع کیا۔ اس کی بنا پر ڈاکٹر سید حامد حسین نے اپنے مضمون ۳ ''دیوانِ غالب (نسخۂ بھوپال) کی کہانی کتابت سے گمشدگی تک'' میں میرے دعوے کی تردید کی ہے اور یہ طے کیا ہے کہ اضافہ شدہ غزلیں متن ہی کے کاغذ پر تھیں۔ جب میں نے ''نقوش'' کے لیے مضمون لکھا تھا اس وقت تک

ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون دریافت ہو کر سامنے نہ آیا تھا۔ میں نے موجودہ مواد کی بنا پر کچھ نتیجے نکالے تھے۔ ڈاکٹر لطیف کے مضمون کے مطالعے کے بعد ''نسخۂ بھوپال'' کے بارے میں ہمیں اپنے کئی فیصلوں میں ترمیم کرنی ہوگی۔

''ق'' کے متن کے بین السطور میں کچھ اصلاحیں ہیں اور حاشیوں پر نئے شعروں یا غزلوں کے اضافے ہیں۔ ان کے علاوہ آخری سادہ اوراق پر ردیف ''ی'' کی کچھ غزلیں ہیں۔ ''نسخۂ عرشی'' میں انھیں ''آخرِ ق'' کہا گیا ہے میرے نزدیک متن میں حک و اضافہ اور ''آخرق'' کے اضافوں کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ اس لیے دونوں پر علاحدہ علاحدہ غور کیا جائے گا۔

ابتدائی اور آخری سادہ اوراق کے مندرجات:

ڈاکٹر عبداللطیف کے مطابق ''ق'' کی ابتدا اور آخر میں چار چار اوراق متن والے دیسی کاغذ کے تھے اور دو دو ورق انگریزی کاغذ کے، جن میں سے مؤخر الذکر پر فوج دار محمد خاں کی ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ہے، ان چھ ابتدائی اور چھ آخری اوراق کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

متن سے پہلے:

ورق ۱۔ الف: متن والے کاغذ کا ہے۔ اس کے نیچے بائیں ہاتھ کے کونے میں ''ق/۶۶'' اور اس سے نیچے ''ادب اُردو/۱۱'' لکھا ہے۔ اس سے کچھ نیچے ''۵۸ء'' اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں ''محمد حسین'' لکھا ہوا ہے۔ ''۵۸'' اور ''۶۶'' دونوں کے آگے ''ع'' کا منھ ہے جو عام طور سے ''عیسوی'' کی نشانی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کا مضمون اصلاً انگریزی میں تھا۔ ہمارے سامنے اُردو ترجمے کی نقل ہے۔ معلوم نہیں انگریزی میں اس ''ء'' کو کس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ بصورتِ موجودہ اس کی دو تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔

الف: یہ سنہ عیسوی پر دلالت کرتا ہو۔

ب: یہ کتابت کا نمبر ہو۔

''ادب اُردو/۱۱'' کی حقیقت تو ابو محمد صاحب کے مضمون ؎ ''دیوانِ غالب نسخۂ بھوپال، چند انکشافات'' سے کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اُنھوں نے مدھیہ پردیش آرکاوز، بھوپال میں حمیدیہ لائبریری بھوپال کی قدیم فہرست کتب اُردو قلمی ڈھونڈ نکالی ہے، جس میں ص ا پر ادب اردو قلمی کے

تحت اس مخطوطے کو نمبر ۱۱ دیا گیا ہے۔ ''ق/ ٦٦ء'' کے لیے دونوں امکانات ہیں، ممکن ہے یہ ۱۸٦٦ء ہو یا قلمی کتب کے Accession رجسٹر میں ٦٦ پر ہو۔ لیکن اس زمانے کے کتب خانوں Accession رواج ہوتا بھی تھا؟ ۵۸ کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ نہیں کہ اسے کتاب کا نمبر قرار دیں۔ یوں بھی ایک کتاب کے متعدد نمبر نہیں ہو سکتے۔ یہ غالباً ۵۸ء ہے۔ محمد حسین کتب خانے کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ جس نے ۱۸۵۸ء میں اس جلد پر یہ نمبر درج کیے۔

ورق ۱۔ب: خالی ہے۔

ورق ۲۔الف: متن والے کاغذ کا ہے اور خالی ہے۔

ورق ۲۔ب: متن والے کاغذ کا ہے اور خالی ہے۔

ورق ۳۔الف: متن والے کاغذ کا ہے اور اس پر غالب کا غیر منقوطہ فارسی خط بنام مولانا فضل حق خیر آبادی تحریر ہے۔

ورق ۳۔ب: اس صفحے پر بھی وہی خط جاری ہے اور ابھی مکمل نہیں ہوا۔

ورق ۴۔الف: انگریزی کاغذ کا ہے جو دوبارہ جلد بندی کے وقت شامل کیا گیا۔ یہ سادہ ہے۔

ورق ۴۔ب: اس پر کاتب نے فارسی میں لکھا ہے کہ مرزا نوشہ اسد کا یہ دیوان میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کا ہے۔

ورق ۵۔الف: یہ بھی اسی انگریزی کاغذ کا ہے اور اس پر فوج دار محمد خاں کی ۱۲٦۱ھ کی بڑی مہر لگی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خالی ہے۔

ورق ۵۔ب: خالی ہے۔

ورق ٦۔الف: متن والے کاغذ کا ہے اور اس پر اسی مکتوبِ غالب کا سلسلہ ورق ۳۔ب سے آگے جاری ہے۔

ورق ٦۔ب: اس پر بھی وہی مکتوب چلا آیا ہے اور اس صفحے پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس طرح فارسی مکتوب تیسرے اور چھٹے ورق کے دونوں طرف، یعنی کل ملا کر چار صفحوں پر ہے۔ بعد کے جلد ساز نے ان کے درمیان انگریزی کاغذ کے ورق ۴ اور ۵ داخل کر دیے۔

عرشی صاحب نے ابتدائی سادہ اوراق کی تفصیلات کسی قدر مختلف دی ہیں۔ [۵] ان کے

مطابق ابتدائی دو ورقوں پر، یعنی کل چار صفحوں پر فارسی مکتوب مسلسل لکھا ہوا ہے اور اس کے آگے انگریزی کاغذ کے دو اوراق شامل ہیں جن پر وہی مہر اور کاتب کا وہی نوٹ ہے جو ڈاکٹر لطیف نے درج کیا ہے۔ عرشی صاحب نے محض دو روزہ قیام بھوپال میں پورے ''ق'' کا مقابلہ ''نسخۂ حمیدیہ'' سے کیا اور مفصل نوٹ لیے۔ دو دن میں اتنا بڑا کام رواروی اور دوا دوی میں کیا گیا ہوگا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے مخطوطہ حیدرآباد منگا کر اطمینان سے مطالعہ کیا اور وہ بھی دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے نقطۂ نظر سے۔ اس لیے ڈاکٹر لطیف کے تفصیلی بیان کو ترجیح دی جائے گی۔ یوں ترتیب اوراق کی زیادہ اہمیت نہیں۔

متن کے آخر میں کاتب حافظ معین الدین نے اطلاع دی ہے کہ ۱۲۳۷ھ میں کام صورت انجام کو پہنچا۔ متن کے بعد چھ سادہ اوراق کی ترتیب یہ ہے:

پہلے دو ورق متن والے دیسی کاغذ کے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے ورق جلد بندی کے وقت لگائے ہوئے انگریزی کاغذ کے ہیں اور ان کے بعد دو ورق اسی متن والے دیسی کاغذ کے۔ ڈاکٹر لطیف کے ۱۹۲۹ء کے مضمون میں اوراق کے بارے میں لکھا ہے:

> ''متن کے بعد جو چار سادہ ورق شریک ہیں ان پر غالب کی کئی غزلیں، جو متن میں شریک نہیں، درج کی گئی ہیں اور ان کے اختتام پر کاتب نے اسی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا۔'' ۶

ڈاکٹر لطیف نے کاتب کے صحیح الفاظ نہیں لکھے۔ عرشی صاحب نے یوں لکھے ہیں:

> ''دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی کہی ہوئی غزلیں لکھی ہیں مگر یہ سب ردیف ''یا'' کی ہیں۔

آخری سادہ اوراق میں جو غزلیں اضافہ کی گئی ہیں ان کے آخر میں لکھا ہے: ''دیکھ تو عکسِ قدِ یار لبِ جُو پر سے۔ تمام شد۔ کارِ من تمام شد۔ ربِّ یسّر وتمم بالخیر۔'' ۷

خاتمے کے یہ الفاظ کسی پیشہ ور کاتب کے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ مصرع: ''دیکھ تو عکس......'' غالب کا نہیں۔ معلوم نہیں یہ کس شاعر کا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے صرف چار سادہ اوراق کا ذکر کیا ہے۔ ''نسخۂ عرشی'' میں چھان بین کے ساتھ معلوم ہوا کہ آخر ''ق'' میں سات غزلیں

ہیں۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مفصل مضمون ''دیوانِ غالب کے دو نسخے'' میں ''نسخۂ شیرانی'' کی تفصیل دی ہے۔ یہ مضمون رسالہ ''معاصر'' حصہ ۱۲ میں شائع ہوا۔ سنہ درج نہیں۔ حصہ ۱۱، دسمبر ۱۹۵۷ء کا ہے۔ حصہ ۱۳ پر بھی تاریخ نہیں۔ حصہ ۱۴، جولائی ۱۹۵۹ء کا ہے۔ مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مالک رام کا مرتبہ دیوانِ غالب شائع ہو چکا تھا لیکن ''نسخۂ عرشی'' (دسمبر ۱۹۵۸ء) کا مضمون میں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قاضی صاحب کا مضمون ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی مدد سے آخر ''ق'' کی ان غزلوں کو ''نسخۂ عرشی'' کے جزو ''نوائے سروش'' کے نمبروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد آخر ''ق'' کے مطابق دی گئی ہے۔

۱۔ ''نوائے سروش'' غزل ۱۸۲:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

۱۰ شعر

اس کے جملہ دس شعر آخر ''ق'' اور ''نسخۂ شیرانی'' دونوں میں ہیں۔

۲۔ ''نوائے سروش'' غزل ۱۸۳:

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے

۷ شعر

آخر ''ق'' اور ''قا'' دونوں میں اس غزل میں سات شعر ہیں۔ ان میں سے چار شعر متداول کلام میں منتخب ہو کر ''نوائے سروش'' میں درج ہیں۔ ذیل کے تین شعر ''نسخۂ عرشی'' کے حاشیہ ص ۳۲۰ کے مطابق ''گنجینۂ معنی'' میں درج ہونے چاہییں، یعنی قلم زد ہیں۔

زندگی میں بھی رہا ذوقِ فنا کا مارا
نشہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
بسکہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن
رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالب
کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

یہ متن آخر''ق'' کا ہے۔ قاضی صاحب کے مطابق ''قا'' میں دوسرے اور تیسرے شعر کے متن میں خفیف سا فرق ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ''تھی'' کی جگہ ''ہے'' ہے۔ تیسرے شعر میں ''جلوۂ خور'' کی جگہ ''جلوۂ خورشید'' ہے۔ چوں کہ ''جلوۂ خورشید'' سے مصرع غیر موزوں ہو جاتا ہے اس لیے یہ ''قا'' یا ''معاصر'' کے کاتب کا سہو ہے۔

۳۔ ''نوائے سروش'' غزل ۱۸۴:

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

۱۱شعر

آخر''ق'' اور''قا'' دونوں میں ''اچھوں'' کی جگہ ''خوباں'' ہے۔ دونوں میں اس غزل میں ۱۱شعر ہیں لیکن متداول کلام میں منتخب ہو کر صرف دس شعر ''نوائے سروش'' میں لیے گئے۔ ذیل کا شعر حاشیہ ص ۳۲۰ کے مطابق ''گنجینۂ معنی''، یعنی قلم زد کلام میں درج ہونا چاہیے۔

دل ہو تو، اچھا، نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیے

۴۔ ''نوائے سروش'' غزل ۱۵۸:

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے

۶شعر

متداول کلام، یعنی ''نوائے سروش'' میں اس غزل کے پانچ شعر ہیں۔ ذیل کا شعر حاشیہ ص ۳۲۰ کے مطابق آخر''ق'' کا ہے جسے ''گنجینۂ معنی'' میں جگہ ملنی چاہیے۔

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں؟ لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

''معاصر'' کے مضمون ص ۱۵ کے مطابق یہ شعر ''قا'' میں بھی ہے۔ اس مضمون کے ص ۳۸ کی تفصیل کے مطابق ''قا'' میں یہ غزل آٹھ شعروں پر مشتمل ہے۔ ''نسخۂ عرشی'' سے چھ شعروں کا پتا چلتا ہے۔ معلوم نہیں بقیہ دو شعر کون سے ہیں۔ چوں کہ ''نسخۂ عرشی'' میں ''قا'' کے پورے کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے، اس لیے یہ دو شعر سہواً چھوٹ گئے ہوں گے۔

''نسخۂ عرشی'' حاشیہ ص ۳۵۶ پر صراحت ہے کہ غالبؔ نے ایک خط ۸ علائی کو لکھا کہ کسی نے ان کی اس غزل کے دو شعر لے کر پانچ الحاقی شعر شامل کر دیے اور اس غزل کو اب سب گاتے پھرتے ہیں۔ عرشی صاحب نے ذخیرۂ حبیب گنج کے صاحبِ عالم مارہروی کے روزنامچے سے وہ سات شعروں کی وضعی غزل دریافت کر کے ''نسخۂ عرشی'' ص ۵۷۔۳۵۶ پر درج کی ہے۔ اس میں مندرجہ بالا شعر: ''یہ کون کہوے ہے......'' بھی شامل ہے۔ معلوم نہیں نسخۂ شیرانی کے مزید دو اشعار بھی اس غزل میں ہیں کہ نہیں؟ اب کم از کم اس ایک شعر کے بارے میں دو صورتیں ہیں:

ا۔ یہ شعر بقول غالبؔ کسی الّو کا ہے اور آخر ''ق''، نیز ''قا'' دونوں میں الحاقی ہے۔

ب۔ یا صاحبِ عالم مارہروی کے روزنامچے میں سات شعروں کی جو غزل درج ہے وہ بعینہٖ وہ نہیں جس پر غالبؔ نے پھبتی کسی ہے۔

۵۔ ''نوائے سروش'' کی غزل ۱۸۶:

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

۱۴ شعر

۶۔ ''نوائے سروش'' کی غزل ۱۸۷:

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے

۷ شعر

''قا''، نیز متداول دیوان میں اس غزل میں آٹھ شعر ہیں لیکن آخر ''ق'' میں ذیل کا شعر ندارد ہے: ۹

تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

۷۔ ''نوائے سروش'' کی غزل ۱۸۸:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

۱۶ شعر

''قا''، نیز متداول دیوان میں اس غزل میں ۱۷ شعر ہیں لیکن آخر ''ق'' میں ذیل کا شعر

ندارد ہے: ۱۰

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

اس طرح آخر ''ق'' میں کل ۷۱ شعر تھے، جن میں سے ۶۶ متداول دیوان میں شامل ہیں اور پانچ قلم زد کیے گئے۔ متداول کلام میں متعلقہ غزلوں میں ۶۸ شعر ہیں، یعنی دو ایسے ہیں جو آخر ''ق'' میں نہیں یہ دونوں شعر ''قا'' میں بھی ہیں لیکن ''قا'' میں آخر ''ق'' کی بہ نسبت دو شعر ہی نہیں چار شعر زائد ہیں۔ ۱۱

یعنی ''قا'' کی متعلقہ غزلوں میں ۷۵ شعر ہیں۔

متن میں اصلاحیں اور حاشیے پر اضافے:

متن کے اشعار میں اصلاح اور حاشیوں پر اضافوں کا کاتب، قلم، روشنائی سب متن سے مختلف ہیں۔ ۱۲ یہ دو خطوں میں ہیں: ایک خوش خط نستعلیق، دوسرا بد خط شکستہ۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے مرتب مفتی انوار الحق کے نزدیک یہ سب غالبؔ کے قلم سے ہیں عرشی صاحب کی بھی کچھ ایسی ہی رائے ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حک و اضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں، لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے سرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔ ۱۳

بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں۔ ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً:

وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں

میں ''بہانیے'' یا:

بوسے ہیں وہ مضائقہ نہ کرے

میں ''مضاعقہ''، یا...

رنگ ہے سنگِ محک، دعوائے بینائی عبث

میں ''سنگِ مہک''، یا:

خانہ زادِ زلف میں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

میں ''بھاگے نگے''...... لکھ دیا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں ۱۴؎

''نسخۂ عرشی'' کے اختلافِ نسخ والے باب میں بھی عرشی صاحب نے بار بار اپنی اس رائے کا اعادہ کیا ہے کہ ''نسخۂ بھوپال'' میں فلاں مقام پر غالبؔ نے خود اپنے قلم سے یہ اصلاح یا اضافہ کیا ہے۔

حک و اضافے کے کسی حصے کو اگر غالب کے قلم کی تحریر ماننے میں تامل ہو سکتا ہے تو ان مبتدیانہ، اغلاط سے پُر عبارتوں کو۔ یہ نہ غالب کی ہاتھ کی تحریریں ہو سکتی ہیں، نہ ان کے کسی ہم نشیں کی۔ یہ نہ اُنھوں نے کسی سے لکھائی ہیں، نہ کبھی ان کی نظر سے گزری ہیں۔ اطمینان کی بات ہے کہ اب عرشی صاحب نے اپنی رائے میں ترمیم کر لی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس لیے اس کے باوجود کہ اس قسم کا انداز حک و اصلاح بالعموم بخطِ مصنف ہوا کرتا ہے اور اندرون کلام میں قلم زد کی اصلاح خود مرزا صاحب کے قلم سے ہونی چاہیے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخطِ غالب نہیں ہیں۔'' ۱۵؎

اسی موضوع پر مالک رام صاحب کا قول ملاحظہ ہو: ۱۶؎

''مرتب (مفتی محمد انوار الحق مرحوم) کے خیال میں یہ اضافے خود غالب کے لکھے ہوئے ہیں، یعنی جب یہ قلمی نسخہ ان کے ملاحظے کے لیے گیا تو اُنھوں نے نہ صرف متن میں لکھے ہوئے کلام کی اصلاح کی، بلکہ اگر کسی پرانی زمین میں کوئی نیا شعر ہو گیا تو اسے بھی حاشیے میں لکھ دیا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے حواشی کے بارے میں مفتی محمد انوار الحق کا یہ کہنا کہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، ٹھیک نہیں۔ ان میں سے بیشتر اضافوں کا خط غالب کے خط سے بالکل نہیں ملتا۔ یہ اضافے کسی اور شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔'' ۱۷؎

مالک رام صاحب کی رائے سے شاید یہ کہہ کر درگزر کیا جائے کہ اُنھوں نے ''ق'' دیکھا ہی

کب تھا؟ ایک صفحے کا فوٹو دیکھ کر رائے قائم کر لی ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف کی تحقیق کے مطابق ان اصلاحوں اور اضافوں کا ایک لفظ بھی غالب کے قلم سے نہیں۔ اُنھوں نے مفتی انوار الحق کے دعوے کی بڑی شدومد سے تردید کی ہے۔ ۱۸ یہ تردید ذیل کے ولائل پر مبنی ہے:

۱۔ اُنھوں نے حکومتِ عثمانیہ کے محکمۂ اسناداتِ تاریخی میں ماہرین کی مدد سے ان اصلاحوں اور اضافوں کا غالب کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اور انھیں مصدقہ خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہ پایا۔

۲۔ ان میں بعض جگہ املا کی ایسی سخت غلطیاں ہیں کہ یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں۔

۳۔ کاتب نے حاشیے پر مختلف بیتوں کی غزلوں کو خلط ملط کر دیا ہے اور بعض دفعہ متن میں مندرج ہونے کے باوجود ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ دیا ہے۔

۴۔ کئی مرتبہ ابیات کے آگے اسی کاتب نے طفلانہ رائیں بھی درج کی ہیں۔

اگر اصلاح واضافے غالب کے ہاتھ کے نہیں تو کس کے ہاتھ کے ہیں؟

مخطوطے میں تین دراندازوں کے دست خط ملتے ہیں:

۱۔ ابتدائی کے سادہ ورق ۱۔الف پر شکستہ خط میں محمد حسین کے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے اپنے دو مضامین ۱۹ میں جو اصرار کیا ہے کہ یہ محمد حسین نہیں محمد حنیف ہوگا، اس کا کوئی جواز نہیں۔

۲۔ صاف نستعلیق خط میں کئی جگہ عبدالعلی کے دستخط اور تبصرے۔

۳۔ ورق ۲۹۔الف پر ایک جگہ محمد عبدالصمد مظہر کے دستخط۔

عرشی صاحب نے محمد حسین کا ذکر نہیں کیا بقیہ دو کا کیا ہے۔ ۲۰ ڈاکٹر لطیف نے مظہر کا ذکر نہیں کیا پہلے دو ناموں کا کیا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کے مطابق اصلاح واضافے دو مختلف خطوں میں ہیں۔ ایک شکستہ خط میں، دوسرے نستعلیق خط میں۔ شکستہ خط کے اضافے محمد حسین کے دستخط سے مشابہ ہیں اور نستعلیق کے عبدالعلی کے دستخط سے، یعنی ڈاکٹر لطیف کی رائے میں انھیں دونوں اشخاص نے اصلاحیں اور اضافے کیے ہیں۔

عرشی صاحب نے حاشیہ ''ق'' اور آخر ''ق'' کے زمانے کے بارے میں جو فیصلے کیے تھے وہ اس مفروضے پر مبنی تھے کہ یہ سب غالب کے قلم سے ہیں۔ اب عرشی صاحب بھی مانتے ہیں کہ بدنما

خط کے اضافے اور کسی قلم سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون پڑھنے کے بعد وہ بھی ماننے لگے ہوں گے کہ نستعلیق خط کی اصلاحیں اور اضافے بھی غالب کے قلم سے نہیں۔ محض لکھاوٹ سے کاتب کی تعیین، ادبی محقق بھی پورے وثوق سے نہیں کرسکتا، وہ دھوکا کھا سکتا ہے۔ بالخصوص غالب جیسے پختہ خوشنما خط والے شخص کے معاملے میں۔ یہ فن ماہرینِ تحریر کے لیے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے ان کی مدد سے فیصلہ کیا ہے اس لیے ان کی رائے قابلِ اعتماد ہے۔ عرشی صاحب نے جب ''نسخۂ بھوپال'' کا مطالعہ کیا تو اول تو اس وقت ان کے سامنے غالب کی دوسری تحریریں بھی نہ تھیں کہ مقابلہ کرسکتے، انھیں محض ذہنی تصویروں پر بھروسا کرنا پڑا۔ دوسرے، ان کے ذہن پر مرتب ''نسخۂ حمیدیہ'' کا یہ فیصلہ حاوی ہوگا کہ پورا حک و اضافہ غالب کے قلم سے ہے۔ تیسرے، محض دودن کے قیام میں وہ قلمی اور مطبوعہ متن کے تقابل کا کارِ دراز کرنے والے تھے۔ ان حالات میں اگر انھیں کاتب کی شناخت میں التباس ہوا تو بالکل فطری ہے۔ محض دودن میں وہ ہزاروں اشعار کا تقابلی مطالعہ کر کے سینکڑوں یا ہزاروں یادداشتیں قلم بند کرلائے۔ یہ ان کا دیوزادی کارنامہ ہے۔ یہ گراں بہا یادداشتیں گم شدہ مخطوطے کی تعمیرِ نو کا اہم ذریعہ ہیں اور عرشی صاحب کا اُردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔

ہم بغیر کسی تامل کے مان سکتے ہیں کہ نستعلیق خط میں اضافوں کا کاتب عبدالعلی ہے۔ شکستہ خط کے کاتب کی تعیین میں تھوڑا سا شبہ ہوسکتا ہے کہ محمد حسین کے محض ایک دستخط کی بنا پر بقیہ شکستہ خط والی تحریروں کا اس سے انتساب سو فیصدی صحیح نہ ہو۔ اگر یہ اضافے محمد حسین نے کیے ہیں تو ان کے دستخط کے پاس ''۵۸ء'' لکھا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کام ۱۸۵۸ء میں یا اس کے لگ بھگ کیا ہوگا۔ یہ اضافے جس نے بھی کیے، یہ یقینی ہے کہ اس نے کسی قلمی دیوان میں سے دیکھ دیکھ کر نہیں کیے۔ کوئی اور شخص دیوان میں سے دیکھ کر بولتا گیا ہوگا اور یہ اپنی اہلیت کے مطابق املا کے اجتہادات دکھاتے گئے ہوں گے۔ ''بھاگے نگّے'' جیسا املا کسی مخطوطے کی نقل تو کیا ہوگا، تب صاحب ہی کی کرامات ہوگا۔

محمد حسین کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ یہ کون ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کتب خانے کا کوئی رکن ہوگا جس نے نسخے پر نمبر ڈالے ہیں۔ عبدالعلی کے نام کے ایک شخص کا عرشی صاحب نے

رام پور میں پتا دیا ہے۔ [۲۱] ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھوپال میں عبدالعلی کے نام دو شخصوں اور عبدالصمد مظہر نام کے ایک شخص کی نشاندہی کی ہے۔ [۲۲] یہ سب شاعر بھی تھے اور ریاست کے اعلیٰ عہدے دار بھی، جن کی رسائی مخطوطے تک بہ آسانی ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے اپنے ایک مضمون میں ان کے بارے میں تفصیلی معلومات دی ہیں [۲۳] جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ عبدالعلی تونگر جو عبدالواحد خاں مسکین تلمیذِ مومن کے بیٹے تھے، اپنے والد کے ساتھ بھوپال آئے۔ بھوپال میں ان کے قیام کا زمانہ تقریباً ۱۸۳۸ء سے ۱۸۷۰ء تک کا ہے۔ یہ ریاست میں میر دبیر تھے۔ امکان ہے کہ ''نسخہ بھوپال'' پر خوش خط اضافوں کے کاتب یہی ہوں۔ صرف ایک بات ان کے خلاف پڑتی ہے کہ شاعر اپنے نام سے زیادہ تخلص سے چمٹا رہتا ہے، ''ق'' کے عبدالعلی نے اپنے دستخط کے ساتھ کہیں بھی تونگر نہیں لکھا۔

۲۔ سید محمد عبدالعلی رضوی جو ۱۸۳۶ء کے قریب پیدا ہوئے اور مختلف عہدوں کے منجملہ نائب وزیر بھی رہے، ۱۸۹۱ء میں حسابات کے دفتر کے مہتمم تھے۔

ان دونوں حضرات کے ہوتے ہوئے ہمیں بھوپال کے باہر عبدالعلی کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ عبدالصمد مظہر بیسویں صدی کے عہدے دار ہیں۔ ان کی ملازمت کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں یہ بیگم صاحبہ بھوپال کے ملٹری سیکریٹری تھے۔ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد چلے گئے جہاں ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔ یہ مغربی و مشرقی زبانوں اور ادبوں کے عالم تھے۔ لیکن ان کا زمانہ دیکھتے ہوئے نسخے پر ان کے دستخط کی کوئی اہمیت نہیں۔

جناب عرشی [۲۴] نے ''نسخۂ شیرانی'' کو ''نسخۂ بھوپال'' کا مبیضہ قرار دیا ہے۔ مبیضہ سے میں یہ معنی سمجھتا ہوں: کسی مسودے کی صاف ستھری نقل۔ عرشی صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ ''ق'' ۱۲۳۷ھ کے بعد سے ''نسخۂ شیرانی'' کی تیاری تک غالب ہی کے پاس رہا۔ غالب نے اپنے اشعار میں جو اصلاحیں یا اضافے تجویز کیے وہ پہلی بار اس نسخے کے بین السطور حاشیوں میں اور آخر میں درج ہوتے گئے۔ ان کی صاف نقل ''قا'' ہے کیوں کہ اس میں ''نسخۂ بھوپال'' کی اصلاحیں اور اضافے متن میں موجود ہیں۔

میری رائے میں ''قا'' کو ''ق'' کا مبیضہ کہنا محلِ نظر ہے کیوں کہ ''ق'' میں متعدد غزلیں اور

اشعار ایسے ہیں جو ''قا'' میں نہیں۔ دوسری طرف ''قا'' کے متن میں بہت سی غزلیں اور اشعار ایسے ہیں جو ''ق'' میں نہیں۔ ان سب کی تفصیل قاضی عبدالودود ۲۵ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین میں دی ہوئی ہے، دونوں نسخوں کے تعلق کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''ق'' غالب کے پاس سے ۱۲۳۷ھ کے بعد جلد ہی جدا ہوگیا، جدا ہوتے وقت اس کے متن یا حاشیے میں کوئی حک و اضافہ نہ ہو۔ بعد میں کسی وقت کسی کو ''نسخۂ شیرانی'' کی کوئی ناقص نقل ملی ہو اور اس کے مطابق مختلف اوقات میں دو شخصوں نے متن کے اشعار میں کاٹ چھانٹ کر کے اصلاح کر دی ہو اور اس کے حاشیے پر نئی غزلوں کا اضافہ کر دیا ہو، ''قا'' کی نقل میں جو غزلیں یا اشعار غیر حاضر تھے، اس پر ''غلط''، ''غ'' یا ''لا لا'' لکھ دیا ہو۔ انھیں دو اشخاص میں سے خوشخط لکھائی والے یا کسی تیسرے شخص نے نسخے کے آخر میں چار سادہ اوراق پر ''قا'' سے لے کر ''ی'' تک ردیف کی چند نئی غزلیں نقل کر دی ہوں۔

ڈاکٹر عبداللطیف کی بھی کچھ ایسی ہی رائے ہے۔ اپنے مضمون میں، یہ طے کرنے کے بعد کہ حک و اضافہ عبدالعلی اور محمد حسین نے کیا ہے، لکھتے ہیں: ۲۶

> ''یہ دونوں کون تھے؟ معلوم نہیں۔ شاید میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار رہوں گے۔ یہ یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں، جو محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے، غالب نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ ناممکن نہیں اگر حاشیے کی غزلیں اسی انتخاب مرتبہ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخے سے نقل کی گئی ہوں۔''

مندرجہ بالا مضمون کی تصنیف کے وقت تک ''نسخۂ شیرانی'' دریافت نہ ہوا تھا۔ ''ق'' کی اصلاحات، حاشیۂ ''ق'' اور آخر ''ق'' کا متنِ ''قا'' سے تطابق دیکھ کر ڈاکٹر عبداللطیف انتخابِ ۱۲۴۸ھ کی جگہ ''قا'' ہی کو اصلاحاتِ ''ق'' و حاشیہ ''ق'' کا ماخذ قرار دیتے۔

''نسخۂ عرشی'' میں ''نوائے سروش'' کے فٹ نوٹ میں ہر غزل کے پہلے ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرشی کی رائے میں زمانی اعتبار سے متنِ ''ق'' کے بعد حاشیہ ''ق''، پھر آخرِ ''ق'' اور ان کے بعد ''قا'' وجود میں آئے۔ حک و اضافے کا عمل اگر

مصنف کے قلم سے ہوتا تب تو امکان یہی تھا کہ اس نے شعر میں جوں ہی کوئی اصلاح تجویز کی، سب سے پہلے ''ق'' میں قلم بند کردی۔ جوں ہی کوئی نئی غزل کہی یا پرانی غزل میں نئے شعر کا اضافہ کیا، اسے حاشیے پر لکھ دیا اور ظاہر ہے کہ یہ متن کی تکمیل کے بعد ہوا۔ متن کے آخر میں شاعر نے یا اس کے ایماء پر کسی نے ردیف ''ی'' کی نو تخلیق غزلیں لکھ دیں۔

لیکن یہ طے ہوجانے کے بعد کہ ''ق'' میں ایک لفظ بھی غالب کے حکم سے نہیں اور اضافہ کنندوں میں ایک کاتب ایسا کم سواد ہے کہ اسے غالب سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوسکتا، حاشیہ ''ق'' اور آخرِ ''ق'' کے زمانے کی اس تعیین کی بنیاد ہی منہدم ہوجاتی ہے۔ اب ذیل کے نکات پر غور کیا جائے:

۱۔ ڈاکٹر عبداللطیف ماہرینِ فنِ تحریر کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''ق'' کی اصلاحیں اور اضافے غالب کے قلم سے نہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ بھی طے کیا کہ ان میں سے خوشنما خط کی اصلاحیں اور اضافے عبدالعلی کے دستخط شدہ تبصروں سے مماثل ہیں۔ یہ واضح نہیں مؤخر الذکر فیصلہ بھی ماہرینِ تحریر کی مدد سے کیا گیا یا نہیں، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ جب ان اصلاحوں اور اضافوں کا ماہرین نے بغور معائنہ کیا تو انھیں عبدالعلی سے منسوب کرنے میں بھی ماہرین شریک رہے ہوں گے اگر اس کا قوی امکان ہے کہ خوش خط اضافوں کا کاتب عبدالعلی ہے تو اس کا بھی قوی امکان ہے کہ یہ عبدالعلی بھوپال کے مذکورہ بالا حکام میں سے ہوگا۔ انھیں کی یہ جسارت ہوسکتی ہے کہ ایک بیش بہا مخطوطے پر اپنے دستخط کے ساتھ تبصرے درج کریں۔

۲۔ قاضی عبدالودود نے ''قا'' کے مشمولات کو تفصیل اور ترتیب سے درج کیا ہے۔ ''ق'' کی ترتیب کے لیے ہم ''نسخۂ عرشی'' پر اعتماد اور انحصار کر سکتے ہیں۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نسخوں کی ترتیب میں بڑا فرق ہے۔ ''ق'' میں شروع میں قصیدے اور بعد میں غزلیں ہیں۔ ''قا'' میں اس کے برعکس ہے۔ اس کے علاوہ دونوں نسخوں میں غزلوں کی ترتیب میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہی حال حاشیہ ''ق'' کی غزلوں کا ہے۔ ''قا'' میں ان کی ترتیب بھی ''ق'' سے بدلی ہوئی ہے۔

۳۔ ردیف ''ی'' کی آخر ''ق'' میں مندرجہ غزلیں ایک ہی کاتب کے قلم سے ہیں۔ یہ سب ''قا'' میں بھی ہیں۔ ''قا'' کا پورا متن ایک ہی کاتب کے قلم کی تحریر ہے۔ اگر ''قا'' ''نسخۂ بھوپال'' کا مبیضہ ہوتا تو یہ غزلیں ایک ہی ترتیب سے ہوتیں۔ ''نسخۂ عرشی''، ''نوائے سروش'' میں ان غزلوں کی جو ترتیب ہے ظاہراً یہی آخرِ ''ق'' میں رہی ہوگی۔ اب ''ق'' اور ''قا'' کی ترتیب ملاحظہ ہو:

''نوائے سروش''

آخرِ ''ق''	مصرع اول	''قا''
غزل نمبر۱۸۲	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	غزل نمبر۱۷۵
غزل نمبر۱۸۳	گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	غزل نمبر۱۷۷
غزل نمبر۱۸۴	چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے	غزل نمبر۲۱۴
غزل نمبر۱۸۵	وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے	غزل نمبر۲۲۰
غزل نمبر۱۸۶	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	غزل نمبر۱۸۳
غزل نمبر۱۸۷	کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے	غزل نمبر۲۳۳
غزل نمبر۱۸۸	مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے	غزل نمبر۲۵۱

ان کے بیچ بیچ میں ردیف ''ی'' کی دوسری غزلیں ہیں، جن میں سے بہت سی ''ق'' کے متن کی ہیں۔ اگر ''نسخۂ شیرانی'' ''ق'' کا مبیضہ ہوتا تو اس میں غزل کی ترتیب ''ق'' کے مطابق ہوتی۔ اگر حاشیہ ''ق'' اور بالخصوص آخرِ ''ق'' ''نسخۂ شیرانی'' پر مقدم ہوتے تو ان کی ترتیب ''قا'' میں بھی برقرار رہتی۔

۴۔ اس کا بھی کوئی یقین نہیں کہ آخرِ ''ق'' کی غزلیں حاشیہ ''ق'' کے بعد کی ہیں۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ آخرِ ''ق'' کی تمام غزلیں ''ی'' کی ردیف کی ہیں۔ جب کہ حاشیہ ''ق'' میں مختلف ردیفوں کی ہیں۔ متنِ ''ق'' اور متنِ ''قا'' کی کتابت میں پانچ چھ سال کا وقفہ ہے۔ اگر عرشی صاحب کی ترتیب تسلیم کی جائے کہ اس عرصے میں اوّل حاشیہ ''ق'' کی غزلیں تخلیق ہوئیں اور اس کے بعد آخرِ ''ق'' کی، تو یہ عجیب نتیجہ نکلتا ہے کہ اس درمیانی وقفے میں ابتدائی سالوں میں غالب ہر

ردیف کی غزلیں کہتے رہے لیکن آخر کے دوایک سال میں صرف ردیف ''ی'' کی۔ حاشیہ ''ق'' میں صرف ردیف ''ی'' کی غزلیں آخرِ ''ق'' پر مقدم معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ''نسخۂ شیرانی'' بھی یہ آخرِ ''ق'' کی غزلوں سے پیشتر درج ہیں لیکن ''ی'' کے علاوہ دوسری ردیفوں کے حاشیے کی غزل کے لیے کیوں کر کہا جائے کہ یہ آخرِ ''ق'' سے پہلے کی ہیں۔

ان مشاہدات کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''نسخۂ بھوپال'' جس وقت بھوپال پہنچا اس میں محض متن درج تھا، اصلاح اور اضافے نہ تھے۔ بعد میں کچھ حضرات کو ''نسخۂ شیرانی'' کی نقل ملی۔ اس کے مطابق مختلف اوقات میں ان محرروں نے:

(الف) ''ق'' کے متن میں ''قا'' کے مطابق اصلاح کردی۔

(ب) پرانی غزلوں کے نئے اشعار اور نئی غزلیں حاشیے پر لکھ دیں۔

(ج) آخری ردیف، یعنی ''ی'' کی مزید غزلوں کے لیے آخر کے سادہ اوراق بھی دستیاب تھے۔ اس لیے ردیف ''ی'' کی مزید دو غزلیں حاشیے پر لکھیں اور بقیہ سات غزلوں کے لیے آخر کے چار سادہ اوراق کو استعمال کرلیا۔ یہ کاتب غیر محتاط تھے اس لیے اُنھوں نے بعض غزلیں، جو متن میں موجود تھیں، مکرر حاشیے پر لکھ دیں۔ چند غزلیں جو ''قا'' میں تھیں یا تو ان کی بداحتیاطی سے ''ق'' میں اضافہ ہونے سے رہ گئیں یا پھر انھیں ''قا'' کی جو کاپی ملی تھی وہ ''قا'' کے موجودہ نسخے کے مقابلے میں ناقص تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''نسخۂ بھوپال'' کی اصلاحوں اور اضافوں کے ''نسخۂ شیرانی'' کا ماخذ ہونے سے یہ کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ ''نسخۂ شیرانی'' ان اصلاحوں اور اضافوں کا ماخذ ہے اور یہ اصلاحیں اور اضافے تاریخی ترتیب سے ''نسخۂ شیرانی'' سے بعد کے ہیں۔

حوالہ وحواشی

۱۔ ''نقوش''، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۸۔

۲۔ ''نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبداللطیف''، ''ہماری زبان''، یکم مئی، ۱۹۶۹ء۔

۳۔ ''اُردو ادب''، ۱۹۶۹ء، غالب نمبر، ص ۱۵۲۔

۴۔ ''ہماری زبان''، ۲۲، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۵۔۴۔

۵۔ ''نسخۂ عرشی'' دیباچہ ص ۷۵۔

۶۔ ''ہماری زبان''، یکم مئی، ۱۹۶۹ء، ص ۹، کالم ۱۔

۷۔ دیباچہ ''نسخۂ عرشی''، ص ۷۷۔

۸۔ یہ خط ''خطوطِ غالب'' مرتبہ مالک رام، طبع اول میں ص ۳۹۱ پر موجود ہے۔

۹۔ مضمون مشمولہ ''معاصر''، ص ۳۹ و ''نسخۂ عرشی'' ص ۴۵۷۔

۱۰۔ ''معاصر''، ص ۴۱؛ ''نسخۂ عرشی'' ص ۴۵۷۔

۱۱۔ قاضی عبدالودود نے محولہ بالا مضمون میں ''نسخۂ شیرانی'' کے ایسے ۱۲۵/ا اشعار درج کیے ہیں جو ''نسخۂ بھوپال''، نیز متداول دیوان دونوں سے غیر حاضر ہیں۔ ان میں سے چند کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے:

۱۔

سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ
جتنا کہ نا امید تر، امیدوار تر

اس شعر والی غزل ''نسخۂ عرشی''، ''گنجینۂ معنی'' میں ص ۴۱۔۴۰ پر درج ہے۔ فٹ نوٹ میں ''ق'' کے علاوہ ''قا'' کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن مندرجہ بالا شعر سہواً درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ ''شرحِ غالب'' یا ''اختلافِ نسخ'' میں بھی اس کا ذکر نہیں۔

۲۔ ''نسخۂ عرشی'' میں ذیل کے تین اشعار ''قا'' کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں۔ عرشی صاحب نے قاضی صاحب ہی کی نقلِ ''قا'' سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں فضلاء کے درج شدہ متن میں کچھ اختلاف ہے:

''نسخۂ عرشی''	مضمون ''معاصر''
طاقتِ رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنی	رنجِ سفر بھی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو	

انجام شمارِ غم نہ پوچھو　　　　انجام شمارِ غم نہ کچھ پوچھ

یہ مصرف تا بکے نہیں ہے

جس دل میں کہ تا بگی (؟) سما جائے جس دل میں تا بکے سما جائے

واں عزتِ تختِ کے نہیں ہے

۳۔

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے

صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے

قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں اس شعر کو بھی ان ۱۲۵ اشعار میں جگہ دی ہے جو ''نسخۂ بھوپال'' میں نہیں۔ یہ سہو ہے۔ ''نسخۂ عرشی'' میں ص ۱۱۶ کے مطابق یہ حاشیہ ''ق'' پر ہے جہاں پہلے مصرع میں ''ہو'' کی جگہ ''ہیں'' ہے۔

۴۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی

ہاں، کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

قاضی صاحب کے مطابق یہ شعر متداول دیوان میں نہیں۔ متداول دیوان کے لیے اُنھوں نے مالک رام کے مرتبہ دیوانِ غالب کو پیشِ نظر رکھا جو مطبع نظامی کان پور ۱۸۶۲ء کے متن کو پیش کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر نظامی مطبع کے ایڈیشن میں بھی ہے اور مالک رام کے دیوانِ طبع دوم میں بھی۔

۱۲۔ دیباچہ ''نسخۂ عرشی''، ص ۷۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۱۴۔ دیباچہ ''نسخۂ عرشی''، ص ۷۸۔۷۷۔

۱۵۔ ''نسخۂ حمیدیہ کی فروگذاشتیں''، مشمولہ ''صحیفہ''، غالب نمبر حصہ سوم، بابت جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۵۔۴۔

۱۶۔ ’’گلِ رعنا، غالب کا گمشدہ انتخاب‘‘، مشمولہ ’’نذرِ ذاکر‘‘، جلد اول، ص ۴۰۳۔
۱۷۔ زیرِ نظر مضمون کی تحریر کے کئی سال بعد ’’اُردو ادب‘‘، شمارہ نمبر ۱، ۲، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۹، پر ڈاکٹر انصار اللہ نظر یہ دلچسپ اطلاع دیتے ہیں:

’’میرے محترم بزرگ جناب مالک رام نے ایک دن فرمایا کہ آج تم سے اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں۔ دیوانِ غالب کے بھوپالی نسخے میں جو اصلاحیں ملتی ہیں، میرا خیال ہے کہ بعض شاید مفتی انوار الحق ہی نے کی ہوں۔‘‘

۱۸۔ ’’ہماری زبان‘‘، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔
۱۹۔ ’’اردو ادب‘‘، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۵ نیز ’’شاعر‘‘، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۴۱۔
۲۰۔ دیباچہ ’’نسخۂ عرشی‘‘، ص ۷۷۔
۲۱۔ دیباچہ ’’نسخۂ عرشی‘‘، ص ۷۷۔
۲۲۔ ’’دیوانِ غالب کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ: نسخۂ بھوپال مشمولہ ’’نیا دور‘‘، غالب نمبر، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء۔
۲۳۔ ’’دیوانِ غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دست خط اور مہریں‘‘ از ڈاکٹر سید حامد حسین، مشمولہ ’’شاعر‘‘ جولائی ۱۹۶۹ء۔
۲۴۔ دیباچہ ’’نسخۂ عرشی‘‘، ص ۲۰۔
۲۵۔ ’’دیوانِ غالب کے دو نسخے‘‘، از قاضی عبدالودود، ’’معاصر‘‘، حصہ ۱۲ و ’’غالب کا نسخہ شیرانی‘‘ از ڈاکٹر وحید قریشی، ’’نقوش‘‘، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء۔
۲۶۔ بحوالۂ مضمون ’’ہماری زبان‘‘، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔

(ماہنامہ ’’نیا دور‘‘ لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۳ تا ۱۱)

◆◆◆

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال......ملکیت اور کتابت

دیوان غالبؔ موسوم بہ نسخۂ بھوپال کے بارے میں گمشدگی کے باوجود اگرچہ ہماری معلومات میں ادھر قابل ذکر اضافہ ہوا ہے لیکن چند امور قیاسات سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ البتہ قیاسات بجائے خود اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے صورت حال خاصی تشویشناک دکھائی دیتی ہے۔ غالبؔ کی زندگی اور کلام کے بعض پہلوؤں کی تحقیق کا عام طور پر یہی انداز ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں ایسی باتیں جاننے کے درپے ہیں جن کے لیے ضروری شواہد موجود نہیں ہیں۔ چناں چہ:

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زوند

کا عمل پورے شدومد کے ساتھ جاری ہے۔

تحقیق میں افسانہ سرائی کا راہ پاجانا کوئی اچھا میلان نہیں ہے۔ قیاس آرائی بھی اگر وہ محقق کو مواد کی تلاش و جستجو کے لیے ایک سمت عطا کرنے کے بجائے مقصود بالذات بن جائے تو ایک طرح کی افسانہ سرائی ہے۔ کوئی نئی اور اہم تحقیق اکثر کسی قیاس یا مفروضے کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایسے شواہد دستیاب ہو جائیں جن سے وہ قیاس یا مفروضہ پایۂ شہرت کو پہنچ جائے۔ محض قیاس یا مفروضہ شواہد کا بدل نہیں ہوسکتا خواہ منطقی اعتبار سے کتنا ہی سلجھا ہوا ہو کیوں کہ واقعات کی اپنی ایک الگ منطق ہوتی ہے۔ ان کو معمولی یا قیاسی منطق سے ہمیشہ ثابت یا رد نہیں کیا جاسکتا۔ افسانہ سرائی تو محض افسانہ سرائی ہے لیکن قیاس آرائی میں چوں کہ استدلال سے کام لیا جاتا

ہے اس لیے اس کا حد سے زیادہ دخل نہ صرف افسانے کو حقیقت بلکہ حقیقت کو بھی افسانہ بنا دیتا ہے چناں چہ یہ بات زیادہ تعجب خیز نہیں کہ آج ہمیں غالبؔ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی صحت پر بھی پورا پورا یقین نہیں ہے۔

غالبؔ کے دیوان کے بعض دستیاب مخطوطوں پر کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے کاتب کا نام اور متن کی تاریخ کتابت درج ہے تو حاشیوں کے اضافوں کا زمانہ علم میں نہیں۔ مخطوطوں کے مالکوں کا نام معلوم ہے تو یہ نہیں معلوم کہ وہ کس طرح اور کب ان کے قبضے میں آئے چوں کہ ان امور سے صحیح واقفیت کے ذرائع مسدود ہیں اس لیے قیاس پر قیاس کیے جاتے ہیں، ایک قیاس کو دوسرے قیاس سے ثابت یا رد کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ قیاس کو یقین میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فلسفے کے لیے کہا گیا ہے کہ فلسفہ ایک اندھیرے کمرے میں کالی بلی کی تلاش ہے جہاں کوئی بلی نہیں ہے۔ یہی بات ہماری تحقیق پر صادق آنے لگتی ہے۔ خود غالبؔ کے ایک خط میں کتنا برمحل قول موجود ہے!

''جس کو تم تحقیقات کہتے ہو، وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو۔ وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا ہے کہیں خلاف۔'' [1]

نسخۂ بھوپال بھی دیوان غالبؔ کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جس کے بارے میں اس کے زمانۂ دریافت سے لے کر اس وقت تک ضروری شواہد کے بغیر بہت سے فیصلے صادر کیے گئے ہیں۔ اس کے متن کے کاتب کا نام اور تاریخ کتابت تو محض اس لیے معلوم ہے کہ خوش قسمتی سے کاتب نے خود ترقیمے میں اس کا اظہار کر دیا تھا۔ ایک اور خاص بات یہ طے ہے کہ یہ نواب فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے کی ایک کتاب تھی لیکن دیگر مسائل جو زیادہ تر اس مخطوطے کی ملکیت، کتابت، ترمیموں اور اضافوں سے متعلق ہیں کافی اُلجھے ہوئے ہیں۔ چوں کہ یہ مخطوطہ میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے ان مسائل سے بحث کرنے میں مجھے بڑا تامل رہا جب دید سے یہ حل نہ ہو سکے اور اس کے دیکھنے والوں میں باہم اختلاف بھی رہا تو دید اور شنید میں تو بہت فرق ہے۔ اسی تامل کے ساتھ میں یہاں اس مخطوطے کی ملکیت اور کتابت کی اس نوعیت کا جائزہ لوں گا جو دراصل ملکیت ہی کے مسئلے سے وابستہ ہے۔ ترمیموں اور اضافوں کے مسائل پر ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔

اس مخطوطے کے بارے میں غالباً سب سے پہلے مفتی انوار الحق نے یہ قیاس کیا تھا کہ یہ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔

''یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ غالباً یہ رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے ''دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسدؔ از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ قلمی خوشخط'' اور اس کے سامنے ان کی مہر ہے اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے:

''دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسدؔ و غالبؔ سلمہم دربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت۔'' ۲؎

اس کے بعد نیاز فتح پوری نے ایک قلمی بیاض مملوکہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ کا تعارف کراتے ہوئے نگار فروری ۱۹۳۱ء میں یہ الفاظ سپرد قلم کیے۔

''چوں کہ کتب خانہ بھوپال کا نسخہ جس کے مطابق نسخۂ حمیدیہ شائع کیا گیا ہے وہ ہے جسے خود غالبؔ نے نواب بھوپال (؟) کے پاس حذف و اصلاح کے بعد روانہ کیا تھا اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی کلام غالبؔ کا ایسا نہیں جو شائع ہونے سے رہ گیا ہو......'' ۳؎

مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پر اپنے ایک مضمون میں جس کا صحیح زمانۂ تحریر میرے علم میں نہیں، ضمناً لیکن یقینی طور پر یہ لکھا کہ اس مخطوطے کو غالبؔ نے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا:

''جب مرزا غالبؔ کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا، مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بے تاب ہوگئے۔ . .'' ۴؎

اس سلسلے میں ۱۹۵۶ء میں یوسف قیصر نے کئی روایتیں قلمبند کیں۔ ان میں سے دو روایتوں یعنی نواب فوجدار محمد خاں غالبؔ کے شاگرد تھے اور نسخۂ بھوپال خود غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، کی تردید تو انھوں نے خود ہی کر دی لیکن یہ باتیں وثوق سے بیان کیں کہ نواب فوجدار محمد خاں غالبؔ

کی شاعری اور جدتِ افکار سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ان سے ملنے کے لیے دہلی گئے تھے، کچھ دن ان کے پاس رہے تھے، بادشاہ کے مشاعروں میں شریک ہوئے تھے اور غالبؔ سے ایک خصوصی مراسم کا تحفہ یعنی نسخۂ بھوپال لے کر واپس آئے تھے نیز یہ کہ یہ دیوان انھوں نے خود اپنا ایک خوش نویس بھیج کر نقل کرایا تھا۔ ۵

روایتوں کے کسی ایسے ہی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے بھی لکھا ہے کہ نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال

''وقتاً فوقتاً اپنے ماموں میاں فوجدار محمد خاں کو غالبؔ کی خدمت میں نذرانے کی رقم دے کر بھیجا کرتی تھیں۔ اسی آمد و رفت کا نتیجہ تھا کہ فوجدار محمد خاں کو غالبؔ نے اپنے اصل دیوان کا نسخہ اپنے قلم سے تصحیح کر کے نذر کیا تھا جو ان کے کتب خانے کی زینت بنا، اور بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔''

ان حضرات میں سے صرف مفتی انوار الحق نے اس مخطوطے کی تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ کا حوالہ دیا ہے، باقی کسی نے اپنے قیاس یا دعوے کی تائید میں کوئی ثبوت تو کیا معمولی سی دلیل بھی نہیں دی۔ جہاں تک زبانی روایت کا تعلق ہے ان میں سے نہ تو کوئی غالبؔ کا ہم عصر ہے اور نہ یہ بتاتا ہے کہ وہ کسی معاصرانہ روایت کا ورثہ دار ہے۔

مفتی انوار الحق کے مندرجہ بالا قیاس کی تردید سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے کی۔ ۶ مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی اپنے طور پر مفتی انوار الحق کے قیاس کو تسلیم نہیں کیا اور چوں کہ ترمیموں اور اضافوں کی نوعیت کے پیش نظر انھوں نے اس کو نسخۂ مصنف قرار دیا اس لیے یہ فیصلہ کیا کہ:

''یہ فی الحقیقت مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا۔'' ۷

نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھے جانے اور ان کو نذر کیے جانے کے قیاس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ یہ مخطوطہ ان کے ذاتی کتب خانے کا تھا اور اس پر ان کی ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۶۱ھ کی مہریں ثبت تھیں۔ اس قیاس کے لیے اگرچہ یہ شہادتیں کافی نہ تھیں لیکن اس کی تردید میں بھی کوئی شہادت نہیں پیش کی گئی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ۱۲۴۸ھ کی مہر سے واقفیت کے باوجود اس مخطوطے کے

نواب فوجدار محمد خاں کے قبضے میں آنے کا زمانہ متعین کرنے کے لیے صرف کتب خانۂ فوجدار محمد خاں کے اندراج اور ۱۲۶۱ھ کی مہر کو پیش نظر رکھا اور تحریر کیا کہ:

> ''اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات اخذ کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں موجود تھا۔'' ۸

حالاں کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر کی روشنی میں یہ بات زیادہ سے زیادہ کے بجائے کم سے کم تھی۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اتنا کم تو نہیں کیا لیکن انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ:

> ''۱۲۴۸ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں (بھوپال) باریابی حاصل ہوئی ہوگی جو دیوانِ غالبؔ کے متداول انتخاب کی تاریخ ترتیب وتالیف ہے۔'' ۹

لیکن جس طرح ''فی الحقیقت'' سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ نسخہ خود غالبؔ کے لیے تیار کیا گیا تھا اسی طرح ''بہر حال'' سے بھی اس کو زیادہ تقویت نہیں پہنچتی کہ یہ نسخہ ۱۲۴۸ھ کے بعد بھوپال پہنچا۔

نسخۂ بھوپال کی اکثر خصوصیات یہ ماننے پر مجبور کرتی تھیں کہ یہ نسخہ ابتدا میں غالبؔ کا تھا یا ان کی دسترس میں تھا۔ چناں چہ راقم الحروف نے بھی اسی بنا پر ایک مضمون میں عرشی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن کسی مخطوطے کی خصوصیات کی وجہ سے اس کو نسخۂ مصنف قرار ماننے میں اور امر واقعی کے طور پر ایسا قرار دینے میں جو فرق ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نسخے کے بعض صفحات پر عبد العلی اور عبد الصمد مظہرؔ کے دستخط بھی ملتے تھے۔ اگرچہ یہ نام خود مولانا عرشی کے اعتراف کے مطابق ان کے لیے بالکل اجنبی تھے لیکن پھر بھی انھوں نے یہ قیاس فرمایا کہ یہ نسخہ عبد العلی اور عبد الصمد مظہرؔ کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا تھا۔ عبد الصمد مظہرؔ بہت بعد کے آدمی تھے اور ان کا ریاست بھوپال سے تعلق رہ چکا ہے۔ ۱۰ عبد العلی کی شخصیت کے تعین میں کسی قدر شکوک ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ یہ شکوک جلد دور ہو جائیں گے اور یہ بھی بعد کے بھوپال کے آدمی نکلیں گے۔

نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی کتابوں پر جو مولانا آزاد سینٹرل لائبریری (کتب

خانۂ حمیدیہ) بھوپال میں موجود ہیں ان کی مختلف سنوں کی مہریں ثبت ہیں۔ ۱۲۵۷ھ اور ۱۲۶۱ھ کی مہریں اکثر کتابوں پر اس صورت میں ثبت ہیں کہ ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر کتاب کی ابتدا میں سادہ ورق پر ہے اور ۱۲۵۵ھ کی چھوٹی مہر آخر کے سادہ ورق پر ۱۲۴۸ھ کی چھوٹی مہر اصل کتاب کے صفحات پر بھی ملتی ہے۔ یہ مہر جن چند مخطوطات پر ہے، ان میں دیوان دردؔ قابل ذکر ہے۔ دیوان مومنؔ قلمی پر ۱۲۵۵ھ کی مہر ثبت ہے۔ دردؔ تو ۱۲۴۸ھ سے بہت پہلے مر چکے تھے لیکن ۱۲۵۸ھ میں مومنؔ زندہ تھے۔ لیکن نذر و نیاز کی باتیں جیسی غالبؔ کے ساتھ چلتی ہیں ویسی کسی کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔

یہ طے کرنا بھی محال ہے کہ نسخۂ بھوپال نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں کب آیا کیوں کہ اس کا بھی ۱۲۴۸ھ کی مہر کے سوا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے اور اس مہر کا بلکہ ۱۲۶۱ھ کی مہر کا بھی بعد میں لگایا جانا ناممکن نہیں ہے۔

مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال میں کتابی شکل میں نواب فوجدار محمد خاں کے سامان کی ایک قلمی فہرست ہے جو ۱۲۶۷ھ کی کیفیت کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ معدودے چند اندراجات ۱۲۶۹ھ کے ہیں۔ دو تین موقعوں پر شاید سہواً ۱۲۶۶ھ بھی درج ہو گیا ہے کیوں کہ ایک موقع پر اسے کاتب نے ۱۲۶۷ھ بنا دیا ہے۔ !! کتاب کے ابتدائی سادہ اوراق میں سے ایک صفحے پر جسے ہم چوتھا صفحہ کہہ سکتے ہیں، مندرجہ ذیل اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فہرست کا مسودہ خود نواب فوجدار محمد خاں نے تیار کیا تھا:

> ''فہرست حاضری ہائے کہ سرکار ذوی الاقتدار میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام حشمہ دو دو اقبالہ در بکاری خود بہ تحقیق تلاش تمام گرفتہ بہ دستخط خاص خود تحریر فرمود۔''

انھیں صفحات میں سے چودھویں صفحے پر ایک کا مدار دائرے میں یہ اندراج ہے:

> ''جنتری حاضری ہائے کل سامان سرکار فیض آثار نواب فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہ بموجب حاضری ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۲۵۸ھ فصلی۔''

پندرھویں صفحے پر فوجدار محمد خاں کی ۱۲۴۸ھ کی مہر ثبت ہے اور اسے بھی چودھویں صفحے کی عبارت کی طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ اندراجات اور اس فہرست کے مشمولات کی فہرست

کے ابتدائی دو صفحات خوشخط ہیں، باقی فہرست شکستہ خط میں لکھی گئی ہے لیکن کاتب ایک ہی ہے۔ پندرھویں صفحے کی طرح آخر کے ایک صفحہ پر بھی ۱۲۴۸ھ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ دو صفحات پر کسی اور کی بھی ایک غیر واضح مہر ثبت ہے۔

۱۲ اس قسم کی ایک اور شہادت ''مجموعۂ احکامات یار محمد خاں صاحب'' سے بھی ملتی ہے۔ یہ مخطوطہ فوجدار محمد خاں کے صاحب زادے یار محمد خاں کے ۱۲۸۶ھ کے ذاتی احکامات سے متعلق ہے۔ اگرچہ ۱۲۸۶ھ میں فوجدار محمد خاں کے انتقال کو پانچ برس ہو چکے تھے لیکن اس کے آخر کے ایک صفحہ پر بھی ان کی ۱۲۴۸ھ کی مہر ثبت ہے۔

ہر مخطوطے کے بارے میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس طرح کی مثالوں سے یہ بات بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ مخطوطوں کے شروع اور آخر کے صفحات پر جو مہریں چسپاں ہیں ان کا زمانۂ کتابت یا زمانۂ ملکیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں تک کہ بہت بعد کے مخطوطوں پر بھی ایک مخصوص طریقے کے مطابق پرانی مہریں لگا دی گئی ہیں۔

فوجدار محمد خاں کے سامان کی مذکورہ فہرست سے مزید پتہ چلتا ہے کہ ان کے کتب خانے کی عربی، فارسی اور اردو کتابیں مولوی عبداللہ اور ہندی کتابیں گنپت گرو جی کی تحویل میں تھیں۔ مطبوعہ کتابوں کے نیچے اکثر قیمت بھی درج ہے کہیں کہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کتاب کب خریدی گئی۔ دو تین مخطوطوں کے نیچے بھی کاتب کا نام اور قیمت درج ہے۔ گلشن بے خار کے نیچے ''بخط بخشی عبدالقادر'' لکھا ہوا ہے اور مثنوی سحر البیان کے بارے میں یہ اندراج ہے کہ ''۴، جمادی الاول ۱۲۷۰ھ خرید کتاب مثنوی میر حسن المشہور بہ بدر منیر قلمی مطلا مع تصویرات عمدہ خریدار از میر اکبر علی قیمت، یک عدد یک جلد''، کتابیں مختلف فنون مثلاً طب، فقہ، انشا دواوین، مثنویات وغیرہ کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ''دیوان ہائے'' کے تحت آٹھ کتابوں کے بعد اور انیس کتابوں سے پہلے ''دیوان اسد غالب قلمی خوشخط'' درج ہے لیکن اس کے نیچے ایک عدد اور ایک جلد کے سوا کوئی اور صراحت نہیں ہے۔ ابتدا کی آٹھ کتابوں میں دیوانِ حافظ شیراز، دیوان انوری قلمی، دیوان بدر چاچ قلمی، دیوان بلیغ قلمی اور دیوانِ عرفی قلمی شامل ہیں اور بعد کی قلمی کتابوں میں دیوان درد مع قصہ لیلیٰ مجنوں، دیوانِ جرأت، دیوان انشا، دیوان مومن اور گلشن بے خار قابل ذکر ہیں۔ گلشن

بے خار کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے دواوین میں درج کیا گیا ہے۔ ۱۳؎ ''دیوانِ اسد غالب قلمی'' چوں کہ شمار میں دیگر مخطوطوں سے کافی پہلے آیا ہے اس لیے کتب خانے میں اس کے داخلے کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی دوسری کتابوں پر ثبت مہروں کے جائزے سے جو روش سامنے آتی ہے، وہ بڑی حد تک کتب خانے کی ترتیب و تنظیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا آغاز کب ہوا اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ حتیٰ کہ ۱۲۶۱ھ کی مہر کی روشنی میں اب یہ قیاس بھی درست نہیں رہا کہ ترتیب و تنظیم اسی سال ہوئی تھی۔ لیکن چوں کہ اس کام کو کرنے والا کاتب عموماً ایک ہی ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ اکثر کتابوں پر یہ عمل ۱۲۶۱ھ یا اس کے بعد ایک ہی زمانے میں کیا گیا ہے اور بعد میں جیسے جیسے نئی کتابیں آئی ہیں یا تیار ہوئی ہیں یہ عمل اس کتب خانے کے ایک دستور کی طرح جاری رکھا گیا ہے لیکن اس کا تعلق قلمی نسخوں کے شروع اور آخر کے صفحات پر مہریں لگانے اور ان کی تزئین و آرائش سے ہے۔ اس میں اور نسخۂ بھوپال میں یہ فرق ہے کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر اصل دیوان کے صفحات پر کئی جگہ ثبت تھی۔ یہ صورت عموماً کتاب کی ملکیت یا زمانۂ ملکیت پر دلالت کرتی ہے، چوں کہ ۱۲۴۸ھ کی مہر کے اسی سال ثبت کیے جانے کے امکان کو کسی طرح خارج نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس سلسلے میں خواہ کتنے ہی متبادل قیاسات ہمارے ذہن میں آئیں کسی حتمی شہادت کے بغیر اس کی تردید نہیں ہو سکتی کہ یہ نسخہ ۱۲۴۸ھ میں نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں داخل ہوا تھا۔

نواب فوجدار محمد خاں کا ذکر ریاست بھوپال کی تاریخی کتابوں اور تذکروں میں ملتا ہے۔ وہ بھوپال کے پانچویں برائے نام حکمراں نواب غوث محمد خاں (۱۲۳۳ھ۔۱۲۴۲ھ) کے دوسرے بیٹے تھے۔ چوں کہ کچھ مخصوص حالات میں نواب غوث محمد خاں کے مسلوب الامتیاز ہو جانے کے ساتھ ساتھ ان کی اولادِ نرینہ بھی حق جانشینی سے محروم کر دی گئی تھی اس لیے نواب فوجدار محمد خاں کی شخصیت عموماً شک و شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی لیکن اخوان ریاست میں تا حیات انھیں ممتاز حیثیت حاصل رہی۔ ان کی تاریخ پیدائش کہیں درج نہیں لیکن ۱۲۳۵ھ میں ان کے بہنوئی نواب نظر محمد خاں (شوہر نواب گوہر بیگم) کے بہ ضرب تفنگچہ ہلاک ہونے کے سلسلے میں ان کا نام اس طرح آتا ہے کہ

تفنگچہ شاید عمداً یا سہواً ان کے ہاتھ سے سر ہوا تھا اور اس وقت ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ تاج الاقبال میں اسی روایت کو صحیح بتایا گیا ہے۔

''روایت دیگر اینست کہ دختر خود را بزانو گرفتہ دستِ شفقت بر سر درویش می کشید دور پہلو تفنگچہ پُر نہادہ بود فوجدار محمد خاں ہشت سالہ برادر نسبتی وے تفنگچہ را برداشت و زدست او عمداً یا سہواً مرشدواین روایت صحیح ست۔'' ۱۴

اگر چہ ہشت سالہ کا کچھ بھروسا نہیں لیکن اس حساب سے ۱۲۳۷ھ میں ان کی عمر دس سال اور ۱۲۴۸ھ میں اکیس سال قرار پاتی ہے۔ کرم محمد خاں مدار المہام ریاست کے انتقال کے بعد ۱۲۵۰ھ میں نواب قدسیہ بیگم ۱۵ کو پہلے نواب فوجدار محمد خاں کو نائب ریاست بنانے کا خیال آیا پھر انھوں نے خوش وقت رائے کو یہ منصب عطا کیا۔ اس کا ذکر تاج الاقبال، دفتر اول ص ۴۳ کی مندرجہ ذیل عبارت میں موجود ہے:

> ''قدسیہ بیگم صاحبہ اول نصب برادر خرد میاں فوجدار محمد خاں بر خدمت نیابت ریاست بخاطر آوردہ باز خوش وقت رائے را خطاب راجگی دادہ بعہدۂ نیابت سربلند کرد۔''

نواب شاہجہاں بیگم جب ۱۲، محرم ۱۲۶۱ھ کو رئیسہ بھوپال ہوئی تو نواب فوجدار محمد خاں نائب ریاست ہوئے۔ صاحب تاریخ الکۂ بھوپال نے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہوئے ان کی حکومت کا زمانہ صرف آٹھ دس ماہ بتایا ہے۔ ۱۶ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ دربار کی سازشوں میں حقیقی اقتدار انھیں صرف آٹھ دس ماہ حاصل رہا۔ تاج الاقبال کے مطابق ۲۰، شوال ۱۲۶۱ھ کو ان کے مخالفین نے ایجنٹ سے شکایت کی۔ ایجنٹ نے گورنر جنرل سے یہ سفارش کی کہ نواب سکندر بیگم کو مختار ریاست بنا دیا جائے کیوں کہ ایک ریاست میں دو حکمرانوں کا ہونا مناسب نہیں۔ چناں چہ نواب سکندر بیگم مختار ریاست ہوئیں۔ ایجنٹ نے ۱۵، محرم ۱۲۶۳ھ کو نواب فوجدار محمد خاں سے استعفا لے لیا اور خوش وقت رائے کو خلعت نیابت عطا ہوا۔ ۱۷

اس کے بعد نواب فوجدار محمد خاں کا تذکرہ جو یہاں زیادہ مفید مطلب ہے ضمنی طور پر نواب سکندر بیگم ۱۸ کے ان سفرناموں کے بیان میں ملتا ہے جن میں وہ بھی ہم رکاب تھے۔ پہلا سفر

(۱۸، جنوری تا ۱۳ فروری ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۷ھ) جبل پور سے متعلق ہے ۱۹ دوسرے سفر کا اصل مقصد الٰہ آباد میں گورنر جنرل کے دربار منعقدہ یکم نومبر ۱۸۶۱ء مطابق ۲۷، ربیع الاول ۱۲۷۸ھ میں نواب سکندر بیگم کی شرکت تھی۔ اس دربار کے موقع پر ان کو، مہاراجہ سندھیا، راجہ پٹیالہ اور نواب رامپور کو ''تمغۂ نیٹی وخطاب اسٹار آف انڈیا'' عطا کیا گیا تھا۔ نواب سکندر بیگم ۲۳۴ کی جمعیت سے یکم اکتوبر ۱۸۶۱ء مطابق ۲۵، ربیع الاول ۱۲۷۸ھ کو بھوپال سے روانہ ہوئیں اور ساگر، ریوال، الٰہ آباد، بنارس، جون پور، فیض آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ اور متھرا ہوتی ہوئی ۲۲، رجب ۱۲۷۸ھ کو دہلی پہنچیں اور وہاں سے ۲۷، رجب کو روانہ ہو کر جے پور، اجمیر، نیمچہ، آگرہ اور سیور ہوتی ہوئی بھوپال واپس آگئیں۔ تاج الاقبال میں اس دورے میں انگریز حکام اور امراء کو چھوڑ کر نواب سکندر بیگم سے صرف دو اصحاب کی ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی عبدالحکیم اور دوسرے کانپور کے عبدالرحمٰن خاں مہتمم مطبع نظامی۔ ۲۰ حیات سکندری سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں نواب سکندر بیگم نے مرزا رجب علی بیگ سُرور کو بھی شرف ملاقات بخشا تھا۔ ۲۱

ہفتہ وار اخبار عالم، میرٹھ نے نواب سکندر بیگم کے اس دورے کی خبریں بڑی پابندی سے شائع کی تھیں۔ چناں چہ ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء کے جو پرچے پیش نظر ہیں ان میں سے کئی میں اس سفر کی خبریں اور انھیں ممتاز اعیان ریاست کے ساتھ نواب فوجدار محمد خاں کا نام موجود ہے۔ اس اخبار نے ۱۴، نومبر ۱۸۶۱ء کے پرچے میں اپنے ''کرم فرمائے صادق'' کے خط کے حوالہ سے الٰہ آباد کے دربار کی روداد شائع کی ہے لیکن اختصار کے خیال سے یہاں اس سے قبل کے پرچے کی خبر درج کی جاتی ہے جسے اس نے شعلۂ طور کانپور کے حوالہ سے چھاپا ہے۔

> ''اخبار اول الذکر میں درج ہے کہ جناب عفت مآب نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال مع جناب نواب گوہر بیگم صاحبہ، والدہ ماجدہ اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ ولی عہد ریاست اور نواب دولہن صاحبہ فرانسیسی جاگیردار اور جناب نواب نظیر الدولہ صاحب امراء ورؤسا باقی محمد خاں صاحب بہادر اور والا خطاب معلّٰی القاب دار المہام محمد جمال الدین خاں صاحب بہادر نائب الملک محروسۂ بھوپال اور نواب فوجدار محمد خاں صاحب براہ ریال ۲۰، اکتوبر کو رونق افروز الٰہ آباد ہوئیں۔ یہاں سے بعد حصول

خطاب وتمغہ وملاقات نواب گورنر جنرل کشور ہند مقاماتِ منصۂ ذیل کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے بطریق سیر وسیاحت رونق بخشیں گی۔

بنارس (۷ مقام)، میرزاپور (۷ مقام)، لکھنؤ (۱۰ مقام)، کانپور (۷ مقام)، دہلی (۱۰ مقام)، جے پور (۷ مقام)، جودھپور (۷ مقام)، اجمیر (۷ مقام) فقط۔'' ۲۲

اس اخبار کے مطابق ۲۳، جنوری ۱۸۶۲ء مطابق ۲۱، رجب ۱۲۷۸ھ روز پنج شنبہ کو یہ قافلہ دہلی پہنچا۔ ۲۳ نواب سکندر بیگم نے ۲۴، جنوری کو انگریز حکام کے لیے دربار کیا اور ۲۵، جنوری کو محمد وجاحت علی خاں مہتمم اخبار عالم سے ملاقات کی اور اخبار کی بہت تعریف کی۔ ۲۴

''واصلات اخبار'' کے تحت جو اندراجات ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب سکندر بیگم، نواب شاہ جہاں بیگم اور نواب مصطفی خاں شیفتہ کے علاوہ نواب فوجدار محمد خاں بھی اخبار عالم، میرٹھ کے خریدار تھے۔ یہ اخبار والیۂ بھوپال اور اعیان ریاست کا، جن میں نواب فوجدار محمد خاں شامل ہیں، بڑا خیر خواہ تھا۔ چناں چہ نواب سکندر بیگم کے زیارت حرمین شریف کے مصمم ارادے کی خبر دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''......مہتمم اخبار عالم کو یقین ہوتا ہے کہ جس قدر نیک نیت جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ اور نواب قدسیہ بیگم صاحب ہیں اور والیاں ریاست اور صاحب الملک ہیں اور جو اس قدر ملک اور دولت کے دوسرا نہیں ہے۔ علی ہذا القیاس ارکان دولت اور عمائد ریاست بھی اکثر صفات حسنہ سے متصف ہیں خصوصاً جناب دارالمہام محمد جلال الدین خاں صاحب بہادر نائب اول ملک محروسہ بھوپال اور جناب نواب نظیر الدولہ امراء دولہ باقی محمد خاں صاحب بہادر داماد جناب نواب سکندر بیگم صاحب اور جناب نواب فوجدار محمد خاں صاحب بہادر ماموں جناب بیگم صاحبہ والیہ ریاست۔ اللہ تعالیٰ اور والیانِ ریاست میں بھی ایسے عابد اور ارکان پیدا کرے فقط۔'' ۲۵

تیسرا سفر ۱۸۶۳ء کا ہے جب نواب سکندر بیگم گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے آگرے گئی تھیں۔ وہ ۱۲۴۷ افراد کے ساتھ جن میں نواب فوجدار محمد خاں بھی تھے، سرونج، گنہ، شیو پوری اور

گوالیار ہوتی ہوئی ۲۰، شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۰، فروری ۱۸۶۳ء کو سہ شنبہ کے دن آگرہ پہنچیں اور ۱۱، شوال ۱۲۷۹ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۶۳ء بروز چہار شنبہ بھوپال واپس آگئیں۔ اس سفر میں ''میر فتح پور سیکری وغیرہ'' کے ارادے کا حوالہ آیا ہے لیکن دہلی جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ۲۶

نواب سکندر بیگم کے مکہ معظمہ کے سفر (۲۲، جمادی الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۵، نومبر ۱۸۶۳ء سے ۳، جمادی الثانی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۴ء) میں بھی نواب فوجدار محدم خاں ہم رکاب تھے۔ ۲۷ اس کے بعد نواب سکندر بیگم نے گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے آگرے کا ایک اور سفر ۱۸۶۶ء (۱۲۸۲ھ) میں کیا تھا جہاں سے ۱۹، نومبر ۱۸۶۶ء کو گورنر جنرل کے دربار کے بعد ۲۳، نومبر کو وہ دہلی بھی گئی تھیں اور یکم دسمبر ۱۸۶۶ء کو آگرے واپس آگئی تھیں۔ ۲۸ لیکن اس سفر میں نواب فوجدار محمد خاں ساتھ نہ تھے اس لیے کہ ۱۶، ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ۲۹

غرض یہ کہ نواب فوجدار محمد خاں کے کم از کم ایک بار دہلی جانے کا تو ہمیں علم ہوتا ہے لیکن غالبؔ سے ملاقات کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ یہی صورت نواب سکندر بیگم کے دہلی کے دو سفر بھی پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۶ء کا زمانہ ایسا ہے کہ غالبؔ کے اردو خطوط میں بھی کسی نہج سے اس کا ذکر آسکتا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ نواب فوجدار محمد خاں کے پاس ان کا ایک قدیم قلمی دیوان موجود تھا اور نواب سکندر بیگم بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ان کو نذرانے کی رقوم بھیجا کرتی تھیں۔

نواب فوجدار محمد خاں کے صاحب زادے میاں یار محمد خاں شوکتؔ نے انشائے نور چشم اور تذکرۂ فرح بخش میں اپنے باپ کا ذکر ضمناً اور غالبؔ کا علاحدہ کیا ہے۔ ۳۰ لیکن انھوں نے بھی دونوں کے مراسم کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ ایک اور کتاب شہنشاہ نامہ کے آخر کی ایک عبارت بھی جس میں غالبؔ سے ان کے تلمذ اختیار کرنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے خالی ہے۔ اس عبارت کا جس پر لکھنے والے کا نام درج نہیں ہے ضروری حصہ حسب ذیل ہے:

''... ہم رکاب خلد نشیں نواب سکندر بیگم صاحبہ جو بتقریب ملاقات لارڈ صاحب بہادر آگرہ کو تشریف لے گئی تھیں بطریق سیر وارد شاہجہاں آباد ہوئے۔ جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بہ غالبؔ دہلوی

سے ملاقات کی اور ان کے شاگرد ہوئے۔ شوکتؔ تخلص خسر و شعرائے ہند سے پایا۔ مرزا صاحب کے جناب ممدوح سے کہا کہ آپ میرے شاگرد ہوئے۔ اگر چندے یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو فن شاعری میں آپ کو مہارت کلی حاصل ہو جاتی مگر قیام ممکن نہیں۔ بھوپال میں مولانا محمد عباس رفعت شروانی میرے دوست مرزا فاضل ادیب کامل موجود ہیں۔ فارسی زبان ان کی نہایت فصیح اہل زبان سے ملتی ہے۔ بار ہا اپنا کلام میرے پاس بھیج کر مولانا نے مجھ سے اصلاح بھی لی ہے۔ ان سے بہتر دوسرا شخص مجھے وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ آپ کو میں اجازت دیتا ہوں کہ آپ ان سے اصلاح اپنے کلام میں لے کر میرے پاس بھیجا کریں۔ جناب موصوف نے ارشاد غالبؔ پر عمل کیا۔ رسالہ گلدستۂ نرگس اور چند غزل جناب غالبؔ کے پاس اصلاح کو بھیجیں اور اصلاح لی......" ۳۱

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے نواب سکندر بیگم گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے دو مرتبہ آگرے گئی تھیں۔ ایک مرتبہ ۱۸۶۳ء (۱۲۷۹ھ) میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) میں اول الذکر سفر میں نواب سکندر بیگم یا ان کے ہمراہیوں کے دہلی جانے کا ذکر نہیں ہے جبکہ موخر الذکر سفر سے بس یہ معلوم ہے کہ وہ بطریق سیر شاہ جہاں آباد روانہ ہوئی تھیں۔ گلدستۂ نرگس ۱۲۸۰ھ کی تالیف ہے۔ ۳۲ اس کے علاوہ مندرجہ بالا حکایت میں نواب فوجدار محمد خاں کے توسط کا کوئی حوالہ نہیں ہے یہ اور اسی طرح کے دوسرے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ شوکتؔ نے ۱۸۶۶ء میں غالبؔ سے ملاقات کی ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس حکایت میں زیب داستاں کے طور پر بھی نواب فوجدار محمد خاں اور غالبؔ کے تعلقات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا حالاں کہ ابھی ان کے انتقال کو کم وبیش دو برس گزرے تھے۔ ۳۳

نواب سکندر بیگم ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۶ء) میں پیدا ہوئیں، ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۳ء) میں ان کی شادی ہوئی ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں مختار ریاست اور ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں والیۂ بھوپال ہوئیں۔ ۳۴ بالفرض نواب سکندر بیگم نواب فوجدار محمد خاں کو نذرانے کی رقوم دے کر غالبؔ کے پاس بھیجا کرتی تھیں تو اس کا آغاز ۱۲۶۳ھ سے پہلے قرین قیاس نہیں۔ اب اگر اتنا اور فرض کر لیا جائے کہ نسخۂ

بھوپال نواب فوجدار محمد خاں کو دہلی کی اسی آمد و رفت میں ملا تھا تو اس واقعے کا سال ۱۲۶۳ھ کے بعد قرار پائے گا جو صریحاً غلط ہوگا۔ لیکن اس روایت کے پایۂ ثبوت تک نہ پہنچنے کی وجہ سے یہ لازمی نہیں کہ نواب سکندر بیگم کسی اور زمانے میں جو اغلباً ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہوسکتا ہے۔ غالبؔ کی سرپرستی کرنے کی خواہش مند نہ تھیں کیوں کہ اس سلسلے میں امجد علی اشہریؔ کی یہ معاصرانہ روایت موجود ہے کہ:

> ''جناب نواب سکندر بیگم صاحب خلد نشیں والیۂ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت مرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر مرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔'' ۳۵

نواب فوجدار محمد خاں اور غالبؔ کے مبینہ مراسم بھی محض اس اعتبار سے بے بنیاد نہیں قرار دیے جاسکتے کہ نسخۂ بھوپال کے حصول کے سلسلے میں نواب سکندر بیگم کا توسط ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ نسخۂ بھوپال بہرحال ان کے پاس موجود تھا۔ اس لحاظ سے کہ یہ نسخہ ۱۲۳۷ھ میں لکھا گیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں ان کے قبضے میں آ گیا تھا، غالبؔ سے ان کے مراسم کا زمانہ اتنا پیچھے چلا جاتا ہے کہ موجودہ مآخذ زیادہ کارآمد نہیں رہ جاتے۔ یہ بھی لازمی نہیں کہ دو آدمیوں کا باہمی ربط اتنا اہم اور مستقل ہو کہ اس کا ذکر ضرور آئے اور ہر زمانے میں آتا رہے۔ کسی کتاب کے کسی کی ملکیت میں آنے سے یہ ناگزیر نہیں کہ وہ کتاب مصنف نے اس کو نذر کی ہو لیکن اس کا امکان ہوسکتا ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ کسی ممکن الوقوع روایت کی نہ تو لاعلمی کی بنا پر نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اس کے لیے دستیاب مآخذ کے محذوفات پر تکیہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کسی معاصرانہ شہادت کی مسلسل عدم موجودگی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اور جب ہمارے سامنے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ یہ مخطوطہ غالبؔ نے نواب فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا تو اس کی توثیق تو اور بھی محال ہے کہ یہ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے تیار کیا گیا تھا یا انھوں نے اپنا کاتب بھیج کر اسے نقل کرایا تھا۔

مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال میں کیمیائے سعادت رکن سوم کا ایک خوشخط قلمی نسخہ ہے۔ ۳۶ اس کے ورق اب پر ایک گلدستے میں یہ عبارت درج ہے۔

''نسخہ ہذا المعنی بہ کیمیائے سعادت رکن سوم قلمی من تصنیف حضرت محمد غزالی اقدس اللہ سرہٗ
از کتب خانۂ سکرار ذوی الاقتدار نواب فوجدار محمد خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ ودولہ وحشمتہ۔''

ورق ۲ الف پر ایک ایسے ہی گلدستے میں فوجدار محمد خاں کی ۱۲۶۱ھ کی مہر ثبت ہے۔ ورق ۲ الف سادہ ہے۔ ورق ۳ ب پر نہایت دیدہ زیب مطلا و مذہب نقشیں لوح اور جدول میں متن کا آغاز ہوا ہے۔ ورق ۴ الف پر لوح نہیں ہے لیکن جدول اور متن اسی طرح مطلا و مذہب ہے، ورق ۴ ب پر صفحہ ۳ پڑا ہوا ہے۔ متن صفحہ ۴۶۵ پر ختم ہوا ہے جبکہ صفحہ ۴۶۶ پر ایک خاصا طویل ترقیمہ ہے۔ نسخے کے آخری صفحے پر جس کا ۴۶۷ ہے کامار دابڑے میں ۱۲۶۱ھ کی مہر چسپاں ہے۔ ترقیمے کا خلاصہ یہ ہے کہ کیمیائے سعادت کا رکن سوم یعنی ربع مہلکات نواب فوجدار محمد خاں کے حکم کے بموجب ''دارالاقبال شہر تال بھوپال'' میں صاحب زادہ فیض محمد خاں اور یار محمد خاں کے مطالعے کے لیے چہارم شہر جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو بروز دوشنبہ بوقت یکم پہر تمام ہوا۔ کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے:

''..... بخط الضعیف حقیر پر تقصیر المفتقر الی الغنی العمین پیر معین الدین داد پیر
کرام الدین سارنگ پوری۔''

اسی کاتب کی لکھی ہوئی ۷۵۵ صفحات کی تقریباً ایک ایسی ہی فارسی قلمی کتاب تعبیر نامہ ہے۔ اس کا ترقیمہ خط نسخ میں ہے اور کتابت کی تاریخ نہم شہر محرم الحرام ۱۲۷۴ھ ہے۔

ان دونوں قلمی نسخوں کا خط اتنا پختہ نہیں جتنا نسخۂ بھوپال کے اس صفحے کے متن کے عکس تحریر میں ہے جو نسخۂ حمیدیہ میں شائع ہوا تھا۔ قلم بھی کسی قدر موٹا ہے لیکن یہ اختلافات نظم ونثر کی کتابت اور زمانے کے فرق کی وجہ سے ہو سکتے ہیں ورنہ انداز خط اسی طرح روشن ہے اور حروف کی کشش ملتی جلتی ہے۔ ترقیموں میں عربی فقروں کی آمیزش بھی ایک اور قریبی مماثلت فراہم کرتی ہے۔ نواب فوجدار محمد خاں کے سامان کی قلمی فہرست پر اگرچہ کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن وہ بھی بلاشبہ پیر معین الدین کی لکھی ہوئی ہے اور اس کا شکستہ خط بھی بہت کچھ اس غزل کے خط سے مشابہ ہے جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل عکس میں حاشیے میں ہے۔ اُن شواہد سے گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ وہی معین الدین نہ ہوں جنھوں نے ۱۲۳۷ھ میں نسخۂ بھوپال کے ترقیمے میں اپنے نام سے پہلے

''حافظ'' لکھا تھا۔ لیکن مختلف قلمی نسخوں کے خط کو جن میں اختلافات بھی نظر آئیں چند مماثلتوں کی بنا پر ایک ہی کاتب سے منسوب کر دینا چوں کہ آسان نہیں اس لیے ان نسخوں کا ذکر مزید تحقیق کے لیے ایک غور طلب شہادت کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس امر کا صحیح فیصلہ کہ یہ نسخے اسی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں جس نے نسخہ بھوپال لکھا تھا موخر الذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر نسخۂ بھوپال پیر معین الدین کا لکھا ہوا نہ بھی ہو تو اتنا تو تقریباً یقینی ہے کہ اس پر کتب خانۂ فوجدار محمد خاں کا اندراج اور ان کی ۱۲۶۱ھ کی مہر کی آرائش انھیں کی رہین منت تھی کیوں کہ اس کتب خانے کی اکثر موجود کتابوں پر اس عمل میں ان کا ہاتھ صاف پہچانا جاتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں پر شکستہ خط کے بعض اضافے جو تربیت یافتہ خطِ شکست کے آئینہ دار تھے اور جن پر غالبؔ کے خط کا دھوکہ رہ چکا ہے انھیں کی سرسری جنبش قلم کا نتیجہ ہوں۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ مکتوب بنام تفتہ خطوط غالبؔ مرتبۂ غلام رسول مہرؔ، ص ۲۰۲۔

۲۔ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق، تمہید ص ۵، ۶۔

۳۔ بحوالہ مکمل شرح کلام غالبؔ مرتبہ عبدالباری آسیؔ، مقدمہ ص ۲۶۔

۴۔ چند ہم عصر از عبدالحق، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۸، اس مضمون کے آخر میں یادگار بجنوری ۱۹۵۱ء کا حوالہ ہے۔

۵۔ بحوالہ ''نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں'' از نادمؔ سیتاپوری، فروغ اردو، لکھنؤ، غالبؔ نمبر ۹۶۹، حصہ ۳، ص ۵۰۔ نادمؔ سیتاپوری نے اس مضمون میں ان روایتوں کو تسلیم کرنے پر بہت اصرار کیا ہے۔ شاید انھیں کے کسی خط کی بنا پر مالک رام صاحب نے یہ لکھ دیا ہے کہ غالبؔ کے تعلقات نواب فوجدار محمد خاں سے بہت دوستانہ تھے۔ دیکھیے تلامذۂ غالبؔ، ص ۱۷۳۔

۶۔ ''دیوانِ غالبؔ قلمی، ۱۲۳۷ھ'' مترجمہ سید محمد، مجلّہ مکتبہ، حیدرآباد، جلد ۲، شمارہ ۶، نیز ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۷تا۹۔

۷۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۱۷۔

۸۔ ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۸۔

۹۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۸۔

۱۰۔ دیکھیے دیوانِ غالبؔ کا ایک اہم گمشدہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال۔

۱۱۔ اسی کتب خانے میں فولس کیپ سائز کا ایک مجلّہ متفرقات اردو قلمی ۳ ہے اس میں ۱۲۶۵ھ اور ۱۲۶۷ھ کے شمار کے مطابق نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی دو فہرستیں شامل ہیں۔ ۱۲۶۵ھ کی فہرست میں دواوین کے تحت دیوان اسدؔ غالبؔ کی جلد ۱۲، ۱۲۶۷ھ کی فہرست میں ۱۱ دیوان اسدؔ غالبؔ قلمی خوشخط ایک جلد ایک عدد درج ہے اول الذکر سے ڈاکٹر سید حامد حسین نے اپنے مضمون ''دیوان غالبؔ نسخۂ بھوپال'' کی لکھائی کتابت سے گمشدگی تک''، مطبوعہ اردو ادب علی گڑھ، غالبؔ نمبر ۱۹۶۸ء میں بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نسخۂ بھوپال ۱۲۶۱ھ میں نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں موجود تھا۔ تاہم دوسرے مخطوطوں پر ۱۲۵۵ھ کی مہر کی موجودگی اور نسخۂ بھوپال پر اس کی عدم موجودگی سے انھوں نے یہ قیاس کیا ہو کہ یہ مخطوطہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۵۵ھ کے درمیان کسی وقت نواب فوجدار محمد خاں کی ملکیت میں آیا تھا۔ اسی مضمون میں ان کا ایک طویل قیاس یہ بھی ہے کہ نسخۂ بھوپال دراصل غالبؔ کے برادر نسبتی علی بخش خاں کا تھا جن سے شیفتہؔ یا کسی اور وسیلے سے عبدالواحد مسکیںؔ سے بھوپال لائے اور پھر ان کے صاحب زادے عبدالعلی تونگر سے نواب فوجدار محمد خاں نے خود اپنے معتمد خاص محمد حنیف کے توسط سے اسے حاصل کیا۔

۱۲۔ متفرقات اردو قلمی، مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال۔

۱۳۔ متفرقات اردو قلمی، ص ۴۳، مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال۔ دراصل یہ فہرست فارسی میں ہے۔

۱۴۔ تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال مرتبہ نواب شاہجہاں بیگم، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۶ھ دفتر اول، ص ۲۶۔
۱۵۔ نواب گوہر بیگم۔
۱۶۔ تاریخ الکہ بھوپال از منشی مہدی علی، ناقص الاول ۱۳۱۴ھ ص ۵۰۔۵۹۔
۱۷۔ تاج الاقبال، دفتر دوم ص ۳ تا ۵۔
۱۸۔ اب والیہ بھوپال ہو چکی تھیں۔
۱۹۔ تاج الاقبال، ص ۱۵۔۱۸۔
۲۰۔ تاج الاقبال، دفتر دوم ص ۱۹ تا ۴۵۔
۲۱۔ حیات سکندری، دفتر تاریخ گورنمنٹ بھوپال، ۱۹۳۰ء ص ۱۵۷، ۱۵۸۔
۲۲۔ اخبار عالم، میرٹھ، ہفتم نومبر ۱۸۶۱ء مطابق سوم جمادی الاول ۱۲۷۸ھ روز پنج شنبہ، جلد ۲، شمارہ ۱، ص ۱۶۔
۲۳۔ اخبار عالم میرٹھ، بست سوم، جنوری ۱۸۶۲ء مطابق ۲۱، رجب ۱۲۷۸ھ روز پنج شنبہ، جلد ۲، شمارہ ۳۷م ص ۱۶۔
۲۴۔ اخبار عالم، میرٹھ، مورخہ ۲۰، جنوری ۱۸۶۴ء مطابق ۲۵، رجب ۱۲۷۸ھ روز پنج شنبہ، جلد ۶، شمارہ ۱۳، ص ۱۶۔
۲۵۔ اخبار عالم، میرٹھ، ۸، مئی ۱۸۶۲ء، مطابق ۸، ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ جلد ۳، شمارہ ۲۷، ص ۱۳
۲۶۔ تاج الاقبال، دفتر دوم، ص ۳۵ تا ۳۸۔
۲۷۔ تاج الاقبال، دفتر دوم، ص ۳۰، ۲۹۔
۲۸۔ تاج الاقبال، دفتر دوم، ص ۵۰، ۵۱۔
۲۹۔ تاج الاقبال، دفتر سوم، ص ۱۰۰۔
۳۰۔ دیکھیے انشائے نور چشم مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۶ھ، ص ۴۱، ۴۲ اور ۴۶ تا ۴۸ اور تذکرۂ فرح بخش، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۷۸ھ، ص ۲۸ اور ۶۶ تا ۶۹۔

۳۱۔ شہنشاہ نامہ از نواب میاں یار محمد خاں شوکتؔ، مطبع حسنی، رام پور۔ ۱۲۶۶ھ خاتمہ متصل براحوال شوکتؔ صاحب کمال ص ۱۰۳ تا ۱۱۰ اس عبارت میں شوکتؔ کی تاریخ پیدائش ۲۷، صفر ۱۲۴۸ھ (ص ۱۰۴) درج ہے لیکن غلط نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح سنہ ۱۲۵۹ھ ہے۔

۳۲۔ گلدستۂ نرگس از یار محمد خاں شوکتؔ، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۵ھ۔

۳۳۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بھی غالبؔ سے شوکتؔ کے تلمذ کو ۱۸۶۶ء کے سفر سے منسوب کیا ہے لیکن حاشیے میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کے اس قوم کا بھی ذکر کیا ہے کہ شوکتؔ کو غالبؔ سے فوجدار محمد خاں نے ملایا تھا۔ (بھوپال اور غالبؔ، ص ۲۵) ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کے قول کے لیے دیکھیے اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ص ۲۰۴۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کے تلمذ کی روایت کو نواب سکندر بیگم کے ۱۸۶۳ء کے سفر آگرہ سے منسوب کیا ہے۔ دیکھیے ان کا مضمون ''میاں فوجدار محمد خاں اور غالبؔ'' سب رس، حیدر آباد، غالبؔ نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۔

۳۴۔ تاج الاقبال، دفتر دوم ص ۶۔

۳۵۔ ایشیائی شاعری از سید امجد علی شہریؔ، طبع دوم، مطبع آگرہ، اخبار، ص ۱۳۰۔

۳۶۔ تصوف فارسی مخطوطہ نمبر ۳۱۔

(ماہنامہ ''نیادور'' لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۰ء، ص ۲۲ تا ۳۱)

◆◆◆

ڈاکٹر ابو محمد سحر

دیوانِ غالب قلمی نسخۂ بھوپال

ترمیمیں اور اضافے

اپریل ۱۹۶۹ء میں بھوپال ہی میں دیوانِ غالبؔ بخط غالبؔ کے دستیاب ہونے سے قبل نسخۂ بھوپال دیوانِ غالبؔ کا سب سے قدیم معلوم مخطوطہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے متن کی کتابت اس کے ترقیمے کے مطابق ۵، صفر ۱۲۳۷ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ معمولی حالات میں ترقیمے کی کتابت کے بعد کسی قلمی نسخے کے متن میں ایسے اضافوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا جن کے بارے میں یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ بعد میں کیے گئے ہیں۔ نسخۂ بھوپال کے متن کی کتابت اور جلد بندی کے متعلق کسی غیر معمولی صورت حال کا ہمیں علم نہیں۔ چناں چہ اس حد تک یہ یقینی ہے کہ اس کے متن میں جو کلام درج تھا وہ صفر ۱۲۳۷ھ اور اس سے پہلے کی تخلیق تھا لیکن جا بجا اس کے متن اور حاشیے میں ترمیمیں کی گئی تھیں۔ اول اول اس نسخے کی یہ خصوصیات اس لحاظ سے بڑی معلومات افزا اور دل خوش کن ثابت ہوئیں کہ غالبؔ کے کلام کا پہلے کیا حال تھا، اور بعد میں کیا ہو گیا لیکن شائقین کلامِ غالبؔ نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ نسخے کی ترمیموں اور اضافوں کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں بھی کیں۔ اس کے بعد جب کلامِ غالبؔ کی تدوین کا وہ دور آیا جسے ہم نام نہاد تاریخی ترتیب کا دور کہہ سکتے ہیں تو ان معاملات نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ چناں چہ آج نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کی نوعیت تحریر سے لے کر زمانۂ تحریر کے تعین تک کتنے ہی مسائل درپیش ہیں اور وہ بھی اس صورت

میں کہ پہلے ضروری شواہد مفقود تھے تو اب یہ نسخہ ناپید ہے۔

نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے متعلق اب تک جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ داخلی شہادتوں کے رہین منت ہیں۔ ان کی نوعیت کتابت یا زمانۂ کتابت کے بارے میں کوئی خارجی بیان تاحال منظر عام پر نہیں آیا۔ نسخے کو دیکھنے والوں نے اپنی اپنی قوتِ مشاہدہ اور استخراجِ نتائج کی صلاحیت کے مطابق ان کی مجمل یا مفصل کیفیت بیان کی ہے اور اُن کی توجیہہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی تحریروں میں فرداً فرداً مشاہدے اور استخراج نتائج کی کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں اور باہمی اختلافات بھی۔ اس بساط پر جن اصحاب کا شمار تازہ واردان میں کیا جاسکتا ہے، ان کی معلومات اگرچہ بہتر ہیں لیکن وہ مشاہدے کی دولت سے محروم ہیں۔

اس نسخے کی ترمیموں اور اضافوں کے بارے میں سب سے پہلا معلوم تاثر جسے مولانا عبدالسلام ندوی سے منسوب کرنا شاید غلط نہ ہوگا۔ معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات میں ملتا ہے۔ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں اس کی دریافت کی اطلاع دیتے ہوئے اس میں لکھا گیا ہے:

> ''ہمارے دوست عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا یعنی مرزا غالبؔ کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ بھی لکھ دیا ہے۔'' [۱]

گویا اولین تاثر یہ تھا کہ نسخۂ بھوپالی کی ترمیمیں اور اضافے کسی خوش مذاق نے غالبؔ کے مطبوعہ دیوان سے کیے تھے لیکن اس کے بعد بہت جلد بعض خصوصیات کے پیش نظر ناگزیر تذبذب کے ساتھ اُن کو غالب سے منسوب کرنے کی کوشش کی گئی۔ مفتی انوار الحق نسخۂ حمیدیہ کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> ''یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالبؔ کے پاس بھی گیا ہے اور اُن کی نظر سے گزرا ہے اور

انھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں۔ کیوں کہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر اس میں اور غالبؔ کی طرزِ تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بناء پر اُن کو غالبؔ کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ اُن کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیوں کہ اُن میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اُس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرعے کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیے پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ اُن میں بھی دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں اُن کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے۔'' ۲

حواشی میں بھی جا بجا مفتی انوار الحق نے نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں پر غالبؔ کے قلم کا قیاس کیا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر رقم طراز ہیں:

''ایسی ہی اصلاحوں سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ترمیمیں بہ ظن غالب غالبؔ کی قلمی ہیں۔'' ۳

صرف ایک حاشیے میں غالباً رواروی میں انھوں نے قیاس کے پہلو کو حذف کر کے تحریر کیا ہے۔

''متن میں اس مشہور شعر کا مصرع ثانی پہلے یوں تھا:

نہ ہوئے گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مگر حاشیے پر وہ اصلاح غالب کی قلمی موجود ہے جو اب عام طور پر متداول ہے۔'' ۴

نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بلاشبہ ایسے تھے کہ انھیں خود شاعر ہی اپنے کلام میں کر سکتا ہے۔ اس نسخے کی اکثر ترمیموں اور اضافوں کا دیوانِ غالبؔ کے متداول متن میں بجنسہٖ موجود ہونا اس کا ایک خاص اور ناقابلِ تردید ثبوت تھا لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نسخے پر ترمیمیں اور اضافے خود غالبؔ نے اپنے قلم سے کیے تھے۔ مفتی انوار الحق نے یہ قیاس محض اس بنا پر کر ڈالا تھا کہ انھوں نے ان میں اور غالبؔ کے طرزِ تحریر کے

موجودہ نمونوں میں یک گونہ مشابہت پائی تھی چوں کہ وہ اس سے پہلے یہ قیاس کر چکے تھے کہ یہ نسخہ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس لیے اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ترمیم واضافہ کے لیے وہ اس کو غالب کے پاس بھیجیں چناں چہ انھوں نے مزید قیاس یہ کیا کہ یہ نسخہ تصحیح و ترمیم کے لیے اگر کئی بار نہیں تو کم سے کم ایک بار غالب کے پاس گیا تھا۔ اس نسخے کے ایک سے زیادہ مرتبہ غالب کے پاس جانے کا احتمال مفتی صاحب کو بظاہر اس وجہ سے ہوا کہ ترمیم واضافہ میں یکسانیت نہ تھی۔ اگر چہ انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ غنیمت ہے کہ انھوں نے قلمی نسخے کو غالب کے پاس بھیجنے پر قناعت کی۔ ورنہ اُن کے طرزِ استدلال اور استخراج نتائج کو دیکھتے ہوئے قیاس آرائی کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس کی تصحیح و ترمیم کے لیے خود غالب بھوپال آئے تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے مفتی انوار الحق کی قیاس آرائیوں کو تسلیم نہیں کیا، نسخۂ بھوپال پر ان کے ایک اہم انگریزی مضمون کے اردو ترجمے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوار الحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالب کے ہاں ان نظموں کے اندراج کے لیے روانہ کیا جاتا تھا جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں مگر مفتی صاحب اس استدلال کے لیے کوئی سند اور ثبوت پیش نہیں کرتے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیے کے اضافے اور اصلاحیں خود مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے سرکارِ عالی کے محکمۂ اسناداتِ تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ اُن کی تنقیح کی اور غالب کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اور ان اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہ پایا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں۔ یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں .....'' ۵

اس کے علاوہ انھوں نے ترمیموں اور اضافوں کے بارے میں کچھ نئی اور اہم معلومات بھی فراہم کیں:

> ''حاشیے کے اضافے یقیناً غالب کے خط میں نہیں بلکہ یہ دو مختلف ہاتھوں کے ہیں۔ بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں۔ اسی خط میں عبدالعلی کا

نام لکھا ہوا ہے۔ شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کے دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق
االف پر ثبت ہے، بہت مشابہ ہیں۔ یہ دونوں کون تھے، معلوم نہیں۔ شاید میاں فوجدار
محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار ہوں گے۔ جنھوں نے غالبؔ کی تازہ غزلیں جیسے
ہی وقتاً فوقتاً ملتی گئیں حاشیے پر درج کر دیں۔'' ۶

اور بالآخر انھوں نے یہ قیاس کیا کہ نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے غالبؔ کے منتخب متداول دیوان کے کسی قلمی نسخے سے نقل کی گئی تھیں:

''یہ یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں جو فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے غالبؔ
نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ
ناممکن نہیں۔ اگر حاشیے کی غزلیں اسی انتخاب مرتبہ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخے سے نقل کی گئی
ہوں۔'' ۷

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی یہ توضیحات کچھ نامعلوم وجوہ سے معرضِ گمنامی میں پڑی رہیں زیادہ تر مفتی انوار الحق کے طرزِ تخیل کا بول بالا رہا پھر اس کے ساتھ کچھ ایسی روایتیں سامنے آتی رہیں جن کا صحیح پس منظر واضح نہ تھا۔ بظاہر یہ دو روایتیں بھی نسخۂ بھوپال کی نمایاں خصوصیات کی قیاسی توجیہات کا کرشمہ تھیں۔ مثلاً نیاز فتح پوری کا یہ خیال کہ اس نسخے کو خود غالبؔ نے حذف و اصلاح کے بعد بھوپال روانہ کیا تھا۔ ۸ یا یوسف قیصر کی یہ روایت کہ:

''فوجدار محمد خاں نے اپنے ایک خوش نویس کو بھیج کر اس کی نقل کرائی تھی۔
اس نقل کو غالبؔ نے بطریق اصلاح دیکھا۔ جہاں غلطی دیکھی اور دیکھتے وقت کسی
مصرعے یا شعر کا کوئی اچھا سا مضمون ذہن میں آ گیا تو خوشخط کو کاٹ کر اپنے قلم سے
پورا شعر یا مصرعہ لکھ دیا۔ یا کوئی غزل لکھنے سے رہ گئی یا دورانِ کتابت میں کوئی تازہ
غزل لکھی تو وہ ردیف کے اعتبار سے خوشخط دیوان کے صفحہ کے حاشیے پر اپنے قلم سے
لکھ دی۔'' ۹

اگرچہ ان روایتوں کو کلامِ غالبؔ کے ممتاز محققین نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن ان کا لب لباب بھی یہی تھا کہ نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے خود غالب کی تراوشِ خامہ کا نتیجہ تھے۔

یوسف قیصر کی روایت کے معرضِ تحریر میں آنے سے تقریباً بارہ برس پہلے جنوری ۱۹۴۴ء میں مولانا امتیاز علی عرشی نے نسخۂ بھوپال کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ ۱۹۴۵ء کے عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو میگزین میں ان کے ایک مضمون ''نسخۂ حمیدیہ کے چند اغلاط'' کی اشاعت تھی۔ ۱۰ لیکن اس سلسلے میں اُن کی تحقیق کے مفصل نتائج دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی اشاعت (۱۹۵۸ء) کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئے۔ قبل اس کے کہ ان سے بحث کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب کے ایک مضمون سے جو نسخۂ عرشی کے دیباچے کی تحریر سے پہلے شائع ہو چکا تھا، نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے خط اور زمانۂ کتابت کے بارے میں اُن کی مختصر رائے پیش کر دی جائے۔ مفتی انوار الحق کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''حواشی میں جو اشعار ہیں وہ بے شبہ غالب کے ہیں اور اصلاحوں کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ لیکن کاتب کون ہے اس کے متعلق فیصلہ کن بات (ب و بھوپال کا خطی نسخہ جس کی کتابت بتاریخ ۵، صفر ۱۲۳۷ھ مکمل ہوئی) کو دیکھے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔ اضافات و اصلاحات کے متعلق مرتب کے ایسے اقوال سے جو نقل نہیں ہوئے۔ اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب ۵، صفر ۳۷ھ کے بعد کے ہیں، مگر اس کا امکان ہے کہ کچھ اس سے قبل کے ہوں۔'' ۱۱

مولانا عرشی نے دیباچۂ نسخۂ عرشی کے ایک حاشیے میں نسخۂ بھوپال کی غزلوں اور اشعار کی تعداد کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کے مضمون کا حوالہ دیا ہے لیکن اُن کی مندرجہ بالا رائے سے بحث نہیں کی۔ یوسف قیصر کی روایت کو زیرِ بحث لانے سے تو غالباً انھوں نے بالقصد احتراز کیا لیکن سوءِ اتفاق کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا مضمون ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ چناں چہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بیان کردہ نکات سے جو مباحث پیدا ہو سکتے تھے وہ بھی اُن کے احاطۂ تحریر میں نہ آ سکے۔ انھوں نے مفتی انوار الحق کے اس قیاس سے اتفاق نہیں کیا کہ یہ نسخہ نواب فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔ بلکہ اُن کی رائے یہ ہوئی کہ یہ خود غالب کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن ترمیموں اور اضافوں کے خط کے بارے میں انھوں نے مفتی انوار الحق کے قیاس کو بڑی حد تک یقین میں بدل دیا۔ اگر چہ ترمیموں اور اضافوں کے قلم، روشنائی اور روشِ خط کے اختلافات، املا کی غلطیاں

اور عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے دستخط اُن کے نظر سے پوشیدہ نہیں رہے لیکن چوں کہ وہ اس نسخے کو نسخۂ مصنف مان چکے تھے اس لیے انھیں یہ فیصلہ کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ ترمیم واضافہ کا سارا عمل یا تو خود غالب نے کیا تھا یا اُن کے ایما سے وقتاً فوقتاً کسی اور نے بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ یہاں تک کہ بعض شکوک کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے غالبؔ کے عالم سرخوشی کا بھی سہارا لیا:

"دیوان کے متن اور حواشی دونوں میں جگہ جگہ اصلاحیں اور اضافے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم، روشنائی اور روشِ خط تینوں مختلف ہیں جس سے یقین ہوجاتا ہے کہ یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے۔ دیوان کے آخری سادہ اوراق میں بھی بعد کی کہی ہوئی غزلیں لکھی ہیں۔ مگر یہ سب ردیف یا کی ہیں۔ حک واضافے کا خط جگہ جگہ میرزا صاحب کے اس خط سے ملتا ہوا ہے جس سے ہم آشنا ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر وہ بالیقین میرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے سرخوشی یا کسی دوسری وجہ سے کسی اور سے بھی یہ کام لیا ہے۔" ۱۲

دوسرے موقعوں پر انھوں نے اس نسخے کی ترمیموں اور اضافوں کو پورے وثوق کے ساتھ غالبؔ کے قلم سے منسوب کیا ہے۔ مثلاً:

"غالب نے گرد کے اوپر غبار بنایا ہے۔"

"غالبؔ نے کاٹے بغیر پرانے لفظوں کے نیچے نئے الفاظ لکھے ہیں۔"

"ق (نسخہ بھوپال) کے کاتب نے سہواً بہار آفریں لکھا تھا۔ غالبؔ نے اپنے قلم سے آفرینا بنایا ہے۔"

"حاشیۂ ق بخطِ غالبؔ، جدا ہو جانا (سہو کتابت)"

"ق بخط غالبؔ تقھ (سہو کتابت)"۔ ۱۳

چوں کہ انھوں نے دیوانِ غالبؔ قلمی نسخہ شیرانی کے متن کے اندراجات نسخۂ بھوپال کی ترمیموں کے مطابق پائے۔ اس لیے ایک خاص فیصلہ یہ کیا کہ اول الذکر موخر الذکر کا مبیضہ ہے۔ اس طرح انھوں نے نسخہ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کا زمانہ نسخۂ بھوپال کے متن کی تاریخ

کتابت (۵، صفر ۱۲۳۷ھ اور نسخہ شیرانی کے متن کے قیاسی ۱۴ سنہ کتابت (۱۲۴۲ھ) کے درمیان متعین کر دیا۔ بلکہ اس حد تک تخصیص کر دی کہ:

"تہذیب و تنقیح کا یہ کام صفر ۱۲۳۷ھ (اکتوبر ۱۸۲۱ء) کے بعد شروع ہوا اور سفر کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۶۲ء) میں ختم ہو گیا۔" ۱۵

مالک رام صاحب کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے نسخۂ بھوپال دیکھا تھا یا نہیں لیکن اُن کی بھی ایک تحریر جو نسخہ عرشی کی اشاعت کے بعد شائع ہوئی ہے ایماء قابل ذکر ہے:

"مرتب (مفتی محمد انوار الحق مرحوم) کے خیال میں یہ اضافے خود غالبؔ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یعنی جب یہ قلمی نسخہ ان کے ملاحظے کے لیے گیا تو انھوں نے نہ صرف متن میں لکھے ہوئے کلام کی اصلاح کی بلکہ اگر کسی پرانی زمین میں کوئی نیا شعر ہو گیا تو اُسے بھی حاشیے میں لکھ دیا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی کے بارے میں مفتی انوار الحق کا یہ کہنا کہ یہ غالبؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، ٹھیک نہیں۔ ان میں سے بیشتر اضافوں کا خط غالبؔ کے خط سے بالکل نہیں ملتا۔ یہ اضافے کسی اور شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔" ۱۶

ترمیموں اور اضافوں کے بخط غالبؔ ہونے کے بارے میں مفتی انوار الحق نے عموماً اپنے قیاس کا اظہار کیا تھا۔ اس کو یقین کی شکل دراصل مولانا عرشی نے دی تھی۔ مالک رام صاحب نے کسی وجہ سے اُن کی رائے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مولانا عرشی کو خود بھی کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی رائے میں اب تھوڑی سی ترمیم کر لی ہے۔ دیگر ترمیمیں اور اضافوں کے متعلق اب اُن کا خیال ہے کہ وہ بخط غالبؔ نہ تھے:

"اس لیے اس کے باوجود کہ عام طور پر اس انداز کا حک و اضافہ بخط مصنف ہوتا ہے اور اندرونِ کلام میں قلم زدگی و اصلاح خود غالبؔ کے قلم سے ہونا چاہیے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدنما خط کے اندراجات بخط غالبؔ نہیں ہیں۔" ۱۷

لیکن یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ جب قلمی نسخہ دیکھ کر مولانا عرشی نے اس خط کو غالبؔ کا قرار

دیا تھا تو تقریباً پچیس برس کے بعد قلمی نسخے کی عدم موجودگی میں انھوں نے یہ فیصلہ کیوں کر کیا کہ یہ خط غالبؔ کا نہ تھا۔

اب ہم اس منزل پر آجاتے ہیں جہاں خود راقم الحروف کی تحقیق سے جس کا ایک اہم حصہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھولے بسرے مضمون کی دوبارہ اشاعت بھی تھی۔ کچھ ایسے حقائق رونما ہوئے جن کی وجہ سے نسخۂ بھوپال کے متعلق کئی پچھلے فیصلوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی، چناں چہ اس سلسلے کی ایک اہم کوشش ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک حالیہ مضمون ''نسخہ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے'' ہے۔ [۱۸] لیکن اس موضوع پر ممکن حد تک بھی کوئی فیصلہ کن بحث کرنے کے لیے ابھی کچھ اور شواہد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی حد تک یہ کمی حال ہی میں ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں سے پوری ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتب موصوف نے ۱۹۳۸ء میں نسخۂ بھوپال کا مطالعہ کیا تھا اور مفصل یادداشتیں بھی لے لی تھیں۔ انھوں نے نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق کے برخلاف صرف نسخۂ بھوپال کے کلام کو اس کی اصلی ترتیب اور متن وحواشی کے امتیازات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے۔ نسخۂ بھوپال کی گمشدگی کے پیش نظر یہ مطبوعہ دیوان جسے خود مرتب نے بجا طور پر نسخۂ بھوپال کی ہو بہو نقل قرار دیا ہے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق کی ترتیب کی سب سے بڑی کوتاہی یہ تھی کہ اس میں قلمی نسخے کی انفرادیت بالکل گم ہوگئی تھی۔ [۱۹] پروفیسر حمید احمد خاں کی ترتیب سے اس کے متن وحواشی آخر کے سادہ اوراق پر بڑھائی ہوئی غزلوں اور دیگر اندراجات وغیرہ کی صحیح کیفیت (جس قدر قلمی نسخے کی عدم موجودگی میں ممکن تھی) کھل کر سامنے آگئی۔ قلمی نسخے کے مشاہدے اور مطالعے کا غالباً اب کوئی اور کام پردۂ خفا میں نہیں ہے، اس کی کیفیت اور کلام کے بارے میں اگر اب بھی ہماری معلومات میں کچھ کمی رہ جاتی ہے تو وہ صرف اسی صورت میں دور ہوسکتی ہے کہ قلمی نسخہ دوبارہ مل جائے۔

ترمیموں اور اضافوں کے سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خاں کی بعض صراحتیں خاص طور سے غور طلب ہیں۔ ان کے مطابق ترمیموں اور اضافوں کے قلم اور خط میں کسی قسم کے اختلافات تھے، جنھیں انھوں نے باریک قلم خوشخط، موٹا قلم شکستہ خط، باریک قلم شکستہ خط، موٹا قلم کسی قدر خوشخط

شکستہ، موٹا قلم شکستہ اور بدخط، موٹا قلم کچھ ایسا بدخط نہیں، خوشخط، شکستہ بدخط اور بدخط اور غلط نگار کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ صرف چند موقعوں پر انھیں غالبؔ کے خط کا گمان یا یقین ہوا ہے۔ جسے انھوں نے اس طرح آشکار کیا ہے:

''نیز حاشیے پر یہ اندراج باریک قلم میں خوش خط نہیں ہے بلکہ موٹے قلم کے شکستہ خط میں ہے۔ تاہم اس خاص اضافے کو دیکھ کر یہ گمان ضرور ہوتا ہے کہ یہ اندراج غالبؔ کی تحریر سے، بہت مشابہ ہے۔'' ۲۰

اس غزل کے حاشیے پر موٹے قلم سے شکستہ خط میں ذیل کا شعر درج ہے:

مفت دل و جگر خلش غمزہ ہائے ناز
کاوش فروشی مژۂ تیز یک طرف

خاص بات اس اندراج کے متعلق یہ ہے کہ یہ غالبؔ کی تحریر سے نمایاں طور پر مشابہ ہے۔'' ۲۱

''اس غزل کے حاشیے پر یہ تین شعر درج ہیں۔ موٹے قلم سے شکستہ مگر خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔ یہ شعر غالبؔ کی تحریر معلوم ہوتے ہیں ۲۲

''یہ مصرعہ یوں بدلا ہے
نور سے تیرے ہے اس کی روشنی

اس اصلاح کا عالم یہ ہے کہ بجنسہٖ غالبؔ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔'' ۲۳

''کاتب، داستانی فی شوق طولانی، لطف یہ ہے کہ یہاں کے شعروں میں کہیں کہیں غالبؔ کی تحریر کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔'' ۲۴

''ناامیدی کو ناامید درج کیا ہے مگر پھر بھی یہ مصرع غالبؔ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔'' ۲۵

پروفیسر حمید احمد خاں نے یہ قیاس بھی کیا ہے کہ موٹے قلم والے بدخط کاتب عبدالصمد مظہر ۲۶ تھے، انھوں نے قلمی نسخے پر عبدالعلی اور عبدالصمد مظہرؔ کے علاوہ ایک اور شخص آغا علی کے دستخط بھی بتائے ہیں۔ ۲۷

اس طویل بحث وتمحیص سے غالباً یہ امور واضح ہو گئے ہوں گے کہ نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے متعلق وقتاً فوقتاً کیا کیا مشاہدات، قیاسات اور نتائج پیش کیے گئے ہیں اور ان کا کیا پس منظر رہا ہے۔ نیز یہ کہ نہ صرف استخراجِ نتائج میں بلکہ نسخے کی چشم دید کیفیت کے بیان میں بھی محققین میں جابجا اختلاف رہا ہے۔ مفتی انوارالحق نے تو نسخے کی کیفیت اتنے اختصار سے لکھی ہے کہ اگر ڈاکٹر سید عبداللطیف، مولانا امتیاز علی عرشی اور پروفیسر حمید احمد خاں کی توضیحات منصۂ شہود پر نہ آتیں تو آج ہمیں نواب فوجدار محمد خاں کی مہروں، اُن کے کتب خانے کے اندراج، کاتب نسخہ کے نام اور تاریخِ کتابت کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہوتا اور اس نسخے کی ترمیموں اور اضافوں کے باب میں چند گمراہ کن قیاسات کلامِ غالبؔ کی تحقیق کا مقدر بن جاتے۔ لیکن دوسری تحریریں بھی جامعیت اور معروضیت کی کمی کی وجہ سے ہمیں بحرِ ظلمات میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق میں جب تک ایک کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ ضمنی اور متعلقہ مواد کی چھان بین سے کام نہ لیا جائے صحیح اور دیرپا نتائج مشکل ہی سے نکل سکتے ہیں۔ نسخۂ بھوپال کے سلسلے میں ایک طرف تو ممکن الحصول شواہد کی بھی جستجو نہیں کی گئی۔ دوسری طرف استخراجِ نتائج میں احتیاط نہیں برتی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ جب ضروری شواہد دستیاب نہیں ہوتے تو محقق کو قیاس بھی کرنا پڑتا ہے لیکن تحقیقی قیاس ایسا ہونا چاہیے جو دوسرے قیاسات کا مانع ہو۔

اگر لکھنے والے کے دستخط یا کوئی اور اشارہ موجود نہ ہو تو کسی کے خط کی صحیح پہچان اکثر ایک مشکل مسئلہ ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے خط یا خطوں کی نوعیت واضح نہ تھی تو اس کو غالبؔ سے منسوب کرنے کی کیا حاجت تھی۔ بظاہر یہ محض ایک قیاس تھا جس کی بنیاد اس قیاس پر تعمیر کی گئی کہ یہ نسخہ خود غالبؔ کا تھا۔ جب نسخہ اُن کا مان لیا گیا تو ترمیم واضافہ بھی انھیں کو کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے مضمون کی دریافت سے قبل مجھے بھی ان قیاسات سے اتفاق تھا لیکن اب یہ قیاسات بہت مشکوک معلوم ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

> ”حک واضافہ کے کسی حصے کو اگر غالبؔ کے قلم کی تحریر ماننے میں تامل ہوسکتا ہے تو ان مبتدیانہ اغلاط سے پُرعبارتوں کو، یہ نہ غالبؔ کے ہاتھ کی تحریریں

ہو سکتی ہیں نہ ان کے کسی ہم نشیں کی، یہ نہ تو انھوں نے کسی سے لکھائی ہیں نہ کبھی اُن کی نظر سے گزری ہیں۔" ۲۸

غالبؔ یا کسی کی تحریر میں املا کی معمولی غلطیوں کا مل جانا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن گزشتہ سال خود غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے، اُس میں ایک آدھ جگہ سہوِ کتابت کے سوا معمولی غلطیاں بھی نہیں ہیں۔ اس کا سنہ کتابت چاہے ۱۲۳۱ھ نہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ نسخۂ بھوپال سے مقدم ہے۔ ۲۹ نسخۂ بھوپال کے بعض افسانوں میں مبتدیانہ بلکہ جاہلانہ غلطیاں تھیں اور وہ غالبؔ کے قلم سے تھیں تو اس سے قبل کے نسخے میں تو ایسی غلطیاں ضرور ہونا چاہیے تھیں۔

اگر ترمیم واضافہ کے کسی ایک حصے کے بارے میں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ غالبؔ کی نظر سے نہیں گزرا۔ تو پھر دوسرے حصوں کے بھی اُن کے نظر سے گزرنے کا کچھ ٹھیک نہیں۔ اصلیت تو یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے متن میں بعض ایسی غلطیاں تھیں جن کے درست نہ ہونے سے بھی یہی گمان ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اس کو تصحیح کی غرض سے کبھی نہیں دیکھا مثلاً

یہ سرنامہ جو بوسہ گل پیام رہا
ہمارا کام ہوااور تمھارا نام ہوا

۳۰

نظر بہ غفلت اہل جہاں ہوا ظاہر
کہ عید خلق پہ حیراں ہے قربانی

۳۱

اسی قسم کا سہوِ کتابت حاشیے کے بعض شعروں میں بھی تھا مثلاً:

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال

کے بجائے

پھر کوچے کو جاتا ہے خیال

۳۲

یا:

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا

کے بجائے

باور آیا ہمیں پانی کا جدا ہوجانا

۴۳

کتابت کی ایسی غلطیوں کا کسی کتاب میں راہ پاجانا یا باقی رہ جانا بھی خلافِ معمول نہیں لیکن واضح رہے کہ اس قلمی نسخے کے بارے میں یہ قیاس ہے کہ ترمیم و اضافہ کے لیے برابر غالبؔ کے پیش نظر تھا اور ایک اور قلمی نسخے یعنی نسخۂ شیرانی کے مسودے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ دونوں صورتوں میں یعنی ترمیم و اضافہ سے لے کر نسخۂ شیرانی کی کتابت تک کسی مرحلے پر ان غلطیوں کا درست نہ کیا جانا بعید از قیاس ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ قیاس بڑی حد تک قرین صحت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ بھوپال جس وقت بھوپال پہنچا اس میں محض متن درج تھا اصلاح اور اضافے نہ تھے۔ ۴۴

مولانا امتیاز علی عرشی اور پروفیسر حمید احمد خاں دونوں متفق ہیں کہ اس نسخے پر عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے دستخط ثبت تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے عبدالصمد مظہر کے دستخط کا ذکر نہیں کیا لیکن انھوں نے عبدالعلی کے ساتھ محمد حسین کے دستخط کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح پروفیسر حمید احمد خاں نے آغا علی کے دستخط کا ذکر کیا جس سے دیگر اصحاب کی تحریریں خالی ہیں۔ ان میں سے کسی نام کا کسی تحریر میں نہ ہونا زیادہ معنی خیز نہیں۔ مفتی انوار الحق نے ان میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ جس وقت انھوں نے قلمی نسخہ دیکھا تھا اس وقت اس پر ان لوگوں کے دستخط نہ تھے۔ اس نسخے کا ہر شاہد جو کچھ دیکھتا ہے یا جس بات کو قابل ذکر سمجھتا ہے اس کا پتا دے دیتا ہے اور دیگر باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے اس نوع کی ہر صراحت کو خواہ وہ سب کے یہاں موجود نہ ہو صحیح سمجھنا چاہیے۔

ترمیموں اور اضافوں کا زمانہ متعین کرنے کے لیے ان ناموں کی تحقیق فیصلہ کن ثبوت فراہم کرسکتی ہے۔ ان میں سے عبدالصمد مظہر کے بارے میں یہ ثابت ہوچکا ہے کہ وہ بیسویں صدی

کے اوائل میں ریاست بھوپال کے ایک عہدہ دار تھے۔ ۳۵ عبدالعلی اور محمد حسین کون تھے جنھوں نے اس نسخے پر دستخط کیے تھے یا ترمیم و اضافہ کیا تھا لیکن اس سلسلے میں بعض معلومات سے اتنا تو طے ہو ہی سکتا ہے کہ اس نسخے پر ترمیم و اضافہ کا زمانہ بعد کا ہے اور یہ مختلف لوگوں نے بھوپال ہی میں کیے تھے۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے عبدالصمد مظہر کے متعلق صرف اس قدر انکشاف کیا تھا کہ ''ورق ۲۹ الف کے حاشیے میں بار یکے کے اندر لکھا ہے، محمد عبدالصمد مظہر'' ۳۶ اس کی وجہ سے پہلے مجھے صرف یہ خیال ہوا کہ نسخے کے اس صفحہ پر عبدالصمد مظہر نے اپنے دستخط کر دیے ہوں گے اور میں نے مولانا عرشی کی صرف اس رائے کی تردید پر اکتفا کی کہ یہ نسخہ عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا تھا۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں سے معلوم ہوا کہ نسخے کے حاشیے پر ''محررہ عبدالصمد مظہر'' لکھا ہوا تھا۔ ۳۷ چوں کہ ''محررہ'' کا لفظ بڑا نتیجہ خیز تھا اور یہ طے کرنا مشکل تھا کہ عرشی صاحب نے ''محررہ'' کو ''محمد'' پڑھا یا پروفیسر حمید احمد خاں نے ''محمد'' کو ''محررہ'' نیز طباعت کی غلطی کا بھی احتمال تھا۔ اس لیے میں نے احتیاطاً پروفیسر حمید احمد خاں سے رجوع کیا۔ موصوف میرے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے بھوپال کے قلمی نسخے سے جو اشارات لیے تھے وہ ناکافی ہونے سے قطع نظر، نہایت احتیاط سے لیے گئے تھے۔ مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۱۸ پر قلمی نسخے کی اکتالیسویں غزل درج ہے۔ اس غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کے حاشیے پر میرا نوٹ بڑی وضاحت سے ہے، محررہ عبدالصمد مظہر۔ میرے مملوکہ نسخۂ انوار الحق میں میرا لکھا ہوا اس قسم کا ہر نوٹ قلمی نسخے کے اندراجات کی ہو بہو نقل ہے۔ اس لیے آپ بالیقین یہ قرار دے سکتے ہیں کہ قلمی نسخے کے حاشیے کا اندراج ''محررہ ... الخ'' ہے۔ یعنی لفظ ''محررہ'' عبدالصمد مظہر کے نام سے پہلے وہاں موجود ہے۔ میں نے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔'' ۳۸

''محررہ عبدالصمد مظہر'' کا مطلب یہ ہے کہ عبدالصمد مظہر نے صرف اپنے دستخط نہیں کیے تھے بلکہ اشعار بھی لکھے تھے اور اگر کچھ اور اضافے نہیں تو کم از کم اس صفحے کے اضافے جس پر یہ

اندراج تھا، بلاشبہ اُن کے قلم سے تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں اسی خط میں عبدالعلی کا نام لکھا ہوا ہے۔'' ۳۹ میں نے اس مضمون کے مطالعے سے قبل دیباچہ نسخۂ عرشی کی صراحت کے پیش نظر بھوپال کے عمائد ریاست میں اس نام کے دو اصحاب کا ذکر کیا تھا ایک عبدالعلی تونگر جن کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا اور دوسرے منشی سید عبدالعلی خان جو ۱۳۰۶ھ میں بقید حیات تھے، اور یہ قیاس کیا تھا کہ مخطوطے پر انھیں دونوں میں سے کسی ایک نے دستخط کیے ہوں گے۔ عبدالعلی تونگر کے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ نکتہ غور طلب ہے کہ شاعر اپنے نام سے زیادہ تخلص سے چمٹا رہتا ہے۔ ق (نسخۂ بھوپال) کے عبدالعلی نے اپنے دستخط کے ساتھ کہیں بھی تونگر نہیں لکھا۔'' ۴۰ اس کے برخلاف دوسرے عبدالعلی شعر میں بھی عبدالعلی لکھتے تھے۔ تفسیر فتح البیان مولفہ نواب صدیق حسن خان کے قطعۂ تاریخ تالیف میں اُن کا ایک شعر ہے:

کمترین بندگان ایزدی عبدالعلی
کز حریم حرمتش برذروۂ حرمت رسید

ان کے والد قاضی سید امجد علی متوطن قصبہ شجاعلپور جو خوش نویس بھی تھے اندور ریذیڈنٹی کے میر منشی تھے۔ پھر پرگنہ بیرسیہ کے عامل رہے لیکن کسی رنجش کی وجہ سے ۱۲۷۴ھ میں مستعفی ہو کر بھوپال آگئے۔ منشی سید محمد عبدالعلی خاں مختلف عہدوں پر ترقی کے بعد ۱۳۰۰ھ میں ''اعلیٰ عہدۂ نیابت دوم ریاست'' پر فائز ہوئے۔ یہ مولوی محمد نواز اور مولوی سید عبداللہ پنجابی کے شاگرد تھے اور انھوں نے ''خطوط نسخ و نستعلیق وشکستہ'' بھی مختلف استادوں سے سیکھے تھے۔ صاحب آثار الشعراء کے الفاظ میں:

''منشی صاحب موصوف نے ہنگام طفلی مدرسۂ انگریزی قصبہ سیہور میں مولانا محمد نواز صاحب مدر اس مدرسہ سے کتب عربی و فارسی وغیرہ اور مدرسۂ ہندی میں حساب و ہندی حاصل کی۔ بعد کو بھوپال میں آ کر مولوی سید محمد عبداللہ صاحب پنجابی سے ریاضی و ہیئت و جغرافیہ و تفسیر و فقہ و حدیث میں تلمذ رہا اور خطوط نسخ و تعلیق و شکستہ

میں مختلف استادوں سے اصلاح لی۔'' ۴۱

نواب فوجدار محمد خاں کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکت نے انشائے نورِ چشم میں مولوی محمد نواز کے نام نواب فوجدار محمد کا ایک فارسی خط اس تمہید کے ساتھ نقل کیا ہے:

''مولوی محمد نواز صاحب مرحوم مدرس مدرسۂ چھاؤنی سیہور نے بہ سبیل ہدیہ آم بھیجے، وہ آم تمام کھٹے نکلے، جناب والد صاحب قبلہ نے یہ خط بنام مولوی صاحب رقم فرمایا۔'' ۴۲

''مولوی سید محمد عبداللہ پنجابی بھی غالباً وہی ''مولوی عبداللہ'' ہیں جن کی تحویل میں نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی عربی، فارسی اور اردو کتابیں رہتی تھیں۔'' ۴۳

منشی سید عبدالعلی کے یہ حالات اور روابط اس قیاس کے لیے بظاہر کافی ہو سکتے ہیں کہ نسخۂ بھوپال کے بعض اضافے انھیں کے قلم سے تھے لیکن جب تک نسخۂ بھوپال کے متعلقہ اندراجات اور اُن کی تحریر کا کوئی مصدقہ نمونہ سامنے نہ ہو کوئی آخری بات کہنا تحقیقی احتیاط کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اسی زمانے کے لوگوں میں بھوپال ہی میں عبدالعلی نام کے کم سے کم دو اور اصحاب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۴۴ چناں چہ نسخۂ بھوپال والے عبدالعلی کی شخصیت کے تعین کے بجائے اُن کی کی ہوئی ترمیموں اور اضافوں کے زمانے کے تعین پر اگر زیادہ توجہ صرف کی جائے تو یہ شاید حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔

مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال میں فارسی کی ایک طویل قلمی مثنوی ہے جس کی جلد سے ملحق موٹے کاغذ کے ورق اپر پنسل سے ''محاربۂ کابل'' لکھا ہوا ہے۔ متن سے نہ تو مثنوی کا نام معلوم ہوتا ہے اور نہ مثنوی نگار کا۔ مثنوی میں جنگ افغانستان کے واقعات نظم کیے گئے ہیں۔ کتابت خوشخط نستعلیق ہے۔ مثنوی کے دو دفتر ہیں۔ پہلا دفتر ۱۲۵۸ھ میں تمام ہوا ہے:

بانجام این نامہ بر زد قلم
بتاریخ سالش بدنیساں رقم
زہجرت ہماں در شمرون گذشت
ہزارہ دو صد سال و پنجاہ و ہشت

دوسرا دفتر اور پوری مثنوی ۱۲۶۰ھ میں تمام ہوئی جس کا اظہار بھی مثنوی نگار نے آخر میں اس طرح کیا ہے:

به دریائے معنی شدم غوطہ خور
به سہ سال اندوختم ایں گہر
زہجرت بتاریخش اندر شمار
به دوشش صد آمد فزوں سی دو بار

اس کے بعد درمیان میں دوہری لکیریں کھینچ کر عبدالعلی نے منظوم ترقیمہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نسخہ نواب فوجدار محمد خاں کے صاحب زادے یار محمد خان شوکت کے حکم سے ۱۸، ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ بروز جمعہ مکمل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

بخط خفی و حروفِ جلی
نوشت است ایں نامہ عبدالعلی
وہ وہشت ذیحجہ آدینہ روز
بشد ختم ایں نامۂ دلفروز
نود پنج و دو صد فزوں بر ہزار
سن اہلِ اسلام. دور شمار
بفرمان نواب شوکت مآب
بہادر جواں مرد عالی جناب
کہ یار محمد بود نام آں
فروزندہ در دہراز لفظ خاں
الٰہی باقبال ماند مدام
برادرنگ شوکت بصد احتشام

۴۵

اس سے ظاہر ہے کہ عبدالعلی نام کا کوئی شخص تھا، جو خوش نویس بھی تھا اور یار محمد خان سے تعلق رکھتا تھا۔ چناں چہ نسخۂ بھوپال پر کچھ ترمیمیں اور اضافے اسی نے منتقل کیے ہوں گے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ''محمد حسین'' کے متعلق اس طرح صراحت کی ہے:

''متن کے ورق سے پہلے سادہ اوراق میں سے ورق ا، الف کے بائیں گوشے کے سرے پر ٦٦/ق درج ہے۔ اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے اردو ادب/ ااا اور پھر کچھ نیچے ۵۸ء اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں (محمد حسین) لکھا ہوا ہے۔''

شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کے دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق ا الف پر ثبت ہے بہت ہی مشابہ ہیں۔'' ۴۶

''ادب اردو/ اا کی حقیقت تو ابو محمد صاحب کے مضمون ۴۷ دیوان غالب نسخۂ بھوپال، چند انکشافات سے کھل کر سامنے آگئی ہے۔ انھوں نے مدھیہ پردیش آرکاوز بھوپال میں حمیدیہ لائبریری بھوپال کی قدیم فہرست کتب اردو قلمی ڈھونڈ نکالی ہے جس میں ص ا پر ادب اردو قلمی کے تحت اس مخطوطے کو اا دیا گیا ہے ٦٦ء/ق کے لیے دونوں امکانات ہیں۔ ممکن ہے ١٨٦٦ء ہو یا یہ قلمی کتب کے Accession رجسٹر میں ٦٦ پر ہو۔ لیکن اس زمانے کے کتب خانوں میں Accession رجسٹر کا رواج ہوتا بھی تھا؟ ۵۸ء کے ساتھ ایسا کوئی قرینہ نہیں کہ اُسے کتاب کا نمبر قرار دیں۔ یوں بھی ایک کتاب کے متعدد نمبر نہیں ہو سکتے۔ یہ غالباً ۵۸ء ہے۔ محمد حسین کتب خانے کا کوئی فرد ہو سکتا ہے جس نے ١٨۵٨ء میں اس جلد پر یہ نمبر درج کیے۔'' ۴۸

ڈاکٹر عبداللطیف کے مضمون میں نمبروں کے بعد جو نشان ہے وہ دراصل ''نمبر'' کی شکستہ صورت ہے۔ اس پر سنہ عیسوی کا قیاس درست نہیں۔ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال کی پرانی کتابوں پر اکثر نمبر اسی طرح درج ہیں اور ایک کتاب پر ایک سے زیادہ نمبر بھی ملتے ہیں۔

ایسے دستخط سے جو کسی اور جگہ کیا گیا ہو شکستہ خط کے اضافوں کی پہچان پر اگرچہ پورا یقین

نہیں ہوسکتا لیکن ڈاکٹر عبداللطیف نے اُن کو محمد حسین کے دستخط سے بہت ہی مشابہہ قرار دیا ہے۔ یوں تو غالبؔ کے اردو اور فارسی خطوط میں بھی محمد حسین نام کے کئی اصحاب کا پتا چلتا ہے لیکن نسخۂ بھوپال سے اُن کے ربط کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ بھوپال کے تعلق سے محمد حسین کی شخصیت کا تعین کرنا یا نسخۂ بھوپال کے بعض اضافوں کو اُن سے منسوب کرنا عبدالعلی سے بھی زیادہ دشوار مسئلہ ہے۔ تاہم اس سلسلے میں بھی جو شواہد میرے سامنے آئے ہیں اُن کو پیش کر دینا غالباً زیادہ غیر متعلق نہ ہوگا۔

محمد حسین نام کے ایک کاتب کی لکھی ہوئی دو قلمی کتابیں بھی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال میں موجود ہیں۔ ایک کتاب ''عافیہ شرح شافیہ'' ہے جس کے نام کے نیچے ''از کتب خانہ مختار الدولہ محمود خاں بہادر ثابت جنگ'' درج ہے اور ''محمد عثمان خاں خلف مختار الدولہ محمود خاں بہادر ثابت جنگ'' کی ۱۲۸۹ھ کی مہر ثبت ہے۔ آخر میں کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے:

فدوی شیخ محمد حسین عرف غلام حسین ولد شیخ محمد منور ابنِ شیخ محمد...... ساکن و متوطن قریہ موضع کرسکھری معمولہ پرگنہ نجیب آباد۔ ۴۹

دوسری کتاب نواب جہانگیر محمد خاں دولہؔ کا اردو دیوان ہے۔ اس کے ایک سادہ صفحے پر شکستہ خط میں محمد حسین کا نام مع ولدیت درج ہے۔ دیوان کا اولین کاتب گنپت رائے ہے۔ جس نے ۱۲۶۹ھ میں اس کا کوئی نسخہ تیار کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گنپت رائے کے لکھے ہوئے نسخے کو محمد حسین نے دوبارہ لکھا ہے اور گنپت رائے کا ترقیمہ بھی درج کر دیا ہے اور اس کے بعد کچھ غزلیں اضافہ کی ہیں۔ شروع کے چند صفحات زیادہ خوشخط ہیں لیکن پورا نسخہ ایک ہی کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں غالباً ''بقلم خاکسار محمد حسین'' بھی لکھا تھا لیکن ملحقہ ورق کے چپک کر علیحدہ ہونے کی وجہ سے اس اندراج کے کچھ اجزاء مقابل کے صفحہ پر منتقل ہو گئے ہیں اور صاف پڑھے نہیں جاتے۔

نسخۂ بھوپال کے کاتب نے ترقیمے میں اپنا نام حافظ معین الدین لکھا تھا۔ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال میں کیمیائے سعادت رکن سوم اور تعبیر نامہ کے عمدہ خوش خط قلمی نسخے ہیں۔ اُن کے ترقیموں میں کاتب نے اپنا نام پیر معین الدین سارنگپوری لکھا ہے۔ نواب فوجدار محمد خاں کے

سامان کی ایک قلمی فہرست میں اسی کاتب کے شکستہ خط کا نمونہ بھی ملتا ہے۔ یہ کاتب نواب فوجدار محمد خاں کا متوسل تھا۔ اس کے خوش خط تحریر اور شکستہ خط اور نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کے متن و حاشیہ کے عکس (مشمولہ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق) میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ۵۰

نسخۂ بھوپال اگر دستیاب ہوتا تو ان صفحات کی تحریروں کے نمونوں سے اس کے مندرجات کا مقابلہ کر کے تھوڑی سی دیر میں یقینی نتائج اخذ کیے جا سکتے تھے۔ جہاں آج اس کی گمشدگی سوہانِ روح ہے وہاں اس پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نسخے پر کام کرنے والوں نے آنکھ اٹھا کر بھی اس متعلقہ مواد کو نہیں دیکھا۔ جو اس کتب خانے میں موجود تھا جس میں یہ نسخہ تھا۔ تاہم عبدالعلی اور عبدالصمد مظہر کے بارے میں نئی معلومات کی بنا پر یہ خیال شاید ہی حقیقت سے دور ہو کہ نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں بعد میں کیے تھے، یہاں تک کہ کچھ اضافوں کا تعلق بیسویں صدی کے اوائل سے تھا۔ البتہ اس میں اتنی گنجائش رکھنا ضروری ہے کہ جب تک یہ نسخہ غالبؔ کی دسترس میں تھا کچھ ترمیمیں اور اضافے خود اُن کے قلم یا ایما سے کیے گئے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس نسخے کو بہ نظرِ تصحیح دیکھنا اُن کا مقصد نہ تھا۔

''معارف'' کے شذرات کے مطابق نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے مطبوعہ غزلوں سے کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا قیاس ہے کہ اُن کا ماخذ ۱۲۴۸ھ کے انتخاب کا کوئی قلمی نسخہ تھا۔ مولانا عرشی نے نسخۂ شیرانی کو نسخۂ بھوپال کا مبیضہ قرار دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ترمیم و اضافہ شدہ نسخۂ بھوپال نسخۂ شیرانی کا مسودہ تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا تازہ ترین خیال یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کی ترمیمیں اور اضافے نسخۂ شیرانی کی کسی نقل سے کیے گئے تھے۔ مطبوعہ دیوانِ غالبؔ سے نقل کا خیال تسلیم کرنے میں یہ قباحت ہے کہ نسخۂ بھوپال میں سارا مطبوعہ کلام شامل نہیں تھا۔ ۱۲۴۸ھ کے انتخاب کی صراحت نظامی بدایونی کے اس قول پر مبنی ہے کہ انھوں نے دیوانِ غالبؔ کا ایک ایسا نسخہ دیکھا تھا جس میں دیباچے کی تاریخ ۲۴، ذیقعدہ ۱۲۴۸ھ لکھی ہوئی تھی ۵۱ لیکن آج تک یہ نسخہ کسی اور کی نظر سے نہیں گزرا۔ مولانا عرشی نے نسخۂ رام پور کو جس کی تاریخ کتابت معلوم نہیں، اسی ناپید نسخے کا پہلا ''ایڈیشن'' قرار دیا ہے۔ ۵۲ لیکن اب تک کسی ایسے قلمی نسخے سے نسخۂ بھوپال کے کلام کے مقابلے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ ماننے میں بھی کہ نسخۂ بھوپال کی

ترمیمیں اور اضافے نسخۂ شیرانی یا اس کی کسی نقل سے کیے گئے تھے۔ وہی رکاوٹ ہے جو مطبوعہ دیوان کے سلسلے میں ابھی بیان کی گئی۔ کیوں کہ نسخۂ شیرانی کا بھی کل کلام نسخۂ بھوپال میں درج نہیں تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس قباحت کو دور کرنے کے لیے یہ قیاس کیا ہے کہ نسخۂ شیرانی کا یہ کلام کاتبوں کی بداحتیاطی سے نقل نہیں ہوا۔ یا پھر نسخۂ شیرانی کی جو نقل انھیں ملی تھی وہ موجودہ نسخے کے مقابلے میں ناقص تھی۔ ۵۳ لیکن قیاس آرائی میں اس طرح کا استثنا قابل قبول سمجھا جائے تو ہر بے ربطی میں ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔

نسخۂ شیرانی کا متن نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے مطابق بتایا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اول الذکر کے متن میں کچھ غزلیں زیادہ ہیں اور درمیان اور آخر کے کچھ اوراق کے نقصان کی وجہ سے متن کی مکمل کیفیت معلوم نہیں۔ قاضی عبدالودود نے نسخۂ شیرای اور نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ مفتی انوارالحق کے مقابلے کے جو نتائج پیش کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں اختلافات بھی ہیں۔ ۵۴ لیکن بعض اصحاب کے مقابلے میں لغزشیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی نے نسخۂ شیرانی کی حسب ذیل آٹھ غزلیں نسخۂ بھوپال سے ''غیر حاضر'' بتائی ہیں۔

۱۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
۲۔ شب اختر قدح عیش نے محمل باندھا
۳۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
۴۔ عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
۵۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
۶۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
۷۔ رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
۸۔ خودفروشی ہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے ۵۵

لیکن نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ مفتی انوارالحق نسخۂ عرشی اور نسخۂ حمیدیہ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق ان میں سے پہلی، دوسری اور آٹھویں غزل نسخۂ بھوپال میں موجود تھیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے نسخۂ عرشی پر انحصار کر کے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کی غزلوں کی ترتیب کے فرق کی

نشاندہی کی ہے لیکن نسخۂ حمیدیہ (حمید احمد خاں) کے مطابق نسخۂ بھوپال کے آخر کی سات غزلیں نسخۂ شیرانی میں اسی ترتیب سے درج ہوئی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ نسخۂ شیرانی میں ان کے درمیان دوسری غزلیں بھی لکھی گئی ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ (حمید احمد خاں) اور نسخۂ شیرانی (فوٹو آفسٹ) کے مقابلے سے صحیح کیفیت سامنے آسکتی ہے۔ لیکن چوں کہ فی الحال مجھے اس کا موقع نہیں اس لیے فرض کر لیتا ہوں کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات چند غزلوں کو چھوڑ کر نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کے مطابق ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کے باوجود ان دونوں نسخوں میں مسودے اور مبیضے کا رشتہ لازمی طور پر ثابت نہیں ہوسکتا۔

دیوانِ غالبؔ کے کئی قلمی نسخوں کے وقتاً فوقتاً برآمد ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کی اولین ترتیب کے بعد اس کے متعدد قلمی نسخے نئی نئی ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ تیار ہوتے رہے ہیں۔ لازمی نہیں کہ جو قلمی نسخے آج ہمارے علم میں ہیں ان کے سوا دوسرے قلمی نسخے نہ تھے۔ چناں چہ دو معلوم قلمی نسخوں کے مندرجات کی یکسانیت اس کا فیصلہ کن ثبوت نہیں ہوسکتی کہ ایک قلمی نسخہ دوسرے سے نقل کیا گیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں مسودے اور مبیضے کا تعلق نہ تھا بلکہ اول الذکر کے ترمیم و اضافہ اور موخر الذکر کے متن کی تسوید مشترک ماخذ یا ذرائع کا نتیجہ تھی۔ ایک کے متن کی کتابت چوں کہ ہو چکی تھی اس لیے اس میں ترمیمیں اور اضافے ہوتے رہے، اور دوسرا صاف لکھا گیا۔ چوں کہ ترمیموں اور اضافوں کا اصل سرچشمہ خود شاعر کی ذات تھی اس لیے دو کیا دو سے زیادہ قلمی نسخوں کے ترمیم شدہ متن میں مطابقت یقینی تھی، خواہ اُن کی کتابت جداگانہ طور پر ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔

نسخۂ بھوپال کی ترمیموں اور اضافوں کا زمانۂ تصنیف اس میں شک نہیں کہ نسخۂ شیرانی کے متن کی تکمیل کتابت سے پہلے کا ہے لیکن نسخۂ بھوپال پر اُن کا ایک بڑا حصہ اس کے بعد منتقل کیا گیا تھا۔ اس خوشخط قلمی نسخے پر قطع و برید غالباً اس وجہ سے کی گئی کہ غالبؔ نے اپنے دیوان کے متداول انتخاب کے دیباچے میں سختی سے اس کی تاکید کر دی تھی کہ حذف شدہ کلام کو اُن سے منسوب نہ کیا جائے۔ یوں تو یہ کام مختلف اوقات میں ہوا اور ایک سے زیادہ ہاتھوں نے کیا۔ شاید ان کا ماخذ بھی ایک نہ تھا لیکن کسی ایک وقت جو آخر کے صفحات پر اضافوں کا ہوسکتا ہے کوئی ترمیم شدہ بیاض یا قلمی نسخہ

جس میں نسخۂ شیرانی کے متن کی بعض غزلیں شامل نہ تھیں ناقل یا ناقلین کے پیش نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کے اوپر کے حاشیے میں ''مقابلہ کردہ شد'' اور جن چند غزلوں کی ترمیم شدہ شکل کسی اور صفحے پر درج کی گئی تھی ان کے متن کے مقابل ''مکرر نوشتہ شد'' لکھا ہوا تھا۔ ۵۶ آخر کے صفحات کے اضافوں کے بعد کاتب کے اندراج کی مفتی انوار الحق اور پروفیسر حمید احمد خاں نے کوئی خبر نہیں دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے صرف اتنا لکھا ہے کہ:

''ان کے اختتام پر کاتب نے اسی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا۔''

لیکن مولانا عرشی کے مطابق ان کے آخر میں لکھا تھا:

''دیکھ تو عکس قد یار لب جو پر سے۔ تمام شد، کار من نظام شد۔ رب یسر و تمم بالخیر۔''

اس اندراج سے بھی مقابلے کے کام سے فراغت پر مسرت کا اظہار ہوتا ہے جو کسی قدر طفلانہ بھی ہے۔ غالب کی سرکردگی میں اس طرح کے اندراج کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ چناں چہ اس وقت بھی یہ کام آزادانہ طور پر ہوا تھا۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء، شذرات، ص ۱۱۶۔

۲۔ دیوانِ غالب، جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ، تمہید از مفتی انوار الحق، ص ۶۔

۳۔ ایضاً، حاشیہ: ص ۱۷۴۔

۴۔ دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیہ، تمہید از مفتی انوار الحق حاشیہ ص ۱۷۶۔

۵۔ دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ مترجمہ سید محمد، مشمولہ ''نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبداللطیف'' از راقم الحروف، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا انگریزی مضمون سہ ماہی مسلم ریویو کلکتہ بابت جنوری ۱۹۲۹ء میں اور اردو ترجمہ پہلی بار مجلہ مکتبہ، حیدرآباد، جلد ۲، شمارہ ۶ میں شائع ہوا تھا۔

٦۔ ایضاً ص ۹۔

۷۔ دیوانِ غالبؔ قلمی ۱۲۳۷ھ مترجمہ سید محمد، مشمولہ ''نسخۂ بھوپال'' اور ڈاکٹر سید عبداللطیف از راقم الحروف، ''ہماری زبان'' علی گڑھ یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا انگریزی مضمون سہ ماہی مسلم ریویو کلکتہ بابت جنوری ۱۹۲۹ء میں اور اردو ترجمہ پہلی بار مجلہ مکتبہ حیدر آباد جلد ۲ شمارہ ٦ میں شائع ہوا تھا۔ ص ۹۔

۸۔ نگار، فروری ۱۹۳۱ء، بحوالہ مکمل شرح کلامِ غالبؔ مرتبۂ عبدالباری آسی، مقدمہ ص ۳٦

۹۔ غالبؔ کے پانچ شاگرد از یوسف قیصر، قسط ایک، ''ندیم'' بھوپال، ۵، فروری ۱۹۵٦ء بحوالہ نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں از نادم سیتاپوری، فروغ اردو، لکھنؤ، غالبؔ نمبر ۱۹٦۹ء، حصہ ۳، ص ۵۰۔

۱۰۔ مکتوب جناب اکبر علی خاں از رام پور بنام راقم الحروف مورخہ ۲۵، نومبر ۱۹٦۸ء، اب یہی مضمون نظرِ ثانی کے بعد صحیفہ لاہور غالبؔ نمبر ۱۳ اور نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹٦۹ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ دیوانِ غالبؔ کے دو نسخے، از قاضی عبدالودود، معاصر ۱۲ (پٹنہ) ص ۱۳۔

۱۲۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ٦۷۔۷۷۔

۱۳۔ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی اختلاف نسخ ص ۴۰۲، ۴۰۹، ۴۳۱، ۴۳٦۔

۱۴۔ نسخۂ شیرانی کے متن کی کتابت کا یہ سنہ عرشی صاحب نے اس بنیاد پر نکالا ہے کہ اس کے حاشیے کی ایک غزل کے اوپر ''از باندہ فرستادہ لکھا ہوا ہے۔'' دیکھیے نسخۂ عرشی دیباچہ، ص ۲۰۔

۱۵۔ نسخۂ عرشی دیباچہ ص ۲۰۔

۱٦۔ گل رعنا، غالب کا گمشدہ انتخابِ کلام، از مالک رام، نذرِ ذاکر (۱۹٦۸ء) ص ۴۰۲، ۴۰۳۔

۱۷۔ نسخۂ حمیدیہ کی فروگزاشتیں نسخۂ بھوپال کی روشنی میں، از امتیاز علی عرشی، نیا دور، لکھنؤ، مئی ۱۹٦۹ء، ص ۵۔

۱۸۔ نیادور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۳ تا ۱۱۔
۱۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''نسخۂ حمیدیہ اور اس کی اہمیت'' از راقم الحروف، نگار پاکستان، کراچی، جون، ۱۹۶۹ء۔
۲۰۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۳۰۔
۲۱۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۱۲۶۔
۲۲۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۱۴۳، ۱۴۴۔
۲۳۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۱۳۳۔
۲۴۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۲۸۷۔
۲۵۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۲۸۸۔
۲۶۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، دیباچہ ص ۲۹۔
۲۷۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، حاشیہ ص ۱۳۰۔
۲۸۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے از ڈاکٹر گیان چند جین، نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۷۔
۲۹۔ اس قلمی دیوان کو بخط غالب ماننے میں ترقیمے کی بنا پر تامل نہیں ہوسکتا ورنہ محض خط کی شناخت کا میں زیادہ قائل نہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۳۵ھ ہونا چاہیے لیکن ابھی اس قیاس کا جائزہ لینے کا مجھے موقع نہیں ملا۔
۳۰۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق ص ۴۰۔
۳۱۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق ص ۲۱۵۔
۳۲۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں ص ۴۷۔
۳۳۔ عکس مشمولہ نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ مفتی انوار الحق۔
۳۴۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے، نیادور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔
۳۵۔ دیکھیے دیوانِ غالب کا ایک اہم گم گشتہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال از راقم الحروف، نیادور، لکھنؤ، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۶۳۔

۳۶۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۷۷۔
۳۷۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں، ص ۶۴۔
۳۸۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۲۵، مارچ ۱۹۷۰ء، از لاہور۔
۳۹۔ دیوانِ غالب قلمی ۱۲۳۷ھ مترجمہ سید محمد، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔
۴۰۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے از ڈاکٹر گیان چند جین، نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۹۔
۴۱۔ آثار الشعراء از حافظ سید محمد ممتاز علی حافظ ۱۳۰۶ھ، ص ۱۵۳، ۱۵۴۔
۴۲۔ انشائے نور چشم، مطبع نظامی، کانپور، ص ۴۴۔
۴۳۔ متفرقاتِ اردو قلمی ۸، ص ۳۳، مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال۔
۴۴۔ آثار الشعراء، ص ۱۰۱، ۲۰۳۔
۴۵۔ محاربۂ کابل، تاریخ فارسی قلمی ۷۰، مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال۔
۴۶۔ دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ مترجمہ سید محمد، ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۹۔
۴۷۔ ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۴، ۵، (حاشیہ ماخذ)۔
۴۸۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے از ڈاکٹر گیان چند جین، نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۔ ڈاکٹر جین صاحب نے ''مدھیہ پردیش آرکائوز'' سہواً لکھ دیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں ''محکمہ آثار قدیمہ'' لکھا ہے جس سے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ مراد ہے۔ اسی مضمون کے ایک حاشیے میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے اپنے مضمون ''نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبداللطیف'' مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مئی ۱۹۶۹ء، میں مجلّہ مکتبہ حیدرآباد کے متعلقہ پرچے کا نمبر جلد ۶، شمارہ ۲ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ میرے مضمون میں دو جگہ نمبر آیا ہے اور دونوں جگہ جلد نمبر ۲ شمارہ ۶ ہے۔
۴۹۔ عافیہ شرح شافیہ، صرف فارسی قلمی ۸۔
۵۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مضمون ''دیوانِ غالب قلمی نسخۂ بھوپال: ملکیت اور کتابت''۔

۵۱۔ بحوالۂ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۲۴۔

۵۲۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۸۴۔

۵۳۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے از ڈاکٹر گیان چند جین، نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔

۵۴۔ معاصر، پٹنہ، ص ۱۶۔

۵۵۔ غالبؔ اور نسخۂ شیرانی از ڈاکٹر وحید قریشی، نقوش، غالبؔ نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۸۴۷

۵۶۔ اس قسم کے اندراجات سہو کی بنا پر نہیں کیے گئے تھے جیسا کہ بعض محققین کو غلطی ہوئی ہے۔ اگر سہو کا دخل ہوتا تو ''مکرر نوشتہ شد'' حاشیے کے اشعار پر لکھا جاتا نہ کہ متن کی غزل پر۔ ایسے موقعوں پر چوں کہ حاشیے میں غزل کی ترمیم شدہ شکل ملتی ہے اس لیے قصداً لکھی گئی تھی اور متن کی غزل پر یہ صراحت کر دی گئی تھی کہ دوبارہ لکھ دی گئی ہے۔

(سہ ماہی ''اُردو''۔ کراچی۔ ۱۹۷۰ء۔ ص ۶۱ تا ۸۷)

◆◆◆

ڈاکٹر احمر لاری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور تدوینِ دیوانِ غالبؔ

انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک نیا ایڈیشن اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں غالب کے غیر متداول کلام کو بھی شامل کرنے کا خیال تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے چند مشہور ادیبوں سے غالب کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھوا کر انجمن اس دیوان میں ایک علمی شان بھی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ دیوان کی ترتیب و تدوین کا کام سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا۔ اُنھوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مبیضہ تیار کر لیا۔ [۱] متداول کلام کے علاوہ اُنھوں نے ''شرحِ دیوانِ غالب'' مرتبہ حسرت موہانی، دیوان غالب کے قلمی نسخہ مملوکہ نواب احمد سعید خاں اور دوسرے ذرائع سے کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی حاصل کر کے داخل دیوان کیا۔ اس سے آگے کی داستان سید ہاشمی ہی کی زبان سے سنیے:

> ''انجمن کی تجویز اس منزل میں تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ [۲] صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے ایسا نہ تھا کہ جیسا انجمن چھاپنا چاہتی تھی، لیکن مروّجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ مگر ان مرحوم کو کلامِ غالبؔ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اس (کذا) کے

سپرد کر دیا۔“ ۳

جیسا کہ سید ہاشمی کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی یورپ سے واپسی کے بعد دیوانِ غالبؔ کی ترتیبِ نو کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ ڈاکٹر بجنوری غالباً ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں ہندوستان آئے بہر حال وہ ۱۹۱۶ء میں بھوپال میں مشیر تعلیمات (ایجوکیشنل ایڈوائزر) کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نواب حمید اللہ خاں کے (جو اس زمانے میں پرنس تھے) لٹریری سیکریٹری اور حمیدیہ لائبریری کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ ۴ اسی زمانے میں ان کا شعیب قریشی کے نام ایک خط ملتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے دیوان غالب کی ترتیبِ نو کا کام شروع کر دیا تھا، بدقسمتی سے اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں:

”ڈیرسٹ شعیب!

اب آپ بھوپال آجایئے۔

۱...... غالب کے خط کی مجھے ضرورت ہے۔ اگر آپ نے تیغ کے صفحہ کا فوٹو لے لیا ہے تو کافی ہے۔

۲...... نواب احمد سعید خاں صاحب کے (دیوان کے) ۵ حاشیہ پر جو غزلیں غالبؔ کی دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ کون کون سی ہے (کذا) نوٹ کر لیجیے گا اور اگر متداولہ نسخہ کہیں اختلاف ہو تو وہ اختلاف نوٹ کر لیجیے گا۔ چند اشعار اور ایک آدھ قطع غیر مطبوعہ ”جن کا خط میں ذکر کیا ہے وہ کیا ہیں۔ ضرور لکھ لایئے گا۔ اور نسخہ کا حوالہ دینے کے لیے نسخہ کے لکھنے کا سنہ، کاتب کا نام وغیرہ، اگر کوئی مہر کہیں سے اس کا پتا نشان کسی شخص کے خط میں اضافی غزلیں اور چند اشعار ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ تحریر ہیں (شاید نواب صاحب کو معلوم ہو) وغیرہ وغیرہ بھی یادداشت کے طور پر درج کر لیجیے گا۔

۳ ....واسوخت کے متعلق میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ہاشمی کے ایڈٹ کیے ہوئے دیوان سے (جو اُنھوں نے مجھ کو دے دیا ہے، اس کو کاٹ دوں گا ..

۴… لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ''تکیہ'' والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا ایڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اُردو سے واقفیت رکھتا ہوں زمین آسمان ٹل جائیں، لیکن یہ ان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ دوسرے نواب صاحب کی اس بارے میں رائے کیا ہے۔

طائر دل جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف ہوسکے نوٹ کر لیجیے گا۔'' ۷

ڈاکٹر بجنوری کی اس تحقیق و تلاش کا کیا نتیجہ نکلا یہ بتانا تو مشکل ہے، بہر حال اُنھوں نے دیوانِ غالب کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ وہ بڑے خوش ذوق اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے، اس لیے وہ اس دیوان کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوانا چاہتے تھے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے نام ان کے دو خطوط ملتے ہیں، جن پر بالترتیب ۱۵، اکتوبر ۱۹۱۶ء اور ۲۷، جولائی ۱۷ء کی تاریخ درج ہے۔ ان خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو دیوان ترتیب دیا تھا، اس کی کتابت بھی ہوگئی تھی، مگر طباعت کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تھے اور اس کے متعلق خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان خطوط کے متعلقہ اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

''مولانا ہاشمی صاحب کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوانِ غالب کو لکھنؤ الناظر پریس میں ہی طبع کرالیا جائے۔ گو مجھ کو اس بات کا باور نہیں ہوتا۔ لیکن اس خبر نے مجھ کو نہایت حشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمایئے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے۔ لیکن اگر اس کی چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجے کے کلوں کے پریس میں انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگایا جائے حرف پھیل جائیں گے، سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت اور نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اوّل تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسودہ (کاپی) کو فوٹو کرانے کی کوشش کی جائے۔ یو۔اے۔ کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت بڑھ جائے گی۔ بہرحال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص ہائے نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا جاتا ہے۔ ہائے نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔ اس کا پتا لگا کر اس سے طبع کرالیا جائے جو دیوانِ غالب آپ طبع کرا رہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہاشمی صاحب کا خیال غلط ہے اور میں خواہ مخواہ یہ لکھ رہا ہوں۔ لیکن دل نے نہ مانا اور جب تک لکھ نہ دیا دل کا وسوسہ نہ دیا۔" ۷

"(۲) دیوانِ غالب کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہو رہا ہے۔ جب تیار ہو جائے گا، روانہ ہوگا۔ علاوہ اس کے فزنک پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں۔ کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے اوروں کے جواب ابھی نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو زنک پلیٹ ٹائپ بہترین جلد کے ساتھ بہترین کاغذ سمیت ممکن ہے۔

(۳) کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔ فوٹو ٹائپ کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔

(۴) چند تصاویر متعلق مضامین دیوان وغیرہ کا بھی بندوبست کر رہا ہوں، دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوالی ہے۔" ۸

لیکن اسی دوران میں (وسط ۱۹۱۸ء) میں مولانا عبدالسلام ندوی بھوپال آئے اور حمیدیہ لائبریری میں اُن کی نگاہ غالب کے اس نادر قلمی دیوان پر پڑی جو "نسخۂ بھوپال" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بنیاد پر بعد میں نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا۔ اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی

''معارف'' کے شمارہ ستمبر ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں!

''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہندی کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا، یعنی مرزا غالب کا اصل مکمل اُردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلاّ نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کا ہاتھ وہ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے موصوف آج کل دیوان غالبؔ کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب ان کے نتائج فکر (انجمن) ترقی اُردو کے سے منظرِ عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخہ پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔'' 9

''نسخۂ بھوپال'' سے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک اور بیان بھی ملتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر بجنوری کے مرتبہ دیوان غالبؔ اور نسخۂ بھوپال کی ترتیب و تدوین سے متعلق ان کے منصوبوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اسے بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔ دیوانِ غالبؔ مصحح مولوی ابوالبیان سید حامد حسین بلال شاہجہان پوری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری انجمن ترقی اُردو کی طرف سے نہایت کوشش کے ساتھ اس کا (دیوانِ غالب کا) ایک صحیح اور عمدہ نسخہ تیار کر رہے تھے۔ مرحوم نے اس کے لیے بڑی محنت اُٹھائی تھی۔ ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں غالب کی شاعری اور فلسفہ پر عمدہ خیالات مرتب کیے تھے۔ اسی اثناء میں ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی کو بھوپال کے ایک رئیس کو ہدیتاً بھیجا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر بجنوری کا ارادہ تھا، جیسا کہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ وہ اس دیوان کا فوٹو بعینہٖ اپنے نسخہ کے اخیر میں شامل کریں گے۔

لیکن افسوس کہ:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اُمید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اُردو مرحوم کی یادگار میں اس نسخہ کو چھاپ کر شائع کرے گی، لیکن مولوی عبدالحق سیکریٹری انجمن کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت وکاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے۔" [۱۰]

نسخۂ بھوپال کے ملتے ہی ڈاکٹر بجنوری اپنے مرتبہ دیوان سے بے نیاز ہو کر اس کی ترتیب و تدوین میں دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ اس کے بارے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو اطلاع دیتے ہوئے وہ ایک خط مورخہ ۲۰، اگست ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں!

"محترمی و معظمی سلامت۔ تسلیم بعد تعظیم۔

آپ کا والا نامہ عین انتظار میں شرف صدور لایا۔ جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالب کا میرے پاس آیا ہے شہر کے علمی طبقہ میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔

مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک حملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے، اب نسخہ نہیں جاتا۔ ان شاء اللہ جتنا جھوٹ آج کل بول رہا ہوں، عمر بھر موقع نہ ہوا تھا۔ جب ہاشمی صاحب آویں گے اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔ آپ ان کے ہمراہ جو تصاویر، آرائش کی چیزیں وغیرہ آپ نے جمع کی ہیں اور جو کچھ مصالحہ یا خط و کتابت وغیرہ ہے، سب بھیج دیجیے گا۔ شعیب میری ہدایات کے مطابق چند چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہیں اور سراپا سعی ہو رہے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا ہے۔ آپ علی گڑھ لکھیے، اگر کلیاتِ خسرو میں سے کاغذ بچتا ہو سب کو انجمن کے لیے فوراً خرید لیجیے کسی طرح بیکار نہیں ہو سکتا۔ اگر بچ رہا یا خدانخواستہ کام میں نہ رہا تو بک سکتا ہے۔ اگر اخبارات میں اعلان ابھی نہ دیا ہو تو اس میں بھی چندے توقف کیجیے ہاشمی صاحب سے گفتگو کروں۔

دیوان ایڈٹ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ جب ہاشمی صاحب تشریف لائیں گے تو کافی نمونہ پیش کر سکوں گا۔ فرمایئے کتنے روپے تک انجمن خرچ کر سکتی ہے، کاش اس وقت کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا۔ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کی پہلی جلد پر آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہے، پانچ ہزار تو اس کام کے لیے ہوتا۔" [اا]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے سید ہاشمی کو بھوپال بھیجا اور اُنھوں نے وہاں جا کر نسخۂ بھوپال کی زیارت کی۔ اس واقعے کی تفصیل سید ہاشمی ہی کی زبان سے سنیے:

"اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اُردو کی جانب سے خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جب کہ غالب کی عمر صرف ۲۵ ربرس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالب مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا۔ لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں تاہم وہ ابتدائی کلام تمام وکمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا صاحب نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے تو خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم وجدید کا فرق اور بعد کی اصلاح وتنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

یہ بھی اُمید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی

آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا اور وہ سب اُمیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں۔'' [۱۲]

ڈاکٹر بجنوری نے ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو وفات پائی۔ گویا وہ ''نسخۂ بھوپال'' کے ملنے کے بعد تقریباً تین ماہ حیات رہے۔ اس دوران میں اُنھوں نے ''نسخۂ بھوپال'' کی ترتیب و تدوین کے مختلف منصوبے بنائے۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور سید ہاشمی کے محولہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی نہیں اُنھوں نے ان منصوبوں کو عملی جامہ بھی پہنانا شروع کر دیا تھا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں اُنھوں نے ''اس اصلی نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کے لیے چابک دست مصور سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔'' [۱۳]

اُنھوں نے دوستوں کی مدد سے غالب سے متعلق بہت سے نوادرات بھی اکٹھا کر لیے تھے۔ انھیں میں غالب کا وہ خودنوشتہ سوانحی خاکہ بھی تھا جو بقول بابائے اُردو غالباً ''تذکرۂ مظہر العجائب'' کے لیے لکھا گیا تھا۔ سید ہاشمی کے مطابق دیوان کی کتابت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن بجنوری کی اچانک موت نے ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

میرے پیشِ نظر حسین میاں نامی ایک شخص کا خط ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کی وفات کے بعد ''نسخۂ بھوپال'' کو حاصل کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے محولہ بالا تبصرے میں بابائے اُردو کے حوالے سے ''جس ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش'' کی طرف اشارہ کیا ہے، اس خط سے اس کی حقیقت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ خط [۱۴] یہاں بغیر کسی تبصرے کے نقل کیا جاتا ہے:

''۱۱، دسمبر ۱۸ء، بروز بدھ، بوقت ۵ بجے شام

جناب پیارے بھائی صاحب

آداب بندگی کے بعد عرض ہے، میں اور تاج خیریت سے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ سب بھی خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا خط ملا۔ چھ سو سولہ (۶۱۶) روپیہ دس

آنہ، چھ پائی انشور کر دیا ہے۔ بھتہ کے روپیہ اب تک ملے نہیں ہیں۔ ماسٹر صاحب
نے کہا ہے کہ میں دے دوں گا۔ دیوانِ غالب کا اصلی واقعہ یہ ہے۔ ایجوکیشنل
ایڈوائزر کا چارج مفتی انوار الحق صاحب کو دیا گیا ہے اور اس حکم میں یہ بھی لکھا ہوا
ہے کہ دیوانِ غالبؔ مرحوم نے نامکمل چھوڑا ہے اور اسے مفتی صاحب ایڈٹ کریں۔
آج ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ دیوانِ غالبؔ دے دو کیوں کہ میاں ۱۵
نے حکم دیا ہے کہ اُس کو مفتی صاحب ایڈٹ کریں گے اور میاں اُس کو اپنے نام سے
چھپوائیں گے۔ میں نے اُس کا جواب یہ دیا کہ جب تک سندھی صاحب ۱۶
نہیں آئیں گے کوئی چیز نہیں دے سکتا، نہ تو الماریوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں۔
اس وقت مفتی صاحب، ماسٹر صاحب اور مسعود صاحب (نے) مجھے بلوا کر کہا کہ
بنگلہ کھولو ہم کچھ کاغذات لیں گے۔ اُس کا جواب میں نے دیا کہ بنگلہ کھولنے کے لیے
میں تیار ہوں مگر کاغذات ایک بھی نہیں دوں گا۔ جب تک سندھی صاحب نہ
آجائیں۔ اس کے بعد یہ تینوں صاحب بنگلہ میں آئے تھے۔ کمپلسری ایجوکیشن کی
اسکیم ڈھونڈی مگر کہیں نہیں ملی۔ اس کے بعد واپس چلے گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے
کہ پرنس نے دیوانِ غالب کے لیے آرڈر تو دے دیا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دیوانِ
غالب کا آرڈر پرنس کا نہیں ہے۔ اگر پرنس کا ہوتا تو یہ لوگ اتنی عجلت نہ کرتے۔ یہ
لوگ چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کے بھوپال آنے سے پہلے دیوانِ غالبؔ ہمارے
ہاتھ آجائے۔ میں بہت افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ اس جلا ہے کی محبت مرحوم کو
بہت تھی اور مرحوم نے اس کے لیے دو مرتبہ مجھے ڈانٹا بھی تھا اور اس کے بیس پچیس
روز بعد ہی مرحوم کی کی ہوئی محنت کو خاک میں ملانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ماسٹر
صاحب نے جو تار دیا ہے وہ تار بغیر میاں کے پوچھے دیا گیا ہے۔ براہِ مہربانی اگر
آپ لوگ مرحوم کی یادگار دیوانِ غالب کرنا چاہتے ہیں تو دونوں صاحب میں سے
کوئی ایک بھوپال تشریف لے آئیں اور میاں سے مل کر دیوانِ غالب کا فیصلہ کریں
اور دیوانِ غالب کو یہاں سے لے جائیں۔ مجھے شک ہو چلا ہے کہ شاید دیوانِ

غالب چھپوایا جائے گا۔ میرے خیال میں آپ دونوں صاحب میں سے ایک صاحب اس خط کو پڑھتے ہی بھوپال تشریف لائیں۔

آج ایک خط مولوی نورالاسلام صاحب کا میاں کے نام آیا ہے۔ معلوم نہیں کیا مضمون ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اس خط کے ملنے سے آپ کو یہاں کے پولیٹیکل معاملات کا جلد خیال ہوگا اور دیوانِ غالبؔ کے معاملہ میں بہت ہی عجلت سے کام کریں گے۔ اگر آپ نے کوئی خط میاں کے نام لکھا تو وہ میاں تک پہنچے گا نہیں۔ اگر میاں کو خط لکھنا ہے تو ابو محمد صاحب کو لکھیے یا میرے پاس بھیج دیجیے تو میاں کو دوں۔ باقی خیریت ہے۔

اس کام میں جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔ سب کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو پیار۔

حسین میاں" ۷؎

بالآخر مفتی انوار الحق صاحب "نسخۂ بھوپال" کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ خدشہ کہ "مرحوم کی یہ محنت وکاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے" صحیح ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر بجنوری کا مرتب کردہ دیوان لاپتا ہوگیا، بلکہ اُنھوں نے "نسخۂ بھوپال" کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں جو کام کیا تھا وہ بھی برباد ہوگیا۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ سہ ماہی "اُردو" اکتوبر، ۱۹۲۲ء (تبصرہ بر دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) از سید ہاشمی ص ۷۰۳۔

۲۔ اس دیوان کے خاتمہ کی عبارت کے نیچے ۲۲، مارچ 1915ء درج ہے۔

۳۔ سہ ماہی اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء (محولہ بالا تبصرہ) ص ۴۔۳۔۷۔

۴۔ اُردوادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ص ۳۵۷۔
۵۔ یہ اضافہ راقم السطور نے کیا ہے۔
۶۔ یہ خط مجھے مولانا خیر بہوری صاحب نے عنایت فرمایا، جس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔
۷۔ ''نقوش'' لاہور، مکاتیب نمبر، جلد دوم، ص ۵۷۹۔۸۰۔
۸۔ ''نقوش'' لاہور، مکاتیب نمبر، جلد دوم، ص ۵۸۰۔
۹۔ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۱۶۔
۱۰۔ ''معارف'' اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۱۹ء، ص ۱۶۔۳۱۵۔
۱۱۔ یہ خط بھی مجھے مولانا خیر بہوردی صاحب نے مرحمت فرمایا۔
۱۲۔ سہ ماہی ''اُردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء، (محولہ بالا تبصرہ) ص ۵۔۷۰۴۔
۱۳۔ مقدماتِ عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ناشر اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ص ۳۷۲۔
۱۴۔ مکتوب نگار کے بارے میں تفصیلات فراہم نہیں ہوسکیں کہ بجنوری مرحوم سے ان کے روابط کی نوعیت کیا تھی، بہرحال خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں میں تھے جو ''وفاداری بشرط اُستواری'' کو ''اصل ایمان'' سمجھتے ہیں۔ یہ خط شعیب قریشی کے نام ہے۔
۱۵۔ نواب حمید اللہ خان جو اس زمانے میں پرنس تھے۔
۱۶۔ شعیب قریشی۔
۱۷۔ یہ خط مجھے مولانا خیر بہوری صاحب سے ملا۔

(ماہنامہ ''قومی زبان'' ۔کراچی ۔فروری ۱۹۷۱ء ۔ص ۷۳ تا ۸۱)

◆◆◆

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دیوانِ غالب کا نسخۂ حمیدیہ

دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کی طرف نظر اٹھتی ہے، جس کی طباعت واشاعت کی تاریخ درج نہیں، لیکن یہ غالباً ۱۹۲۱ء ہی میں شائع ہوئی، اس میں سرنامہ نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کا ہے، جس میں انھوں نے غالبؔ کو شہنشاہِ اقلیمِ سخن کہا ہے، پھر مفتی انوار الحق صاحب ڈائریکٹر تعلیمات ریاست بھوپال کی تمہید ہے، اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بیرسٹر ایٹ لاء کا مشہور مقدمہ ہے، مفتی انوار الحق غالبؔ کی شاعری کو ادب اردو کا بہترین سرمایہ اور عروس نظم کا بیش بہا پیرایہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ دیوان جو ۱۲۳۷ھ (یعنی ۱۸۲۱ء) میں مرتب ہوا، غالباً نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا، اور یہ کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے، کہ چند مرتبہ تصحیح وترمیم کی غرض سے غالبؔ کے پاس بھی گیا ہے، اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں، مفتی انوار الحق یہ بھی لکھتے ہیں کہ مروجہ دیوان میں جتنی کٹی چھٹی غزلیں ہیں، وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں، جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے، اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا ہے کہ غالب کے ہیں، وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں، غرض دیوان دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ غالبؔ کا وہی دیوان ہے جسے زمانہ کھو چکا تھا، (ص ۷) مفتی صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ اس دیوان میں غالبؔ کا ایسا کلام بھی ہے جس کو ان کے ہم عصر دوستوں نے قابلِ حذف قرار دیا تھا، اور جسے خود غالبؔ نے اپنے

دیوان سے خارج کر دیا تھا۔'' اسی لیے مفتی صاحب کے بعض دوست اس دیوان کی اشاعت کے خلاف تھے، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ غالبؔ کے مہملات کی اشاعت سے غالبؔ کا درجہ کم ہو جائے گا، اور مجموعی لحاظ سے ان کے کلام کی وقعت کم ہو جائے گی، لیکن خود مفتی صاحب کا خیال ہے کہ غالبؔ کے نظری کلام کی اشاعت سے ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کمی نہ ہوگی، کیوں کہ ان کے کلام کی گوناگوں خوبیوں نے سخن شناس دلوں میں اپنی یکتائی کا جو سکہ بٹھا دیا ہے، اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا، کیوں کہ کسی کی بچپن کی کج مج بیانی سے اس کی آئندہ کی فصاحت و بلاغت پر حرف نہیں آسکتا ہے، یا کسی مصور کی ابتدائی مساعی اس کے عہد کمال کی صناعی کی قدر و قیمت کم نہیں، کر سکتی ہے، یا کسی مصور کی ابتدائی مساعی اس کے عہد کمال کی صناعی کی قدر و قیمت کم نہیں کر سکتی ہے۔

غالبؔ کے جو مہملات اس دیوان میں شائع کیے گئے ہیں، ان کے کچھ نمونے یہ ہیں:

آتشیں پا ہوں، گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقۂ یاں زنجیر کا
شوخیِ نیرنگ صید وحشتِ طاؤس ہے
دام سبزہ میں ہے پرواز چمن تسخیر کا
لذت ایجاد ناز افسونِ عرض ذوقِ قتل
نعل آتش میں ہے تیغ یار سے نخچیر کا
خشت پشت دست عجز و قالب آغوشِ وداع
پر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
وحشت خوابِ عدم شورِ تماشا ہے اسدؔ
جو مزہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

☆

جنونِ گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیر سے دو دو سپند آیا

مہ اختر نشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے
تماشہ کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا
تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی سے
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیم گزند آیا
فضائے خندۂ گل تنگ وذوق عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوشِ وداع دل پسند آیا

☆

تنگی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
تو یک جہاں قماش ہوس جمع کر کہ میں
حیرت مطاع عالم نقصان و سود تھا
گردش محیط ظلم رہا تھا جس قدر فلک
میں پائمال غمزۂ چشمِ کبود تھا
خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

ایسے تمام اشعار کے متعلق مفتی انوار الحق کا بیان ہے کہ ''یہ اُس وقت لکھے گئے جب غالبؔ کی عمر پچیس (۲۵) سال کی تھی، اس لیے کلام میں اس روانی اور پختگی کی توقع نہیں کی جاسکتی، جو بعد کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے، اور کہیں کہیں بندش کی چستی اور مضمون کی پستی، مذاقِ سلیم کی نظروں میں کھٹکتی ہے، تاہم بحکم عموم ترکیبوں کی جدّت، تشبیہوں کی ندرت، خیالات کی بلند پروازی اور مضامین کی آسماں پیمائی اس میں ویسی ہی نمایاں ہے، جیسی بعد کے کلام میں، فرق صرف اتنا ہے کہ نشۂ شباب کی ترنگ اور نازک کلامان ایران کے رنگ نے ان شعروں کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ ابتدائے مشقِ سخن میں بیدلؔ کا طرز غالبؔ کا نصب العین تھا، اور مضمون آفرینی اور خیال بندی میں تمام امت مصروف تھی۔'' (ص ۱۳۔۱۲)

مفتی انوار الحق کا خیال ہے کہ غالبؔ کے نظری کلام کو اس دیوان میں شامل کرنے سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ابتدا میں اُن کے دیوان کی کیا شان تھی، اور بعد میں کیا ہوگئی۔ (ص ۱۱)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو غالبؔ کے نظری اشعار آئندہ کے لیے سینکڑوں نئے نئے خیالات کا سرچشمہ بن سکتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں وہ بہترین اشعار میں شمار ہونے کے قابل نہ ہوں، تاہم ان میں ایسی نئی نئی طرحیں، اور تازہ روشیں ڈالی گئی ہیں، کہ ان کی داغ بیل پر صدہا طرح کی گلکاریاں اور بزم آرائیاں کی جا سکتی ہیں، اور خواہ ان کو کوئی سخن فہم مہمل اور بے معنی ہی کہے، پھر مضمون ان میں ایسے گنجینۂ ہائے معانی پنہاں ہیں کہ اس سے ہزاروں نئے نئے مضمون پیدا ہو سکتے ہیں، سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی تشبیہیں ان میں جواہر ریزوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ (صفحہ ۲۱)

اس طرح کی گل فشانی کر کے مفتی انوار الحق یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں جبکہ اردو زبان کی ترقی اور توسیع کا شور ہو رہا ہے، ان کو یعنی نظری اشعار کو رائیگاں چھوڑ دینا میرے نزدیک ایک ناقابل قصور ہے۔ (صفحہ ۲۱)

لیکن اس کا فیصلہ آئندہ نسل ہی کر سکتی ہے، کہ غالبؔ کے نظری اشعار کو شائع کرنا یا ان کو رائیگاں چھوڑ دینا ناقابلِ تلافی قصور تھا، ممکن ہے کہ آگے چل کر غالبؔ کے ان مہملات پر ضرب کاری لگانے کے لیے پھر کوئی آغا جان عیشؔ یا کوئی عبدالقادر رامپوری یا کوئی یگانہؔ یا کوئی ڈاکٹر عبداللطیف یا کوئی ارگس پیدا ہو جائے، سوال یہ ہے کہ غالبؔ نے جن اشعار کو منتشر اور پراگندہ سمجھ کر اپنے دیوان سے نکال دیا تھا، اور ان کو ان کی طرف منسوب نہ کرنے کی التجا بھی کی تھی، تو پھر ان کو ان کے کلام کے ساتھ شائع کرنا کہاں تک درست ہے؟ ممکن ہے کہ آگے چل کر اہل نظر اس کو یا تو ایک غلط قسم کی ذہنی اور ادبی چاشنی قرار دیں، یا نہیں تو کار بیکاراں یا نہیں تو گڑے مردوں کو اکھاڑنے کا شغل۔

حالی کو اس کا دکھ رہا کہ ''ان کے استاد کے دیوان میں انتخاب کے باوجود ثلث کے قریب ایسے اشعار رہ گئے ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔'' (ص ۱۰۷) انتخاب کے وقت بہت سے اشعار ایسے تھے جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے، مگر ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ

اٹھ سکا، ممکن ہے ایک مدت کے بعد یہ اشعار ان کی نظر میں کھٹکے ہوں۔ (ص ۱۰۸)

غالبؔ فارسی کے ایک قطعہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کہتے ہیں کہ پُرگوئی کوئی فخر کی بات نہیں، یہ تو بانگِ دہل ہے، شعر گوئی نغمۂ چنگ ہے، وہ گویا اس کے قائل تھے کہ شاعری کا کمال شعر کی لطافت اور کیفیت میں ہے، مقدار اور کمیت میں نہیں، حالیؔ بھی اس کے قائل ہیں کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجہ کے ہیں، میرؔ کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنادیا ہے۔ (یادگارِ غالبؔ ص ۱۱۵) حالیؔ کی رائے تھی کہ غالبؔ کے منتخب اشعار ہی لوگوں کے سامنے رہیں، اور یہی صحیح رائے ہے، میرؔ کا سارا کلام منظرِ عام پر آیا تو ان کے متعلق یہ بات عام ہوگئی ''بلندش غایت بلند اور پستش غایت پست'' لیکن غالبؔ نے اپنے مہملات رد کرکے اپنا کلام شائع کیا تو ان کے متعلق یہ کہا گیا:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر

اور پھر یہ بھی کہ:

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری کوئی نہیں

لیکن غالبؔ کے مہملات کی تلاش وجستجو کا جو سیلاب بہہ نکلا ہے، وہ برابر جاری رہا تو پھر غالبؔ کے ناقدین کو ان کے کلام کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ ''مہملش غایت مہمل است'' یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ میرؔ کا سارا کلام چھپ کر سامنے آیا تو اب ان کا انتخاب شائع کیا جارہا ہے، لیکن غالبؔ نے اپنا منتخب کلام پیش کیا تو ان کے سارے کلام کی جستجو جاری ہے۔

غالبؔ نے اپنے جن اشعار میں بعد میں اصلاحیں دی تھیں وہ بھی ان کی غزلوں کے ساتھ درج ہیں، جو یقیناً مطالعہ کے لیے دلچسپ ہیں، ہم بھی یہاں پر ان کے کچھ نمونے اپنی ناچیز رائے کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان کو ایک ساتھ پڑھنے سے غالب کی ذہنی کاوشوں کا اندازہ بھی ہوگا، ذیل کے بہت سے اشعار میں نازک کلامانِ ایران کا رنگ نمایاں ہے، لیکن ان کو نظر انداز کرکے صرف اصلاحوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

(۱) حجاب سیرِ گل آئینہ بے مہری قاتل　　　کہ انداز بخوں غلطیدنِ بسمل نظر آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل　　　کہ انداز بخوں غلطیدنِ بسمل نظر آیا

اس میں سیرِ گل کی مناسبت سے ''ہوائے'' کا لفظ حجاب سے بہتر ہو گیا ہے،

(۲) جز قیس اور کو نہ ملا عرصۂ تپش　　　صحرا مگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　　صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

''نہ آیا بروئے کار'' کے معنی مقابلہ میں نہ آیا، مقابل نہ ہوا ہے، قیس کو اس شعر میں مردِ میدان دکھایا گیا ہے، اس لحاظ سے ''نہ آیا بروئے کار'' سے شعر میں توانائی آ گئی ہے،

(۳) آشفتگی نے نقش سویدا کیا ہے عرض　　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اس شعر میں بلند پروازی ضرور ہے، لیکن بہت ہی مغلق ہے، عرض کو درست سے بدل کر اغلاق میں کچھ کمی پیدا کر دی گئی ہے، نقش کے لحاظ سے درست کا لفظ زیادہ درست ہے،

(۴) تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　　مژگاں جو وا ہوئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

''مژگاں جو وا ہوئی'' یہ اردو زبان کا محاورہ نہیں، خواب کے لحاظ سے ''آنکھ کھل گئی'' کے محاورہ سے شعر میں حسن پیدا ہو گیا ہے،

(۵) شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا　　　آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا　　　آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

''نمک چھڑکا'' کہی اردو کا محاورہ ہے،

(۶) عشرت ایجاد، چہ بوئے گل و کو دودِ چراغ　　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل　　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

الفاظ سے الٹ پھیر کے جادو سے اصلاح شدہ مصرع ڈھلا ہوا معلوم ہونے لگا ہے، عشرت ایجاد کی جگہ نالۂ دل لانے سے شعر بہت ہی حسرت ناک ہو گیا ہے،

(۷) تھی تو آموز فنا، ہمت دشواری شوق سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

تھی تو آموز فنا، ہمت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

ہمت دشوار پسند سے شعر زیادہ صاف ہوگیا ہے۔

(۸) مرگیا صدمۂ آواز سے قم کی غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ناتوانی کے لحاظ سے "صدمہ یک جنبشِ لب" سے شعر کے معنی کی نزاکت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

(۹) پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست پابند حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

مرہون اور رہن کی صنعت اشتقاق سے شعر میں حسن پیدا ہوگیا ہے۔

(۱۰) دیدہ تر نے دیے اوراق لخت دل بہ آب یادگار نالۂ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ دل بہ باد یادگار نالۂ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اصلاح شدہ مصرع پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ بباد دادن فارسی کا محاورہ ہے، اردو میں برباد کرنا ہے،

(۱۱) یہ جانتا ہوں کہ تو اور جواب نامۂ شوق مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

"پاسخ مکتوب" میں غالبؔ کی فارسیت ان کی شعریت پر غالب آگئی ہے،

(۱۲) غمِ فراق میں تکلیف سیر گل مت دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

"تکلیف سیر باغ نہ دو" سے مصرع فصیح تر ہوگیا ہے،

(۱۳) اب میں ہوں اور خونِ دو عالم معاملہ توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

"ماتم یک شہر آرزو" میں اضافت مسلسل ضرور ہے، لیکن اس میں پہلے مصرع سے زیادہ تغزل کا رنگ آگیا ہے۔

(۱۴) قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے   ہاں اس معاملے میں تو میرا قصور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عاشق نامراد کے رشک اور عجز دونوں اصلاح سے زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں، معاملے میں کا تنافر بھی دور ہو گیا،

(۱۵) بے خونِ دل ہے چشمِ جنوں میں نگہ غبار   یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

بے خون دل ہو چشم میں موجِ نگہ غبار   یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

موج نگہ کی تشبیب سے مصرع میں بڑی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، لیکن چشم میں موج سے تنافر پیدا ہو گیا ہے۔

(۱۶) باغ شگفتہ تیرا ابساط ہوائے دل   ابر بہار، خم کدہ، کس کے دماغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساط نشاطِ دل   ابر بہار، خم کدہ، کس کے دماغ کا

بساط نشاط سے مصرع زیادہ شگفتہ اور نشاط انگیز ہو گیا ہے،

(۱۷) گر نہ احوال شب فرقت بیاں ہو جائے گا   بے تکلف داغ مہ مہر وہاں ہو جائے گا

کر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا   بے تکلف داغ مہ مہر وہاں ہو جائے گا

احوال کو بدل کر اندوہ لے آنے سے شبِ فرقت کی المنا کی زیادہ بڑھ گئی ہے،

(۱۸) لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

''بوسہ ہائے پا'' کی گرانی ''پاؤں کا بوسہ'' کی فصاحت سے بدل گئی ہے،

(۱۹) گر نگاہ کرم فرمائی رہی تعلیم ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں دررگ نہاں ہو جائے گا

گر نگاہ کرم فرمائی رہی تعلیم ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

''خوں دررگ'' اور ''خوں رگ میں'' کی فصاحت ظاہر ہے،

(۲۰) قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا　　خط جام بادہ یکسر رشتۂ گوہر ہوا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا　　خط جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا

دوسرے مصرع میں فارسیت غالب ہے، ہوا کا لفظ نہ ہوتا تو یہ فارسی کا مصرع سمجھا جاتا، سراسر کے لفظ سے فصاحت میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے،

(۲۱) اف نہ کی گو سوز دل سے بے محابا جل گیا　　آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا　　آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

ترمیم کے بعد مصرع صاف ہوگیا ہے، پہلے یہ ظاہر نہ تھا کہ کیا جل گیا، اصلاح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سوزِ نہاں سے دل جل گیا ہے،

(۲۲) آہ وہ جرأت فریاد کہاں　　دل کے پردے میں جگر یاد آیا

آہ وہ جرأت فریاد کہاں　　دل سے تنگ آ کر کے جگر یاد آیا

"تنگ آ کے" سے دل کی بے جرأتی اور کم طاقتی کا اظہار زیادہ نمایاں ہوگیا ہے

(۲۳) نہیں گر سر و برگ سودائے معنی　　تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

نہیں گر سرو برگ ادراکِ معنی　　تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

شعر کے یہ معنی ہیں کہ اگر حقیقت دریافت کرنے کی قوت نہیں ہے تو نہ سہی ظاہری صورت کا تماشا ہی سہی، یہ مطلب سودائے معنی سے زیادہ ادراک معنی سے واضح ہو جاتا ہے،

(۲۴) اے عافیت کنارہ کر اے انتظار چل　　سیلاب گریہ دشمن دیوار و در ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظار چل　　سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

"دشمن دیوار و در" کی جگہ پر "درپئے دیوار و در" زیادہ بہتر اور فصیح ہے،

(۲۵) گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج　　قمری کا طوق حلقہ بیرون در ہے آج

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج　　قمری کا طوق حلقہ بیرون در ہے آج

ضبط دگر اردو کا محاورہ نہیں ہے، لیکن رنگِ دگر بولا جاتا ہے،

(۲۶) جنون اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ　　کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ　　ہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

وفورِ اشک سے شعر زیادہ بہتر ہوگیا ہے،

(۲۷) کیا ہے تو نے مے جلوہ کس قدر ارزاں — کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانی مۓ جلوہ — کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

ترمیم کے بعد اضافتوں کی وجہ سے مصرع پہلے سے بہتر نہیں کہا جا سکتا ہے،

(۲۸) نہیں بند زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفید کا ایہام تو دونوں مصرعوں میں مشترک ہے، لیکن ترمیم کے بعد مصرع لفظی اور معنوی حیثیت سے زیادہ صاف ہو گیا ہے، سفیدی کی مناسبت سے خانہ آرائی کا لفظ برمحل ہے، سفیدی سے مراد دیوار کی قلعی اور آنکھوں نور دونوں ہے، اسی سے ایہام پیدا ہو گیا ہے،

(۲۹) اے ترا غمزہ یک قلم انگیز — اے ترا ظلم سر بسر انداز

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز — اے ترا ظلم سر بسر انداز

جلوہ کے لانے سے کوئی خاص بات پیدا نہ ہو سکی،

(۳۰) نگہ التفات سوئے اسد — میں غریب اور تو غریب نواز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز

اس شعر کے حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ متن میں پہلے اس شعر کا پہلا مصرع یوں تھا:

یا علی! اک نگاہِ سوئے اسد

اس طرح تو یہ شعر بہت صاف ہو جاتا ہے، لیکن غالب نے اس کو بدل کر ''نگہِ التفات سوئے اسد'' کر دیا اور علی محذوف رہا، جس کی طرف ذہن مشکل سے منتقل ہوگا، لیکن اس غزل کا ایک اور مقطع غالب نے کہہ ڈالا جو یہ ہے:

اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رند شاہد باز

یہ غالب کو زیادہ پسند آیا، کیوں کہ وہ ان کے حسب حال تھا، اس لیے پہلے مقطع کو بدل دیا،

(۳۱) جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو — اسد ہے دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو — نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع

پہلے اس شعر میں غالب اپنا تخلص بھی لے آئے تھے، لیکن مصرع کو صاف کرنے کے لیے تخلص نکال دیا ہے، اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ معشوق کے بالیں پر پہنچنے سے وہاں کی شمع میری رقیب بن گئی، پھر اس کی بدگمانی کا داغ میرے دل پر کیوں نہ ہو،

(۳۲) زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

غالبؔ پہلے نمک باندھنا ہی استعمال کرتے رہے، لیکن بعد میں نمک چھڑکنا قبول کرلیا، اور یہی اردو کا محاورہ ہے،

(۳۳) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے حساب بے گنہی اے خدا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ترمیم سے مصرع کا مطلب ہی مختلف ہوگیا، لیکن اسی کے ساتھ اس میں بڑی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے، غالبؔ کی زندگی سامنے ہو تو یہ شعر اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے،

(۳۴) ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسدؔ — ہیں وبال تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو — ہیں وبال تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم

دونوں مصرعوں میں گراں خوابی اور ترکِ جستجو کی وجہ ضعف ہی بتائی گئی ہے، لیکن ترمیم میں ''نے قناعت'' سے واضح ہوگیا ہے کہ ترکِ جستجو قناعت کی خاطر نہیں، بلکہ ضعف کی وجہ سے ہے،

(۳۵) باوجود یک جہاں ہنگامہ پر موہوم ہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم
باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم

ترمیم سے پہلے مصرع کی ترکیب زیادہ درست ہوگئی ہے، ہیں ہیں کا تکرار اور تنافر بھی دور ہوگیا ہے، پھر بھی لفظ پیدائی سے مصرع زیادہ صاف نہ ہو سکا ہے،

(۳۶) ریختہ کا وہ ظہوریؔ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

ناسخؔ کا شعر یہ ہے:

شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

غالبؔ نے اپنے شعر کے پہلے مصرع میں جو کہا تھا ''ریختہ کا وہ ظہوری ہے، بقول ناسخؔ'' تو اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا تھا کہ ناسخؔ نے میرؔ کو ریختہ کا ظہوریؔ کہا ہے، حالاں کہ خود غالبؔ کہنا چاہتے تھے، اصلاح کے بعد یہ اشتباہ جاتا رہا،

(۳۷) ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں مہر گردوں ہے چراغ رہگزر بادیاں

ہیں زوال آمادہ اجزا افرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغِ رہگزر بادیاں

پہلے مصرع میں جو اغلاق ہے، وہ اصلاح کے بعد بھی نہ جا سکا ہے............ دونوں مصرعوں میں فارسی ترکیبیں اپنی جگہ پر ہیں،

(۳۸) ہوئی تقریب منع شوق دیدن خانہ ویرانی کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

ہوئی ہے مانع ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

ترمیم سے مصرع نسبتاً کچھ صاف ہو گیا ہے،

(۳۹) اسدؔ پیمانہ سے دل عالم آب تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

اصلاح کے بعد مصرع اور مطلب دونوں صاف اور واضح ہو گئے ہیں،

(۴۰) اگر وہ سرو جاں بخش خرام اہتزاز آوے کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

سرو قد، گرم خرامِ ناز سے مہر و جاں بخش اور خرام اہتزاز کی گرانی جاتی رہی،

(۴۱) عالم بساط دعوتِ دیوانگی نہیں دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

اصلاح کے بعد مصرع صاف ہو گیا ہے، جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ میری وحشت کے لیے عرصۂ آفاق تنگ تھا، اس لیے زمین کو شرمندگی ہوئی اور اس کو پسینہ آیا، جو دریا بن گیا،

(۴۲) اثر آبلہ کرتا ہے بیاباں روشن جادہ جوں رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

غالبؔ نے شعر کو صاف کرنے کی خاطر الفاظ کو الٹ پھیر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ صورت، جوں، طرح کو اکثر اپنی اصلاحوں میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں،

(۴۳) بے کسی ہائے شب ہجر کی وحشت مت پوچھ
سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
بے کسی ہائے شب ہجر کی حسرت ہے ہے
سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
ہے ہے سے حسرت کی شدت زیادہ نمایاں ہوگئی ہے،

(۴۴) عیادت بسکہ تجھ سے گرمی بازار بستر ہے فروغ شمع بالیں، طالعِ بیدار بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو فروغ شمع بالیں، طالعِ بیدار بستر ہے
ترمیم کے بعد مصرع بہت ہی پُر کیف اور جاندار ہوگیا ہے، خوشا اقبالِ رنجوری، فروغِ شمع بالیں، طالع بیدار بستر میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی آمیزش میں حسن ہے،

(۴۵) سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامانِ ہا دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
اصلاح کے بعد ''دامن ہے'' لانے سے یہ اردو زبان کا مصرع بن گیا، ورنہ اور کوئی خاص بات پیدا نہ ہوسکی۔

(۴۶) یہ طوفاں گاہ جوش اضطرابِ وحشت شبہا شعاع آفتابِ صبح محشر تار بستر ہے
یہ طوفاں گاہ جوش اضطراب وشامِ تنہائی شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے
اصلاح کے بعد بھی مصرع اردو زبان کا مصرع نہ بن سکا،

(۴۷) اسد جوش بہار دیدۂ بیدار کے صدقے ہماری دید کو خوابِ زلیخا عار بستر ہے
کبھی آتی ہے بو باش سے اس کی زلفِ مشکیں کی ہماری دید کو خوابِ زلیخا عار بستر ہے
اصلاح سے مصرع کے معنی ہی بدل گئے ہیں، مگر مصرع بہت ہی خوب ہوگیا ہے،

(۴۸) شوخی اظہار دنداںہا برائے خندہ ہے دعوئے جمعیت احباب جائے خندہ ہے
عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے دعوئے جمعیت احباب جائے خندہ ہے
دونوں مصرعے اردو زبان کے اس لیے کہے جاسکتے ہیں کہ لفظ ''ہے'' آگیا ہے، ورنہ فارسیت کی گرانی اپنی جگہ پر ہے،

(۴۹) عیش بے تابی حرام کلفت افسردگی عرض دنداں دردل افشردن بنائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیش بیتابی حرام ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

اصلاح سے پہلا مصرع کچھ اردو زبان کا معلوم ہوتا ہے، ورنہ لفظ ہے نہ آتا تو فارسی ہی کا شعر تصور کیا جاتا،

(۵۰) ہے لخت دل سے خون مژہ ہر شاخ گل تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شخِ گل تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

مصرع اصلاح سے بہتر ہو گیا ہے، گو اضافتیں نہ جا سکیں۔

نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کی افادیت:

نسخہ حمیدیہ چھپ کر غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے ہاتھوں میں آیا تو اس کو وہ ایک گوہر بے بہا سمجھنے لگے، اس کے ذریعہ سے وہ غالؔب کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو خود بھی سمجھے، اور دوسروں کو سمجھاتے رہے جس کسی نے غالؔب پر جو بھی مضمون لکھا، اس نسخہ کو ضرور سامنے رکھا، اور پھر اس کی افادیت پر طرح طرح کے مضامین برابر شائع ہوتے رہے، مثلاً حبیب احمد صدیقی آئی۔اے۔ اس نے انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو ادب کے جولائی ۱۹۵۱ء کے شمارہ میں نسخۂ حمیدیہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تو اس میں جہاں اور باتیں لکھیں، وہاں یہ بھی تحریر کرتے ہیں:

> ''نسخہ حمیدیہ میں ... یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالؔب کی بہت سی مشہور غزلیں ان کے اسی دور جہالت کی کہی ہوئی ہیں جو ۱۲۳۷ھ یعنی ان کی عمر کے پچیسویں برس پر ختم ہوا ..... اگر نسخہ حمیدیہ شائع نہ ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اس عمر تک غالؔب کی شاعرانہ صلاحیتیں ایسی نہ تھیں کہ ان کو صف اول کے شعراء کے زمرہ میں شامل کر سکتیں، خوش قسمتی سے وہی مجموعہ کلام جس کے اوراق غالؔب کے نزدیک قلم چاک کرنے کے قابل تھے، نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ہم تک پہنچا، اور اس کے مطالعہ سے غالؔب کی شاعرانہ عظمت میں کئی حیثیتوں سے اضافہ ہوا، اول تو ہم کو معلوم ہوا کہ

۱۲۳۷ھ تک غالبؔ نے جو کچھ کہا تھا، وہ یک حکم چاک کر دینے کے قابل نہ تھا، بلکہ اس میں بہت سے اشعار ایسے تھے، جو ان کے بہترین اشعار میں شمار کیے جا سکتے ہیں، اس کے علاوہ ہمیں غالبؔ کی شاعری کی ارتقائی منزل سے واقفیت حاصل ہوئی، اور پتہ چلا کہ ایک بڑا شاعر اپنی خامیوں پر آگاہ ہو کر کس طرح خود اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔"

اس کے بعد حبیب احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں کہ سب سے بڑا فائدہ جو نسخۂ حمیدیہ کے شائع ہونے سے ہوا وہ یہ ہے کہ ایک کافی تعداد عمدہ اور پاکیزہ اشعار کی جو انتخاب کے وقت نظر انداز کر دیے گئے تھے، ہم کو دستیاب ہوئی، ان کے نزدیک ایسے عمدہ اور پاکیزہ اشعار جو سو (۱۰۰) سوا سو کے قریب ہیں، ان کو انھوں نے اپنے مضمون میں نقل کر دیا ہے، ان میں سے کچھ اشعار ہم بھی یہاں درج کرتے ہیں،

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

☆

یا رب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو — یہ محشر خیال کہ دنیا کہیں جسے

☆

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

☆

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے — جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچیے

☆

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی — میری محفل میں غالبؔ گردش ایام باقی ہے

☆

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوال دل مگر — کس کو دماغ منت گفت و شنود تھا

☆

کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں لیکن آخر — جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

☆

شورِ رسوائی دل دیکھ کر یک نالۂ شوق	لاکھ پردے میں چھپا پھر وہی عریاں نکلا
شوخی رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک	آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

حبیب احمد صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ ''نسخۂ حمیدیہ کے بہت سے ایسے اشعار جو رواں اور بلند ہیں، وہ تو نظر انداز کر دیے گئے، لیکن ان کے بجائے مروجہ دیوان میں غالبؔ کے بہت ایسے اشعار شامل کیے گئے جو نسبتاً ثقیل بھی ہیں اور پست بھی، وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ غالبؔ کے مروجہ دیوان کے ثقیل اور چست اشعار خارج کر دیے جائیں، اور ان کے بجائے نسخہ حمیدیہ کے وہ سلیس، رواں اور بلند اشعار داخل کر دیے جائیں، جو نظر انداز ہو گئے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مروجہ دیوان میں جواہر ریزوں کے ساتھ کچھ کنکریاں آ گئی ہیں، اور کچھ جواہر ریزے چھوٹ گئے، وہ نسخہ حمیدیہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالبؔ کے بیان سے جو دھوکا ہوتا تھا کہ پچیس برس تک انھوں نے جو کچھ کہا تھا، قابل اعتنا نہ تھا، وہ نسخۂ حمیدیہ کے توسط سے دور ہو گیا، اور یہ ثابت ہوا کہ غالبؔ میں ابتدا ہی سے شاعری کا وہ جوہر موجود تھا جس نے انھیں بقائے دوام عطا کیا، معلوم ہوتا ہے کہ عرفیؔ اور کیٹسؔ کی طرح ان کا شاعرانہ شعور بھی بہت جلد بالغ ہو گیا تھا، اور اگر عرفیؔ اور کیٹسؔ کی طرح غالبؔ کی موت بھی عنفوانِ شباب میں واقع ہوتی جو اردو ادب کے لیے ایک سانحہ عظیم ہوتا، تو بھی وہ ایک ایسا ادبی کارنامہ چھوڑ جاتے جو ہمیشہ رہنے والا ہوتا۔''

غالبؔ کے پچیس برس کی شاعری کی یہ مداحی اس وقت قابل قبول ہو سکتی ہے، جب یہ یقین کامل ہو کہ نسخہ حمیدیہ میں صرف ۱۸۲۱ء تک کے اشعار ہیں لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں ۱۸۲۱ء کے بعد بھی گیارہ (۱۱) بارہ (۱۲) برس تک کی غزلیں درج ہوتی رہیں تو پھر حبیب احمد صدیقی صاحب کی مذکورہ بالا مدح سرائی محلِ نظر ہو جاتی ہے۔

نسخۂ حمیدیہ پر اعتراضات:

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت پر جہاں تعریف و توصیف کے پھول برسائے گئے، وہاں اس پر تنقیدوں کی چنگاریاں بھی گرتی دکھائی دیتی ہیں، مثلاً مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالبؔ

میں لکھا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کبھی غالبؔ کے پاس نہیں گیا، اور اس کے لیے یہ دلائل دیے ہیں:

(۱) غالبؔ ۱۸۲۷ء میں کلکتہ گئے، اور جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھہرے، اور یہاں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمین بوس قدم ہے ہم کو

نسخۂ حمیدیہ میں یہ غزل غالبؔ کے اُس کلام میں شامل کی گئی ہے جس کا کوئی ہم طرح شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں، اگر یہ نسخہ کلکتہ سے غالبؔ کی مراجعت کے بعد بغرض تصحیح وترمیم ان کے پاس گیا، اور انھوں نے نسخہ کی کتابت سے بعد کی کہی ہوئی غزلیں حاشیہ پر بڑھائیں تو اس غزل کو کیوں نظر انداز کیا؟

(۲) غالبؔ اپنے ایک خط مرقومہ ۲۷، جولائی ۱۸۶۴ء میں لکھتے ہیں کہ پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی، بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

الٰہی بخش خاں معروف کا انتقال ۱۸۲۶ء میں ہوا، لہٰذا ماننا چاہیے کہ یہ غزل ۱۸۲۶ء سے پہلے کہی گئی، لیکن مطبوعہ نسخہ حمیدیہ کے مطابق یہ بھی، اس کلام میں شامل ہے، جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں، ثابت ہوا کہ بھوپال والا نسخہ ۱۸۲۵ء کے بعد کبھی بھی غالب کے پاس نہیں گیا۔

(۳) غالبؔ نے کسی تحریر میں اس نسخہ کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ غدر کے بعد انھیں اپنے کلام کے مختلف نسخے جمع کرنے کی سخت ضرورت پیش آگئی تھی۔

(۴) قلمی نسخۂ حمیدیہ میں قصائد اور گیارہ رباعیات کے علاوہ کل ایک ہزار آٹھ سو نوے اشعار ہیں، لیکن ۱۸۲۵ء کے بعد آخری دم تک چوالیس (۴۴) برس میں غالبؔ نے اردو غزلیات میں مطبوعہ دیوان کے مطابق نوسو نوے اشعار کہے، بعد کے قصائد، قطعات اور مثنوی انبہ

کے اشعار کی تعداد دو سو ستر ہے، رباعیات گیارہ (۱۱) ہیں یعنی اگر سب کو شامل کرلیا جائے تو ان کے چوالیس (۴۴) برس کے کل اردو اشعار تیرہ سو سے کسی قدر کم بنتے ہیں۔

(۵) نسخۂ حمیدیہ والے اشعار کا کوئی مجموعہ اگر انتخاب کے وقت غالبؔ یا ان کے دوستوں کے پیش نظر تھا، تو ماننا چاہیے کہ انتخاب میں فروگذاشتیں ہوئیں، اس نسخہ میں بعض ایسی غزلیں موجود ہیں جو تماماً یا جزواً انتخاب میں آنی چاہیے تھیں مگر نہیں آئیں (غالبؔ ص۴۶۳۔۴۶۱، دوسرا ایڈیشن)

معلوم نہیں مولانا غلام رسول مہر نے یہ کیسے لکھ دیا کہ غالبؔ کے کل اردو اشعار تیرہ سو سے کم بنتے ہیں، مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ غالبؔ کا جو دیوان ان کی زندگی میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا، اس میں ان کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف غالبؔ کے بڑے ناقد ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوار الحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالبؔ کے ہاں ان نظموں کے اندراج کے لیے روانہ کیا جاتا تھا، جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں، مگر مفتی صاحب، اس استدلال کے لیے کوئی سند اور ثبوت نہیں پیش کرتے ... ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیہ کے اضافے اور اصلاحیں خود مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، راقم الحروف نے سرکارِ عالی کے محکمۂ اسنادات تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تصحیح کی اور غالبؔ کے اصل خطوط سے مقابلہ کیا، ان کی اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا گیا، علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں، یہ اغلاط غالبؔ جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں۔''

(بحوالہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مئی ۱۹۶۹ء)

مولانا عرشی رام پوری نے اس کی تائید تو نہیں کی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالبؔ کے پاس گیا اور ان کی نظر سے گزرا، لیکن وہ یہ وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا، اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھی کے پاس رہا تھا،

اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں بہادر کے کتاب خانے میں پہنچا، بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن ۱۲۴۸ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہرحال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی (دیوان غالب اردو از مولانا امتیاز علی عرشی، ص ۸۷) مولانا عرشی نے جو کچھ وثوق کے ساتھ لکھا ہے، اس کی سند پھر بھی باقی رہ گئی، ان کا وثوق دراصل قیاس ہی پر مبنی ہے، کیوں کہ مولانا غلام رسول مہر کا یہ اعتراض اب بھی باقی رہ جاتا ہے کہ غالب کی کسی تحریر میں اس نسخہ کا ذکر نہیں ملتا۔

پروفیسر حمید احمد خاں کا اعتراض مفتی انوارالحق کے نسخہ پر یہ بھی ہے کہ ان کا مطبوعہ نسخہ قلمی نسخہ کی صحیح نقل نہیں ہے، (ص ۲۰)......ان کے مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے (ص ۲۱)......قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی قسمیں تصور میں آسکتی ہیں، وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہیں، بجز اس ایک صورت کے کہ قلمی دیوان کا شاید کوئی شعر مطبوعہ نسخے سے حذف نہیں ہوا (ص ۲۲)...... مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں نہ صرف بعد کی سب اصلاحیں بلکہ وہ پوری کی پوری غزلیں بھی شامل ہیں، جن کا بھوپال کے مخطوطے میں سرے سے وجود ہی نہیں (ص ۲۲)......

پروفیسر صاحب نے مفتی صاحب کے ترتیب دیے ہوئے نسخے کو سخت الفاظ میں مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ نسخہ اتنے سخت الفاظ کا مستحق نہیں، وہ لکھتے ہیں کہ مطبوعہ نسخہ قلمی نسخہ کی صحیح نقل نہیں ہے، لیکن یہ بھی تحریر کرتے ہیں، قلمی دیوان کا شاید کوئی شعر مطبوعہ نسخہ سے حذف نہیں ہوا، پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ یہ صحیح نقل نہیں ہے، مگر صحیح نقل سے مراد پروفیسر صاحب کی شاید یہ ہے کہ جس ترتیب سے قلمی نسخہ میں قصائد اور غزلیں نقل کی گئی ہیں، وہ ترتیب مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے، مثلاً قلمی نسخہ میں فارسی اور اردو کے قصائد شروع میں ہیں، لیکن مفتی صاحب نے ان کو آخر میں درج کیا ہے، اسی طرح بعض غزلوں کے اندراج میں تقدیم و تاخر ہوگیا ہے، ان غزلوں کے اندراج کی ترتیب سنین کے لحاظ سے ہوتی تو اس تقدیم و تاخر کو بڑا فتور کہا جا سکتا تھا، ورنہ یہ کوئی فتور نہیں، پروفیسر صاحب کو مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں انحراف کی وہ ساری قسمیں دکھائی دی ہیں، جو تصور میں آسکتی ہیں، لیکن اس انحراف کی ساری قسموں کی وضاحت دیباچہ میں نہیں کی گئی

ہے، وہ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ مطبوعہ نسخے میں بعد کی اصلاحیں اور وہ پوری غزلیں بھی شامل ہیں جن کا بھوپال کے مخطوطے میں سرے سے وجود ہی نہیں۔ ناظرین کی نظر میں یہ مطبوعہ نسخے کا نقص نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ خوبی ہے، اور جس محنت و کاوش سے بعد کی اصلاحیں اور غزلیں شامل کی گئی ہیں، وہ داد طلب ہے، کیوں کہ ان اضافوں سے ناظرین کو غالبؔ کے دیوان کے ابتدائی متن اور متداول دیوان کے مقابلہ کرنے میں اپنی بینش و دانش کو زیادہ آزمائش میں مبتلا کرنا نہیں پڑتا ہے، بلکہ آسانی سے غالبؔ کی ذہنی کاوشیں نظر میں آجاتی ہیں، پروفیسر صاحب کے دیوان کے ٹائٹل کے اندرونی حصہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ مفتی صاحب کا مطبوعہ نسخہ متعدد فروگذاشتوں کی وجہ سے وہ مقصد کما حقہٗ پورا نہ کرسکا جو اسے کرنا چاہیے تھا، اگر یہ جملے محض نسخہ حمیدیہ کے جدید ایڈیشن کی اہمیت کو بڑھانے کے خیال سے لکھے گئے ہیں، تو پھر ان سے اختلاف کرنا بیکار ہے، لیکن اگر پروفیسر صاحب کو بھی ان سے اتفاق ہے تو اس کی تردید ان کے دیباچہ کی اس تحریر سے ہوجاتی ہے کہ اس کی دریافت نے اس زمانے کے ادبی حلقوں میں ایک سنسنی سی پیدا کردی (ص ۱۷) اور پھر وہ اس کی اشاعت پر مفتی انوار الحق کی فہم سلیم کی داد بھی دی ہے، (ص ۱۸) گزشتہ پچاس سال سے غالب پر جس کسی نے کوئی مضمون لکھا، اس کو سامنے ضرور رکھا اور غالب کو سمجھنے میں اس مطبوعہ نسخہ سے جو مدد ملی، اس کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی، یہ کوئی ضروری نہیں کہ غالب کا ابتدائی دیوان جس ترتیب سے لکھا گیا اگر اس کی ترتیب میں بال برابر بھی فرق آگیا تو غالبؔ کو سمجھنے اور سمجھانے کا مقصد کما حقہ پورا نہیں ہوسکتا ہے، بھوپال کے قلمی نسخہ کی دریافت اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کہ بقول پروفیسر صاحب، غالبؔ کا پہلا دیوان اس بے دریغ قطع و برید کے باعث جس کا ذکر حالیؔ، آزادؔ اور خود غالبؔ نے کیا ہے، محض ایک ادبی حکایت بن کر رہ گیا تھا وہ میسر ہوگیا، (ص ۱۷) مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ سے اس ادبی حکایت کے سامنے آجانے سے کوئی فتور پیدا نہیں ہوتا۔

مالک رام صاحب نے ابھی حال ہی میں یعنی ۱۹۷۰ء کے انتخاب کلام موسومہ بہ گلِ رعنا کو شائع کیا ہے، اس کے دیباچہ میں وہ مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''افسوس کہ مرتب اور ان کے ہم کاروں کی سہل انگاری سے اس میں کئی طرح کی غلطیاں راہ پاگئیں، ان میں سے دو بہت افسوسناک تھیں، متن اور حاشیے کا کلام

کچھ ایسا گڈمڈ ہو گیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون سا کلام ۱۸۲۱ء سے پہلے کا ہے اور کون سا بعد کا، دوسرے یہ کہ نہ صرف رسم الخط میں ترمیم کر کے اسے جدید بنا دیا، بلکہ اس میں کتابت کی تصحیح پر بھی کماحقہٗ توجہ نہیں دی گئی، جس سے یہ نسخہ بے حد غلط چھپنے کے باعث ساقط الاعتبار ہو گیا۔" (ص ۲۹)

مالک رام صاحب نے اپنے دیوانِ غالبؔ کے ایڈیشن کے مقدمہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے جب مطبوعہ کلام اپنے ہاں شامل کیا، تو ان اغلاط کو جوں کا توں لے لیا، اور ان کی درستی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، اس لحاظ سے نسخۂ حمیدیہ جامع الاختلافات بلکہ جامع الاغلاط کہلانے کا مستحق ہے۔ (ص ۳۳، ۱۹۵۷ء ایڈیشن)

پروفیسر حمید احمد خاں کے ایڈٹ کردہ نسخۂ حمیدیہ سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون سا کلام ۱۸۲۱ء سے پہلے کا ہے اور کون سا بعد کا، حالاں کہ انھوں نے متن اور حاشیے کے کلام کو بقول ان کے گڈمڈ نہیں کیا ہے، اور اس کا پتہ چلانا بھی مشکل تھا، کیوں کہ دیوان کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار ہے، پروفیسر صاحب بھی رسم الخط میں ترمیم کر کے اس کو جدید بنانے پر مجبور ہوئے ہیں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"املا میں البتہ قلمی نسخے کے بجائے مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کا تتبع کیا گیا ہے، قلمی نسخے کے کاتب یا کاتبوں کے ڈیڑھ سو برس پرانے املا کا بجنسہٖ اختیار کرنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا، اگرچہ کہیں کہیں میں نے حسب ضرورت ان کاتبوں کی خصوصیات تحریر کا ذکر کیا ہے، مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ میں بڑی حد تک جدید اصولِ کتابت ملحوظ رکھے گئے ہیں اور جا بجا اضافت کا استعمال ہوا ہے، جو بجائے خود قلمی نسخے کے املا سے انحراف ہے، مگر بحالات موجودہ انحراف کی یہ صورت قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔" (ص ۲۴)

اور پھر پروفیسر صاحب بھی اپنے جدید ایڈیشن کی کتابت کی غلطیوں پر نوحہ خواں ہوتے ہیں، لکھتے ہیں:

"دیوان کے مطبوعہ اوراق سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ صحت، طباعت کے

لیے پوری کوشش کے باوجود متن میں اور خود اپنے لکھے ہوئے حواشی میں جابجا غلطیاں رہ گئی ہیں، ایک صحت نامۂ اغلاط دیوان کے آخر میں دیا جارہا ہے۔''
(ص ۲۷)

یہ صحت نامہ پندرہ صفحے کا ہے، اس صحت نامہ کے بعد مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ پر یہ اعتراض بہت زیادہ صحیح نظر نہیں آتا کہ:

''قلمی دیوان کے متن میں حافظ معین الدین نے جو اغلاط کتابت ابتداً داخل کیں اور دیوان کے حواشی پر موٹے قلم والے بدخط کاتب (غالباً عبدالصمد مظہر) نے اپنی بے بضاعتی اور بے احتیاطی کے باعث جو گل کھلائے، اُن پر سب مفتی انوارالحق کے نسخے کے کاتب نے وہ چند اضافے کیے۔'' (ص ۲۹)

لیکن اس کے باوجود وہ فوراً یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''جب تک بھوپال کا مخطوطہ دوبارہ دستیاب نہ ہو، مفتی انوارالحق کے شائع کردہ نسخے کی عبارت سے بلاوجہ موجہ انحراف نہیں کرنا چاہیے۔'' (ص ۲۹)

ان آخری جملوں سے ظاہر ہے کہ وہ اس کے تو قائل ہیں کہ مفتی صاحب کا مطبوعہ نسخہ اپنی متعدد فروگذاشتوں کی وجہ سے وہ مقصد کماحقہٗ پورا نہ کرسکا جو اسے کرنا چاہیے تھا، مگر مالک رام صاحب کی طرح اس کو ساقط الاعتبار نہیں کہتے، اور پھر مفتی صاحب کے نئے مطبوعہ نسخہ پر اب چاہے کتنی ہی نکتہ چینیاں کی جائیں لیکن یہ اپنا مقصد کماحقہٗ پورا کرچکا ہے، جیسا کہ مالک رام صاحب کو بھی اعتراف ہے،

''یہ حقیقت ہے کہ جب یہ خطی نسخہ دستیاب ہوا ہے، علمی حلقوں میں سنسنی سی پھیل گئی، اہلِ نظر نے اس دیوان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی اشاعت سے غالباً غالبؔ شناسی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔'' (گل رعنا، ص ۲۹)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری:

دیوانِ غالبؔ جدید یعنی نسخۂ حمیدیہ میں مفتی انوارالحق کی تمہید کے بعد کلامِ غالبؔ پر ڈاکٹر

عبدالرحمٰن بجنوری بیرسٹرایٹ لاء (المتوفی ۱۹۱۸ء) کی وہ تقریظ بھی ہے جواب غالبؔ کے محاسنِ کلام کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے یہ تحریر دیوان غالبؔ کے ایک نئے ایڈیشن کے لیے لکھی تھی، جوانجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہونے والا تھا، یہ ایڈیشن جوطبع نہ ہوسکا، لیکن یہ تحریر علیحدہ بھی چھپی اور حمیدیہ میں منسلک کرکے محفوظ بھی کردی، افسوس یہ ہے کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی وفات جوانی میں ہوگئی، جس سے اردو ادب کو بھی ایک بڑا نقصان پہنچا، مگر اسی تحریر کی بدولت ان کا نام بہت عزت سے لیا جاتا ہے، یہ انگریزی داں حلقہ میں کلامِ غالبؔ کے لیے بانگِ درا بن گیا، اس کو لکھے ہوئے پچاس برس سے زیادہ گزر گئے، لیکن یہ اب بھی شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری نے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے تعلیم پائی تھی، جناب رشید احمد صدیقی صاحب علی گڑھ کے ہراولڈ بوائے کے کارنامے پرجھوم جاتے ہیں، اس لیے ان کو یہ لکھنے میں بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ ''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالبؔ کو نفسیاتی اسلوب کی تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا،...... اور یہ بجنوری مرحوم کے مقالہ کا تصرف ہے کہ آج کل کے پڑھے لکھوں میں غالبؔ سے شیفتگی پیدا ہوئی، اور اربابِ ذوق وفکر نے غالبؔ ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے اندازِ تنقید سے جانچنا پرکھنا شروع کیا'' (تعارف، باقیاتِ بجنوری) لیکن جب کوئی اچھی تحریر شائع ہوتی ہے تو یہ اگر پسند کی جاتی ہے تو اس کی طرف نقادوں کی بھی نظر اٹھتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریر اس سے مستثنیٰ نہ ہوسکی، خود نسخۂ حمیدیہ کے مرتب مفتی انوار الحق نے اپنی تمہید میں لکھا ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بلاچون وچرا تسلیم ہی کرلیا جائے، بعض جگہ خود مجھ کو بھی اس سے ایک گونہ اختلاف ہے...... وہ غالبؔ کے ایسے مداح اور معتقد تھے کہ وہ (ان کے اشعار کی) گوناگوں معنوی خوبیوں کے سامنے اشعار کے چند لفظی اسقام کی کچھ وقعت نہ کیا کرتے تھے، بلاشبہ انھوں نے ان کی بابت جو کچھ لکھا ہے، وہ جوشِ عقیدت اور فرطِ محبت کی ایک مسلسل داستان ہے۔'' (ص ۲۹)

بجنوری مرحوم کے مداح جناب رشید احمد صدیقی صاحب بھی لکھتے ہیں ''یہ صحیح ہے کہ غالبؔ

کی تنقید میں بجنوری مرحوم نے کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے، جہاں تہاں اشعار کے مفہوم سے بھی دور جا پڑے ہیں، لیکن اس سے ان کے خلوص یا ان کی ذہنی جامعیت پر آنچ نہیں آتی، مجتہد یا امام کے لیے یہ مراحل ناگزیر ہیں۔" (تعارف باقیاتِ بجنوری)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی یہ تحریر دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، ایک تو ہے جس میں ہوش حقیقت ہے اور دوسری وہ ہے جس میں صرف جوش عقیدت ہے، ہوش حقیقت ہی سے کام لے کر انھوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ کون سا نغمہ ہے جو غالبؔ کی شاعری کے ساز کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے، (ص ۴۳) مرزا نے اپنے دیوان میں محاورہ کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے،...... مرزا کی شاعری دلّی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں، بلکہ آزاد زبان ہے.... مرزا کے خیالات نے اپنے اظہار کے لیے خود الفاظ تیار کر لیے بلکہ وقت نے مرزا کی مشکل پسند طبیعت کے لیے کام کو زیادہ آسان کر دیا، الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہادِ کامل کا درجہ رکھتے ہیں، مثلاً دام شنیدن، خمار رسوم، آتشِ خاموش، جوہر اندیشہ، گلبانگِ تسلی، شبنمستان، دریائے مے، پہلوئے اندیشہ الخ۔ شیکسپیئر اور غالبؔ کا کام قواعد و زبان کی پابندی نہیں ہے، یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے، (ص ۴۲۔۴۵)

مرزا غالبؔ نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے، اس کے متعلق سید فضل الحسن حسرتؔ اور علی حیدر طبا طبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کیے ہیں، (ص ۴۴) جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے، وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے (ص ۴۵۔۴۶) ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معانی پنہاں ہیں۔ (ص ۴۹) مرزا غالبؔ کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے (ص ۶۴) مرزا غالبؔ کے کلام کی عجیب سادگی اور ہوشیاری اور عجیب تر بے خودی اور پُرکاری انتہائے کمال ہے (ص ۷۳) غالبؔ وحدت الوجود کے قائل ہیں، وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہیں خیال کرتے (ص ۸۳) مرزا غالبؔ ان تابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں ہیں جو زندگی کو ماتم خانہ اور اہلِ دنیا کو اہلِ جنازہ خیال کرتے ہیں، وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہے کہ ماسوا اور خدا صرف عارضی طور پر جدا ہیں، اور بعد الموت یہ جدائی ختم ہو جاتی

ہے(ص ۱۱۵) مرزا کو کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے، گاہ گاہ زیرلب تبسم ضرور کرتے ہیں، ان کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ مزاح کا انداز رکھتا ہے(ص ۱۲۲) مرزا نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی (ص ۱۲۳)

عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ سب کچھ جو لکھا ہے، وہ ان سے پہلے بھی لکھا جا چکا تھا، لیکن انھوں نے ان کے لکھنے میں جو جاندار طرز بیان اختیار کیا ہے اس سے ان کی پوری تحریر شاندار ہوگئی ہے، اردو ادب میں ایسی جاندار اور شاندار تحریریں کم لکھی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے پڑھنے میں بڑی لذت ملتی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے، غالبؔ نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے، کون سا ''پیکر تصویر'' ہے جو اس ''کاغذی پیرہن'' پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔'' (ص ۳۴)

بجنوری مرحوم کے مذاقی کی خوبی بلا امداد و ساز و ترنم کے ترتیل سے دریافت ہوسکتی ہے۔ (ص ۳۶)

''زبان ارضی ہے، اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں، ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم طیار کرتا ہے، شعرا گو تلامیذ الرحمٰن ہیں، لیکن ان میں بھی یہ قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کرسکیں، جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں، وہ اصلی لطافت کے بعد کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے...... غالبؔ کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہوگیا ہے اور عریاں بدن نظر آتا ہے۔'' (ص ۳۹)

''دیوانِ غالبؔ میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے، تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے، گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے، بہت سے نقاد اس کو کیفِ شراب پر محمول کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، گیٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ کا حصہ دوم ہے، یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا، ایک دن ایکر ماں نے گیٹے سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے؟ گیٹے نے جواب دیا، یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں، لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامیابی

سے نہیں اکتاتے ،انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے،اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمالِ فن ہے،اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے، کہ اس کے پسِ پشت کیا ہے،لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آواز کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔'' (ص ۴۰۔۴۱)

تحریر کی اسی قسم کی آن بان سے پڑھنے والا دبتا چلا جاتا ہے،اور اس کو یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، بلکہ وہ اسی میں کھویا رہتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، کس شان وشکوہ سے کہہ رہے ہیں،لیکن جب وہ ٹھہر کر نہ۔رکرتا ہے تو پھر ان کی پرشکوہ تحریروں کے بارے ہلکا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان کی بعض باتوں میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کو دخل ہے۔

وہ اس تقریظ کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں،مقدس وید اور دیوانِ غالب۔''

ظاہر ہے کہ یہ شعروادب کے کسی عارف کی عارفانہ رائے نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ اس کو شاعر کی عقیدت میں جذب ہو کر کسی ادبی مجذوب کی ایک مجذوبانہ بڑ یا مشاعرہ کے پلیٹ فارم پر واہ وا حاصل کرنے کی خاطر ایک صدائے مستانہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اپنی جوانی کی ترنگ میں یہ لکھ گئے ہیں،عمر کی پختگی ہوتی تو ان کی رائے میں یہ وارفتگی نہ ہوتی، ایسی تعریف وتحسین سے چڑھ کر خلیفہ عبدالحکیم لکھ اٹھے ہیں''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے کلامِ ریختہ کو وحی والہام قرار دیا،لیکن اس کلام میں ربانی وحی کے ساتھ شیطانی وحی کو بھی اچھا خاصا دخل ہے۔'' (افکارِ غالب، ص ۱۸)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن آگے چل کر لکھتے ہیں کہ دیوانِ غالب میں فصاحت کی یہ کیفیت ہے گویا دریائے لطائف رواں ہے، (ص ۳۴) اس عمومی رائے سے تو یہی ظاہر ہے کہ غالب کا کوئی شعر فصاحت کی کیفیت سے خالی نہیں،مولانا شبلی کی رائے کے مطابق فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ ''لفظ میں جو حروف آئیں، اُن میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس، غریب اور ثقیل نہ ہوں، تراکیب کی ساخت، ہیئت اور نشست میں تناسب، توازن اور توافق ہو، مرکبات میں برجستگی، سلاست اور روانی ہو، اور سہل الادا بھی ہو، معانی ومطالب میں زیادہ اغلاق اور اشکال نہ ہو۔'' لیکن کیا غالب کا ہر شعر اس معیار پر پورا اُترتا ہے؟

ان کے یہاں تنافر کی بھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

☆

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

☆

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

☆

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

☆

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

ترے تیر، جو جگر، جگر جدا، جی جلے، بہ بدی، بات بگڑ، ہے ہو، کل کہیں گے کہ، کیا کیا کیے ہیں، تنافر ظاہر ہے۔

غالبؔ کے یہاں غریب اور ثقیل ترکیبیں تو بہت ملیں گی جو اردو میں استعمال نہیں ہوتی ہیں، مثلاً نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں میں، خشت پشت، دست عجز، قالب آغوشِ وداع، شمار سبحہ، مرغوب بت مشکل، نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب، اندازِ بخوں غلطیدن بسمل، سبحہ واماندگی شوق وتماشا، تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ، دمیدن نے مکیں چوں ریشہ زیرز میں بگر دسر مواندازنگاہ شرگیں وغیرہ جیسی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں، ان سے اردو کی غزلوں میں روانی و برجستگی تو کیا، تناسب اور توازن بھی تو پیدا نہیں ہوسکتا، پھر دریائے لطافت کیسے رواں ہوسکتا ہے، ایسی ترکیبوں کے اشعار

معنی میں جو اغلاق و اشکال ہوتے ہیں، اُن سے فصاحت کہاں باقی رہ سکتی ہے؟

ڈاکٹر عبدالرحمٰن اپنے زورِ بیان میں بعض جگہ ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے اُن پر وہی اعتراض عائد ہوتا ہے جو انھوں نے دوسروں پر کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں ''تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہوگئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آراء سے کرنے لگے ہیں، یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی، پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانہ میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالبؔ کا شیکسپیئر، ورڈس ورتھ اور ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں، افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے۔'' (ص ۳۶۔۳۷)

لیکن اسی یورپ زدگی کے اثر سے وہ بھی یہ لکھ گئے ہیں کہ دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالبؔ کا مقابلہ ہوسکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گیٹے المعروف بہ گیٹے ہے (ص ۳۷) غالبؔ کے بعد اشعار کی مشابہت پاور لیعنی (ص ۷۹) اور ملارمین (ص ۸۰) اور الفرڈ ٹام برٹ (ص ۸۲) سے بھی کی ہے، اور پھر جا بجا فلابیر (ص ۴۱) میکائیل انجلو (ص ۴۴) مارکو دل پینو (ص ۴۸) فرانسس ٹامپسن (ص ۷۴) کانٹ (ص ۷۹) بودکیر (ص ۸۰) لاپلس (ص ۱۰۸) ہرشل (ص ۱۰۸) ماطرلنک (ص ۱۱۷) ہنرک ابسن (ص ۱۲۴) کے اقوال و آراء سے اپنے خیال کی تائید کر کے اپنے علمی معلومات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں کہ مرزا غالبؔ کے لیے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے، یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرعہ تارِ رباب نظر آتا ہے (ص ۳۶) غالبؔ کی بہت سی غزلیں تو ایسی ضرور ہیں جن کی موسیقیت کے لیے ساز و رباب کی ضرورت نہیں، لیکن ہر مصرعہ تارِ رباب ہے، اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا، ان کی بعض غزلیں تو ایسی مشکل اور مغلق ہیں کہ کوئی مطرب خواہ کیسا یہ رہزنِ تمکین و ہوش کیوں نہ ہو، ان کو گا کر محفل میں کوئی کیفیت نہیں پیدا کرسکتا، وہ تو شرحوں کے ذریعہ سے کچھ تھوڑی بہت سمجھ لی جاتی ہیں، پھر نغمہ و ترنم سے یہ بھلا کیا کیفیت پیدا کرسکتی ہیں؟

ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی رائے ہے کہ غالبؔ کا موضوعِ کلام بیشتر فلسفہ ہے ....یہی باعث ہے کہ.... دیوانِ غالبؔ میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے،

(ص ۳۹۔۴۰) یہ کہنا صحیح نہیں کہ غالبؔ کے اشعار اس لیے نا قابل فہم ہیں کہ ان میں فلسفہ بھرا ہوا ہے، بلکہ اس لیے جیسا کہ حالیؔ نے بھی لکھا ہے کہ ان کے بہت سے اشعا میں ان کے خیالات بھی اجنبی ہیں اور زبان بھی غیر مانوس، وہ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف، ربط، اور توابعِ مہمل جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کو اردو میں عموماً استعمال کرتے رہے، اور بعض اسلوب بیان خاص ان کے مخترعات میں سے ہیں جو نہ ان سے پہلے اردو میں دیکھے گئے، نہ فارسی میں (ص ۱۱۰) اسی لیے ان کے بہت سے اشعار آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن یہ بھی کہتے ہیں کہ غالبؔ کا موضوعِ کلام بیشتر فلسفہ ہے، اگر فلسفہ سے قدرتِ مستور کی حقیقت اور زندگی کی منتشر شعاعوں کو اس کے ہفت رنگ جلوؤں کے ساتھ دیکھنا مراد ہے، تو غالبؔ کے اشعار میں یقیناً فلسفہ ہے، ورنہ موجودہ اصطلاح میں ان کو فلسفی کہنا درست نہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی جو خود بھی ایک فلسفی ہیں، لکھتے ہیں کہ غالبؔ غریب کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں، ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی، باتیں کرتے تو ذرا گہری، نظر سطح کی نہیں، عمق کی عادی، چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر، سوجھ بوجھ غضب کی، اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دل آویز نظم میں، کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے اور کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے ...... ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا، یہی ان کی حکمت، یہی ان کا فلسفہ، یہی ان کی شاعری کا پیام، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ۔

غالبؔ کی شاعری اور ان کے شاعرانہ فلسفہ کا یہی صحیح تجزیہ ہے، ورنہ وحدت الوجود پر ان کے افکار کو ان کا فلسفہ نہیں کہا جا سکتا ہے، مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ وحدتِ وجود یعنی ہمہ اوست کا مسئلہ صوفیانہ شاعری کی روحِ رواں ہے، صوفیانہ شاعری میں جو ذوق، شوق، سوز و گداز، جوش و خروش، اور اثر سب اسی بادۂ مرد افگن کا فیض ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وحدت الوجود کا مسئلہ سرتاپا شاعری ہے، ہر چیز خدا ہے، تمام عالم اس کے اشکال گوناگوں ہیں، ایک ہستیِ مطلق، عام بھی ہے، خاص بھی، مطلق بھی، مقید بھی، کلی بھی، جزئی بھی، جوہر بھی ہے، عرض بھی، سیاہ بھی ہے، سفید بھی، اس سے بڑھ کر شاعری کیا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخیل نے اس مضمون میں اس قدر عمل کیا کہ چھ سو

برس سے اس بات کو کہتے آتے ہیں، پھر بھی نہ ختم ہوتی ہے، اور نہ اس کی دل آویزی میں کمی ہوتی ہے، (شعر العجم، ج ۵، ص ۱۴۲ و ۱۵۱) فارسی شعراء کے یہاں اس مسئلہ پر بکثرت اشعار ملیں گے، فارسی کے مشہور شاعر مغربیؔ نے تو تمام دیوان میں ایک حرف بھی اس کے سوانہیں کہا، طرح طرح اور نئے نئے پیرایے سے یہ مضمون ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے اکابر صوفیہ میں شیخ ہجویری سے لے کر مرزا مظہر جانِ جاناں اور میر درد کے یہاں اس مسئلہ پر بڑی بحثیں ملتی ہیں، اس طویل درمیانی دور میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت اشرف جہانگیری سمنانی، حضرت عبدالقدوس گنگوہی نے اس کی بڑی وضاحت کی ہے، ہندوستان میں وحدت الوجود کے ایسے بھی حامی گزرے ہیں جنھوں نے اس کی تعبیر کچھ ایسے رنگ میں کی جو راسخ العقیدہ صوفیہ کی وضاحت سے بالکل مختلف ہوگئی، ان ہی میں کبیر داس بھی تھے، اکبر کا دینِ الٰہی بھی اس کا ایک کرشمہ تھا، جس کی تعلیم و تلقین سے مسلمان چیخ اٹھے، وحدت الوجود کے ایسے ہی حامیوں کو دیکھ کر علماء وحدت الوجود کو کفر، ضلالت اور رسوائی سمجھنے لگے، حضرت مجدد الف ثانی نے اس کی غلط تعبیر کے خلاف آواز بلند کی، اور یہ سمجھایا کہ اگر وحدت الوجود کی تصریح صحیح طور پر کی جائے تو یہ گمراہی نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ شریعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو یہ الحاد اور ضلالت ہے، دارا شکوہ اور سرمد توحید وجودی کے ایسے ہی حامی تھے، جن سے احکام شریعت نظر انداز ہو گئے، شاہ عبدالرحیم، ان کے بھائی شیخ ابوالرضا اور ان کے نامور صاحب زادے شاہ ولی اللہ نے توحید وجودی کو پھر شریعت کا خلعت پہنایا، اسی طرح مرزا مظہر جانِ جاناں اور میر درد نے بھی اس کو سلک شریعت سے منسلک کیا، غالبؔ کے دور میں بھی یہ مسئلہ زندہ رہا، انھوں نے بھی اس بادۂ مردافگن کا سہارا لے کر اپنی شاعری میں سوز و کیف پیدا کیا، اور جب اردو کے اکابر شعراء، اپنی غزلوں میں اس کو اپنا موضوع بنا چکے تھے تو پھر جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، غالبؔ کیوں پیچھے رہتے، البتہ انھوں نے اپنی گہری لیاقت و استعداد اور غیر معمولی شاعرانہ ذہانت و وجدان کی بدولت اس تقلیدی، رسمی اور روایتی رنگ کو اس طرح پیش کیا کہ بظاہر یہ معلوم ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، بالکل ایک نئی چیز ہے، حالاں کہ وہ محض ایک آواز بازگشت تھی، گو دل آویز تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن معلوم نہیں یہ کیسے لکھ گئے ہیں کہ دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے

ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے۔اس کی وجہ سبحان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے، بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے (ص ۴۲) اس عمومی دعوی پر صاد نہیں کیا جا سکتا، ان کے یہاں ایک لفظ کے بار بار استعمال کی مثالیں بھی موجود ہیں، مثلاً:

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

☆

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

☆

شوق ہے ساماں طراز نازش اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

☆

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کی
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

☆

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

☆

وعدۂ میر گلستاں ہے خوشا طالع شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں

☆

گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصر شوق ہے بانی میری

☆

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
جوں گل شمع ہو نظارہ پریشاں مجھ سے

☆

ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبار شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

☆

پھر شوق کررہاہے خریدار کی طلب
عرض متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

☆

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی توہاں
شوق فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

☆

اے دل ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لاسکتاہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

☆

مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازت تسلیم و ہوش ہے

☆

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

صرف لفظ شوق پر اتنے اشعار جمع کر چکا تو خورشید الاسلام صاحب کی کتاب غالبؔ کے اُس ضمیمہ پر نظر پڑی جس میں انھوں نے وہ تمام الفاظ مثالوں کے ساتھ جمع کر دیے ہیں جو غالبؔ

کے اشعار میں بار بار استعمال ہوئے ہیں، ان میں شوق کے علاوہ رفتار، دریا، موج، پرواز، جوش، جنون، تمنا، سعی، تماشا، جلوہ، نقش، بزم، سیلاب، بیابان، دشت، صحرا، ویرانی، آئینہ، شعلہ، برق، آتش، شرار، چراغ، دود، تپش، گداز، بے تابی، کشاکش وغیرہ کے الفاظ ہیں۔

پھر ان کے یہاں خیال کے اعادہ کی بھی مثالیں ملیں گی، وحدت الوجود پر جتنے اشعار ہیں، اُن میں ایک ہی خیال کو مختلف طریقے سے ظاہر کیا گیا ہے، یہ تمام اشعار ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے خود اپنے مضمون میں یکجا کر دیے ہیں، پھر ہستی پر غالبؔ نے جتنے اشعار کہے ہیں، اُن میں بھی ایک ہی خیال کا اعادہ ہو گیا ہے،

شاہد ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

☆

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

☆

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

☆

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

☆

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

غالبؔ فرہاد کے عشق کی نوعیت کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے اس کی مذمت بار بار کرتے ہیں،

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

☆

پیشہ میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

☆

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

☆

عشق، مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

☆

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینہ خوابِ گران شیریں

☆

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستۂ نیروے تن کی آزمائش ہے

اور دوسرے ہم معنی اشعار یہ ہیں:

(۱)
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(۲)

دکھاؤں تماشہ دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

(۳)

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

(۴)

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

(۵)

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

(۶)

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۷)

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۸)

نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

(۹)

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
سب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

(۱۰)

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

(۱۱)

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

(۱۲)

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
ہوئے ہیں پانوں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

(۱۳)

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب سے
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

(۱۴)

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

(۱۵)

دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ
نغمہ ہوجاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزم عیش دوست"
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

(۱۶)

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خونِ گرم دہقاں ہے
مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولٰی برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

(۱۷)

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

(۱۸)

یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے
ہم پیشہ وہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۱۹)

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

(۲۰)

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادۂ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(۲۱)

کہوں کس سے میں کہ کیا شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
نہ پوچھ ہجر کی راتوں کی کاہشیں ہمدم
وہ کیا جیے گا جسے موت بار بار آئے

(۲۲)

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر
مرگیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(۲۳)

مند گئیں کھوتے ہی کھوتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

(۲۴)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

(۲۵)

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھنا مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

(۲۶)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

(۲۷)

کبھی نیکی بھی اُس کے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

(۲۸)

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہیں ہے طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

(۲۹)

ناکامی نگاہ برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ مجھ کو تماشا کرے کوئی
جب وہ جمالِ دل فروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
اے دل ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

اس قسم کے متحد المعانی اشعار عبدالباری آسی کی مکمل شرح دیوانِ غالب میں اور بھی ملیں گے، اعادۂ خیال اور تکرار الفاظ شاعر کے عجز بیان کی دلیل نہیں، بلکہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی قادر الکلامی کے کمال سے ایک مضمون کو ادنیٰ تغیر سے کس کس طرح ادا کرسکتا ہے، اور پھر چاہے تو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ خیال میں نیا آب ورنگ پیدا کرسکتا ہے، میر انیس بڑے فخر کے ساتھ کہہ گئے ہیں:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

غالبؔ کے حسب ذیل اشعار سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ عالم کر مایا خیال کرتے ہیں (ص ۱۰۳)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جزو ہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

اگر ان اشعار کی بنا پر غالبؔ کو مایا کا فلسفی کہا جاسکتا ہے تو پھر اسی غزل میں خود بینی، خود آرائی، گل افشانی گفتار، پیمانہ وصہبا، ایمان وکفر، معشوق فریبی اور ساغر و مینا کا بھی فلسفہ ڈھونڈا جاسکتا ہے، اس سے قطع نظر اگر اس غزل میں غالبؔ نے مایا کے فلسفہ کی ترویج کی ہے، تو اس کو بھی غالبؔ کا کوئی اوریجنل اندازِ فکر نہیں کہا جاسکتا۔

انشاءؔ کے حسب ذیل اشعار میں بھی فلسفہ تلاش کیا جاسکتا ہے،

مرغانِ اولیٰ اجنحہ مانند کبوتر
کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے
وہ مار فلک کاہکشاں نام ہے جس کا
کیا دخل جو بل کھا کے کرے فوں مرے آگے

لیکن محمد حسین آزادؔ کو اس قسم کے اشعار میں کوئی فلسفہ نہیں مل سکا، بلکہ اس کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ یہ ایک فخریہ غزل تھی، جس کا ہر شعر دلوں پر توپ کے گولہ کا کام کرتا تھا (آبِ حیات، ص ۲۴۴)

اور اگر مرزا غالبؔ کے دل پر دنیا کے حادثات کا اثر نہیں ہوتا رہا، اور وہ محض اس کو تماشا سمجھتے رہے، تو پھر یہ کیسے کہہ گئے ہیں،

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

☆

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتار دوست

☆

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

☆

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

☆

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشار پئے امتحانِ اشک

☆

ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
جوں زلفِ یار ہوں میں سراپا شکستہ دل

☆

ناسازی نصیب و درشتی غم سے ہے
امید ناامید و تمنا شکستہ دل
مواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں
ہے چشم اشک ریز سے دریا شکستہ دل

☆

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

☆

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

☆

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

☆

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

یہ تضاد غالبؔ کے خیالات کا تضاد نہیں ہے، بلکہ غزل کی نیرنگیوں کے جلوے ہیں، جس کے بعد غزل گو کے خیالات میں ربط، تنظیم اور یک رنگی کو تلاش اور ثابت کرنا غزل گو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ غزل گو غالبؔ کو کسی ضابطہ فکر اور تنظیم خیال کے ماتحت کر دینا غالبؔ شناسی نہیں، ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہتے ہیں، خواہ وہ ایجابی ہو یا سلبی، مثبت ہو یا منفی، روایتی ہو یا غیر روایتی، تقلیدی ہو یا اختراعی، وہ اپنی غیر معمولی شاعرانہ استعداد اور بے مثال جدّت ادا سے ایسے اشعار کہہ جاتے ہیں جن میں کبھی شوکت ہوتی ہے، کبھی صلابت، کبھی جمال، کبھی جلال، کبھی رعنائی، کبھی ژرف نگاہی، کبھی سادگی، کبھی پُرکاری، کبھی شوخی، کبھی فکر فلسفیانہ، کبھی رموزِ عارفانہ، کبھی لغزشِ رندانہ، کبھی اندازِ مستانہ، کبھی نکاتِ صوفیانہ، کبھی اندازِ مردانہ، کبھی روشِ دلبرانہ، اسی رنگارنگی کی وجہ سے ان کی غزلیں ذہن و دماغ پر اب تک چھائی ہوئی ہیں، یہی رنگارنگی ان کی تہہ دار ذات میں بھی رہی، دونوں پر سخت سے سخت نکتہ چینیاں جاری ہیں، لیکن ان کی غزلوں اور ان کی ذات دونوں کی یہ کرامت ہے کہ ان کی زندگی سے لے کر اب تک علماء، صلحاء، زعماء، بوڑھے، جوان، نوجوان، زاہد، فاسق سب ہی ان کے سامنے جھکے اور جھکتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ مرزا کی شراب سے بے خودی مراد ہے، ...... یہ کیفِ سرمدی ہے، ..... ان ہی کا ظرف ہے کہ اس دانش ربا شراب کو جس کی دوسرے بو بھی نہیں لے سکتے ہیں، پیتے ہیں یہ وہ شراب ہے کہ جب ساقی جام میں ڈالتا ہے، تو مسیح و خضر رشک سے سبقت کے لیے

کشاکش کرتے ہیں، یہ شراب غم شکن اور شادی اثر ہے......آہ تا دمِ اخر کیا آرزوئے بے خودی ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

(ص ۱۲۹۔۱۲۷)

غزل کے اعجاز کا سہارا لے کر غالبؔ کے خمریات، موقع بہ موقع معرفت اور بے خودی کی شراب کی سرشاری اور مستی کے اظہار کے لیے تو استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان کی بیس روپے اور حد چوبیس روپے درجن بکنے والی شراب کاسن ٹیلن اور اولڈ ٹام کو بے خودی کی شراب کہنے کے لیے پہلے غالبؔ کی شاعری کو لیلیٰ قرار دینے کی ضرورت ہے، پھر چشم مجنوں کی قوتِ اختراع جس طرح بھی ظاہر ہو، اس پر چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

اور جب ڈاکٹر عبدالرحمٰن غالبؔ کی شراب کو بے خودی کی شراب تسلیم کرانے کے لیے مُصر ہو سکتے ہیں تو پھر انھوں نے غالبؔ کے اور اشعار کے جو معانی و مطالب بیان کیے ہیں، وہ ممکن ہے کہ خود غالبؔ کے حاشیہ خیال میں بھی نہ رہے ہوں لیکن ان کو اس لیے صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی لیلائے شاعری کے قیس کے بتائے ہوئے ہیں، ان میں جو خط و خال وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں وہ کسی اور کو نظر نہیں آ سکتے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ ان ہی سے غالبؔ کے تصوف اور فلسفہ پر باضابطہ بحث کی ابتدا ہوئی، حالیؔ نے غالبؔ کے تصوف اور فلسفہ پر کوئی لمبی بحث نہیں کی ہے، طبا طبائی نے غالبؔ کے اشعار کی شرح میں جا بجا ان کے صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کی وضاحت ضرور کر دی ہے، لیکن ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلی دفعہ بڑے آب و تاب کے ساتھ غالبؔ کے تصوف اور فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی جس کے بعد یہ بحث چل پڑی کہ غالبؔ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہ تھے، بلکہ ایک رمز شناس فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم بھی تھے، یہ اور بات ہے کہ اس رائے سے کچھ لوگوں نے اختلاف کر کے یہ ظاہر کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ وہ نہ فلسفی تھے اور نہ حکیم بلکہ فلسفیانہ اور عارفانہ افکار سے لذت حاصل کرتے اور اپنے حسنِ بیان سے

دوسروں کولذت بخشے۔

جس طرح حالؔی کا قلم غالبؔ کی اردو قصیدہ نگاری کی مدح خوانی میں رُک گیا ہے، اس طرح ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بھی ان کے اردو قصیدوں کی نغمہ سرائی کرنے میں خاموش ہیں، پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ غالبؔ کو اپنے فارسی قصیدوں پر بڑا ناز تھا، یہی ناز ان کو اپنے اردو قصیدوں پر بھی رہا ہوگا، وہ اپنی غزلوں کو زیادہ اہمیت دینا پسند نہیں کرتے تھے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔'' (مکتوب بنام علاؤ الدین احمد خاں نمبر۴) غزلوں میں زیادہ تر عاشقانہ اشعار ہی ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی غزلوں کے بارے میں کہتے ہیں ''اُن کی غزلیں کاہے کو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں''

غالبؔ اپنی شاعری میں جس چیز کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے رہے، اس سے ان کی قدر ومنزلت میں تو زیادہ اضافہ نہ ہوسکا لیکن جس کو وہ کفر اور پیٹ پالنے والی باتیں خیال کرتے رہے، انھی کی بدولت اقلیم سخن کے بادشاہ کہلائے اور انھی سے اردو شاعری میں جلوۂ صد رنگ پیدا ہوا جس کی بناء پر آج لوگ اپنی زبانِ حال سے بڑے فخر کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اور پھر ان ہی پیٹ پالنے والی باتوں کو پڑھ کر ان کے مداح ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالبؔ کا دل ایک آئینہ ہے، جس میں ہر مظہر الٰہی اور منظر قدرت کا جلوہ موجود ہے، اس کی زبان ترجمانِ حقیقت ہے، اس کے پرکار تخیل کا دائرہ، دائرۂ امکان سے ہم کنار ہے، عالمِ کون وفساد میں ایک ذرہ کی جنبش، اس کے حلقۂ غور سے باہر نہیں ہے (ص ۸۲) ناظرین کو اس رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن ان کو غالبؔ کے پیٹ پالنے والی باتوں کی کرامت کا اعتراف ضرور کرنا پڑے گا۔

(''غالبؔ مدح وقدح کی روشنی میں'' (حصہ اوّل)۔ ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۸۲ تا ۲۳۰)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد حامد حسین

دیوانِ غالبؔ اور ڈاکٹر بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی لازوال شہرت کا سرچشمہ، ان کا کلامِ غالب پر وہ تبصرہ ہے جو آپ ''محاسن کلامِ غالب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ تبصرہ دراصل غالبؔ کے اس دیوان میں مقدمے کے طور پر شامل کیے جانے کے لیے تیار کیا گیا تھا جسے انجمن ترقی اردو شائع کرنا چاہتی تھی۔ اس دیوان کے چھپنے کی تو نوبت نہیں آئی لیکن اول سے آخر تک اس دیوان کی سرگزشت دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

یہ بات ۱۹۱۲ء کی ہے کہ مشہور انگریزی ناول نگار ای۔ ایم۔ فارسٹر سر راس مسعود کی دعوت پر ہندوستان آیا اور یہاں کے اہم مقامات کی سیر کی۔ ایک دن دہلی کے چاندنی چوک میں راس مسعود کے ساتھ گھومتے ہوئے فارسٹر نے اردو کے سب سے اہم شاعر کے بارے میں استفسار کیا اور جب راس مسعود نے غالبؔ کا تذکرہ کیا اور غالبؔ کے اشعار ترجمہ کر کے سنائے تو اس نے دیوانِ غالبؔ کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس وقت جو مطبوعہ نسخے دستیاب تھے ان کا کاغذ بہت معمولی تھا اور طباعت نہایت ناقص۔ اس پر فارسٹر نے اپنے تعجب کا اظہار کیا اور مسعود سے کہا کہ تم جس شاعر کو عظیم سمجھتے ہو اس کا دیوان ایسے کاغذ پر چھاپا ہے جس سے ہم اپنا بدن بھی صاف کرنا پسند نہ کریں گے۔ [۱] فارسٹر کا یہی جملہ سر راس مسعود کے لیے دیوانِ غالبؔ کے ایک نفیس ایڈیشن کی اشاعت کے واسطے تحریک بنا۔ پہلے انھوں نے نامیؔ پریس کانپور کے مالک رحمت اللہ رعد سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ [۲] لیکن وہ دیوان بالآخر نظامی پریس میں چھپ کر

۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔

دیوانِ غالبؔ کی غلط اور ناقص طباعت کا دلدادگانِ علم و ادب کو پہلے ہی احساس تھا۔ فارسٹر کے طنز نے اسے اور شدید بنا دیا۔ چناں چہ انجمن ترقی اردو نے بھی دیوانِ غالبؔ کے ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن کے چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور مولوی عبدالحق نے ''الناظر'' (لکھنؤ) میں شائع ہونے والی انجمن کی مختصر رپورٹ میں تحریر کیا، ''انجمن نے یہ بھی ارادہ کیا ہے کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن طبع کیا جائے اور اس میں یہ جدّت ملحوظ رکھی جائے گی کہ اردو زبان کے موجودہ نامور انشا پردازوں سے مرزا کی شاعری کی بعض خصوصیات پر مضامین لکھوا کر دیوان کے شروع میں درج کیے جائیں۔'' [۳] اس سلسلے میں مولوی صاحب نے جو عنوانات قائم کیے تھے اور ان کے تحت جن اصحاب سے مضامین تحریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی اس کی تفصیل یہ تھی:

(۱) مرزا صاحب کے خاندانی حالات، تعلقات، احباب و اقربا کے ساتھ، عوام و خواص کے ساتھ ان کا برتاؤ اور عام گفتار، کردار، نشست و برخواست، معاشرت کا طریقہ: نواب سعید الدین خاں صاحب طالبؔ دہلوی۔

(۲) مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات، ان کی زبان اور طرزِ بیان کی جدّت: مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی اور مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ کلکتہ۔

(۳) مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور اساتذۂ فارسی سے اس کا تاثر: مولانا شبلی نعمانی۔

(۴) مرزا صاحب کا فلسفۂ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعراء سے: ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبالؔ لاہور۔

(۵) مرزا صاحب کی شاعری کا اثر اردو زبان پر: مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی اور مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی۔

(۶) مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات: مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی اور مولوی عبدالحق۔ ان اصحاب کے علاوہ مولانا حالیؔ سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ وہ بھی چاہیں تو کچھ تحریر کریں۔ [۴]

اس دیوان کی اشاعت کے لیے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

''مسٹر محمد علی بی۔اے (آکسن) ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد کی خدمت میں یہ استدعا پیش کی گئی ہے کہ جو فنڈ انھوں نے مرزا صاحب کے مقبرے کی ترمیم وتعمیر کے لیے جمع کیا تھا اور اب وہ کسی درجہ سے اس کام میں صَرف نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ رقم اس ایڈیشن کے طبع کے لیے بہ اجازتِ معطیان عنایت فرمائی جائے تو مرحوم کی ایک عمدہ یادگار رہوگی۔'' ۵

آخر ۱۹۱۴ء میں جب راولپنڈی میں آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے دیوانِ غالبؔ کے سلسلے میں انجمن کی کوششوں کا خلاصہ پیش کیا اور بتایا کہ ملک کے جن نامور اہل قلم سے مرزا کی خصوصیات شاعری پر مضامین لکھنے کی استدعا کی گئی تھی ان میں سے سوائے عبدالحلیم صاحب شررؔ اور مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ کے کسی نے حامی نہ بھری لیکن اب تک ان صاحبوں سے بھی مضامین حاصل نہیں ہوئے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب کے دیوان کا ایک صحیح قلمی نسخہ بھی دستیاب ہوگیا ہے۔ یہ نسخہ نواب ضیاء الدین خاص صاحب نیرؔ نے لکھوایا تھا اور مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب نے بکمالِ عنایت ولطف وہ نسخہ انجمن کو مستعار عنایت فرمایا اور انجمن نے اس پر سے ایک نسخہ تیار کیا ہے لیکن چوں کہ مرزا صاحب کا کلام مشکل و دقیق ہے، اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی لکھ دی جائے۔ یہ ایڈیشن تیار ہورہا ہے اور آئندہ سال طبع ہوجائے گا۔ جناب نواب عمادالملک بہادر نے جو خود بڑے ادیب اور صاحب ذوق ہیں، ازراہِ قدر دانی پانچ سو روپے اس کے اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے ہیں۔'' ۶

کلامِ غالبؔ کے اس جدید ایڈیشن کی تیاری کا کام جناب سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا تھا جس کی تفصیلات انھوں نے اس طرح بیان کی ہیں:

''انجمن ترقی اردو نے اول ہی اول ۱۳ء یا ۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک نیا نسخہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوانِ غالبؔ کو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع

کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔ اس کے ساتھ چند مشہور ادیبوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلامِ غالبؔ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر فرمائیں تاکہ انجمن کے نسخے میں ایک علمی شان پیدا ہو جائے۔ تجویز کے اسی آخری حصے کی بدولت کتاب کی تیاری میں بہت دیر ہوئی۔ صرف رضا علی صاحب وحشتؔ (کلکتہ) نے انجمن کی درخواست پر ایک دلچسپ مضمون ارسال فرمایا لیکن دیگر حضرات نے یا تو یہ درخواست قبول ہی نہ کی اور یا قبول کی تو ایفائے وعدہ نہ کر سکے۔ دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہو گیا۔ نیز مختلف ذرائع سے جو کچھ غیر مطبوعہ کلام مل سکا اسے شامل کر لیا گیا۔" ۷

۱۹۱۵ء کی رپورٹ میں مولوی عبدالحق نے بتایا کہ دیوان طبع ہونے کے لیے ظفر الملک علوی ایڈیٹر "الناظر" کو لکھنؤ بھیج دیا گیا ہے۔ ۸ لیکن اسی زمانے میں جیسا کہ سید ہاشمی نے ذکر کیا ہے:

"نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالبؔ کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ صحت یا حسنِ طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا انجمن چھاپنا چاہتی تھی، لیکن مروجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیا ہو جاتی۔ مگر ان مرحوم کو کلامِ غالبؔ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام (اُن) کے سپرد کر دیا۔" ۹

چناں چہ ۱۹۱۶ء کی سالانہ رپورٹ میں مولوی عبدالحق نے اس دیوان کے بارے میں اطلاع دی:

"جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری، بی اے، ایل ایل ڈی، بیرسٹرایٹ لاء، مشیر تعلیم ریاست اس کے لیے ایک عالمانہ مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ جناب مولانا

عبدالحلیم صاحب شرؔر نے بھی اس ایڈیشن کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب تک بوجہ جنگ اعلیٰ درجے کا کاغذ دستیاب ہونے میں دشواری ہے۔ دوسرے اب تک لیتھو کا کوئی ایسا مطبع نہیں ملا جو اسے اعلیٰ درجے کی نفاست کے ساتھ چھاپ سکے جو انجمن کا منشا ہے۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ فوٹو گراف کے ذریعے طبع کرایا جائے۔ اس کے متعلق بھی خط و کتابت جاری ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ سال یہ طبع ہو جائے۔" ۱۰

دیوانِ غالب کی طباعت میں یہ اہتمام دراصل ڈاکٹر بجنوری کی تجاویز اور اصرار کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحق کے نام ان کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک اس دیوان کی لکھنؤ میں کتابت ہو چکی تھی اور "الناظر" پریس میں اس کی طباعت کا خیال تھا لیکن ڈاکٹر بجنوری اس تجویز سے متفق نہ تھے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا ہاشمی صاحب کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوانِ غالبؔ کو لکھنؤ "الناظر" پریس میں ہی طبع کرا لیا جائے... اس خبر نے مجھ کو نہایت مشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمائیے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے، نہایت عمدہ ہے۔ لیکن اگر اس کی چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجے کی کلوں کے پریس کا انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگایا جائے حروف پھیل جائیں گے، سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت، نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اوّل تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسودہ (کاپی) کو فوٹو کرانے کی کوشش کی جائے۔ یو اے کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت بڑھ جائے گی۔ بہرحال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص ہائے نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا جاتا ہے۔ ہاؔئے نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔ اس کا پتہ

لگا کر اس سے طبع کرالیا جائے جو دیوانِ غالبؔ آپ طبع کرارہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔'' [11]

بعد میں ڈاکٹر بجنوری نے دیوانِ غالبؔ کی یہ کتابت شدہ کاپیاں اپنے ہی پاس منگوالیں اور اس کی طباعت کے سلسلے میں خود اہتمامات شروع کیے۔ چناں چہ ایک دوسرے خط میں انھوں نے مولوی عبدالحق کو تحریر کیا:

''دیوانِ غالبؔ کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہورہا ہے، جب تیار ہوجائے گا، روانہ ہوگا۔ علاوہ اس کے زنک پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کررہا ہوں۔ کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے۔ اوروں کے جواب ابھی تک نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صَرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو زنک پلیٹ ٹائپ، بہترین جلد کے ساتھ بہترین کاغذ سمیت ممکن ہے۔ کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔ فوٹو ٹائپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ چند تصاویر متعلق مضامین دیوان وغیرہ کے بھی بندوبست کررہا ہوں۔ دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوائی ہے۔'' [12]

ان تیاریوں کے ساتھ ساتھ بجنوری، اس دیوان کے لیے مقدمہ لکھنے اور سید ہاشمی کے مرتبہ دیوان میں شامل غیر مدوّن کلام کی تحقیق میں مشغول ہوگئے۔ چناں چہ ایک خط میں، جس کا عکس ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' میں شامل ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

''لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ ''تکیہ'' والی غزل پوری لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا ایڈیٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلامِ اردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں، لیکن یہ ان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ اگر یہ غزل ان غزلوں میں جو بعد میں حاشیے پر اضافہ کی گئی ہیں، موجود ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کس شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے، آیا یہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں۔ دوسرے

نواب صاحب کواس کے بارے میں ذاتی علم کیا ہے۔ تیسرے نواب صاحب کی اس بارے میں رائے کیا ہے؟ ''طائر دل'' جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارے میں بھی جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے، نوٹ کر لیجیے گا۔'' ۱۳

''تکیہ'' والی غزل مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲، جولائی ۱۹۱۴ء کے ''الہلال'' (کلکتہ) میں شائع کی تھی۔ لیکن سید ہاشمی نے اس کو نواب احمد سعید خاں طالبؔ کے حوالے سے درج کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے طالبؔ سے انجمن کے لیے دیوانِ غالبؔ کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا تھا جو کہ غالباً سید ہاشمی کے دیوان کے تکمیل پا جانے کے بعد انھیں واپس لوٹا دیا گیا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر بجنوری کو نواب احمد سعید خاں طالبؔ سے اس غزل کے بارے میں تصدیق مطلوب تھی۔

یہ تیاریاں اسی مرحلے میں تھیں کہ اگست ۱۹۱۸ء میں بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نادر قلمی نسخہ دریافت ہوا۔ آخر ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق نے انجمن کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا:

> ''انجمن دو تین سال سے مرزا غالبؔ کے اردو دیوان کا صحیح اور عمدہ نسخہ شائع کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا مسودہ بڑی تلاش اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور صرف طبع کی دیر تھی۔ غالباً اس سال طبع بھی ہو جاتا۔ لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اگر چہ یہ تاخیر ناگوار ہوئی لیکن حکمت سے خالی نہ تھی اس لیے کہ اب انجمن کو مرزا صاحب مرحوم کے تمام (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کلام کے جمع کرنے کا فخر نصیب ہوگا......
>
> انجمن ترقی اردو کو تلاش سے بعض غیر مطبوعہ غزلیں اور خارج شدہ اشعار ضرور مل گئے تھے، لیکن اس بات کی کسی کو امید نہ تھی کہ پورا خارج شدہ کلام کبھی میسر آ جائے گا۔ یہ محض حسنِ اتفاق اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی سعی کا نتیجہ ہے کہ بھوپال کے ایک کتب خانے سے یہ گنج گم شدہ برآمد ہو گیا۔ (میں اس امر کا اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سب سے پہلے کتب خانۂ حمیدیہ میں اس نسخے پر مولوی عبدالسلام کی نظر پڑی)۔ ۱۴ انجمن کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب اس کی

تصحیح و ترتیب و طبع کا انتظام فرما رہے تھے کہ ان کی بے وقت اور پُر الم موت نے اس کے ساتھ بہت سی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔

یہ دیوانِ خاص نواب فوجدار محمد خاں صاحب برادر نواب قدسیہ بیگم کا ہے۔ دیوان کے شروع اور وسط میں مہریں موجود ہیں۔ کلاں مہر پر ۱۲۶۱ھ درج ہے۔ دیوان قلمی ہے بہت خوشخط لکھا ہوا ہے اور ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت زیادہ ایسے اشعار ہر غزل میں موجود ہیں جو موجودہ دیوانوں میں نہیں پائے جاتے۔ بہت سی نئی غزلیں ہیں۔ بعض اشعار میں مرزا صاحب نے اپنے قلم سے خفیف یا زیادہ الفاظ کا ردو بدل کیا ہے۔ گویا نظرِ ثانی کے بعد مروجہ دیوان طبع ہوا ہے۔ الفاظ کی اس ردو بدل اور اصلاح سے شاعر کے ذوق و نظر کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

جناب صاحب زادہ نواب حمید اللہ خاں بہادر، بی اے، نے اپنی خاص عنایت اور علمی قدر دانی کی وجہ سے اس نسخے کے استعمال کی اجازت انجمن کو عطا فرمائی۔ انجمن جناب ممدوح کی بے حد ممنون ہے۔" [15]

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۶، اگست ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالسلام کی بھوپال میں موجودگی کی اطلاع دی ہے۔ [16] غالباً اسی زمانے میں مولوی صاحب نے دیوانِ غالب کا یہ نادر نسخہ حمیدیہ لائبریری میں دیکھا۔ چناں چہ ستمبر ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں یہ اطلاع شائع ہوئی:

"ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی "شعر الہند" کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا یعنی مرزا غالب کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ پڑا تھا اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے۔ موصوف آج کل دیوانِ غالب کی خدمت گزاری میں مصروف

ہیں اور عنقریب ان کے تاریخ فکر انجمن ترقی اردو کے ذریعے سے منظر عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔'' ۱۷

حمیدیہ لائبریری کے پرانے ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے ۴، اگست جو کہ ''محاسن کلامِ غالبؔ'' ۱۹۱۸ء کو دیوانِ غالبؔ کا یہ قلمی نسخہ اپنے پاس منگوالیا تھا۔ ۱۸ ۲۰/ اگست ۱۹۱۸ء کو انھوں نے مولوی عبدالحق کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے تحریر کیا:

''جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالبؔ کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک جملہ فرمایا تھا لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے، نسخہ اب نہیں جاتا، ان شاء اللہ...... جب ہاشمی صاحب آویں گے تو اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔'' ۱۹

انجمن کی جانب سے اس قلمی دیوان کو دیکھنے سید ہاشمی بھوپال آئے۔ ۲۰ اور اس نسخے کی طباعت کے سلسلے میں ڈاکٹر بجنوری نے انھیں اپنی تجاویز سے آگاہ کیا۔ مولوی عبدالحق بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر بجنوری نے اس اصلی نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابکدست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش، ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے تھے۔'' ۲۱

اسی اہتمام کا ایک پہلو غالبؔ کے بعض ایسے نوادر کی تلاش تھی جنھیں اس نئے دیوان کے ساتھ شائع کیا جاسکتا۔ بقول مولوی عبدالحق: ''اس کے لیے بہت سی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انھوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انھوں نے اس طرح

لکھے ہیں جیسے غیر شخص لکھتا ہے لیکن عبارت کا رنگ صاف بتا رہا ہے کہ پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں...... سید افتخار عالم نے ان حالات کے ساتھ ''نیّر'' راجستھان جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں ''تذکرہ مظہر العجائب'' کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حالات مرزا نے اسی تذکرے کے لیے تحریر کیے ہوں۔ اس تذکرے کے مؤلف مولوی محمد انوار الحق صاحب مرحوم، مولوی احتشام الدین صاحب ایم اے کے والد ہیں۔ معلوم نہیں اس تذکرے کا کیا حشر ہوا۔'' ۲۲

سید سلیمان ندوی بتاتے ہیں کہ بجنوری اصل نسخے کا عکس بھی دیوان کے آخر میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ ۲۳ کلامِ غالب کی جو ترتیب بجنوری کے پیش نظر تھی اس کی سید ہاشمی نے یہ وضاحت کی ہے: ''ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جا بجا سے مرزا صاحب نے خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا تا کہ دیکھنے والے کو بلا دقّت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔ یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا۔'' ۲۴

ڈاکٹر بجنوری کا ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔ ۲۵ اس طرح انھیں مشکل سے تین ماہ اس پر کام کرنے کا موقع ملا۔ قلمی دیوان کے ملنے کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر بجنوری کو جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ ان کے مولوی عبدالحق کے نام مکتوب مورخہ ۲۰، اگست ۱۹۱۸ء سے ہو سکتا ہے جس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔ غالبؔ کے محذوف کلام کی اشاعت کے خلاف جو دلائل پیش کیے گئے ان کی جانب مفتی انوار الحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں اشارہ کیا ہے: ''ہمارے بعض احباب اب بھی اس دیوان کی اشاعت کے خلاف تھے کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ جس کلام کو شاعر کے ہم عصر دوستوں نے قابلِ حذف قرار دیا اور جسے خود شاعر نے اپنے دیوان سے خارج کر دیا، اس

کے اب شائع کرنے سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ شاعر اپنے پہلے درجے سے بھی گر جائے اور بلحاظ مجموعی اس کے کلام کی وقعت کم ہو جائے اور ایک صاحب تو اس کے اتنے مخالف ہیں کہ انھوں نے اس کا نام مہملاتِ غالبؔ رکھا ہے۔'' ۲۶

اس مخالفت نے ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد ایک تنازعے کی شکل اختیار کر لی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد یہ طے پایا کہ اس دیوان کو ریاست کی جانب سے شائع کیا جائے۔ چناں چہ حمیدیہ لائبریری کو سرکاری طور پر یہ اطلاع دی گئی کہ دیوانِ غالبؔ کا قلمی نسخہ رکھ لیا گیا ہے اور اس سے دوسری کتاب ڈائریکٹر صاحب یعنی مفتی انوار الحق صاحب تیار کریں گے۔ ۲۷ لیکن اشاعت کے پروگرام میں اس تبدیلی یا کسی اور وجہ سے ڈاکٹر بجنوری کے احباب، اعزہ اور شرکائے کار میں کچھ اتنی بددلی پیدا ہو گئی کہ مفتی انوار الحق کو جو تعاون مطلوب تھا وہ انھیں نہ مل سکا۔ وہ تحریر کرتے ہیں: ''خیال تھا کہ اس موقع پر مرحوم (بجنوری) کے کچھ مختصر حالاتِ زندگی بھی ہدیۂ ناظرین کیے جائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تعلقاتِ ظاہری کی ناپائیداری اور محبت ابنائے زماں کی بے ثباتی نے مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے احباب کو ان کی طرف سے اتنا تغافل شعار اور فراموش کار بنا دیا کہ سخت سعی و کوشش اور پیہم تقاضے اور یاددہانیاں بھی ان کو مرحوم کے حالات قلم بند کرنے کی طرف مائل نہ کر سکیں.... میں نے حتی الامکان ان کے بڑے بڑے دوستوں سے مراسلت کی۔ وعدے بھی ہوئے، امیدیں بھی دلائی گئیں۔ چناں چہ ان ہی توقعات پر مرحوم کے مقدمۂ دیوانِ غالب نے عرصے تک ادھر سے اُدھر کی سیر کی اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک ان کے بعض دلی دوستوں کی میز نسیاں کا زینت افروز رہا اور زیادہ تر اسی وجہ سے اس دیوان کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی لیکن افسوس کہ ان سب کوششوں کا انجام حسرت اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہ ہوا اور حالاتِ زندگی کا بہم پہنچنا کجا، مرحوم کی ایک تصویر جس کو اس کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ تھا، وہ بھی مجھ سے لے لی گئی اور اسی سبب سے اس دیوان کو تصاویر سے مزین کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ بے اعتنائی کی انتہا یہ کہ مرحوم کے والد ماجد نے بھی میری استدعا کو عدیم الفرصتی کے عذر سے ٹال دیا۔'' ۲۸

بجنوری کے احباب کے اسی رویے کا نتیجہ تھا کہ دیوان کی اشاعت سے قبل ہی انجمن ترقی اردو نے اپنے سہ ماہی رسالے ''اردو'' کے اجراء کے ساتھ اس کے پہلے شمارے (بابت جنوری

۱۹۲۱ء) میں بجنوری کے مقدمۂ دیوان غالبؔ کو شائع کر دیا بلکہ اسے اسی سال علیحدہ کتابی شکل میں طبع کر دیا گیا۔ اس مقدمے کی عدم موجودگی میں مفتی انوار الحق نے ۱۹۲۱ء میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کی بعض جلدیں بغیر مقدمے کے تیار کر لیں اور انھیں جاری کر دیا۔ بعد میں مفتی صاحب کو مقدمہ اور بجنوری کی تصویر مل گئی اور انھوں نے ان کو ''نسخۂ حمیدیہ'' میں شامل کر کے مزید جلدیں شائع کیں۔

لیکن ''نسخۂ حمیدیہ'' میں شائع ہونے والے مقدمے کے متن میں، اس متن سے تھوڑا فرق ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو نے ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' میں شامل مقدمہ اس شعر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے:

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جو کہ ''محاسن کلامِ غالبؔ'' کے صفحہ ۸۷ پر ہے جبکہ ''محاسن'' کا اختتام صفحہ ۹۶ پر ہوتا ہے۔ ۲۹ اس اختلاف کے دو امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مفتی صاحب کے پاس اوّلاً پورا مقدمہ موجود تھا لیکن اس کو بجنوری کے جن دوستوں نے مفتی صاحب کے پاس سے منگوالیا تھا، انھوں نے اس کو اس وقت واپس کیا جب مفتی صاحب کی تمہید اور دیوان کے متن کی طباعت پوری ہو چکی تھی۔ اس لیے جب مفتی صاحب نے اس مقدمے کا مطبوعہ صفحات میں اضافہ کیا تو جلد بندی کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مقدمے کے آخری چند صفحات کو حذف کر دیا۔ اس وقت یہ مقدمہ صفحہ ۳۳ سے ۱۳۹ تک پھیلا ہوا ہے یعنی یہ ۱۰۷ صفحات پر مبسوط ہے۔ پورا مقدمہ ۱۰۸ صفحات سے بڑھتا تھا جس کی وجہ سے جُز بندی میں سُقم آنے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے مقدمے کے آخری پیراگرافوں کو نکال کر اسے ۱۰۷ صفحات میں محدود کر لیا گیا۔ (''محاسن'' کے زائد حصے میں ایک پیراگراف جو ''غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں''...... کی تشریح پر مشتمل ہے مقدمے کے حصہ (۷) میں بھی آچکا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے صفحات ۲۰، ۲۱ اور ۹۲، ۹۴) لیکن دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے انجمن کو مقدمے کی ترمیم شدہ نقل روانہ کی ہو اور مفتی صاحب نے پاس موجود نقل نامکمل اور غیر ترمیم شدہ ہو۔ بعض مقامات پر ''نسخۂ حمیدیہ'' میں شامل مقدمے میں چند دوسری عبارتیں بھی محذوف ہیں۔ مثلاً ''محاسن'' کے صفحہ ۹ پر گوئٹے اور صفحہ ۶۷ پر بیکن کے جرمن

اورلاطینی زبانوں میں درج اقوال مفتی صاحب نے چھوڑ دیے ہیں۔ ۳۰ اسی طرح ''محاسن'' کے صفحہ ۸۰ پر دیے گئے حواشی بھی مفتی صاحب نے شامل نہیں کیے ہیں۔ ۳۱ لیکن مفتی صاحب کے متن میں بعض ایسے اضافے بھی ملتے ہیں جو ''محاسن'' میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً ''محاسن'' کے صفحہ ۸۷ پر پانچویں سطر کے بعد یہ عبارت اور شعر بھی مفتی صاحب نے درج کیا ہے:

یہ شراب غم شکن اور شادی اثر ہے:

بہت سہی غم گیتی، شراب کیا کم ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو کیا غم ہے ۳۲

اور نویں سطر کے بعد یہ عبارت اور شعر موجود ہے:

''اس طرح شراب کے پینے سے تمام حقائق روشن ہو جاتے ہیں اور تمام قیود سے نجات مل جاتی ہے اور دل کا غنچۂ بستہ کھل کر پھول ہو جاتا ہے''

نشۂ رنگ سے ہے وا شد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں ۳۳

ان اضافوں کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے ''نسخۂ حمیدیہ'' میں اس مقدمے کو رسالہ ''اردو'' یا ''محاسن'' سے نقل نہیں کیا بلکہ ان کے پاس ایک جداگانہ نقل تھی جس میں وہ ترمیمات موجود نہ تھیں جو ''محاسن'' کے متن میں ہیں۔

جہاں تک اس مقدمے کے زمانۂ تحریر کی بحث ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بجنوری اسے غالب کے قلمی دیوان کی دریافت سے قبل مکمل کر چکے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین نے ''ہماری زبان'' میں شائع ایک مراسلے ۳۴ میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کی ایک ایسی کاپی کا ذکر کیا ہے جو محمد احتشام الدین دہلوی کے پاس رہ چکی تھی اور جس میں بجنوری کے مقدمے کے اختتام پر یہ درج کیا گیا تھا:

''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلامِ غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے

لکھا ہوا، کتابچہ ان کے پاس موجود تھا اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔'' ۳۵

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قلمی دیوان ڈاکٹر بجنوری کی وفات سے صرف تین ماہ قبل دریافت ہوا تھا اور مختصر عرصے میں ان کی ساری توجہ اس دیوان کی اشاعت کے اہتمام وانصرام میں لگی رہی۔ جو مقدمہ شائع ہوا ہے اس میں شامل اشعار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف متداول دیوان کو سامنے رکھ کر ہی تحریر کیا گیا ہے۔ مفتی انوار الحق نے مقدمے میں دی گئی غالب کے اشعار کی تعداد کے بارے میں اپنے حاشیے کے ذریعے واضح صراحت کی ہے: ''چوں کہ یہ مقدمہ جدید قلمی نسخے کے ملنے سے پہلے لکھا جا چکا تھا، اس سبب سے اس کی تعداد میں قدیم مطبوعہ دیوان کے شعر شمار کیے گئے ہیں۔'' ۳۶ علاوہ ازیں سید ہاشمی نے بھی اپنے تبصرے میں یہ تحریر کیا ہے کہ ''یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں کچھ اضافہ فرمائیں گے لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا۔'' ۳۷

ان دو معتبر معاصرین کی شہادتوں کی موجودگی میں جو کہ اس دیوان کی ترتیب و تدوین کے معاملات سے اتنے قریب تھے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ بجنوری کا جو مقدمہ مطبوعہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے وہ اسے قلمی دیوان کے ملنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔

آخر میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی مناسب ہوگا کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے مرتب ڈاکٹر بجنوری تھے۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' مفتی انوار الحق کی تالیف و تدوین کا نتیجہ ہے کیوں کہ اس میں نہ تو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی وہ ترتیب مدنظر رکھی گئی ہے جو ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے اور نہ اس کی طباعت، کتابت اور زیبائش میں وہ اہتمام ملحوظ رکھا گیا جو انھیں مطلوب تھا۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق: ''وہ دیوان بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شائع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ کسی دوسرے کے بس کی نہ تھی۔'' ۳۸ مفتی صاحب نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی ترتیب مختلف انداز سے رکھی۔ انھوں نے ہر ردیف کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں وہ غزلیں شامل کیں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں مشترک تھیں۔ دوسرے حصے میں وہ غزلیں رکھیں جو صرف قلمی نسخے میں موجود تھیں اور تیسرے میں ان غزلوں کو جگہ دی جو قلمی

نسخے میں موجود نہ تھیں لیکن متداول نسخوں میں ملتی تھیں۔ پہلے حصے کی مشترک غزلوں کے لیے یہ ترتیب رکھی کہ پہلے قلمی نسخے کی غزل تحریر کی گئی۔ اگر اس غزل کے کچھ اشعار مطبوعہ غزل میں مشترک ہوئے تو ان اشعار کے محاذ میں ''م'' کا نشان بنا دیا گیا اور اگر قلمی اور مطبوعہ اشعار میں کہیں کوئی جزوی اختلاف ہوا تو اختلافی مصرعوں کو تلے اوپر لکھ دیا گیا اور جو اشعار صرف مطبوعہ غزل میں ہی تھے انھیں آخر میں جداگانہ تحریر کر دیا گیا۔

اس لحاظ سے اپنی ترتیب اور معیارِ طباعت میں ''نسخۂ حمیدیہ'' صرف مفتی انوار الحق کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سے منسوب کرنا غلط ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے جس طرح مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی کتابت شروع کروائی تھی وہ ان کی اچانک موت کی وجہ سے مکمل نہیں ہو پائی اور صرف متداول کلام پر مشتمل دیوان جو انھوں نے تیار کروایا تھا، وہ نئے دیوان کی اشاعت کے منصوبوں کی وجہ سے چھپ نہیں سکا۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ راقم الحروف کا مضمون ''ای۔ ایم۔ فارسٹر اور ان کی تصانیف''، ''ہماری زبان'' یکم جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۱۷۷۔

۲۔ ''یادِ ایام'' از محمد الرزاق کانپوری، ص ۲۸۷۔

۳۔ ''مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو'' از مولوی عبدالحق۔ ضمیمہ ''الناظر'' مئی ۱۹۱۴ء، ص ۷۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ''مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو'' بابت ماہ اپریل ۱۹۱۴ء۔ ضمیمہ ''الناظر''، یکم جون ۱۹۱۴ء۔

۶۔ رپورٹ متعلقہ اجلاس بست وہشتم آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام راولپنڈی، منعقدہ دسمبر ۱۹۱۴ء، ص ۱۴۸ و ۱۴۹۔

۷۔ تبصرہ ''دیوانِ غالب جدید'' (نسخہ حمیدیہ) از سید ہاشمی، رسالہ ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۳ء، ص ۷۰۳۔

۸۔ رپورٹ متعلق اجلاس بست ونہم، آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا۔ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۵۴۔

۹۔ ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۳ء، ص ۷۰۳ و ۷۰۴۔

۱۰۔ رپورٹ متعلق اجلاس سی ام۔ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام علی گڑھ۔ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۶ء، ص ۸۳۔

۱۱۔ مکتوب از بھوپال مورخہ ۱۵، اکتوبر ۱۹۱۶ء، نقوش لاہور۔ مکاتیب نمبر۔ جلد دوم، ص ۵۷۹ و ۵۸۰۔

۱۲۔ مکتوب از بھوپال مورخہ ۲۷، جولائی ۱۹۱۷ء، نقوش لاہور، محولہ بالا۔ ص ۵۸۰۔

۱۳۔ ''محاسن کلام غالب'' مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔ طبع ششم ۱۹۶۶ء۔

۱۴۔ یہ اندراج حاشیے میں ہے۔

۱۵۔ رپورٹ اجلاس منعقدہ ماہِ دسمبر ۱۹۱۸ء، بمقام سورت، ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

۱۶۔ ''مکتوباتِ سلیمانی'' جلد اول، مرتبہ عبدالماجد دریابادی، ص ۹۸۔

۱۷۔ ''معارف'' ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۱۶۔

۱۸۔ رجسٹر کتب مستعار اردو من ابتدائے اکتوبر، ۱۷ء، لغایت مارچ ۲۱ء۔

۱۹۔ ''کچھ رنگین تصویر کے بارے میں'' از خیر بھوروی۔ ''شاعر'' غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۷۔

۲۰۔ ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء۔ تبصرہ ''نسخۂ حمیدیہ'' از سید ہاشمی۔

۲۱۔ 'ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری'' مشمولہ ''چند ہم عصر'' از عبدالحق، کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۸۔

۲۲۔ ''مرزا غالب کی خودنوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق'' از عبدالحق ''الشجاع'' (کراچی) غالب نمبر۔ حاشیہ بلاک (بلا نمبر، ص ۵، ۶) مابین صفحات ۲۴، ۲۵۔ یہی بلاک اظہار الحق ملک کے مضمون ''غالب کے خودنوشت حالات'' کے ساتھ ''احوالِ غالب'' مرتبہ مختار الدین آرزو میں مابین صفحات ۲۴، ۲۵ شامل ہے لیکن اس میں مولوی عبدالحق کا حاشیہ محذوف ہے۔ اصل عکس رسالہ ''اردو'' میں شائع ہوا تھا۔

۲۳۔ ''معارف'' اکتوبر ۱۹۱۹ء، ص ۳۱۵۔

۲۴۔ تبصرہ ''نسخۂ حمیدیہ'' از سید ہاشمی ''اردو'' اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴ و ۷۰۵۔

۲۵۔ سول لسٹ عہدہ دارانِ مندرجہ جریدہ ریاست بھوپال۔ بابت ششماہی، دوم ۱۹۱۸ء، ص ۵۹۔

۲۶۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' تمہید ص ۱۶۔

۲۷۔ نوٹ مندرجہ رجسٹر کتب مستعار اردو من ابتدائے اکتوبر ۱۷ء، لغایت مارچ ۲۱ء۔

۲۸۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' تمہید ص ۲۶، ۲۷۔

۲۹۔ صفحات مطابق طبع ششم (۱۹۶۶ء) مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

۳۰۔ نسخۂ حمیدیہ، ص ۳۸۔۱۱۶۔

۳۱۔ ایضاً ص ۱۲۸۔

۳۲۔ ایضاً ص ۱۲۸۔

۳۴۔ ''ہماری زبان'' (علی گڑھ) یکم مارچ ۱۹۶۱ء۔

۳۵۔ اس مراسلے پر جناب امتیاز علی عرشی کی بحث کے لیے ملاحظہ فرمایئے ''نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری''، ''نیا دور'' (لکھنؤ) مئی ۱۹۶۱ء۔

۳۶۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' ص ۲۸۔

۳۷۔ تبصرہ ''نسخۂ حمیدیہ''، ''اردو''، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴، ۷۰۵۔

۳۸۔ ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری'' مشمولہ ''چند ہم عصر'' از مولوی عبدالحق، کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۹۔

(''تحقیق اور حاصلِ تحقیق''۔ ۱۹۸۲ء۔ ص ۳۹ تا ۵۴)

***

ڈاکٹر سیّد حامد حسین

مفتی انوار الحق اور نسخۂ حمیدیہ

مفتی انوار الحق کا مرتبہ ''دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ'' غالبیات کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دیوان کے ذریعے پہلی بار غالبؔ کے ایسے تقریباً ساڑھے سولہ سو اشعار سامنے آئے جو غالبؔ نے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیے تھے۔ ان اشعار کا ماخذ دیوانِ غالبؔ کا وہ قلمی نسخہ تھا جو ۱۸۲۱ء میں تحریر کیا گیا تھا جب کہ غالب کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی۔ ان اشعار کی دریافت سے نہ صرف غالبؔ کا سرمایۂ شاعری تقریباً دوگنا ہو گیا بلکہ ان اشعار کی وجہ سے ناقدین کو غالبؔ کی شاعری کے ابتدائی دور کے بارے میں محاکمے کے مواقع بھی حاصل ہوئے اور ان میں موجود فکری پختگی اور فنی کمال نے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت میں مزید اضافے کے لیے بنیاد فراہم کی۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' میں قلمی دیوان میں شامل اشعار کے علاوہ متداول دیوان میں موجود سارے کلام اور دوسرے مآخذ سے حاصل ہونے والے غالبؔ کے غیر مروج اشعار کو بھی جگہ دی گئی۔ اس لحاظ سے ''نسخۂ حمیدیہ'' پہلا ایسا مکمل دیوان ہے جس میں غالبؔ کا نو دریافت اور متداول سارا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کلامِ غالبؔ میں ترمیم و اضافہ کی جانب جا بجا نشاندہی کر کے ''نسخۂ حمیدیہ'' نے دیوانِ غالبؔ کی محققانہ انداز سے تدوین کی داغ بیل بھی ڈالی۔

اس تاریخی دیوان کے مرتب مفتی محمد انوار الحق ٹونک میں ۸، جون ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ہندوستان کے مشہور محدث شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی تھے جنھوں نے

تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں، ۷، نومبر ۱۹۳۰ء کو بھوپال میں انتقال کیا۔ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بتایا ہے مفتی عبداللہ کا شمار ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا۔ وہ زیادہ عرصہ لاہور کے اورینٹل کالج میں پروفیسر رہے۔ بعد میں وہ دارالعلوم ندوہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے لاہور میں انجمن مستشار العلماء کے نام سے ایک دارالافتاء بھی قائم کیا تھا اور عربی کی بعض درسی کتابوں پر حاشیے بھی لکھے تھے۔ [۱]

مفتی انوار الحق کی تعلیم لاہور میں ہوئی جہاں انھوں نے پہلے منشی فاضل اور پھر فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد راولپنڈی کے گورڈن کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے جہاں سے وہ بمبئی چلے گئے اور ولسن کالج میں پروفیسر رہے۔ اسی دوران والیۂ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کو ان کی لیاقت کا علم ہوا اور ۱۹۰۸ء میں انھیں بمبئی سے بلوا کر ریاست بھوپال میں ناظم تعلیمات کے عہدے پر فائز کیا۔ بعد میں مفتی صاحب نے محکمہ تعلیمات میں سکریٹری کا عہدہ سنبھالا اور پھر پبلک ہیلتھ اور فنانس کے محکموں سے منسلک رہے۔ ۳۰، مئی ۱۹۴۰ء کو انھوں نے بمرضِ ذیابیطس بھوپال میں انتقال کیا۔ [۲]

مفتی صاحب نے ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی تھی جس میں علوم مشرقی سے واقفیت عین فطری تھی۔ چناں چہ فارسی زبان وادب میں دستگاہ کے ساتھ ساتھ انھیں عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ خود حافظِ قرآن تھے اور دینی علوم کے رموز سے بخوبی واقف تھے۔ مفتی صاحب نے مغربی افکار و خیالات کا بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا اور وہ مغربی علوم کی جانب ایک ایسا حقیقت پسندانہ رواداری کا رویہ رکھتے تھے جو ان کے اعتقادات کی راہ میں کسی طرح حارج نہیں ہوتا تھا۔

مفتی صاحب کی اوّلین تصانیف میں مذہب و اخلاق پر ان کی دو کتابیں ہیں ''اثبات واجب الوجود'' میں خدا کے وجود پر منطقی انداز سے بحث کی گئی ہے اور دلائل سے انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ نظامِ کائنات میں ایک ذی عقل حاکم کا وجود ضروری ہے اور جب تک انسان خود کو عقل وفہم سے عاری فرض نہیں کر لیتا، تب تک اسے خدا کے وجود کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس تصنیف کے زیادہ تر مضامین مختلف انگریزی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن خاص

ماخذ آرام اسٹرانگ کی انگریزی کتاب God And Soul ہے۔

دوسری کتاب اخلاق و کردار کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے جس کا عنوان ''رسالۂ قوت خیال ملقب بہ تہذیب الخصال'' ہے اور یہ رالف والڈو ٹرائن کی انگریزی کتاب (Character Building) کا ترجمہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان کے عادات و خیالات خود اس کے دماغی خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اگر ان خیالات پر قابو رکھا جائے تو انسان جیسا چاہے بن سکتا ہے۔

۱۹۱۰ء میں مفتی صاحب نے ''تاریخ ابوالبشر'' کے نام سے امریکی پروفیسر رڈپاتھ کی سترہ جلدوں پر مشتمل (The Universal History Of The World) کے پہلے حصے کا ترجمہ شائع کیا۔ یہ جلد نوع انسانی کے آغاز سے بحث کرتی ہے اور اس میں مختلف علوم کی مدد سے کرۂ ارض پر انسانی وجود کے عرصے اور انسان کے مولد کا تعین کیا گیا ہے جیسا کہ مفتی صاحب نے اپنے دیباچے میں بتایا ہے، اس ترجمے کے ذریعے ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ علمِ ہیئت طبقات الارض، آثارِ قدیمہ، علمِ نباتات قدیمہ، تشریح الانسان، علم الاقوام، تہذیب الاقوام وغیرہ جدید علوم سے واقفیت حاصل کر لیں۔ رڈپاتھ نے اپنی کتاب میں پہلے ان علوم کا خاکہ پیش کیا ہے اور پھر ان کی مدد سے انسانی آغاز کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مفتی صاحب کا یہ ترجمہ ان علوم کا تعارف مہیا کرانے کے علاوہ اردو نثر کو جدید علمی مسائل کا متحمل ہونے کا بھی موقع فراہم کرتا ہے۔

۱۹۱۵ء کے قریب مفتی صاحب نے ''حقائقِ اسلام'' شائع کی جس کا مقصد ان اسلامی تعلیمات سے بحث کرنا تھا جو اسلام کو دنیا کے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں توحید، تصدیق رسالت، ایمان بالقدر، حشر و نشر اور معجزات کے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ دوسرے حصے کا موضوع اعمال و عبادات ہے جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں آداب و معاملات کے تحت عام اخلاق، اخوتِ اسلامی، رعایت حقوق، صنفِ ضعیف کی جانب اسلامی نقطۂ نظر، قانونِ ازدواج، سود خوری اور غلامی کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ آخری حصے میں اسلامی تیوہاروں، طعام، اہل اسلام، اسلام اور روحانیت اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کو زیر غور

لایا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے عقلی دلائل کو اپنی بحث کی بنیاد بناتے ہوئے قرآنی حوالوں اور مغربی مصنفین کی رایوں اور تجربوں سے بھی نتائج اخذ کرنے میں مدد لی ہے۔

''تذکرۃ الحبیب'' مفتی صاحب نے پہلی بار ۱۳۳۶ھ (۱۸/۱۹۱۷ء) میں شائع کی۔ یہ کتاب رسولِ خدا کے اسوۂ حسنہ سے متعلق مستند روایات کا مجموعہ ہے جس میں سادہ زندگی، حسنِ معاشرت، خوش خلقی، شجاعت، ثبات و استقلال، علم اور تحمل، عفو و رحم، صبر و شکر، سخاوت، ایثار و حسنِ سلوک، محبت و شفقت، عدل و انصاف، وقار و متانت، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی وغیرہ عنوانات کے تحت احادیث و واقعات کو یکجا کیا گیا ہے۔

۱۹۲۶ء میں مفتی صاحب نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈرامے The King Of The Dark Chamber کا اردو ترجمہ ''چیستانِ عالم'' کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے اصرار پر انھوں نے یہ ترجمہ تقریباً دس سال قبل مکمل کر لیا تھا اور اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری نے اس کی اشاعت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق سے بھی مشورہ کیا تھا۔ لیکن وہ طبع نہ ہو سکا۔ ۲۲، جنوری ۱۹۲۶ء کو مفتی صاحب کے چودہ سالہ صاحب زادے انصار الحق کی اچانک موت نے ان پر گہرا اثر کیا اور اس حالت میں دل بہلانے کے لیے جہاں اور بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آئیں، وہیں اس فراموش شدہ مسودہ پر نظر پڑی۔ [۳] اور اس کو طبع کرانے کی جانب توجہ کی۔ موضوع کے اعتبار سے ٹیگور کا ڈراما مفتی صاحب کے ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس میں راضی برضائے الٰہی کا جو رمز ہے، اس کی جانب، بیٹے کی موت کے حادثے کے بعد مفتی صاحب کا خیال جانا فطری تھا۔ مفتی صاحب نے ڈرامے کا آزاد ترجمہ کیا ہے اور اکثر نامناسب حذف و اضافے سے کام لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اصل کی برجستگی اور علامت پسندی قائم رہے لیکن دراصل ڈراما مفتی صاحب کا میدان نہ تھا اور اس لیے کہیں کہیں مکالموں میں ان کے اسلوب کی نقاہت، کرداروں کے حسبِ حال نہیں رہتی اور مکالمے اور محاورے کے ذریعے کرداروں کے طبقاتی فصل کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اصل ڈرامے میں کئی گیت بھی شامل ہیں۔ ان میں سے چند کا مفتی صاحب نے منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن اکثر یہ ترجمہ اصل سے صرف دور کی مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود مفتی صاحب کے قطعات ڈرامے میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں۔

محکمہ تعلیمات سے وابستگی کے دوران مفتی صاحب نے کئی کتابیں درسی ضروریات سے لکھیں۔ انتظام خانہ داری پر چار کتابوں کا ایک سلسلہ 'ڈریسٹک اکانومی' کے نام سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا جس کی پہلی تین جلدوں میں مفتی صاحب نے چند کردار وضع کر کے نیم ڈرامائی انداز میں لڑکیوں کی ضرورت کے کئی موضوعات پر بنیادی معلومات فراہم کیں۔ چوتھی جلد میں انھوں نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے اور غذا اور لباس کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اور کتاب ''مذہب کی باتیں'' تحریر کی جس میں انتہائی سادہ انداز میں مذہب کے بنیادی مسائل سے بحث کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مفتی صاحب نے بعض اور درسی کتب اور عام معلومات کی کتابیں ریاست کے محکمہ تعلیمات کے لیے تیار کیں جنھیں سرکاری طور پر چھاپا گیا، اسی لیے ان پر مفتی صاحب کا نام نہیں ہے۔ [۴]

مفتی صاحب کا سب سے اہم کارنامہ بہرحال ''نسخۂ حمیدیہ'' کی ترتیب و اشاعت ہے۔ جب ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا انتقال ہوا تو وہ غالبؔ کے اس خطی دیوان کی اشاعت کی تیاریوں میں مصروف تھے جو کہ جولائی، اگست ۱۹۱۸ء میں بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں مولوی عبدالسلام ندوی نے دریافت کیا تھا اور جس میں غالبؔ کا محذوف کلام بھی موجود تھا۔ اس کی دریافت کے فوراً بعد ڈاکٹر بجنوری نے اسے اپنے پاس منگوالیا تھا۔ لیکن اس دولتِ بیش بہا کو لے کر بھوپال میں مخالفتوں کا ایک بازار گرم ہوگیا۔ چناں چہ ۲۰، اگست ۱۹۱۸ء کو بجنوری نے مولوی عبدالحق کو لکھا: ''جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالبؔ کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک جملہ فرمایا تھا لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے، اب نسخہ نہیں جاتا ان شاء اللہ۔ جتنا جھوٹ آج کل بول رہا ہوں، عمر بھر موقع نہیں ہوا تھا۔'' [۵] اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال میں ایک طبقہ یہ چاہتا تھا کہ یہ نسخہ بھوپال میں ہی رہے اور بھوپال کو ہی اس کی طباعت وغیرہ کا سہرا ملے۔ لیکن بجنوری نے بڑی مستقل مزاجی سے ان مخالفتوں کا سامنا کیا اور مولوی عبدالحق اور اپنے دوستوں شعیب قریشی وغیرہ کی مدد و تعاون سے اس نسخے کی اشاعت کے

پروگرام کو عملی شکل دینے میں مصروف رہے۔

ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے فوراً بعد سرکاری طور پر ایسے احکامات کا اجراء ہوا جن کے تحت بجنوری کی جگہ مفتی انوار الحق کو ریاست میں مشیر تعلیم مقرر کیا گیا اور دیوانِ غالبؔ کی ترتیب وتدوین کا کام سونپا گیا۔ مفتی صاحب اس وقت تک ریاست بھوپال میں ناظمِ تعلیمات تھے اور اپنے علم وفضل، ذوقِ تصنیف وتالیف، غالبؔ کے کلام سے شغف اور ڈاکٹر بجنوری سے قربت کے لحاظ سے دیوانِ غالبؔ کی ترتیب کے لیے اس وقت بھوپال میں ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نہ تھی۔

دیوانِ غالبؔ کی ترتیب کا کام مفتی صاحب کے سپرد کیے جانے سے اس طبقے کو تو اطمینان ہوا جو نسخے کو ریاست سے باہر جانے دینا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے نتیجے میں بجنوری کے دوستوں اور خیر خواہوں میں بے چینی پیدا ہونا فطری تھا۔ بجنوری کی کوششوں سے دیوان کی طباعت کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور اس کے لیے مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کے وسائل مختلف شکلوں میں استعمال ہو رہے تھے مثلاً دیوان کی کتابت شروع ہو چکی تھی۔ حالاں کہ ریاست نے پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے یہ طے کیا تھا کہ دیوان نوابزادہ حمید اللہ خاں کے نام سے شائع ہوگا اور اس کی حیثیت عبدالرحمٰن بجنوری کی یادگار کی ہوگی۔ لیکن یہ بات بجنوری کے ان احباب کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھی جو اس دیوان کو بجنوری کی ہدایتوں کے مطابق انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام شائع کے لیے ہمہ تن مصروف تھے۔ بلکہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداءً مولوی عبدالحق وغیرہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ یہ کام ان سے واپس لیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ آخر ماہِ دسمبر ۱۹۱۸ء میں جب سورت کی محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس میں مولوی صاحب نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھی تو انھوں نے بتایا کہ بجنوری انجمن کی درخواست پر دیوان کی تصحیح وترتیب وطبع کا انتظام کر رہے تھے اور نواب زادہ حمید اللہ خاں نے ''اپنی خاص عنایت اور علمی قدردانی کی وجہ سے اس نسخے کو استعمال کی اجازت انجمن کو عطا فرمائی تھی۔'' ۶ لیکن جب ریاست انجمن کے ساتھ تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا تو بجنوری کے احباب کو شدید مایوسی ہوئی۔ چناں چہ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ''معارف'' میں مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا کہ ''امید تھی کہ ان (بجنوری) کے احباب اور

انجمن ترقی اردو مرحوم کی یادگار میں' اس نسخے کو چھاپ کر شائع کرے گی۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہوا چاہتی ہے۔'' ۷

لیکن حقیقت حال یہ نہ تھی۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں دیوان کی ترتیب کا کام سنبھالنے کے فوراً بعد مفتی صاحب نے تدوین کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا تھا اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں نہ صرف اس کو ترتیب دے دی تھی بلکہ اس کی کتابت اور طباعت کا کام بھی شروع کروا دیا تھا۔ چناں چہ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ''معارف'' میں سید سلیمان ندوی کے مندرجہ بالا نوٹ کی اشاعت کے فوراً بعد مفتی صاحب نے مولانا ندوی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا چناں چہ ''معارف'' نومبر ۱۹۱۹ء کے شذرات میں مولانا نے تحریر کیا:

> ''چند روز ہوئے کہ ہمارے محترم دوست مفتی انوار الحق صاحب ایم اے ناظمِ تعلیمات بھوپال کا ایک مفصل خط آیا جس کو پڑھ کر خوشی ہوئی کہ دیوانِ مذکورہ نہایت خوبی کے ساتھ جناب مفتی صاحب کے زیر اہتمام و تحشیہ چھپ رہا ہے۔ آٹھ صفحے چھپے ہوئے انھوں نے بھیجے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر اور زیادہ مسرت ہوئی کہ لکھائی چھپائی، کاغذ ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے۔ مفتی صاحب یہ یقین دلاتے ہیں کہ چھ مہینے میں یہ نسخہ شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ اشاعت کے تمام مصارف جناب نواب زادہ حمید اللہ خاں بہادر بی اے اپنی طرف سے ادا کر رہے ہیں۔ اس عظیم الشان ادبی خدمت پر ہم اس علم پرور ریاست اور اس کے ارکان کو مبارکباد دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کا مفصل خط جس میں دیوان کے طریقۂ تدوین و تحشیہ و طبع کی کیفیت معلوم ہوگی۔ آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔'' ۸
>
> (لیکن ''معارف'' کے اگلے پرچوں میں یہ خط کہیں نظر نہیں آتا۔)

اس نوٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کے وسط ۱۹۲۰ء تک چھپ جانے کی توقع تھی لیکن دیوان ۱۹۲۱ء میں جاری ہو سکا۔ اس تاخیر کی مفتی صاحب نے یہ وجہ بتائی ہے کہ وہ اسے ڈاکٹر بجنوری کی یادگار کی حیثیت سے شائع کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ دیوان کے ساتھ

بجنوری کی زندگی کے حالات بھی پیش کریں لیکن انھیں اس سلسلے میں بجنوری کے اعزہ اور احباب سے کوئی مدد نہ مل سکی بلکہ اس کے برخلاف ان کے پاس بجنوری کے مقدمے کی جو نقل اور ان کی تصویر تھی وہ بھی واپس لے لی گئی۔ 9 کیوں کہ مولوی عبدالحق وغیرہ ریاست کے ذریعے شائع کیے جانے والے دیوان کے ساتھ بجنوری کے نام کو کسی طرح وابستہ ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور کیوں کہ بجنوری نے اپنا مقدمہ کلام غالبؔ، انجمن کے دیوانِ غالبؔ کے لیے ہی لکھا تھا، اس لیے انجمن ترقی اردو نے جلد از جلد اپنا سہ ماہی رسالہ ''اردو'' نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کے پہلے ہی شمارے (بابت جنوری ۱۹۲۱ء) میں سر فہرست بجنوری کا مقدمہ ''محاسنِ کلام غالبؔ'' کے نام سے شائع ہوا اور سال بھر کے اندر ہی اس کو جداگانہ کتابی شکل میں بھی جاری کر دیا گیا۔

اس صورت حال کے پیش نظر مفتی صاحب نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی چند جلدیں ۱۹۲۱ء میں بلا بجنوری کے مقدمے کے محض اپنی تمہید اور بجنوری پر اپنے مضمون کے ساتھ جاری کیں۔ بعد میں جب انھیں بجنوری کا مقدمہ اور ان کی تصویر دستیاب ہو گئے تو انھوں نے مزید جلدیں زیادہ مکمل شکل میں شائع کیں۔

''نسخۂ حمیدیہ'' اردو زبان میں ایسا دیوان ہے جس میں ماخذ کے طور پر استعمال ہونے والے کسی نسخے کے اندراجات کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیوں کہ اس نوعیت کے کام کی کوئی نظیر اردو میں موجود نہ تھی اس لیے اس میں کوتاہیاں رہ جانا فطری امر تھا۔ ان کوتاہیوں میں اضافے کا امکان اس وجہ اور بڑھا کہ غالباً مفتی انوار الحق کو اپنے ایسے معاونین پر انحصار کرنا پڑا جنھیں جدید تحقیقی ضروریات کے پیش نظر تدوینِ کلام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' میں پائی جانے والی غلطیوں کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ قلمی نسخے کے متن، حاشیے وغیرہ میں موجود اشعار کو زیر ترتیب دیوان میں جگہ دینے کے لیے یکساں اصول نہیں بنائے گئے۔ دوسرے قسم کی غلطیاں قلمی نسخے کی قرأت سے تعلق رکھتی ہیں اور تیسرے قسم کی غلطیاں وہ ہیں جو کتابت شدہ کاپیوں کو توجہ سے صحیح نہ کیے جانے کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔

آخری قسم کی غلطیاں ''نسخۂ حمیدیہ'' میں خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ طباعت کی بعض نمایاں غلطیاں موجودہ دیوان کے صفحہ نمبر اور قوسین میں صحیح شکل کے ساتھ نیچے دی جا رہی ہیں:

ص۲۔مطاع (متاع)،ص۵۔ہم نے (ہم سے) بے وگل (بوئے گل)
ص۹، ۳۱۔عنا گیر (عناں گیر) ص۱۰۔ ڈھونڈے سے (ڈھونڈے ہے) ص۱۲۔
بے ماماتی (بے سامانی) ص۱۴۔ وحشت کدد (وحشت کدہ) ص۲۷۔گل گیا (گل
کیا) ص۲۹۔ رنبور (زنبور) ص۳۲۔ وابستہ (وارستہ) ص۳۵۔ بحر گریباں (بہر
گریباں) ص۳۶۔اندار (انداز) ص۳۹۔نستر (بستر) برگِ کل (برگِ گل) نخچیر
(نخچیر) ص۴۰۔رخم (زخم) ص۴۲۔ گھودنے (کھودنے) ص۴۵۔ شعلۂ حسن
(شعلۂ خس) ص۵۲۔ خافلاں (غافلاں) ص۵۳۔ سیہ ہستی (سیہ مستی) ص۵۶۔
یہاں شوخی (بیان شوخی) ص۵۹۔ مہک (محک) ص۸۷۔ گھرے (کھرے)
ص۹۲۔ نقطعہ (نقطہ) ص۱۰۱۔ دورشتی (ودرشتی) ص۱۲۵۔ آئینۂ پرواز (آئینۂ
پرداز) کوشس (کوشش) ص۱۲۸۔ سرگیا (مہرگیا) ص۱۲۹۔ ناتوانی کی نمو (ناتوانی
کی نمود) ص۱۴۸۔ سمجھے ہیں (سمجھتے ہیں) ص۱۴۹۔ جویاں (جویا) ص۱۵۶۔غرور
سن (غرورِ حسن) ص۱۸۰۔ دیکھ رہتے ہم (دیکھ رہتے ہیں ہم) ص۱۸۱۔صاحبداں
(صاحب دلاں) ص۱۸۶۔ درد (دود) ص۱۹۱۔ روبانیدن (رویانیدن) حسرت
پیز (حسرت بیز) ص۲۰۲ نگیں (رنگیں) ص۲۱۲۔ نام (بام) ص۲۳۴۔ پامزد
(پامرد) ہے نگہی (بے نگہی) ص۲۱۸، نہ کسوت (بہ کسوت) ص۲۳۵۔ ایجاء
(ایجاد) ص۲۳۶۔ چرغاں (چراغاں) ص۲۳۸۔نالہ سے (نالہ ہے) ص۲۳۹۔
گردن (کردن) ص۲۶۴۔ بادہ پیائی (باد پیائی) ص۲۷۹۔طرزِ روش (طرز وروش)
ص۲۸۱۔ قدح رخ (قدورخ) ص۲۸۹۔ ترویج (ترویح) ص۲۹۱۔ جنایش
(جنابش) ص۲۹۲۔آتشِ ودوزخ (آتشِ دوزخ) ص۲۹۵۔قلم کارفتار (قلم کی رفتار)
ص۲۹۹۔ گرداباد (گرد باد) ص۳۰۱۔ نہر نگاہ (شہر نگاہ) ص۳۰۴۔آداب وجنوں
(آداب جنوں) مہ صبح (ہر صبح) ص۳۰۵۔ اس کی ہے (اس کے ہے) ص۳۰۶۔
جہاں تک چکے (جہاں تک چلے) قضا (فضا) ص۳۲۰۔تم (آم) چہرہ آرے (چہرہ
آرائے) ص۳۲۳۔ ڈھیل (یہ ڈھیل) ص۳۲۶۔ دامن کی (دامن کے)

ایسی غلطیاں جنھیں قرأت کی غلطی سمجھا جاسکتا ہے کچھ کم نہیں ہیں۔ قلمی دیوان ''نسخۂ بھوپال'' اس وقت موجود نہیں لیکن پروفیسر حمید احمد خاں نے ۱۹۳۸ء میں اور مولانا امتیاز علی عرشی نے غالباً ۱۹۴۴ء میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کا قلمی نسخے سے مقابلہ کیا تھا اور اس کے نتائج ہر دو اصحاب نے اپنے مرتبہ دواوین میں شائع کیے ہیں۔ ؎ ان اصحاب کی قرأت درج ذیل مثالوں میں قوسین کے اندر دی گئی ہے:

ص۲۔ چوں صبح (جوں صبح) ص۵۔ یکس (نگیں) سمِ جنوں مائل (ستم جنوں مائل) ص۱۵۔ چوں غنچہ (جوں غنچہ) ص۲۲۔ گم کردہ راہ (گم کردہ رہ) ص۲۳۔ کی مانند (کے مانند) ص۲۹۔ سیاہ (سیہ)، سرمو (سرمہ) دمیدن (دویدن) اُگے (اُگی) ص۳۰۔ افگندی (افگندنی) نزاکت سے (نزاکت ہے) مارِ جستن ہا (بار جستن ہا) ص۳۶۔ خوں موم (جوں موم) ص۳۹۔ کامِ زباں (گام زباں) ص۴۹۔ ریختی (ریختے) ص۵۲۔ اختر کنی (اختر گنے) اختر سے (اختر ہے) ص۵۲۔ دلِ دوست شنا (دل ودست شنا) روح بناتی (روح نباتی) ص۵۵۔ اٹھی (اٹھے) ص۵۶۔ چند (چندے) ص۵۷۔ آئی ہے (آتی ہے) یہ کام (بہ کام) دشوار (وشور) ص۵۸۔ مری (مرے) ص۶۰۔ سررشتہ (ہر رشتہ) ص۶۱۔ وحشت مزاج (وحشی مزاج) ص۶۲۔ تیمار دار (بیمار دار) ص۷۲۔ جوں (چوں) ص۷۳۔ بارلاتی (بارلائی) مژہ سے (مژہ ہے) ص۷۹۔ جیب وکفن (جیب کفن) ص۸۰۔ اثر دید (اثر دیدہ) ص۸۳۔ وا کی ہر (وا کی ہے) ص۸۶۔ حیرت سے رخ دوست کے (حیرت سے رُخ دوست کی) ص۹۰۔ حسرت پرداز (حسرتِ پرواز) ص۹۴۔ سنجیدگی (سنجیدنی) ص۹۶۔ اضارا (نصارا) وجہ ذوق (وجدِ ذوق) ص۹۷۔ ہونے تک (ہوتے تک) ص۹۹۔ سبکباری (سبکساری) ص۱۰۷۔ اب کی (اب کے) ص۱۲۰۔ حیرت کش (حسرت کش) ص۱۲۳۔ موجِ درد (موج دود) ص۱۵۸۔ طور (توڑ) ص۱۶۲۔ گزرے (گزری) ص۱۶۵۔ مل گیے (مل گئی) ص۱۶۸۔ یہ پردہ (بہ پردہ) ص۱۶۹۔ گرشادمانی (گوشادمانی) ص۱۶۰۔ موئے خامہ (مرے خامہ)

ص ۱۷۱۔ جانا چاہتے (جایا چاہتے) ص ۲۱۰۔ سرو کے (سروکی) ص ۲۱۹۔ بخشی (بخشے) ص ۲۲۰۔ ہوگئی (ہوگئے) ص ۲۲۳۔ بہ رنگ پستہ (بہ رنگ بستہ) ص ۲۳۸۔ نقدِ رنجم (نقدانجم)۔

پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی نے قلمی نسخے میں شامل اصلاحات اور حاشیے اور قلمی دیوان کے آخر میں مندرج اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کی کیفیت بتائی ہے۔ راقم الحروف نے ''نسخۂ حمیدیہ'' جو تدوینِ نو کی ہے اس میں ان کیفیات کو بصراحت شامل کیا ہے اور مندرجہ بالا اقسام کی تمام غلطیوں کی ضروری حوالوں کے ساتھ صحت کی۔ یہاں صرف ایسے چند اشعار کی جانب اشارہ کافی ہوگا جن میں ترمیم و اصلاح کی کیفیت ''نسخۂ حمیدیہ'' میں نہیں بتائی گئی ہے:

ص ۱۵۔ فلک کو دیکھ کے......ص ۱۶۔ بقدرِ ظرف ہے......ص ۱۷۔ غریب بدرجستہ......ص ۲۱۔ گروہ مستِ ناز......ص ۲۳۔ ہے اسد بیگانۂ افسردگی ... ص ۲۶۔ اندازِ نالہ.... ص ۲۹۔ غم مجنوں......اسدؔ خاکِ در میخانہ......نفسِ حیرت پرست...... ص ۳۱۔ بہ رہنِ شرم ......ص ۸۱۔ تو اور آرائش......ص ۸۳۔ اضطراب نارسائی ......ص ۸۹۔ اگر مضمونِ خاکستر......ص ۹۰۔ رُخِ نگار سے......ص ۹۲۔ وقت خیالِ جلوہ......ص ۹۸۔ ہنگامِ انتظار......ص ۱۰۱۔ نور سے تیرے......ص ۱۰۳۔ خاک ہے عرض......ص ۱۰۹۔ تھی وہ اک شخص ......ص ۱۲۳۔ یہ کس ناہید کی......ص ۱۶۳۔ دہلی کے رہنے والو......ص ۱۹۷۔ ہم نشین مت کہہ......ص ۱۹۸۔ افسردگی نہیں......

''نسخۂ حمیدیہ'' میں جہاں قلمی نسخے اور متداول دیوان کے متن کے اختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے وہاں قلمی متن کو اوپر اور مطبوعہ متن کو نیچے لکھ کر دکھایا گیا ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ بلا کسی اشارے کے یہ ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور سب سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً درج ذیل اشعار میں متداول متن اوپر اور قلمی متن نیچے لکھا گیا ہے۔ ص ۱۹۔ جاں در ہوائے ......ص ۸۱۔ اے ترا غمزہ......

کئی اشعار کی ابتدائی شکل اور ترمیم شدہ شکل کو یکجا نہیں رکھا گیا اس کی مثالیں صفحہ ۱، ۸، ۹، ۱۲، ۱۵ وغیرہ پر ملتی ہیں۔

مولانا عرشی نے بتایا ہے کہ قلمی نسخے میں درج ذیل شعر شامل تھا جو ''نسخۂ حمیدیہ'' میں نہیں لیا گیا:

عالم طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سر بسر
یا میں غریبِ شورِ گفت و شنود تھا

اس کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی نے یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ درج ذیل اشعار قلمی نسخے کے حاشیے پر یا قلمی کے آخر میں لگے سادہ اوراق پر تحریر تھے اور ''نسخۂ حمیدیہ'' میں انھیں شامل نہیں کیا گیا:

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

☆

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیے
صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے
دے داد، اے فلک، دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

☆

زندگی میں بھی رہا ذوقِ فنا کا مارا
نشہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے
بسکہ تھی فصلِ خزانِ چمنستانِ سخن
رنگِ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے
جلوۂ خود سے فنا ہوتی ہے شبنم غالبؔ
کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

☆

دل تو ہو، اچھا نہیں ہے گر دماغ
کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیے

☆

یہ کون کھوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے

آخری شعر کے بارے میں بہر حال ڈاکٹر گیان چند جین نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ یہ غالبؔ کا نہیں ہے۔ [۱] مفتی محمد انوار الحق نے اس شعر کو اور اس کے ساتھ غلط املا میں تحریر شدہ حاشیے اور قلمی نسخے کے آخر میں درج اشعار کو جس طرح نظر انداز کیا ہے، وہ ان کے محتاط رویے کو ظاہر کرتا ہے لیکن انھوں نے یہ فاش غلطی بھی کی ہے کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے صفحہ ۲۴۷ پر امیر مینائی کا یہ شعر کلامِ غالبؔ کی حیثیت سے شامل کر لیا ہے:

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

یہ اور اس قسم کی دوسری کوتاہیوں کے مدِ نظر مولانا عرشی نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کو ''مجموعۂ اغلاط'' کہا ہے۔ [۲] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' ہی واحد ایسا دیوان ہے جس میں خطی دیوان سے تمام و کمال فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن محققین نے اس کی جن کوتاہیوں کی جانب اشارہ کیا ہے انھیں مدِ نظر رکھے بغیر اس کا مطالعہ کرنا بڑا خطرناک ہے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی تدوین و ترتیب میں یکساں اصول نہ اپنانے کی وجہ سے جا بجا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قلمی اور مطبوعہ دیوان میں مشترک اشعار کے محاذ میں ''م'' کا اشارہ تحریر کیا گیا ہے لیکن قلمی دیوان کے ایسے کئی اشعار کے ساتھ اشارہ نہیں ملتا جو مطبوعہ شکل میں بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح صفحہ ۸ پر مقطع: نہ بندھے تشنگی ذوق...... اس طرح درج کیا گیا ہے گویا وہ قلمی دیوان میں شامل تھا لیکن پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی اس پر متفق ہیں کہ وہ قلمی دیوان کا نہیں ہے اور حالاں کہ اس کے ساتھ ''مطبوعہ'' تحریر نہیں کیا گیا، حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف مطبوعہ کلام میں سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کام ناتجربہ کار اور اس قسم کے کام کی صحیح صلاحیت نہ رکھنے والے اہلکاروں کی مدد سے کیا گیا ہو اور کچھ عجلت بھی پیشِ نظر ہو، جس کی وجہ سے یہ کوتاہیاں اور خامیاں ''نسخۂ حمیدیہ'' میں در آئی ہوں۔ لیکن جن محققین نے اصل قلمی نسخے کو سامنے رکھ کر ''نسخۂ حمیدیہ'' کا مطالعہ کیا ہے اور انھوں نے جو انکشافات کیے ہیں

ان کی مدد سے مفتی محمد انوار الحق کی کاوش کار آمد بھی ہو سکتی ہے۔

''نسخۂ حمیدیہ'' میں شامل مفتی صاحب کی تمہید تین حیثیتوں سے اہم ہے۔ اولاً مفتی صاحب نے اس میں مخطوطے کی کیفیت بیان کی ہے۔ دوم اس میں شامل تبصرہ، غالبؔ کے محذوف کلام پر سب سے پہلا تبصرہ ہے۔ سوم اس میں مفتی صاحب نے غالبؔ کے نظری کیے ہوئے کلام کی اشاعت کے جواز سے بحث کی ہے۔ بجنوری سے عقیدت کے باوجود مفتی صاحب نے کبھی اپنی اعتدال پسندی ترک نہیں کی۔ بجنوری کے مقدمے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''میں نہیں کہتا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلا چوں و چرا تسلیم کرلیا جائے۔ نہیں بعض جگہ خود مجھ کو بھی اس سے ایک گونہ اختلاف ہے۔'' ۱۳؎ اختلاف کا ایک ایسا ہی موقعہ وہاں آیا ہے جہاں بجنوری غالبؔ کی مسئلہ وحدت الوجود میں دلچسپی کا ذکر کرتے ہیں اور مفتی صاحب نے اس جگہ ۱۵ صفحوں پر مبسوط حاشیے میں اس مسئلے کی حقیقت سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ۱۴؎

مفتی صاحب نے بہر حال ''نسخۂ حمیدیہ'' کے ذریعے غالبؔ کے قدیم و جدید کلام کو متعارف کرانے کا تاریخی کردار ادا کیا ہے اور یہی ایک کام انھیں زندۂ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ سید سلیمان ندوی: ''یادِ رفتگاں'' ص ۴۰۔

۲۔ یہ تفصیلاتِ زندگی مفتی صاحب کے برادر نسبتی جناب الحق صاحب اور ان کے داماد جناب سید ساجد علی صاحب سے حاصل ہوئیں۔

۳۔ تمہید ''چیستانِ عالم'' ص ۲۔

۴۔ بحوالہ سید ساجد علی صاحب

۵۔ خیر بھوروی: ''بابائے اردو کے نام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا خط'' فروغِ اردو، ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۵ء، ص ۵۸۔

۶۔ رپورٹ اجلاس، منعقدہ دسمبر 1918ء، ص ۱۰۵۔

۷۔ ص ۳۱۶۔

۸۔ ص ۳۲۵۔

۹۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید، ص ۲۵، ۲۶۔

۱۰۔ دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ۔ مرتبہ حمید احمد خاں، لاہور ۱۹۶۹ء و دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔

۱۱۔ ''رموزِ غالب'' ص ۵۲۔

۱۲۔ نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۱۳۔

۱۳۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید، ص ۲۸، ۲۹۔

۱۴۔ ایضاً ص ۸۴ تا ۹۸۔

(''تحقیق اور حاصلِ تحقیق''، ۱۹۸۲ء، ص ۵۴ تا ۶۶)

◆◆◆

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک

جب تک انتخاب کلام غالب کا وہ مخطوطہ منظر عام پر نہیں آیا تھا جو نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے مشہور ہے، اس وقت تک محققین کا خیال یہ تھا کہ دیوان غالب کا سب سے پرانا مخطوطہ نسخہ بھوپال (حمیدیہ) ہے جو نواب غوث محمد خان صاحب کے بیٹے نواب میاں فوجدار محمد خان کا مملوکہ سمجھا جاتا ہے اور جس کی کتابت ۱۸۲۱ء میں ہوئی۔ ؎۱

اس اعتبار سے محققینِ غالب کے نزدیک نسخۂ شیرانی کلام غالب کا دوسرا اور اہم مستند نسخہ تھا جو حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ''اہلِ علم کا خیال ہے کہ نسخۂ شیرانی ۱۸۲۷ـ۱۸۲۶ء کے قریب یعنی نسخۂ حمیدیہ کے پانچ چھ سال بعد مرتب ہوا تھا۔'' ؎۲

لیکن جب نسخہ عرشی زادہ ؎۳ منظرِ عام پر آیا (جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ مخطوطہ بہ قلم غالب ہے) اور اس میں اہلِ علم حضرات کے سامنے یہ عبارت آئی:

> ''بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ لکھ کاوش مضامین دیگر رجوع بہ خیال روح میرزا علیہ الرحمہ آورد۔ فقط۔''

تو اس میں سنہ کی عدم موجودگی موضوع بحث بن گئی، سید قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع

پر ''اُردو نامہ'' کراچی کے شمارہ نمبر ۴۷ میں مفصل بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس مخطوطہ کا سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ ہے، یعنی ۱۸۱۶ء عیسوی اور اس اعتبار سے اسے نسخۂ حمیدیہ پر فوقیت حاصل ہے کہ یہ اس سے پانچ یا چھ برس پہلے معرض وجود میں آیا۔

اس لحاظ سے جب ہم ان نسخوں کی ترتیب کا تعین کرتے ہیں تو نسخۂ شیرانی کو کلامِ غالب کا تیسرا اور اہم مستند نسخہ قرار دیتے ہیں، یہ مخطوطہ حافظ محمود شیرازی مرحوم کے اس ذخیرہ کتب میں شامل ہے، جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پاس ہے، لیکن اس بات کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ حافظ محمود شیرانی کو یہ نسخہ کہاں سے حاصل ہوا۔

مجلس ترقی ادب لاہور کے مذکورۂ بالا مطبوعہ نسخے کے پیش لفظ میں بھی اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ دراصل یہ پیش لفظ محض ایک شاعرانہ انداز کی تحریر ہے اور اس کے مطالعے سے تحقیق کا کوئی پہلو قاری کے سامنے نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ سید امتیاز علی تاج سے اس امر کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

اس سلسلے میں ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

> ''دوسرا قلمی دیوان جو نسخہ بھوپال کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں مرتب ہوا، چوں کہ یہ حافظ محمود شیرانی کے پاس رہ چکا ہے، اس لیے نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے۔''

یہ بات ابو محمد سحر صاحب نے بغیر کسی دلیل کے کہی ہے، یہ تو خیر ظاہر ہی ہے کہ وہ مخطوطہ جس کا نام نسخۂ شیرانی ہے، پروفیسر محمود خاں شیرانی کو کہیں سے ملا ہوگا لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ نسخۂ بھوپال (یعنی مذکورہ نسخۂ حمیدیہ) ''اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل میں'' پروفیسر محمود شیرانی کے پاس کچھ مدت کے لیے رہا۔ یہ ''کچھ مدت'' کی طرف میں اشارہ اس لیے کر رہا ہوں کہ ''رہ چکا ہے'' کے معنی یہی ہیں کہ کچھ مدت ان کے پاس رہا اور پھر کہیں اور چلا گیا۔

دوسری بات اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ''اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل'' کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بعض غزلوں پر غالب نے نظر ثانی کی، بعض کو خارج کر دیا اور بعض میں سے انتخاب کیا۔ یہی بات ڈاکٹر گیان چند نے زیادہ واضح الفاظ میں لکھی ہے، اور اپنی تحریر میں گنجلک یا

ابہام نہیں رہنے دیا۔ ڈاکٹر گیان چند تفسیر غالب کے دیباچے میں غالب کے غیر متداول کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''غیر متداول حصہ ذیل کے کلام پر مشتمل ہے۔

(۱) ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اصل نسخۂ بھوپال کا بڑا حصہ۔ اس نسخے کا انتخاب ''نسخۂ شیرانی'' ہے اور اس کا انتخاب ''گلِ رعنا'' [۴]

گویا وہ صرف یہ نہیں کہتے ''نسخۂ شیرانی''، ''نسخۂ حمیدیہ'' کا انتخاب ہے یعنی وہ نسخۂ حمیدیہ کی اصل یعنی نسخۂ بھوپال کے بڑے حصے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کی نشاندہی کبھی نہ ہوئی جسے ابومحمد صاحب سحر ''نسخۂ حمیدیہ'' کی ''اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل'' کہہ رہے ہیں۔

اب آگے چلنے سے پہلے اس سلسلے میں ایک نظر مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریر پر بھی ڈال لینا چاہیے، وہ ''دیوانِ اُردو نسخۂ بھوپال'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: ''میرزا صاحب نے اپنا ردیف وار اُردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں صاف کرایا تھا۔ اس کی اصل کوئی مردف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بہ ترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی تک کوئی مسالا نہیں مل سکا لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کیے تھے......

''لیکن اس دیوان کے اشعار کا بڑا حصہ پیچیدہ، خیالی مضامین اور مغلق تشبیہ و استعارہ پر مشتمل تھا...... چناں چہ بہت سی غزلیں ''غلط'' قرار دیں۔ فقرے، مصرعے اور شعر بھی بدلے اور آسان اور دلنشیں انداز کی غزلیں بھی کہیں۔

''تہذیب اور تنقیح کا یہ کام صفر ۱۲۳۷ھ (اکتوبر ۱۸۲۱ء) کے بعد شروع ہوا اور سفر کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۶ء) میں ختم ہوگیا۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور بین السطور میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی ہیں اور نئے شعراء کی غزلیں بھی۔ نیز ردیف الیاء کی متعدد غزلیں آخر میں بھی تحریر کردی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصلاح و اضافہ کا یہ کام اس کی تاریخ کتابت کے بعد ہی شروع کیا جاسکتا تھا ورنہ وہ سب کچھ بجائے حاشیوں کے متن ہی میں درج ہوتا:

''نیز مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخہ کا مبیضہ تھا۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں لیکن حاشیوں کے بعد کی کہی ہوئی غزلیں بھی درج ہیں۔ ان میں سے دو میرزا صاحب نے باندہ (بندھیل کھنڈ) سے بھیجی تھیں جو سفر کلکتہ کی ایک منزل تھی۔ ظاہر ہے کہ نسخۂ شیرانی سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب نہ ہو گیا ہوتا تو اس کے حاشیوں پر سفر کے دوران کہی گئی غزلیں کس طرح مندرج ہو سکتی تھیں۔'' ۵

ان تین محققینِ غالب کی تحریروں کی روشنی میں جو نکات سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ''نسخۂ شیرانی'' ''نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے (ابو محمد سحر)

۲۔ نسخۂ حمیدیہ کی اصل نسخۂ بھوپال کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے (ڈاکٹر گیان چند)

۳۔ نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) میں غالب نے بہت سی غزلیں ''غلط'' قرار دیں ...... مصرعے اور شعر بھی بدلے...... نسخۂ شیرانی نے بھوپال نسخے کا بیضہ ہے۔ اس کے تین مندرجات بالکل بھوپال نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں۔ (مولانا امتیاز علی عرشی)

ان تینوں ماہر غالبیات کے بیانات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا مخطوطہ غالب کی نظر سے گزرا تھا اور اُنھوں نے اس پر نظر ثانی کی تھی بلکہ محمد انوار الحق ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال کی مساعی سے نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں چھپ کر سامنے آیا، یہاں تک لکھتے ہیں۔

''یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ ترمیم و تصحیح کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور اُنھوں نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں۔'' ۶

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مفتی انوار الحق کی اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہ یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپال کے لیے لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا، لکھتے ہیں:

''لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھی کے پاس رہا تھا، اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے

> پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ۱۲۴۸ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی۔" ۷

گویا عرشی صاحب جہاں مفتی انوار الحق کی اس رائے کو تقویت پہنچا رہے ہیں کہ "کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا" وہاں یہ کہہ کر انوار الحق صاحب کی تحقیق کی تنقید بھی کر رہے ہیں کہ "فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھی کے پاس رہا تھا۔" یعنی بقول عرشی صاحب یہ مخطوطہ غالب کی نظر سے محض گزرا ہی نہیں بلکہ یہ لکھا بھی گیا میرزا صاحب ہی کے لیے اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھی کے پاس رہا (دوسرے لفظوں میں یہ مخطوطہ کوئی چھ سال تک غالب ہی کی تحویل میں رہا)

اب اس بات کے متعلق کہ یہ مخطوطہ غالب کی نظر سے گزرا یا نہیں، میں ذرا بعد میں اپنی ناقص رائے کا اظہار کروں گا لیکن عرشی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ مخطوطہ (مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا قرین قیاس نہیں۔ کیوں کہ عرشی صاحب نے بھوپال میں اپنے دو روزہ قیام میں اس نسخے کو دیکھنے کے بعد جو کچھ اس کے متعلق لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ اپنے لیے نہیں لکھوایا بلکہ کسی بڑے آدمی کو پیش کرنے کے لیے لکھوایا ہے۔ بقول عرشی صاحب مخطوطے کا "کاغذ عمدہ کشمیری ہے، جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی ہے۔ عنوانات شنجرفی ہیں...... دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے...... ورق ۱۵ اب سے دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں...... آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے: "دیوانِ من تصنیف میرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب، سلمہم ربہم، علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرہ النبویہ صورتِ اتمام یافت۔" ۸ یہ اہتمام غالب نے اس مخطوطے کے لیے کیا ہو جو انھوں نے اپنے لیے لکھوایا ہو بعید از قیاس ہے۔

بقول جناب مالک رام نسخہ حمیدیہ غالب کی نظر سے نہیں گزرا ۹ اور یہی خیال وقیع معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص محمد انوار الحق کے اس مکمل بیان کی روشنی میں جس کے ابتدائی جملے پہلے درج کیے

جا چکے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے بعد کہ غالب نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں۔ محمد انوار الحق اپنی عبارت کو یوں مکمل کرتے ہیں:

> ''کیوں کہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے، کیوں کہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا ہے یا کسی مصرعے کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ کتاب غالب کا گمشدہ دیوان ہی ہے خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں:
>
> آفتاب آمد دلیل آفتاب''

ظاہر ہے کہ یہ تحریر تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ انوار الحق صاحب نے پہلے ایک فیصلہ کر لیا ہے اور پھر اس فیصلے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ محض اندازوں سے کام لیتے چلے گئے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ اصل مخطوطہ تو گم ہو چکا ہے اور مطبوعہ کتاب میں اس قسم کی تحریر قاری کے اس خیال کو پختہ تر کرتی ہے کہ یہ نسخہ غالب کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس صورت میں نسخۂ حمیدیہ کو نسخۂ شیرانی کے مانند مستند اور معتبر قرار دینا دونوں نسخوں کے گہرے اور با احتیاط مطالعے پر مبنی نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بقول مولانا عرشی ''مولانا محمود خاں شیرانی کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا۔'' نیز یہ کہ ''اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں''، لیکن مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا تقابلی مطالعہ مولانا امتیاز علی عرشی کے اس بیان کی تائید نہیں کرتا اور نہ ہی ڈاکٹر گیان چند کے اس بیان کی تائید

اس تقابلی مطالعے سے ہوتی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے۔ کیوں کہ اگر نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا بیضہ ہے یا نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب ہے تو نسخۂ شیرانی میں وہ چھ غزلیں کیسے شامل ہوگئیں جو نسخۂ حمیدیہ میں سرے سے موجود نہیں ہیں اور وہ چھ غزلیں یہ ہیں:

۱۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے
۲۔ عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے دو قدم آگے
۳۔ جس زخم کی ہوسکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی
۴۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے
۵۔ رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے
۶۔ خودفروشی ہائے ہستی بس کہ جائے خندہ ہے
ہر شکستِ قیمت دل میں صدائے خندہ ہے

ان غزلوں کی نشاندہی ڈاکٹر وحید قریشی نے کی ہے۔ [۱۱] لیکن ڈاکٹر وحید قریشی بھی چوں کہ اس خیال سے متفق ہیں کہ نسخۂ بھوپال (یعنی موجودہ مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ) غالب کی تحویل میں رہا اس لیے وہ ان غزلوں کی نسخۂ شیرانی میں موجودگی اور نسخۂ بھوپال میں عدم موجودگی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

> ''جس وقت یہ غزلیں لکھی گئیں (جو نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہیں اور نسخہ بھوپال کے متن اور حواشی اور آخر کے اضافات دونوں سے خالی ہیں) اس وقت تک نسخۂ بھوپال غالب کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس لیے یہ غزلیں اس میں جگہ نہ پا سکیں۔'' [۱۲]

لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچاتے کہ نسخۂ بھوپال غالب کی تحویل میں رہا۔ ہاں اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ ''نسخۂ بھوپال کب تک غالب کی دسترس میں رہا اسے ''نسخۂ شیرانی'' کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔'' ۱۳

اور جب ہم نسخۂ شیرانی کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ نسخۂ بھوپال غالب کی تحویل میں کبھی نہیں رہا اور عرشی صاحب کے اس دعوے کی بھی تائید نہیں ہوتی کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر غزلوں میں اشعار کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ غزلوں کی ترتیب بھی اکثر و بیشتر مختلف ہے۔ اس طرح کی مثالیں ایک نہیں بہت ہیں۔ پہلی غزل میں تو ایک عجیب بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ غزل کا مقطع:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جو نسخۂ بھوپال میں موجود ہے اور نسخۂ شیرانی سے غائب ہے، ہاں حافظ محمود شیرانی نے حاشیے میں اپنے قلم سے اس کا اضافہ کیا ہے اور مطبوعہ نسخۂ بھوپال کے ''آتش زیرِ پا'' کو جو غلط ہے صحیح کر دیا ہے اور اسے ''آتشِ زیرِ پا'' لکھا ہے۔

ایک اور غزل دیکھیے ...... جنوں گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا...... اس شعر کے مصرعِ اول میں غالب نے دو بار ترمیم کی ہے۔ پہلے اس مصرے کی صورت یہ تھی:

جراحت تحفۂ الماس ارمغاں نادیدنی دعوت

بعد میں اُنھوں نے اس میں ترمیم کر کے اسے یہ صورت دی:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں خونِ جگر ہدیہ

دوسری بار جب غالب نے اس مصرعے میں ترمیم کی تو ''خونِ جگر'' کی جگہ ''داغِ جگر'' لکھا اور مصرع یوں ہو گیا:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ

مطبوعہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) میں اس کی پہلی دونوں صورتیں ہیں لیکن نسخۂ شیرانی میں اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ بھی یہ:

اور شیرانی صاحب نے حاشیے میں اپنے ہاتھ سے نادیدنی دعوت کے سامنے ''داغِ جگر ہدیہ'' لکھ دیا ہے۔اس ترمیم کی دوسری اور مصرعے کی تیسری صورت ہے اور جو متداول دیوان میں ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے ترقیمے کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے کہ اس ترقیمے سے مالک رام صاحب یہ اندازہ کرتے ہیں کہ ''یہ نسخہ خود غالب نے لکھوایا تھا اور یہ مدتوں ان کے پاس رہا اس ضمن میں مالک رام صاحب یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب اس نسخے کا بیضہ (یعنی مسودۂ شیرانی) تیار ہو گیا تو یہ گویا تقویم پارینہ کے ذیل میں چلا گیا۔ اسی زمانے میں غالب کے شاگرد میاں یار محمد خاں شوکت بھوپالی نے اسے ان سے حاصل کر لیا اور لے جا کر اسے اپنے والد میاں فوجدار محمد خاں بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا۔'' [۱۴]

لیکن ترقیمے کی عبارت سے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے لیے نہیں لکھوایا گیا بلکہ قرین قیاس بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نسخے کا کاتب حافظ معین الدین بہت پڑھا لکھا اور خوش ذوق آدمی ہے اور غالب سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے نام کی جگہ بھی مرزا صاحب اور قبلہ کے الفاظ لکھتا ہے۔اور گمان یہ ہے کہ اس نے غالب سے عقیدت کی بنا پر اپنے لیے یہ نسخہ تیار کیا اور اسے ہر طرح سے سجایا۔ترقیمے میں کسی ممدوح کا نام تو کیا اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا۔

اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عرشی صاحب کے الفاظ میں ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی کے نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ اُنھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ردیف ''غ'' کی پہلی غزل:

عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ

کے متعدد شعروں کے مقابل ''پسند عبدالعلی منہ'' لکھا ہے۔

اسی ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے ''پسند خاطر عبدالعلی۔'' ورق ۲۸ ب کے اوپر

کے حاشیے میں لکھا ہے ''مقابلہ کردہ شد''

۱۵ ''ردیف ۱۲۹ کے حاشیے میں باریکے کے اندر لکھا ہے ''محمد عبدالصمد مظہر''

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں عبدالعلی اور محمد عبدالصمد مظہر نامی دو اشخاص کے ہاتھوں سے گزر کر پہنچا ہے۔

غالباً یہ مخطوطہ جس کی کتابت حافظ معین الدین ایسے پڑھے لکھے اور خوش مذاق کاتب نے کی تھی عبدالعلی اور محمد عبدالصمد مظہر تک پہنچنے کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کے لیے خریدا گیا۔ اگر چہ فوجدار محمد خاں کی مہر کے ساتھ اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہے، لیکن اصل مخطوطہ چوں کہ گم ہو چکا ہے اس لیے اس طرح کے قطعی ثبوت کی تلاش لاحاصل ہے۔

اب اس سلسلے میں نسخۂ عرشی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ محترم عرشی صاحب لکھتے ہیں: بدنما خط میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً ..... تقاضا کو تقضہ لکھا ہے...... بہانہ کو بہانیے لکھا ہے..... مضائقہ نہ کرے میں مضاعقہ...... رنگ ہے سنگِ محک دعوائی مینائی عبث، میں سنگِ ہمک یا خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں، میں بھاگے نگے ...... اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں۔ ۱۶

تو اس سلسلے میں کہنا یہ ہے کہ غالب سے املا کی ان غلطیوں کی توقع نہیں لیکن جب غالب کی تحویل میں یہ نسخہ رہا ہی نہیں تو وہ ان اغلاط کی اصلاح کیسے کرتے۔ گویا عرشی صاحب کی یہ تحریر اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ غالب نے نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) نہیں دیکھا۔

جب ابو محمد سحر کہتے ہیں کہ نسخۂ شیرانی نسخۂ بھوپال (یعنی نسخۂ حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے تو کیا وہ یہ فرض تو نہیں کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی مبیضہ ہوگا اور عرشی صاحب بھی جب نسخۂ حمیدیہ کے مبیضہ کی بات کرتے ہیں تو کیا وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ بھوپال نہیں بلکہ اس کا ایک مبیضہ اور بھی ہو سکتا ہے اور وہ مبیضہ شیرانی صاحب کے پاس رہا۔ ہاں یہ مفروضہ کہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان ایک اور نسخے کی موجوگی کا امکان ہے، یہ گتھی کھول سکتا ہے۔ اگر چہ یہ مفروضہ بھی اس سوال کے جواب کی طرف رہنمائی نہیں کرتا کہ یہ مبیضہ حافظ محمود شیرانی تک کس طرح پہنچا۔

ساتھ ہی ان کا خیال یہ بھی ہے کہ عرشی صاحب جب یہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک ان ہی کے پاس رہا تھا اور اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس سے ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں پہنچا۔'' ۱۷

تو وہ گویا اس مخطوطے کی موجودگی کو ایک طرح سے خارج کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم نسخۂ شیرانی میں ایسے اشعار موجود پاتے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں نہیں ہیں تو عرشی صاحب کا یہ کہنا قرینِ قیاس نہیں رہتا کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں مثلاً یہ غزل دیکھیے:

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

نسخۂ بھوپال میں یہ غزل مندرجہ ذیل اشعار پر مشتمل ہے:

اف نہ کی سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہم سری
بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا
شمع رویاں کی سر انگشتِ حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پر فشاں پروانہ آسا جل گیا
خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتش باز ہے
شعلہ رویاں جب ہوئے گرم تماشا جل گیا
تا کجا افسوسِ گرمی ہائے صحبت اے خیال
دل ز آتش خیزی داغِ تمنا جل گیا
ہے اسدؔ بے گانۂ افسردگی اے بے کسی
دل ز انداز تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

لیکن نسخۂ شیرانی میں ان کے علاوہ وہ پانچ اشعار ۱۸

بھی میں جو بعد میں مطبوعہ متداول دیوان میں شامل ہیں اور وہ پانچ اشعار الگ نہیں ہیں بلکہ غزل ہی میں مختلف ترتیب سے شامل ہیں۔

اپنی اس بحث کو ختم کرنے کے بعد جوان دو نتیجوں پر پہنچی ہے کہ نسخۂ شیرانی نہ تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کا انتخاب ہے اور نہ ہی یہ نسخۂ بھوپال کا مبیضہ ہے۔

(۲) جہاں تک نسخۂ بھوپال کا تعلق ہے مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی نسخہ ہوگا (نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان) جس نے نسخۂ شیرانی کی بنیاد کا کام دیا ہوگا۔قدرت اللہ نقوی کی مذکورہ کتاب ''نسخۂ شیرانی'' کی یہ عبارت 19 پیش کرنا مناسب خیال کرتا ہوں:

ا۔نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کی نقل نہیں ہے۔

۲۔نسخۂ حمیدیہ کے حواشی اور آخر میں غزلیات کا مختلف القلم اندراج اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے کسی اور دیوان سے وقتاً فوقتاً نقل کا عمل ہوتا رہا اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ کلام شیرانی کے مسودے سے نقل ہوا اور نسخۂ شیرانی کی تبیّض سے کافی مدت قبل یہ عمل ختم ہو چکا تھا۔

''گل رعنا مع آشتی نامہ'' غالب میں بھی قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع کو چھیڑا ہے اس میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کے زیرِ عنوان وہ لکھتے ہیں: ''جا بجا اصلاحات و ترامیم مختلف حضرات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائی گئی ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اولاً متن کسی مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے اور بعد میں اضافے اور اصلاحیں بھی کسی ایسے مخطوطے سے نقل ہوئیں جس میں غالب نے یہ تمام درج کر رکھی ہوں گی... نسخۂ حمیدیہ نو دریافت مخطوطے کی نقل نہیں بلکہ کسی اور دیوان کی ہے۔ میرے خیال میں غیر مردف دیوان سے کوئی نسخہ تیار کیا گیا جس کی یہ نقل ہے۔ اسی عہد کے لگ بھگ تیار ہونے والے ایک نسخہ کے متعلق غالب نے کلکتہ سے محمد علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے:

> ''دیوانِ ریختہ کہ گرد آوردنِ آں را بیش از ہفت سال گزشتہ و معبد امہری از مواہیر ایں روسیاہ کہ اسداللہ خان عرف میرزا نوشتہ نقش نگین و جلوۂ سال یک ہزار دو صد دسی و یک ہجری طرازِ دامن و آستینش بود بر خاتمۂ اوراق سفینہ رقم۔ (نامہ ہائے فارسی غالب صفحہ ۱۰۲)''

یہ ۱۸۲۵ء کا واقعہ ہے، اس میں سات سال کی مدت گھٹائی جائے تو یہ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ کا

زمانہ ہوگا۔لہٰذا وہ دیوان وہی ہوگا جس کی نقل نسخۂ حمیدیہ ہے لیکن گلِ رعنا کا انتخاب دلالت کرتا ہے کہ مذکورہ نسخے کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی غالب کے ساتھ تھا جو نسخۂ شیرانی کے مطابق تھا۔ [۲۰]
اور نسخۂ شیرانی کے زیرِ عنوان ان کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:

''......حاشیے کی ایک غزل بقلم غالب ہے۔متعدد مقامات پر ترامیم ملتی ہیں اور حک واصلاح کا عمل ہوا ہے بعض اصلاحیں بقلم غالب ہی تسلیم کی گئی ہیں۔رسم الخط خوشخط نستعلیق ہے۔حاشیہ بھی اسی قلم سے ہے مگر باریک۔نسخۂ حمیدیہ سے اس نسخے کی غزلیات اور اشعار کی ترتیب کا اختلاف اتنا زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی اس نسخے کو نسخۂ حمیدیہ کی نقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔نیز یہ کہ وہ نسخہ جو غالب نے کلکتہ میں نام وتخلص کے ثبوت کے لیے پیش کیا تھا وہ اگر وہی نسخہ تھا جس سے گلِ رعنا کا انتخاب عمل میں آیا تو وہ ۲۱-۱۸۲۰ء کا مکتوبہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس میں وہ کلام بھی منتخب ہوا ہے جو بعد میں کہا گیا ہے اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ترامیم اور اضافے اس میں کرلیے گئے تھے تو ترتیبِ غزلیات واشعار کا اختلاف اس کی تائید نہیں کرتا۔احساس یہ ہے کہ سفرِ کلکتہ میں غالب کے ساتھ دو نسخے تھے،ایک وہ جس سے نسخۂ حمیدیہ نقل ہوا،دوسرا وہ جس سے نسخۂ شیرانی تیار ہوا......'' [۲۱]

میں نے ''نسخۂ شیرانی'' پر مقالہ لکھنے سے پہلے یہ سوچا تھا کہ اپنے اس مقالے میں مندرجہ ذیل اُمور زیرِ بحث لاؤں گا۔

۱۔نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں کیا ربط باہم ہے۔

۲۔نسخۂ شیرانی کی افادیت اور اہمیت مثلاً یہ کہ نسخۂ حمیدیہ کی یہ حیثیت مشکوک ہے کہ اسے غالب نے دیکھا یا نہیں اور اس لحاظ سے نسخۂ شیرانی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ غالب کا دیکھا ہوا ہے، غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے ورنہ Gap پڑجاتا ہے۔

اس نسخے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ حمیدیہ کے بعد کلام میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔یہ نسخہ غالب کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

مثلاً یہ غزل دیکھیے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

جو نسخۂ شیرانی کے صفحہ ۵۶۔ا کے حاشیے میں درج ہے۔ اس کے آخر میں ایک قطعہ ہے جو متداول دیوان میں یوں ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

نسخۂ شیرانی کے حاشیے میں پہلے شعر کا مصرعِ اول یوں ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالبؔ

اور دوسرا اور تیسرا شعر یہ ہے:

طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

یہ غزل اُنھوں نے کلکتے جاتے ہوئے کہی۔ لکھنؤ میں ان کے پروگرام میں نواب معتمد الدولہ بہادر سے ملاقات شامل تھی لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ غالب نے ملاقات کے لیے چند شرطیں عائد کردیں مثلاً نواب صاحب معانقہ کریں گے، مجھے نذر پیش کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ شرطیں نواب صاحب کو قابلِ قبول نہ تھیں ملاقات نہ ہوسکی اور غالب ملاقات کیے بغیر لکھنؤ سے باندہ روانہ ہوگئے۔ لکھنؤ ہی میں (جب ملاقات ختم ہوگئی) یا لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد اُنھوں نے قطعے میں سے ''طاقتِ رنجِ سفر'' اور ''معتمد الدولہ بہادر'' والے دونوں شعر

خارج کردیے۔ پہلے مصرعے سے اپنا تخلص نکال دیا اور قطعے کو وہ صورت دی جو متداول دیوان میں درج ہے اور جو اوپر بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ غزل بھی اُنھوں نے لکھنؤ یا باندہ سے لکھ کر اپنے اس قریبی عزیز یا دوست کو بھیجی جس کے پاس وہ نسخہ تھا جس کو ہم اب نسخۂ شیرانی کہتے ہیں۔

مذکورہ قطعے سے غالب کی اس مزاجی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے جسے خودداری یا انا کہا جاتا ہے اور جس کا ذکر ہم دہلی کالج والے واقعے کے تعلق سے کرتے ہیں۔ یہ قطعہ بھی اسی مزاجی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

۳۔نسخۂ شیرانی کا کاتب غیر محتاط ہے، نقطوں کے معاملے میں (نقطوں کو خود غالب نے درست کیا ہے۔)

۴۔ یہ نسخہ کسی بڑے آدمی کے لیے تیار کیا گیا ہوگا؟ (کیوں کہ اس کی تیاری میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے) کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے یہ مکمل ہو چکا تھا۔

۵۔غالب نے اپنے اشعار میں جو ترمیم یا اصلاح کی ہے، اس کی قدر و قیمت کیا ہے یعنی کیا اس تبدیلی سے شعر بہتر ہوگیا ہے یا ویسا ہی رہا ہے یا اس کا مرتبہ پہلے سے کم ہوگیا ہے۔

(میں نے خود شاعر کے قلم سے ترمیم واصلاح کے پیشِ نظر علامہ اقبال کے کلام کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ''اقبال کے اپنے کلام پر نظر ثانی'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اس میں اپنے اندازے سے میں نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے یہ تبدیلی کس خیال سے کی ہوگی۔ اسی طرح کا ایک حصہ اس مضمون میں ان ترامیم اور اصلاحوں کے لیے بھی میرے پیشِ نظر تھا۔ جس کی شمولیت اس مقالے میں ضروری تھی)

۶۔اس مقالے میں ان تمام اشعار کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا جن کے اشعار کا متن حمیدیہ (اصل) کے متن سے مختلف ہے۔ ان اہم ترامیم کا تفصیلی ذکر بھی ضروری تھا جو شیرانی میں ہیں مگر حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

لیکن بحث کا پہلا حصہ ہی یعنی نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا ربط باہم ہی اتنا طویل ہوگیا کہ اگر دوسرے مذکورہ ابعاد پر لکھنے کی میں کوشش کرتا تو بربنائے طوالت مکمل مقالہ یہاں پیش کرنا دشوار ہو جاتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اہلِ علم کی نظر سے یہ تمام ابعاد مخفی نہیں ہوں گے اور نسخۂ شیرانی کے

سلسلے میں ان ابعاد پر ضرور لکھا جائے گا اور چوں کہ مقالہ صرف ایک ہی بُعد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اس لیے میں نے اس کے عنوان میں ذرا سا اضافہ کر کے اسے محدود کر دیا ہے یعنی ''نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک۔''

حوالہ و حواشی

۱۔ یہ مجموعہ مفتی انوار الحق نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں چھپوایا تھا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب بجنوری مرحوم کا مبسوط مقدمہ شائع ہوا ہے، جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔'' لیکن راقم التحریر کی تحویل میں نسخۂ حمیدیہ کا جو مطبوعہ ایڈیشن ہے اور جس پر تاریخِ اشاعت ۱۹۲۱ء درج ہے اس میں عبدالرحمٰن بجنوری کا دیباچہ شامل نہیں ہے۔

دراصل یہ دیباچہ بعض جلدوں میں ہے اور بعض میں نہیں ہے، بعد میں یہی دیباچہ ''محاسن کلام غالب'' کے نام سے بجنوری مرحوم کی الگ تصنیف کے طور پر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا۔

ویسے بھی مفتی انوار الحق کا مرتب کیا ہوا اور شائع کیا ہوا نسخۂ حمیدیہ اس مخطوطے پر کام کرنے والے کی صحیح معنی میں رہنمائی نہیں کرتا۔ بقول مالک رام یہ بہت غلط طریقے پر مرتب ہوا، متن اور حواشی اور آخر کا کلام گڈمڈ کر دیا گیا، متن کے کلام کی ترتیب بدل دی گئی، صحتِ کتابت کا معیار بھی بہت ناقص ہے۔

۲۔ پیش لفظ نسخۂ شیرانی (مطبوعہ مجلس ترقی ادب، ۲۔ کلب روڈ، لاہور، یہ پیش لفظ ناشر کا لکھا ہوا ہے اور ناشر اس کتاب کے سید امتیاز علی (ستارۂ امتیاز) ہیں جو اس وقت مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم تھے۔ گویا یہ پیش لفظ سید امتیاز علی تاج ہی کا لکھا ہوا ہے۔

۳۔ ماہنامہ شاعر، بمبئی، غالب نمبر (ادارہ: اعجاز صدیقی۔ مہندر ناتھ) فروری، مارچ ۱۹۶۹ء۔ مضمون بہ عنوان ''پٹنہ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں'' ص ۹۶۔

۴۔ تفسیر غالب (ڈاکٹر گیان چند) ناشر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۷۱ء، ص ۹۔

۵۔ دیوان غالب اُردو۔ نسخۂ عرشی (مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی) پہلی اشاعت ۱۹۵۸ء ناشر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔ ص ۱۹۔ ۲۰۔

۶۔ دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ بہ تدوین احقر العباد ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے منشی فاضل، ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال، ۱۹۲۱ء۔ طابع مفید عام اسٹیم پریس آگرہ ص ۶۔

۷۔ دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن، ص ۷۸۔

۸۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن ص ۷۶۔

۹۔ مالک رام صاحب نے زبانی مجھ سے یہی فرمایا تھا اور یہ کوئی ڈیڑھ ماہ کی بات ہے لیکن اُنھوں نے گفتارِ غالب میں یہ لکھا ہے کہ ترقیمے کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خود غالب نے لکھوایا تھا۔ یہ نسخہ مدتوں ان کے پاس رہا۔ غالباً اب مالک رام صاحب کا خیال یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) غالب کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ (آزاد)

۱۰۔ غالباً یہ لفظ ''موجود'' ہوگا۔

۱۱۔ نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، مطبع منصور پریس، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۲۔

۱۲۔ نذر غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۲۔

۱۳۔ نذر غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۴۔

۱۴۔ گفتارِ غالب (مالک رام) ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۷۔

۱۵۔ نسخۂ عرشی۔ پہلا ایڈیشن ص ۷۷۔

۱۶۔ نسخۂ عرشی۔ پہلا ایڈیشن ص ۷۸۔

۱۷۔ نسخۂ حمیدیہ (مولانا امتیاز علی عرشی) پہلا ایڈیشن ص ۷۸۔

۱۸۔

دل میں ذوقِ وصلِ دیارِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

۱۹۔ نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات (قدرت اللہ نقوی) ص ۱۷۵۔

۲۰۔ ''گل رعنا مع آشتی نامۂ غالب'' مرتبہ سید قدرت اللہ نقوی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۔

۲۱۔ ''گل رعنا مع آشتی نامۂ غالب'' مرتبہ سید قدرت اللہ نقوی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۔۱۶۔

(ماہنامہ ''معارف'' ۔اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۸۹ء۔ ص ۲۰۴ تا ۲۲۳)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

دیوانِ غالبؔ جدید، نسخہ حمیدیہ

غالبؔ نے دس بارہ کی عمر سے پچیس کی عمر تک دس بارہ برس میں جو اشعار کہے، اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۸۲۱ء میاں فوجدار محمد بہادر، بھوپال کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ریاست بھوپال، مفتی محمد انوار الحق نے اس کو پہلی بار ۱۹۲۱ء میں ''دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ'' کے عنوان سے شائع کیا۔ [1] یہ نسخہ بھوپال کے نواب محمد حمید اللہ خان سے انتساب پا کر جو اُس وقت ''نواب زادہ'' اور ریاستِ بھوپال کے ''چیف سیکریٹری'' تھے، نسخہ حمیدیہ کہلایا۔

مفتی محمد انوار الحق نے ''تمہید'' میں نسخہ حمیدیہ کے خطی نسخے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کے مطابق اس قلمی نسخے کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا، لیکن تاریخِ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیسِ وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے: ''دیوانِ ہٰذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہ قلمی، خوش خط'' اور اس کے سامنے اُن کی مہر ہے اور خاتمے پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے: ''دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ [2] من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت'' اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ شروع میں

خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ (۱۸۲۲ء) اور بعض ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہو اور اُن کی نظر سے گزرا ہے اور اُنھوں نے خود اس میں جا بہ جا اصلاحیں کی ہیں کیوں کہ اگر چہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کے طرزِ تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے...... خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ [۳]

نسخۂ حمیدیہ جس بیش بہا مخطوطے سے شائع ہوا ہے، وہ اب ناپید ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی، ۱۷، جون ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کو لکھتے ہیں:

> "یہ سُن کر آپ کو بے حد قلق ہوگا کہ نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل بھوپال سے غائب ہوگئی۔ لائبریرین کہتے ہیں کہ نواب صاحب کے کتب خانے میں منتقل ہوگئی اور خود نواب صاحب فرماتے ہیں کہ وہ وہیں لائبریری سے غائب ہوگئی۔
>
> انا للہ وانا الیہ راجعون۔" [۴]

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل، صرف وہ نسخہ بھوپال مکتوبہ ۱۸۲۱ء ہی نہیں ہے جو اولاً نواب فوجدار محمد خان کے ذاتی کتب خانے میں اور پھر بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ رہا اور اب غائب ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ: نسخۂ بھوپال، غالب کے متداول دیوان اور ان کے کچھ دوسرے مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اسے مفتی محمد انوار الحق کے وسائل کی حد تک "کلیاتِ اُردو" سمجھنا چاہیے۔ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن کاش خطی نسخہ بھوپال، اپنی جداگانہ شکل میں چھپتا یا نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) میں اسے سختی کے ساتھ مشخص کر دیا جاتا۔ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) کے مرتب نے اس کی اہمیت اور بحیثیت مرتب اپنی ذمہ داری کو جیسا محسوس کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا ہے۔

"نسخۂ حمیدیہ" پر ڈاکٹر ابو محمد سحر نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ یہاں اُن کے ایک مضمون "کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں" (مطبوعہ، شاعر، بمبئی، غالب نمبر، فروری مارچ، ۱۹۶۹ء، صفحہ

۹۶-۱۰۲) سے بعض ضروری اُمور پیش کیے جاتے ہیں:

''نسخۂ بھوپال کی دریافت اور نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب واشاعت کے ساتھ کچھ ایسے حالات وابستہ رہے اور ان کے اظہار میں مفتی انوار الحق نے کچھ اتنے رمز وایما سے کام لیا کہ چند ضروری اُمور، جو مرتب کے معمولی بیانات سے واضح ہو سکتے تھے، بظاہر عقدۂ لاینحل بن کر رہ گئے۔ صحیح معلومات اور نتائج تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بعض محققین نے ان کے بارے میں اتنی قیاس آرائیاں کی ہیں کہ ان سب کا جائزہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان اُمور سے بحث کرنے میں صرف فیصلہ کن شواہد کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بارے میں نسخۂ حمیدیہ طبع اول کی ''تمہید'' میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

''زمانے نے بقائے اصلح کے اُصول کو شعر وسخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس کے بعد اس صحیفے کو دنیا میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا'' ۵

اس بیان کے پہلے ٹکڑے سے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال ۱۹۱۹ء قرار پاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں ''پوری ایک صدی'' کی ابتداء، اگر نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت یعنی ۱۸۲۱ء سے شمار کی جائے تو ۱۹۲۱ء کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک واقعہ کی دو تاریخوں کو تسلیم کرنے میں جو قباحت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ۱۹۱۹ء کو صحیح تاریخ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک دوسری دقت سامنے آتی ہے۔ مفتی محمد انوار الحق نے اپنی تمہید میں تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ''عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم'' کے عنوان سے انھوں نے جو تعزیتی تعارف سپردِ قلم کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی طباعت کا اہتمام ڈاکٹر بجنوری کر رہے تھے لیکن موت نے ان کو اس کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ مفتی محمد انوار الحق رقم طراز ہیں:

''آہ کیا انقلاب لیل ونہار، کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے، آج

اُن کی یادگار کے طور پر شائع ہو رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحاتِ قلم سے روکشِ گلزار ہونے والا تھا، اس وقت معناً اُن کا کتابۂ مزار ہے۔" ۲

ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا۔ اگر وہ نسخۂ حمیدیہ کے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال اس سے پہلے دستیاب ہو چکا تھا اور اس کی دریافت کی وہ پہلی تاریخ بھی جو مفتی انوار الحق کے قول سے نکلتی ہے، غلط ہے لیکن یہ محض مفتی انوار الحق کا سہو ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جو واقعے کے خلاف تھا۔ اس سے یہ شبہ کرنا صحیح نہیں کہ اُنھوں نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال قصداً غلط بتایا ہے، کیوں کہ حقیقت کا اظہار تو اُنھوں نے خود اپنے دوسرے بیان میں صاف طور سے کر دیا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے دوسرے بیان کی تائید کچھ اور شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً معارف بابت ستمبر ۱۹۱۸ء کے "شذرات" سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ نو دریافت نسخۂ بھوپال اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری کے مطالعے میں تھا۔ مولوی عبدالحق "محاسنِ کلامِ غالبؔ" طبع اوّل (۱۹۲۱ء) کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اُردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالبؔ اُردو دیوان کا ایک نفیس ایڈیشن طبع کرے۔ چناں چہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا...... میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا...... اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی......

جہاں تک نسخۂ جدید کا تعلق ہے، اس تحریر سے مفتی محمد انوار الحق کے قول پر بس اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ بھوپال کو انجمن ترقیٔ اُردو کے لیے ترتیب دینا شروع کیا تھا۔" ۷

اگر چہ مولوی عبدالحق نے اپنی اس تحریر میں جس کا اقتباس اس سے پہلے گزر چکا ہے، انجمن ترقیٔ اُردو کے دیوانِ غالب کے مرتب کا نام ظاہر نہیں کیا، لیکن یہ مفتی انوار الحق کے بیان کی تردید کے لیے کافی نہیں ہوسکتا کیوں کہ ڈاکٹر بجنوری اپنی وفات سے قبل کسی نہ کسی حیثیت سے دیوانِ غالب کی تدوین میں مصروف تھے۔ ''محاسنِ کلامِ غالب'' میں ان کے ایک خط کے کچھ حصے کا جو عکس شائع ہوا ہے، اس میں یہ عبارت موجود ہے:

''تکیہ والی غزل بھی لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا آڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے، جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلامِ اُردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں، لیکن یہ اُن کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ اگر یہ غزل اُن غزلوں میں جو بعد میں حاشیے پر اضافہ کی گئی ہیں، موجود ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کسی شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے۔ آیا وہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں؟ دوسرے نواب صاحب کو اس کے بارے میں ذاتی علم کیا ہے؟ تیسرے نواب صاحب کی اس کے بارے میں رائے کیا ہے؟ ''طائرِ دل'' جو قطعہ ہے، وہ بھی مرزا کا نہیں ہوسکتا، اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہوسکے نوٹ کر لیجیے گا۔'' ۸

اس خط کے مکتوب الیہ کے نام و مقام اور تاریخِ کتابت وغیرہ کے متعلق عکس سے کوئی واقفیت حاصل نہیں ہوتی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے صاحب کے نام لکھا گیا ہے جو اس وقت دہلی میں تھے۔ نواب صاحب سے مراد نواب ضیاء الدین احمد خان نیر درخشاں کے صاحب زادے اور غالبؔ کے شاگرد نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی ہیں، کیوں کہ ''تکیہ'' کی ردیف کی غزل انھیں کی قلمی بیاض سے منقول ہے اور اُن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ وہ کلام جس کے متعلق ڈاکٹر بجنوری نے اس خط میں استفسارات کیے ہیں، نسخۂ بھوپال کا نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی اس کا وجود نہیں۔ تاہم ان کی یہ تحریر متداول دیوان کے سوا غالب سے منسوب کلام کے بارے میں ان کی چھان بین کا ثبوت ہے۔ غالب کے نو دریافت کلام کو متداول دیوان کے نسخوں

کے ساتھ شامل کرنے کا اس زمانے میں عام رجحان تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ انجمن ترقیٔ اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کام پہلے پہل سید ہاشمی فرید آبادی کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مسودہ تیار کرلیا تھا۔ اس دوران میں نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا ایڈیشن شائع ہوگیا اور انجمن ترقیٔ اُردو کا منصوبہ سرد پڑ گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ڈاکٹر بجنوری ولایت سے واپس آئے تھے۔ اُنھوں نے اس منصوبے سے اتنی دلچسپی دکھائی کہ انجمن ترقیٔ اُردو نے یہ کام ان کے سپرد کردیا۔ نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ہاشمی فرید آبادی جو ان اُمور سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

''انجمن ترقیٔ اُردو نے اوّل اوّل ۱۳ء، یا ۱۴ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نسخہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوانِ غالبؔ کو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔

دیوان کو صحیح اور جدید اُصولِ تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہوگیا تھا...... انجمن کی تجویز اسی منزل پر تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالبؔ کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ صحت یا حسنِ طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی لیکن مروّجہ سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کردیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیا ہو جاتی، مگر ان مرحوم کو کلامِ غالبؔ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سے مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز پر عملی تکمیل پر آمادہ ہوگئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اِس (ان) کے سپرد کردیا۔'' ۹

ڈاکٹر بجنوری کے عکس تحریر مطبوعہ محاسنِ کلامِ غالبؔ میں سید ہاشمی کے ایڈٹ کیے ہوئے نسخے کا جو ذکر ہے، اس سے دیوانِ غالب کا وہی نسخہ مراد ہے جسے سید ہاشمی نے انجمن ترقی اُردو کے لیے

مرتب کیا تھا۔ اس نسخے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر بجنوری متداول دیوانِ غالب مرتب کر چکے تھے کہ نسخۂ بھوپال دستیاب ہوگیا۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کلامِ غالب پر جو تبصرہ لکھا ہے، وہ رسالہ اُردو میں شائع ہو چکا ہے اور ان کے علمی کمالات کی ممتاز یادگار رہے گا لیکن اسے بھی مرحوم کے شوقِ مخلصانہ کا منجانب اللہ انعام سمجھنا چاہیے کہ جس وقت وہ غالبؔ کے متداول دیوان کی طبع کا انتظام کر رہے تھے، حسنِ اتفاق سے خود بھوپال میں مرزا صاحب مرحوم کا وہ گمشدہ کلام دستیاب ہوگیا جسے مرزا نے خود اپنے دوستوں کے مشورے سے تلف کر دیا تھا۔'' [10]

نسخۂ بھوپال کے مل جانے کے بعد ڈاکٹر بجنوری دیوانِ غالبؔ کو نئے طریقے سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اُمید تھی کہ وہ اپنے تبصرے میں بھی ضروری اضافے کریں گے لیکن ان کی مرگِ ناگہاں نے اس کی مہلت نہ دی۔ [11] اس کی تفصیل سید ہاشمی فرید آبادی نے یوں بیان کی ہے:

''ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہیں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

یہ بھی اُمید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے، لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپِ وبائی میں انتقال ہوگیا اور وہ سب اُمیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں، خاک میں مل گئیں۔'' [12]

نسخۂ بھوپال ڈاکٹر بجنوری کی وفات سے کچھ پہلے دستیاب ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف

یہ کہ اسے دیکھا تھا بلکہ متداول دیوانِ غالب کے اشتراک کے ساتھ اس کو طبع کرانے کا ایک مخصوص خاکہ بھی بنالیا تھا اور اس کے مطابق دیوان کی کتابت بھی شروع کرادی تھی۔ اُنھوں نے غالب کے کلام پر اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ قابلِ قبول خارجی شواہد کے علاوہ اس کی سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں اُنھوں نے نسخۂ بھوپال یا غالب کے ابتدائی قلم زد کلام کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ چوں کہ یہ تبصرہ طوالت کے باوجود ابھی ناتمام تھا اور اسی اثناء میں نسخۂ بھوپال مل گیا، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اُنھوں نے یہ تبصرہ نسخۂ بھوپال کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا تھا۔ [۱۳]

حالاں کہ جب اُنھوں نے اس میں کسی نہج سے نسخۂ بھوپال کا ذکر نہیں کیا تو یہ غلط فہمی بے بنیاد ہی نہیں، بے نتیجہ بھی تھی۔ توقع تھی کہ نسخۂ بھوپال کی روشنی میں ڈاکٹر بجنوری اپنے تبصرے پر نظر ثانی کریں گے، لیکن قبل اس کے کہ ان کے ارادے پورے ہوتے یا کسی قدر آگے بڑھتے اُنھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد ریاست بھوپال نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب پر مفتی محمد انوار الحق کو مامور کیا اور اُنھوں نے اسے اپنے طریقے سے سرانجام دیا۔ قطعِ نظر اس کے کہ اُنھوں نے ڈاکٹر بجنوری کے مجوزہ اندازِ ترتیب کی کیفیت نہیں لکھی، ان کے تمام بیانات اپنی تنگی یا اُلجھاؤ کے باوجود صداقت پر مبنی ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ پر ڈاکٹر بجنوری کی مرگِ ناگہانی کا سب سے بڑا اثر تو یہی پڑا کہ یہ دیوان ان کی ترتیب و تنقید سے محروم رہ گیا، لیکن ان کی موت اس دیوان کی اشاعت پر کچھ اور حیثیتوں سے بھی اثر انداز ہوئی۔ اس دیوان کو بجا طور پر اُن کی یادگار بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اعزہ و احباب کے عدم تعاون کی وجہ سے مفتی محمد انوار الحق کو اُن کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں بڑی دِقت پیش آئی اور دیوان کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر کے باوجود اس سلسلے میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چناں چہ ڈاکٹر بجنوری پر جو مضمون اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اُن کے سوانح کے بجائے ان کے اعزہ و احباب کی شکایتوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بجنوری کے اس طویل تبصرے کو بھی نسخۂ حمیدیہ کا مقدمہ بنایا گیا جو صرف متداول دیوانِ غالب سے متعلق تھا۔

ڈاکٹر بجنوری کا تبصرہ رسالہ اُردو، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۱ء میں ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے

عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اسی سال انجمن ترقیٔ اُردو نے اسے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا چناں چہ بقول سید ہاشمی فرید آبادی اس تبصرے کو نسخۂ حمیدیہ میں شامل کرنا غیر ضروری، بلکہ کسی قدر ناموزوں ہوا۔" ۱۴ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے اسے اپنے طور پر شامل کیا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ میں اس تبصرے کا کوئی عنوان نہیں ہے اور یہ تبصرہ اس مقطع پر ختم ہو جاتا ہے:

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جبکہ "محاسنِ کلامِ غالبؔ" میں اس کے بعد نو صفحات اور ہیں، مزید یہ کہ نسخۂ حمیدیہ میں مسئلہ وحدت الوجود پر ڈاکٹر بجنوری کے خیالات سے شدید اختلاف ظاہر کرتے ہوئے مفتی محمد انوار الحق نے ایک اتنا طویل حاشیہ لکھا ہے کہ وہ اس موضوع پر اچھے خاصے جوابی مضمون کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ حاشیہ نسخۂ حمیدیہ طبع اوّل کے صفحہ ۸۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۸ پر تمام ہوتا ہے۔

بعض شواہد سے اس دیوان کی طباعت و اشاعت کے مراحل میں بھی کچھ پیچیدگیوں کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً اس کے ایک ہی ایڈیشن کے تین سرورق ملتے ہیں۔ دو سرورق مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سرورق میں جسے پہلا سرورق سمجھنا چاہیے، دیوان کے نام کے بعد صرف:

"بہ تدوین
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے منشی فاضل
ڈائریکٹر سر رشتۂ تعلیم، بھوپال"

لکھا ہوا ہے۔ مقدمہ دیوان اور ڈاکٹر بجنوری کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ مطبع کے اندراج میں "اسٹیم" کے اوپر خفی قلم سے ۱۹۲۱ء درج ہے۔ اس سطر کے نیچے داہنی طرف "قیمت مجلد ہے" بائیں طرف "قیمت غیر مجلد عام" اور درمیان میں "منتظر امرو ہوی کتابت نمود" لکھا ہوا ہے، لیکن مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے دوسرے سرورق میں دیوان کے نام کے نیچے:

"مع مقدمہ دیوان فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بی اے

ایل ایل بی، بیرسٹرایٹ لاء، ڈی جے'' کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد:

''مرتبہ خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے منشی فاضل ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست بھوپال'' لکھا گیا ہے۔ مطبع کے اندراج میں ۱۹۲۱ء ندارد ہے اور مجلد کی قیمت پانچ روپے اور غیر مجلد کی چار روپے ہوگئی ہے۔ 15

تیسرے سرورق میں ''مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا'' کے بجائے ''صرف ٹائیٹل گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا'' درج ہے اور کاتب کا نام نصیر الدین لکھا ہے۔ دیگر اندراجات مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے مطابق ہیں۔ یہ سرورق تو محض سرورق کم پڑ جانے کی بناء پر بھوپال سے چھپوالیا گیا ہوگا، لیکن مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے چھپوانے کا سبب قیمت کے تغیر کے علاوہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سرورق میں ڈاکٹر بجنوری سے متعلق اندراج نہ تھا جس کا ہونا بعد میں ضروری سمجھا گیا۔ 16 سوءِ اتفاق کہ اس ردوبدل میں دیوان کی تاریخِ طباعت نہیں برقرار رکھی گئی اور چوں کہ کسی دوسری جگہ بھی اس کا ذکر نہ تھا اس لیے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ نسخۂ حمیدیہ کی اکثر جلدوں سے اس کی تاریخ طباعت کا پتا چلنا ناممکن ہوگیا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس نسخے کی تمام جلدیں مفید عام پریس آگرہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خفیف تغیر وتبدل کا عمل متن کی طباعت میں بھی جاری رکھا گیا ہے اور اس طرح ایک ہی ایڈیشن کی جلدوں میں کہیں کہیں معمولی سا فرق ہوگیا ہے۔ اس کی دو پیشِ نظر جلدیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک جلد میں صفحہ ۱۹۱ر پر آخری مصرع کے داہنی طرف ''مطبوعہ'' لکھا ہوا ہے لیکن دوسری جلد میں یہ اندراج غائب ہے۔ اس صفحے کی بعض خطوط کی کشش میں بھی دونوں جلدوں میں فرق ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۹۲ر کے حاشیے کی عبارت میں بھی دونوں جلدوں میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ اگرچہ یہ تغیرات معمولی ہیں اور شاید بہت کم کیے گئے ہیں لیکن کسی تحقیقی کتاب میں بغیر اظہار کے اس طرح کی تبدیلیاں سخت غلط فہمی کا باعث ہوسکتی ہیں کیوں کہ کوئی محقق کسی مطبوعہ کتاب کے تمام نسخوں کا جائزہ نہیں لے سکتا۔

تصویروں کی اشاعت میں بھی نسخۂ حمیدیہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ مفتی محمد

انوار الحق نے ڈاکٹر بجنوری پر اپنے مضمون میں شکایتاً لکھا ہے کہ ''مرحوم کی ایک تصویر جس کو اس کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ تھا وہ بھی مجھ سے لے لی گئی اور اسی سبب سے اس دیوان کو تصاویر سے مزین کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔لیکن دراصل اس دیوان میں ڈاکٹر بجنوری، غالب اور نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کی تصویریں شائع کی گئیں۔ ۱۷ اس کے باوجود مفتی محمد انوار الحق نے نہ تو اس سلسلے میں اپنے بیان پر نظر ثانی کی اور نہ کسی اور طرح تصویروں کی شمولیت کا اظہار کیا۔اب اگر کسی کو اس دیوان کا کوئی ایسا نسخہ ملے جس میں سے تصویریں غائب کر دی گئی ہیں اور آج کل عموماً اس کے ایسے ہی نسخے دیکھنے میں آتے ہیں تو مرتب کے بیان کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ اس دیوان میں تصویریں سرے سے شامل ہی نہیں کی گئیں بلکہ اس کو اس پر تاسف بھی ہوگا کہ مرتب کو ڈاکٹر بجنوری کی تصویر سے محروم رکھا گیا، حالاں کہ یہ باتیں خلافِ واقعہ ہوں گی۔حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیاں نسخۂ حمیدیہ کے ہر متجسس قاری کو بڑی اُلجھن میں ڈالتی ہیں اور اس کے لیے معاملات کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں رہتا۔''

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے اس تحقیقی جائزے کے علاوہ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں بعض نسبتاً پہلے کے جائزوں میں قاضی عبدالودود، ۱۸ مولانا امتیاز علی عرشی ۱۹ اور شیخ محمد اکرام ۲۰ کی تحریریں اہم ہیں۔

☆ دیوانِ غالب جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) طبع اوّل (۱۹۲۱ء) ۸/۳۰x۲۰ سائز پر شائع ہوا تھا۔مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، بھوپال سے ۱۹۸۲ء میں اس کی ایک عکسی اشاعت Reduce کر کے ۳۶ x ۲۳ / ۱۶ سائز پر عمل میں آئی ہے (صفحات ۴۸۸)۔نسخۂ حمیدیہ (۱۹۲۱ء) کے بیک وقت تین سرورق پائے جاتے ہیں۔زیرِ نظر اشاعت کے شروع میں تینوں قسم کے سرورق کے عکس دیے گئے ہیں:

''دیوانِ غالب،نسخۂ حمیدیہ

مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں''

نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق کے زیرِ اہتمام بھوپال سے شائع ہوا''مفتی انوار الحق کا نسخہ شائع ہوا تو یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مطبوعہ نسخہ، قلمی نسخہ کی نقل نہیں ہے۔اس بارے میں شاید سب

سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے نسخے کئی جگہ حاشیے کے اندراجات اور متن کے درمیان ضروری امتیاز قائم نہیں رہ سکا۔'' چناں چہ صحیح صورتِ حال کی دریافت کے لیے پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور) نے دیوانِ غالب کے اصل نسخے کا معائنہ ضروری خیال کیا۔ اواخر اگست ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک سفر سے لاہور واپس آتے ہوئے حمید احمد خاں نے بھوپال میں قیام کیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کے مقابلے کا ذمہ دارانہ کام انجام دیا۔ اس موقع پر انھیں اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ نہ رہنے سے قطع نظر، مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حمید احمد خاں نے یہ لازم کیا کہ وہ اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھیں:

۱۔ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب معیّن کی جائے۔

۲۔ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان جہاں جہاں اختلاف ہے، اس کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لی جائیں۔

۱۹۲۱ء کا نسخۂ حمیدیہ، بھوپال کے قلمی دیوان کی پہلی مطبوعہ نقل ہے۔ حمید احمد خاں کا بیان ہے کہ:

''قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصور میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہیں، بجز اس ایک صورت کے کہ قلمی دیوان کا شاید کوئی شعر مطبوعہ نسخے سے حذف نہیں ہوا ہے۔'' ۲۱

ترتیب منظومات کی تصحیح اور حواشی کی تنقیح کرتے ہوئے جابجا مطبوعہ نسخے کے مطابق لفظی فروگزاشتیں بھی حمید احمد خاں کی نظر سے نہ بچ سکیں۔

نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں جس بیش بہا مخطوطے سے شائع ہوا تھا، وہ اب محفوظ نہیں رہا۔ ۲۲

اس پس منظر میں کہ نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ غائب ہوگیا ہے، پروفیسر حمید احمد خاں کی وہ تحریری یادداشتیں جو تیس بتیس برس پہلے محض ذاتی حوالے کے لیے نسخۂ حمیدیہ کی اصل اور مطبوعہ کے تقابلی مطالعہ سے تیار کی گئی تھیں اور خوبیٔ قسمت سے اب تک ان کے پاس محفوظ بھی چلی آرہی تھیں، ایک مشترک قومی تہذیبی میراث کی حیثیت اختیار کرگئیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کے ذہنی وفکری

ارتقاء کے اس اہم ذاتی ذخیرۂ معلومات میں سب کو شریک کر لینے کے لیے اپنی ان قیمتی یادداشتوں کی بناپر نسخۂ حمیدیہ کے ایک صحیح اور مطابق اصل متن کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام کیا۔ ۲۳

غالبؔ کی وفات کے پچاس برس بعد محض بھوپال میں دستیاب ہونے کی رعایت سے یہ نسخہ بھوپال کے نواب زادہ حمیداللہ خاں سے منسوب ہو کر نسخۂ حمیدیہ کہلایا......نسخۂ حمیدیہ کی اس اوّلین ناقص اشاعت کے کوئی پچاس برس بعد ایک دوسرے ''حمید خاں'' کے ہاتھوں، جو اس نسخہ کے حق میں واقعی مسیحا نفس ثابت ہوئے، اسے پہلی بار حسن و صحت کے ساتھ چھپنا نصیب ہوا ......اس نسبت سے اس نسخے کی عرفیت اب زیادہ متعلق، حسبِ حال اور معنویت کی حامل ہوگئی ہے۔ ۲۴

حوالہ وحواشی:

۱۔ طبع اوّل: مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ، ۱۹۲۱...... مرتبہ: مفتی محمد انوار الحق
ضخامت: ۱۳۹+۳۴۲ صفحات، سائز: ۲۲×۲۹/۸......سرنامہ از: محمد حمیداللہ خاں، ص ا۔
تمہید: مفتی محمد انوار الحق، صفحہ ۳۔۲۴......تذکرہ ''عبدالرحمٰن مرحوم'': مفتی محمد انوار الحق، ۲۵۔۳۱۔
مقدمہ: عبدالرحمٰن بجنوری، ص ۳۳۔۱۳۹......دیوانِ غالب جدید (متن): ۱۔۳۴۲

۲۔ مطابق ۳۱، اکتوبر ۱۸۲۱ء۔

۳۔ نسخۂ حمیدیہ، طبع اول، ص ۵/۶۔
مفتی محمد انوار الحق کی اس عبارت کی روشنی میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو چکا تھا بلکہ ان کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔ دیکھیے: نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۱ء، ص ۸۔

۴۔ نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۳، ص ۱۵۹۔

۵۔ نسخۂ حمیدیہ، تمہید از مفتی انوار الحق، ص ۳۔

۶۔ نسخۂ حمیدیہ، طبع اوّل، ص ۲۵۔

۷۔ مفتی محمد انوار الحق، نسخۂ حمیدیہ، طبعِ اوّل، آگرہ، ۱۹۲۱ء، ص ۲۸۔

۸۔ عکسِ تحریر مطبوعہ ''محاسنِ کلامِ غالبؔ''، طبع پنجم، انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ، اپریل، ۱۹۵۸ء۔

۹۔ اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۳۔۷۰۴۔

۱۰۔ اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر، ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔

۱۱۔ '' ۱۹۱۸ء کے وبائی انفلوائنزا میں پہلے ڈاکٹر بجنوری کی بیگم کا انتقال ہوا، چند روز بعد ۷، نومبر ۱۹۱۸ء کو وہ خود بھی عین عالمِ شباب میں رہ گزرِ عالمِ بقا ہو گئے۔''

(مولانا غلام رسول مہر، سہ ماہی اقبال، لاہور، اپریل، ۱۹۶۹ء، ص ۶۰)

۱۲۔ اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر، ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔۷۰۵۔

۱۳۔ پروفیسر سید احتشام حسین کے پاس نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد تھی جو غالباً محمد احتشام الدین دہلوی کے پاس رہ چکی ہے۔ اس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے آخر میں محمد احتشام الدین دہلوی نے ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا ہے کہ ''یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالبؔ کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلامِ غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ مقدمہ اس ارادے کی پیروی میں لکھا گیا اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا ان کے پاس موجود تھا اور اُنھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔'' دیکھیے پروفیسر سید احتشام حسین کا مراسلہ مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۶۱ء

۱۴۔ اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۵۔

۱۵۔ اس دوسرے سرورق کے حامل نسخۂ حمیدیہ کے دو مطبوعہ نسخے راقم الحروف کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہیں اس فرق کے ساتھ کہ ایک سرورق سفید رنگ کے چکنے کاغذ پر چھپا ہوا ہے اور دوسرا فیروزی رنگ کے نسبتاً دبیز کاغذ پر طبع ہوا ہے۔

۱۶۔ نسخۂ عرشی طبع اوّل کے دیباچے میں عرشی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کی تقریبی تاریخ ۱۹۲۸ء لکھی ہے (ص ۱۱۶) لیکن اس کے بعد انھیں آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۲۱ء کے سرورق والا نسخہ مل گیا جس کا ذکر انھوں نے اپنے مراسلے مطبوعہ ''ہماری زبان'' علی گڑھ، ۸، اگست ۱۹۶۱ء میں کیا ہے تاہم چوں کہ انھوں نے اس کو نظرانداز کر دیا کہ اس سرورق پر ڈاکٹر بجنوری کا نام نہیں ہے۔ اس لیے دوسرا سرورق چھپوانے کے اس سبب کی طرف بھی اُن کا خیال نہیں گیا۔

۱۷۔ میرے کتاب خانے میں موجود نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ میں بجنوری مرحوم کی تصویر ''تمہید'' کے خاتمے کے بعد صفحہ ۲۴ اور ۲۵ کے مابین، غالب کی تصویر بجنوری کے مقدمے ص ۳۳ کے مقابل اور قلمی نسخے کے ایک صفحے کا عکس ''دیوانِ غالب جدید'' کے متن سے پہلے شامل ہے۔

۱۸۔ دیوانِ غالب کے دو نسخے، معاصر، پٹنہ، حصہ ۱۲، ص ۱۔۴۷۔

۱۹۔ دیباچہ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۷۵۔۷۸۔

۲۰۔ ارمغانِ غالب، ص ۶ و بہ بعد۔

۲۱۔ دیباچہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۲۔

۲۲۔ اس سلسلے کی معلومات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر گیان چند کا مضمون ''غالب اور بھوپال'' مطبوعہ اُردوئے معلّٰی، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۹۲ تا ۹۴۔

۲۳۔ مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، دیباچہ مرتب ۲۹ صفحات، متن ۲۹ صفحات، طبع دوم لاہور، ۱۹۸۳ء۔

(''غالب کا علمی سرمایہ''۔ یونیورسل بکس، لاہور۔ فروری ۱۹۸۹ء۔ ص ۸۴ تا ۹۹)

•••

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالبؔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کی روشنی میں

''نسخۂ حمیدیہ'' سے مراد غالبؔ کے اُردو دیوان کا وہ قدیم ترین نسخہ ہے جسے خود غالب نے بہ عمر ۲۴ سال ردیف وار مرتب کیا تھا اور جس میں حذف و اضافہ کے بعد ان کا منتخب کلام موجودہ اردو دیوان کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ موجودہ دیوان ان کی زندگی میں بھی:

پہلی بار ۱۸۴۱ء/ ۱۲۵۷ھ میں مطبع سید الاخبار، دہلی سے۔

دوسری بار ۱۸۴۷ء/ ۱۲۶۳ھ میں مطبع دار السلام حوض قاضی، دہلی سے۔

تیسری بار ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۸ھ میں مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی سے۔

چوتھی بار ۱۸۶۲ء/ ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی، بدایوں سے۔

پانچویں بار ۱۸۶۳ء/ ۱۲۷۹ھ میں مطبع مفید خلائق، آگرہ سے۔

چھپ چکا تھا۔ [1] مرزا نوشہ کی وفات کے بعد بھی ان کے مروجہ دیوان کے اچھے برے درجنوں ایڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے لیکن ان کا سب کا ماخذ اور تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم ان کا وہ اردو دیوان ہے جو ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع ہوا۔

یہ وہی قدیم ترین اُردو دیوان ہے جسے خود غالبؔ نے ابتداً ردیف وار مرتب کیا تھا۔ بعد کو اس میں ترمیم، تنسیخ اور اضافے سے کام لے کر صرف منتخب کلام کو اردو دیوان کے نام سے شائع کیا۔ ہر چند کہ بعض تحریروں سے یہ پتا تو چلتا تھا کہ غالبؔ کا موجودہ اردو دیوان ان کے کسی ایسے

مجموعۂ کلام کا انتخاب ہے جس کا بہت سا حصہ انھوں نے قلم زد کر دیا ہے۔ مثلاً خود غالبؔ نے مروجہ اردو دیوان کے دیباچے میں لکھ دیا تھا:

''امید کہ سخن سرایان سخنور ستائی پراگندہ ابیاتے را کہ خارج ازیں اوراق یا بند از آثار تراوش رگ کلک ایں نامہ سیاہ نشناسد و جامہ گرد آور را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔''

اسی طرح ایک خط میں مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے کہ:

''قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چناں چہ ایک غزل کا مقطع تھا:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسدؔ اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ ۱۰ برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا، آخر تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔'' ۲

بعض قدیم تذکروں سے بھی ان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اپنے تذکرۂ گلشن بے خار مؤلفہ ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ میں غالبؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگر نگریست، فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قلیلے انتخاب زدہ۔'' ۳

اس کے بعد مولانا آزاد نے ''آبِ حیات'' مؤلفہ ۱۸۸۰ء میں قدرے صراحت سے خبر دی تھی کہ:

''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا، یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی

اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ شعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہوسکتا ہے، انھوں نے کہا خیر ہوا، سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔'' ؎

مولانا حالی کے بیان سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ غالبؔ کا مروجہ دیوان، کسی ضخیم مجموعۂ کلام سے اخذ و انتخاب کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ چناں چہ وہ ''یادگار غالبؔ'' مصنفہ ۱۸۹۷ء/۱۳۱۵ھ میں غالبؔ کی بے دلانہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

کرے گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں زقالب ہا

☆

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن
بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

☆

بہ حسرت گاہ تازہ کشتۂ جاں بخشی خوباں
خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا

☆

رکھا غفلت سے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

☆

پریشانی سے مغز سر ہوائے پنبۂ بالش
خیالِ شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا

☆

موسم گل میں مئے گلگوں حلالِ میکشاں
عقد وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا
ساتھ جنبش کے بہ یک برخاستن طے ہوگیا
گوئیا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

...... یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں، جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں۔'' ۵

مولانا حالیؔ نے الف کی ردیف کی جو سات بیتیں اوپر درج کی ہیں، ان کے متعلق یہ سراغ نہیں دیا کہ وہ غالبؔ کے کس مجموعۂ کلام سے حاصل کی گئی ہیں۔ لیکن یہ سب نسخۂ حمیدیہ میں الف کی ردیف میں ایسی غزلوں کے ذیل میں موجود ہیں، جن کا ایک شعر بھی غالبؔ کے مروجہ دیوان میں نہیں ہے۔ گویا یہ بیتیں اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' یا اس کا کوئی اور نسخہ مولانا حالیؔ کی نظر سے ضرور گزرا تھا۔ پھر بھی ایک مدت تک غالبؔ کے اس ابتدائی نسخے کا سراغ نہ لگ سکا۔ آخر کار کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا۔ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب کا خیال ہے کہ یہ مسودہ رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں۔ اس قلمی نسخے کے اصل متن اور حاشیہ دونوں میں جگہ جگہ غالبؔ کے ہاتھ کی اصلاحیں، ترمیمیں اور اضافے موجود ہیں۔ کاتب کا نام حافظ معین الدین اور تاریخ کتابت پانچویں صفر ۱۲۳۷ھ ہے۔ غالبؔ کی تاریخ پیدائش ۸، رجب ۱۲۱۲ھ ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ۲۴ سال کی عمر میں یا اس سے پہلے اپنا اردو کلام ردیف وار مکمل و مرتب کرلیا تھا۔ مداحین غالبؔ کی خوش قسمتی سے مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات ریاست بھوپال نے اس قدیم ترین نسخے کو خاصے اہتمام او قرینے سے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے اس معرکہ آراء مقدمے کے ساتھ جو ''محاسن کلام غالبؔ'' کے نام سے کتابی صورت میں الگ بھی کئی بار شائع ہوچکا ہے اور جس کے ان ابتدائی فقروں نے

غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے کہ:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالبؔ۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ، موجود نہیں ہے۔''

۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے ابتدائی چوبیس صفحات میں مفتی انوار الحق نے نسخے کی خصوصیات اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پچیس تا اکتیس صفحات ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے تعارف کے لیے مخصوص ہیں اور تینتیس تا ایک سو اکتالیس صفحات میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مذکورہ بالا مقدمہ پھیلا ہوا ہے۔ بعد ازاں اصل دیوان ردیف وار شروع ہوتا ہے اور تین سو بیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ترتیب میں بہ قول مؤلف یہ اصول برتا گیا ہے کہ:

''ہر ایک ردیف میں پہلے دونوں دیوانوں (قلمی اور مروجہ) کی ہم طرح غزلوں کو لکھا ہے اور ان میں اول اول قلمی نسخے کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں، ان کے سامنے ''م'' لکھ دیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ ابتداً یہ غزل اس طرح کہی گئی تھی اور اس میں فلاں فلاں اشعار (جن کے سامنے ''م'' لکھا ہوا ہے) مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد اس طرح کے جو شعر قلمی دیوان کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کہے گئے ہیں اور اب مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں، ان کو لکھ دیا ہے تاکہ پوری غزل پیش ہو جائے۔ مشترک شعر جو قلمی نسخے میں اوپر درج ہو چکے ہیں اور جن کو ''م'' کے اشارے سے ممتاز کر دیا ہے، ان کو اب دوبارہ مروجہ دیوان کے بقیہ شعروں کے ساتھ لکھنا غیر ضروری تھا۔ بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ شعر تو دیوانوں میں موجود ہیں لیکن جہاں کسی مصرعے میں کوئی خفیف سی لفظی تبدیلی ہوئی ہے وہاں ان مصرعوں کو اوپر نیچے لکھ کر سامنے ایک قوس بنا کر دوسرا مصرع لکھ دیا ہے۔ اور یہ التزام رکھا ہے کہ ہر جگہ جو مصرع اوپر لکھا ہے وہ قلمی نسخے کا ہے اور جو اس کے نیچے لکھا ہے وہ مروجہ دیوان کا۔ ہم طرح غزلوں کے بعد اس ردیف کے قلمی نسخے کی وہ غزلیں لکھ

دی گئی ہیں جو بالکل نئی ہیں۔ یعنی جن کا کوئی شعر بھی مروجہ دیوان میں موجود نہیں اور پھر ان کے بعد مروجہ دیوان کی وہ غزلیں درج کی گئی ہیں جو ۱۲۳۷ھ کے بعد بڑھائی گئی ہیں اور جن کا کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ یوں ہر ایک ردیف کے کل شعر ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں جن میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں غالبؔ کے دیوان کی کیا شان تھی اور بعد میں کیا ہو گئی۔ ؁

نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ بھوپال بھی اب نایاب ہے اور کسی کسی کے پاس دیکھنے کو ملتا ہے۔ راقم الحروف کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے، اور زیر نظر مضمون کی ترتیب کے وقت یہی سامنے ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت بعض گوشوں سے یہ اعتراض اٹھایا گیا تھا کہ جب غالبؔ نے خود ہی اپنی بعض غزلوں اور بعض شعروں کو نظری قرار دے دیا تھا اور منتخب کلام کو طبع کرا کر دیباچے میں یہ گزارش بھی کر دی تھی کہ جو اشعار میں نے دیوان سے خارج کر دیے ہیں ان کے حسن و قبح کو مجھ سے منسوب نہ کیا جائے تو پھر آخر ان کے اس مجموعہ کلام کو کیوں شائع کیا گیا۔ اعتراض کرنے والوں کو شاید یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ اس طرح غالبؔ کا بہت سا مہمل کلام سامنے آئے گا اور اس سے ان کی شہرت و مقبولیت کو نقصان پہنچے گا، لیکن یہ اندیشہ درست نہ تھا۔ اول اس لیے کہ غالبؔ کی شخصیت اور فن کی کوئی خامی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ خود غالبؔ نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ اپنی کمزوریوں کو واشگاف بیان کر دیا ہے، دوسرے یہ کہ کسی کی کمزوریاں سامنے آ جانے سے اس کی وقعت کم نہیں ہو جاتی، بلکہ جس طرح رات کے اندھیرے میں چاند کی مدھم روشنی، دن میں سورج کی تیز روشنی کے مقابلے میں زیادہ دلکش و نظر گیر بن جاتی ہے، بالکل اسی طرح جب کسی عظیم شخصیت کے سامنے اس کی کمزوریاں رکھی جاتی ہیں تو اس کی عظمت کچھ اور نکھر جاتی ہے۔ غالبؔ کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے ان کے رتبۂ شعری پر کوئی حرف نہیں آیا بلکہ اس کے ذریعے ان کی مقبولیت و شہرت کے امکانات کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔

''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ غالبؔ کے فکر و فن دونوں کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہو گئی۔ اگر آج نسخۂ حمیدیہ ہمارے سامنے نہ ہوتا تو ہمیں

اس بات کی خبر تک نہ ہوتی کہ غالبؔ کا وہ ''اردو کلام'' جس کے سبب وہ دنیائے شاعری کے نابغوں میں شمار کیے جاتے ہیں، صرف چوبیس سال کی عمر میں دیوان کی صورت میں مرتب ہو چکا تھا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ غالبؔ کے بعض ایسے دعوؤں اور بیانات کی تصدیق ہوگئی جنھیں کسی خارجی شہادت کی عدم موجودگی میں غلط سمجھا جاتا تھا یا شبہے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک خط میں تفتہؔ کو لکھا تھا:

''ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے، میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔'' ۷

بیان لفظاً نہ سہی معناً بالکل صحیح ہے۔ مروجہ دیوان تو خیر ان کا منتخب دیوان ہے۔ اس لیے خیال گزر سکتا ہے کہ ابتدائی مسودے میں طویل طویل غزلیں رہی ہوں گی جنھیں منتخب دیوان میں مختصر کر دیا گیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی لمبی غزلیں نہیں ہیں اور صاف پتا چلتا ہے انھیں کسی کی غزل پر کہنے یا کسی زمین کے سارے قافیوں کو نظم کرنے کی عادت نہیں ہے۔ حالاں کہ اردو میں اس قسم کی قافیہ پیمائی کا رواج عام تھا اور بڑے سے بڑے غزل گو شاعر کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ غالبؔ اس کی روش عام سے مستثنیٰ ہیں۔ انھیں شروع ہی سے قافیہ بندی سے نفرت تھی۔ چناں چہ انھوں نے جو کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے تو سمجھ بوجھ کر کہا تھا اور ایک خط میں جو یہ لکھا تھا کہ:

''تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بچپن میں جب میں ریختہ کہنے لگا ہوں، لعنت ہے، مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ کہنے لگا۔ ۸

بے سبب نہیں لکھا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ کا وہ سارا کلام جو ۱۲۳۷ھ یا اس سے پہلے کا ہے کسی استاد کی بحر یا زمین کے تتبع سے پاک ہے۔ تقریباً ساری غزلیں طبع زاد زمینوں میں ہیں اور مرزا کی غیر معمولی قوتِ متخیلہ اور جولانیِ طبع کا پتا دیتی ہیں۔

اسی طرح اپنے طرز سخن گوئی کے متعلق غالبؔ نے عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدلؔ اور اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چناں چہ ایک غزل کا مقطع تھا:

طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسدؔ اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیال لکھا کیا، دس برس میں دیوان جمع ہو گیا، آخر جب تمیز آئی، اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔'' ۹

ہر چند کہ ان کے اس بیان کا ثبوت ان کے مروجہ دیوان کے بعض اشعار سے مل جاتا ہے لیکن چوں کہ اس کا زیادہ حصہ بیدلؔ کے رنگ سے پاک ہے اس لیے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا یہ قول کس حد تک درست ہے اور وہ بیدلؔ کے فیضان کے کہاں تک معترف ہیں، لیکن ''نسخہ حمیدیہ'' نے ان کی بیدلؔ پرستی کا واضح ثبوت بہم پہنچا دیا۔ اس لیے کہ اس میں بہت سے ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں بیدلؔ کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کیا گیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز بر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

☆

مجھے راہِ سخن میں خوف گم راہی نہیں غالبؔ
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

☆

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ماہیچ

☆

دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بے نوائے دل
یاں سنگ آستانہ بیدلؔ ہے آئینہ

☆

اسدؔ قربان لطف جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے

☆

ہے خامہ فیض بیعت بیدلؔ بکف اسدؔ
یک نیستاں قلم روِ اعجاز ہے مجھے

☆

گر ملے حضرتِ بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ آئینہ پرداز معانی مانگے

رہا یہ سوال کہ بیدلؔ کے تتبع میں غالبؔ کے مضامین خیالی کا کیا رنگ تھا، وہ انھیں کس انداز خاص سے باندھتے تھے، اس کا صحیح اندازہ فی الواقع نسخۂ حمیدیہ کے مطالعے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ غالبؔ کے مروجہ دیوان میں جو چند اشعار بیدلؔ کے رنگ میں مضامینِ خیالی کی صورت میں ملتے ہیں، ان سے اصل کیفیت کا اندازہ نہیں ہوتا...... اس کیفیت کو اصل رنگ روپ میں دیکھنے کے لیے نسخۂ حمیدیہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہم اس سلسلے میں ان کے دیوان کی صرف پہلی دو غزلیں اس جگہ بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ موجودہ دیوانِ غالبؔ کی پہلی غزل حسب ذیل صورت میں ملتی ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی، نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

لیکن اس غزل کی ابتدائی صورت نسخۂ حمیدیہ کے ذریعے اس طور پر سامنے آتی ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
آتشیں پا ہوں، گدازِ وحشت زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
شوخیِ نیرنگ صید وحشتِ طاؤس ہے
دام سبزہ میں ہے پروازِ چمن تسخیر کا
لذتِ ایجاد ناز افسونِ عرضِ ذوق قتل
نعلِ آتش میں ہے، تیغ یار سے نخچیر کا
کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
خشت پشتِ دست عجز و قلب آغوشِ وداع
پر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
وحشتِ خواب عدم شور تماشا ہے اسدؔ
جو مزہ جوہر نہیں تعبیر کا

جب غالبؔ نے اپنے اس بیدلانہ رنگ سخن پر نظر ثانی کی اور منتخب دیوان شائع کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے اس غزل کے صرف دو شعر نمبر ۱، ۲ رہنے دیے باقی قلم زد کر دیے، مقطعے میں

اسدؔ کی جگہ غالبؔ کر دیا اور دوسرے شعر کے پہلے مصرع:

آتشیں پا ہوں گداز وحشت زنداں نہ پوچھ

کو تازہ مصرع:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا

سے بدل کر مقطع بنالیا۔ پانچ شعر یکسر خارج کر دیے اور دو شعر تازہ شامل کر کے اسے سات کے بجائے پانچ شعروں کی مختصر غزل بنالی۔ یہی غزل مروجہ دیوان کے ذریعے ہمارے سامنے آئی۔

اسی طرح مروجہ دیوان میں دوسری غزل کا صرف ایک شعر:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ! غم خوارِ جان درد مند آیا

موجود ہے، لیکن جیسا کہ نسخۂ حمیدیہ سے ظاہر ہے، یہ غزل ابتدا حسب ذیل صورت میں چھ اشعار کی تھی:

جنوں گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا
سویدا تا بہ لب زنجیریِ دودِ سپند آیا
مہِ اختر فشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے
تماشا کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا
تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی سے
نگاہِ بے حجاب ناز کو بیم گزند آیا
فضائے خندۂ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوشِ وداع دل پسند آیا
عدم ہے خیر خواہ جلوہ کوہ زندانِ بے تابی
خرام ناز برق خرمن سعی پسند آیا
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں نادیدنی دعوت
مبارک باد اسدؔ! غم خوار جان درد مند آیا

اس کے پانچ اشعار یکسر قلم زد کر دیے۔ صرف مقطع باقی رکھا لیکن پہلے مصرعے کے آخری ٹکڑے نادیدنی دعوت کو داغِ جگر ہدیہ سے بدل دیا گیا۔

غزل کے پورے پورے اشعار حذف کرنے کے ساتھ جیسا کہ اوپر کی دو غزلوں میں بھی اس کی مثالیں نظر سے گزر چکی ہیں، غالبؔ نے نسخۂ حمیدیہ میں جگہ جگہ شعروں اور مصرعوں میں تبدیلیاں کی ہیں۔ کہیں پورا مصرع بدل دیا ہے کہیں مصرعے کا ایک ٹکڑا اور کہیں صرف ایک آدھ لفظ۔ یہ تبدیلیاں شعر کے حسنِ ظاہری و معنوی، دونوں پر اثر انداز ہوئی ہیں اور اس کا پتا دیتی ہیں کہ ان کا تنقیدی شعور، شعر کو خوب سے خوب تر بنانے میں کس طرح لگا رہتا تھا۔ بطور مثال نسخۂ حمیدیہ اور مروجہ دیوان کے چند مشترک اشعار اس جگہ ایک دوسرے کے مقابل درج کیے جاتے ہیں۔ یہ صرف الف کی ردیف سے لیے گئے ہیں۔ ان سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ لفظی تبدیلیاں کس نوعیت کی ہیں اور شعر پر ان کا کیا اثر پڑا ہے:

(۱)

حجابِ سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بہ خوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(نسخۂ حمیدیہ)

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(مروجہ دیوان)

(۲)

جز قیس اور کو نہ ملا عرصۂ طپش
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

(نسخۂ حمیدیہ)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

(مروجہ دیوان)

(۳)

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
مژگاں جو وا ہوئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

(نسخۂ حمیدیہ)

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

(مروجہ دیوان)

(۴)

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(نسخۂ حمیدیہ)

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(مروجہ دیوان)

(۵)

عشرت ایجاد چہ بوئے گل وکو دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(نسخۂ حمیدیہ)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(مروجہ دیوان)

(۶)

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوارئ شوق
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

(نسخۂ حمیدیہ)

ہے نو آموزِ فنا، ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

(مروجہ دیوان)

(۷)

مرگیا صدمۂ آواز سے قُم کی غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(نسخۂ حمیدیہ)

مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(مروجہ دیوان)

(۸)

غمِ فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

(نسخۂ حمیدیہ)

غم فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

(مروجہ دیوان)

(۹)

لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

(نسخۂ حمیدیہ)

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

(مروجہ دیوان)

(۱۰)

اف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

(نسخۂ حمیدیہ)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

(مروجہ دیوان)

(۱۱)

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل کے پردے میں جگر یاد آیا

(نسخۂ حمیدیہ)

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

(مروجہ دیوان)

اصلاح، ترمیم اور تنسیخ کا یہ عمل سارے نسخۂ حمیدیہ میں نظر آتا ہے۔ بعض ردیف مثلاً الف، د، ل اور ی وغیرہ کی متعدد پوری پوری غزلیں محذوف کر دی گئی ہیں۔ ث، ح، غ، کی ردیف میں علی الترتیب ۲، ۱، اور ۲ غزلیں تھیں۔ یہ سب قلم زد کر دی گئی ہیں اور مطبوعہ دیوان میں ان ردیف کے تحت کوئی غزل نہیں ہے۔ گویا غالبؔ نے رنگ بیدلؔ کے تتبع میں جو کچھ کہا تھا اس کا زیادہ حصہ نظری قرار دے دیا حالاں کہ کسی شاعر کے لیے اپنے اشعار کا اس طرح قلم زد کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ مولانا حالیؔ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جان کاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا

ہوگا۔" ١٠

جن لوگوں کی نظر سے نسخۂ حمیدیہ گزرا ہے اور جنھوں نے غالبؔ کے قلم زد اشعار اور غزلوں پر نظر ڈالی ہے وہ مولانا حالیؔ کے اس خیال کی بھی تائید کریں گے کہ:

"مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنلٹی (Originality) اور غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت واستعداد پر شہادت دیتی ہیں۔" ١١

لیکن نسخۂ حمیدیہ میں غالبؔ کی تراش خراش اور عملِ تنسیخ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے مروجہ دیوان میں اصل نسخے سے کچھ لیا ہی نہیں یا صرف چند اشعار لیے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے اس میں سے ایک چوتھائی یعنی ساڑھے چار سو سے کچھ زائد اشعار منتخب کیے ہیں۔ یہ ساڑھے چار سو اشعار ٢٤ سال یا اس سے بھی کم عمر میں کہے گئے ہیں اور غالبؔ کے مروجہ دیوان میں عطرِ خیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے مروجہ دیوان میں اکثر مقبولِ عام غزلیں اور طبع زاد زمینیں وہی ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی موجود ہیں۔ پوری غزلوں کے علاوہ بہت سے ایسے اشعار جو زبان زدِ خلائق ہیں اور جن کا تعلق آج ان کے مروجہ دیوان سے ہے وہ بھی نسخۂ حمیدیہ ہی سے منتخب کیے گئے ہیں، یعنی ١٢٣٧ھ سے قبل کی تخلیقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ بطور مثال چند اشعار دیکھیے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

☆

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

☆

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

سادگی و پُر کاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا

عشق سے، طبیعت نے، زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

☆

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

ہے نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام آساں نکلا

☆

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

☆

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

☆

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ انداز استغنائے حسن
دستِ مرہون حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

☆

آئینہ دیکھ، اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

☆

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

☆

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

☆

فرصتِ کار و بارِ عشق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہوں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

☆

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

☆

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا، یہ سازِ ہستی ایک دن

☆

ترے سروقامت کو اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

☆

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

☆

دیوار بارِ منت مزدور سے، ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھایئے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھایئے

☆

رندانِ در مے کدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

☆

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

☆

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے، بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

☆

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے، جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

☆

ہے ہے، خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

☆

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

☆

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

☆

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

☆

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

☆

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار چوں کہ غالبؔ کے مروجہ دیوان اور نسخۂ حمیدیہ دونوں میں موجود ہیں، اس لیے صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق کے وقت غالبؔ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۴ سال رہی ہوگی اور یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ صرف اردو کے نہیں بلکہ دنیا کے نابغہ شاعروں میں سے ایک ہیں۔

لیکن یہ خیال کرنا کہ غالبؔ نے جو ساڑھے چار سو اشعار نسخۂ حمیدیہ سے اپنے مروجہ دیوان کے لیے منتخب کیے تھے اور جس کا ایک نمونہ ہم نے اوپر درج کیا ہے، صرف اتنے ہی اشعار قابل انتخاب تھے، درست نہ ہوگا۔ اس لیے کہ نسخۂ حمیدیہ میں ان کے علاوہ بھی ایک دو نہیں سینکڑوں ایسے اشعار موجود ہیں جو مضامین خیالی یا رنگِ بیدلؔ سے پاک ہیں اور ان میں سادگی و پُرکاری کا وہی معیار نظر آتا ہے جسے سامنے رکھ کر غالبؔ نے ساڑھے چار سو سے کچھ زائد اشعار کا انتخاب کیا تھا...... بلکہ بعض اشعار تو ایسے ہیں جو غالبؔ کے فکر و فن کے بالکل تازہ پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اگر انھیں نظری قرار دے دیا جائے تو ''ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا'' کی تعبیر مشکل ہو جائے گی۔ اس قسم کے چند اشعار دیکھیے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☆

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ سخت دلِ کوہ طور تھا

☆

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

☆

بہ قدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

☆

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہارِ آفرینا گنہ گار ہیں ہم

☆

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

☆

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

☆

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

☆

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

☆

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

یہ اشعار بھی نسخۂ حمیدیہ کی دین ہیں اور غالبؔ کے مروجہ دیوان میں نہیں ملتے۔ خدا جانے غالبؔ نے ان اشعار کو نظری کیوں قرار دے دیا۔ ان میں سے کچھ تو ایسے فکر انگیز اور دلکش ہیں کہ اگر یہ سامنے نہ آجاتے تو کلامِ غالبؔ کے بعض اہم نکات ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتے۔ اس قبیل کے سادہ و پُر کار اشعار نسخۂ حمیدیہ میں سینکڑوں کی تعداد میں ہیں کہ جنھیں غالبؔ نے اپنے مروجہ دیوان میں شامل کرنا پسند نہیں کیا۔ کسی شاعر کا اپنے کلام پر اتنا سخت محاسبہ حیرت انگیز ہے،

ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ سے غالبؔ نے جتنے اشعار اپنے دیوان کے لیے منتخب کیے ہیں، کم از کم اتنے ہی اشعار اور منتخب کیے جانے کے لائق تھے۔ ہم اس جگہ قابل انتخاب اشعار میں سے چند مزید اشعار بطور نمونہ نقل کر رہے ہیں:

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

☆

وسعت رحمت حق دیکھ، کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر، کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

☆

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسباب تمنا سب تھا

☆

اسدؔ اربابِ فطرت قدردانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

☆

اصطلاحات اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نہ کھولی اسے مشکل باندھا

☆

بے پردے سوئے وادی مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

☆

ہوں قطرہ زن بہ وادی حسرت شبانہ روز
جز تارِ اشکِ جادۂ منزل نہیں رہا

☆

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گل دستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

☆

دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے، وصال کا مذکور

☆

ہجوم فکر سے دل مثل موج، لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

☆

ہلاک بے خبری نغمۂ وجود و عدم
جہان و اہل جہاں سے جہاں جہاں فریاد
جواب سنگ دلی ہائے دشمناں ہمت
ز دست شیشہ دلی ہائے دوستاں فریاد

☆

میں دور گرد عرضِ رسوم نیاز ہوں
دشمن سمجھ ولے نگہ آشنا نہ مانگ

☆

بس کہ وہ چشم و چراغِ محفل اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

☆

سر پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یارب! میں کس غریب کا بختِ رسیدہ ہوں

☆

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگ جادہ سر کوئے یار رکھتے ہیں

☆

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد، جہاں میں ورقِ ناخواندہ

☆

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

☆

کرتے ہو شکوہ کس کا، تم اور بے وفائی
سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی

☆

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسدؔ
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

☆

اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

☆

بے چشم دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی کہ ہر ورق ورق انتخاب ہے

☆

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
وہ محشر خیال کہ دنیا کہیں جسے

☆

ساقی بہارِ موسم گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

☆

خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

☆

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

☆

تاچند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
ہے ذوق گریہ، عزم سفر کیجیے اسد
رخت جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

☆

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
اسدؔ بہ موسم گل در طلسم کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

☆

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

☆

اسدؔ بہار تماشائے گلستانِ حیات
وصال لالہ عذارانِ سروقامت ہے

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار ہیں جو مضامینِ خیالی کے الجھاؤ یا غالبؔ کے فارسی آمیز مغلق اسلوب سے پاک ہیں اور دیوانِ غالبؔ میں بہر طور شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت سے اشعار مروجہ دیوان میں جگہ نہ پانے کے باوجود صرف اپنے حسن وزور کی بدولت خود بہ خود سامنے آگئے ہیں اور مختلف مقالات و منتخبات کے ذریعے لوگ ان اشعار سے اس طرح مانوس ہیں گویا وہ انھیں غالبؔ کے مروجہ دیوان میں مدت سے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ یہ فکروفن کا جادو نہیں تو اور کیا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ اور غالبؔ کے مروجہ اردو دیوان کے سلسلے میں ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے۔ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ غالبؔ نے عبدالرزاق شاکر کو اپنی ریختہ شاعری کے متعلق لکھا تھا کہ:

''۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، ۱۰ برس میں دیوان جمع ہوگیا، آخر تمیز آئی، اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔'' ۱۲

اس بیان کے آخری ٹکڑے کے متعلق مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ:

''یہ مبالغہ ہے اس لیے کہ......غزلوں میں سے بڑی تعداد موجودہ دیوان میں پائی جاتی ہے۔ یہ کھلا ہوا ثبوت ہے اس امر کا کہ منتخب اشعار کی واقعی تعداد دس پندرہ نہیں کہیں زیادہ تھی اور دیوان اردو کا طاقِ نسیاں پر رکھ دینا یا اس کے اوراق یک قلم چاک کردینا صرف مبالغہ ہے۔'' ۱۳

عرشی صاحب حیاتِ غالبؔ اور کلامِ غالبؔ دونوں کے پارکھوں میں ہیں اور اسی لیے غالبؔ کے سلسلے میں ہم ان کی رائے کو وقیع اور مستند خیال کرتے ہیں، لیکن اس جگہ انھوں نے غالبؔ کے

خط کے آخری ٹکڑے سے جو مفہوم نکالا ہے، اُسے قبول کرنے میں ہمیں تامل ہے۔ اس ٹکڑے سے غالبؔ کی مراد یہ نہیں ہے کہ نسخۂ حمیدیہ یا کسی اور قدیم نسخے سے، مروجہ دیوان کے لیے صرف دس پندرہ شعر منتخب کر کے باقی سارے اشعار قلم زد کر دیے ہیں۔ اس کے مفہوم کے سلسلے میں ہمیں غالبؔ کے خط کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ خط میں ان کا اشارہ اپنے ابتدائی دیوان کے اس حصے سے ہے، جس پر بیدلؔ کی تقلید کا گہرا اثر ہے اور جس میں بہ قول ان کے، دس برس تک، بالعموم، مضامین خیالی باندھے گئے تھے۔ یقیناً اس رنگ کا زیادہ حصہ بلکہ اپنی سمجھ میں پورا حصہ انتخاب سے خارج کر دیا ہے۔

ہاں، مضامین خیالی یا بیدلؔ کے تتبع کے سلسلے میں دس پندرہ شعر بطور نمونہ، انھوں نے اپنے انتخاب میں شامل کر لیے تھے تاکہ دیوان مروجہ کے دیکھنے کے بعد، اُن دس پندرہ اشعار کی مدد سے اس امر کا اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ ابتداً کس رنگ میں کہتے تھے اور آخر آخر انھوں نے اپنے اسلوب میں کیا اصلاح و ترمیم کی ہے۔ غالبؔ کا ابتدائی اردو دیوان یا نسخۂ حمیدیہ تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ اس کا زیادہ حصہ یقیناً مضامین خیالی اور تقلید بیدلؔ سے متعلق تھا۔ غالبؔ نے اس لیے اس دیوان کا بیشتر حصہ یعنی تین چوتھائی سے بھی زیادہ قلم زد کر دیا۔ مثلاً صرف الف کی ردیف میں انھوں نے مختلف غزلوں کے بیشتر اشعار کے ساتھ مکمل بائیس غزلیں قلم زد کر دی ہیں۔ یہی عمل انھوں نے دوسری ردیفوں کے ساتھ کیا ہے۔ ث، خ، غ کی ردیف کی ساری غزلیں خارج کر دی ہیں۔ ''ل'' کی پانچ غزلوں میں سے ایک اور ''ہ'' کی آٹھ غزلوں میں سے صرف دو رہنے دی ہیں۔ اسی طرح ''ی'' کی ردیف میں جہاں مختلف غزلوں کے سینکڑوں اشعار حذف کیے ہیں، وہاں کم و بیش پچپن غزلیں پوری کی پوری نظری قرار دے دی ہیں۔ ایسی صورت میں مرزا نوشہ کا یہ کہنا کہ:

''اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے۔''

مبالغہ نہیں بلکہ حقائق کے مطابق اور روزمرہ کے طرز کلام کے عین موافق ہو جاتا ہے۔ اب رہا ان کے بیان کا یہ آخری ٹکڑا کہ:

''دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔''

سو اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں انھوں نے سادگی و سلاست کو معیار قرار دے کر اپنے

ابتدائی مجموعہ کلام سے تقریباً ساڑھے چار سو اشعار منتخب کیے وہاں چند اشعار بہ طور نمونہ، مشکل و مغلق بھی منتخب کر لیے تاکہ ان کے ذریعے ان کے پرانے اور نئے اسلوب سخن میں امتیاز کیا جاسکے۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ جس سے غالبؔ نے ساڑھے چار سو سے زائد سادہ و دلنشیں اشعار منتخب کیے ہیں، اس میں اب بھی دس پندرہ نہیں سینکڑوں شعر ایسے ہیں جو نہایت صاف ستھرے اور پاکیزہ ہیں اور ان پر کسی طرح بیدلؔ کے تتبع یا مضامین خیالی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ غالبؔ اپنے سادہ و دلنشیں اشعار میں سے صرف دس پندرہ اشعار انتخاب کرتے اور باقی کو قلم زد کر دیتے، اس لیے ان کے بیان کا سیدھا سادا مفہوم یہی نکلتا ہے کہ اپنے مشکل و مبہم اردو دیوان کے اس حصے سے جس کے تقریباً سارے اشعار انھوں نے نظری قرار دے دیے ہیں، دس پندرہ اشعار نمونۃً رکھ لیے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ غالبؔ کے منتخب و مروّج اردو دیوان میں فی الواقع دس پندرہ بلکہ اس سے بھی کچھ زائد ایسے اشعار موجود ہیں، جو ان کے ابتدائی اور مشکل رنگِ سخن کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل اشعار:

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہیں سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

☆

شب، شمار شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

☆

اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

☆

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر گو بے تاب تھا

☆

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

☆

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی

☆

مے کدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

☆

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

☆

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

☆

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

☆

بہ طوفاں گاہ جوشِ اضطراب و شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

☆

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

یہ اور اس قسم کے کچھ اور اشعار جو غالبؔ کے ابتدائی رنگ کے حامل ہیں، نسخۂ حمیدیہ اور

غالبؔ کے مروجہ دیوان دونوں میں شامل ہیں۔ یعنی انھیں خود غالبؔ نے نسخۂ حمیدیہ سے منتخب کر کے مروجہ دیوان میں دانستہ جگہ دی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خط کے آخری ٹکڑے میں دس پندرہ اشعار کو نمونۃً رہنے دینے کا اشارہ آسان و عام فہم اشعار کی جانب نہیں بلکہ مشکل وژولیدہ کی طرف ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ ذکرِ غالبؔ، ص ۶۶۔۱۶۵ از مالک رام، مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی، طبع سوم، ۱۹۵۵ء۔

۲۔ خطوطِ غالب، جلد دوم، ص ۸۶۔۲۸۵، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، مطبوعہ کتاب منزل، لاہور۔

۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۳۹، مطبوعہ نول کشور، ۱۹۱۰ء/ ۱۳۲۸ھ۔

۴۔ آبِ حیات، ص ۵۰۵، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۴ء۔

۵۔ یادگارِ غالب، ص ۴۰۔۱۳۹، مطبوعہ ملک نذیر احمد تاج بک ڈپو، اردو بازار، لاہور۔

۶۔ ملاحظہ ہو نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۹ تا ۳۳، مطبوعہ گورنمنٹ پریس، بھوپال، طبع اول ۱۹۲۱ء۔

۷۔ دیباچہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۰۔۱۱۔

۸۔ اردوئے معلیٰ، ص ۳۰۹، خطوط (۱) ص ۳۹۳، بہ حوالہ مقدمہ نسخۂ عرشی، ص ۳۶، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔

۹۔ خط بہ نام تفتہؔ۔

۱۰۔ خطوطِ غالب، ص ۲۸۵، حصہ دوم، مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ کتاب منزل، لاہور۔

۱۱۔ یادگارِ غالب، ص ۱۴۱۔

۱۲۔ یادگارِ غالب، ص ۱۴۵۔

۱۳۔ خطوطِ غالب، حصہ دوم، ص ۲۸۵، مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ کتاب منزل، لاہور۔

(''تعبیراتِ غالبؔ''۔ ادارۂ یادگارِ غالبؔ، کراچی۔ ۲۰۰۲ء۔ ص ۱۹۵ تا ۲۲۸)

◆◆◆

ڈاکٹر اکبر حیدری

دیوانِ غالبؔ: نسخۂ حمیدیہ

(بعض اہم انکشافات)

(غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام غالبؔ سیمینار دسمبر ۱۹۸۸ء میں ایوانِ غالبؔ میں منعقد ہوا تھا۔ یہ مقالہ ایک بڑے اجتماع میں ماہرین غالبیات جناب مالک رام، آلِ احمد سرور، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، خلیق انجم وغیرہم کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ اکبر حیدری)

نسخۂ حمیدیہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ سرورق پر غالبؔ کی اس تصویر کا عکس ہے جو نسخۂ نظامی بدایونی میں ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا۔ اس صفحے میں یہ بھی درج ہے:

''دیوانِ غالبؔ جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق۔''

کتاب کا سائز ۲۶×۲۰/ ۸ ہے۔ صفحہ نمبر ا پر نواب حمید اللہ خاں کا ''سرنامہ'' یوں درج ہے:

''ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

میں دلی مسرت سے میرزا غالبؔ کے دیوانِ اردو کا یہ جدید نسخہ ابنائے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور مجھے اپنی سعادت پر فخر ہے کہ اس شہنشاہِ اقلیمِ سخنوری کے عہدِ شباب کی نازک خیالی اور نکتہ سنجی کے یہ نقشِ اول، جو سو برس سے کنجِ خمول اور گوشۂ ذہول میں پڑے تھے، آج میرے ذریعے سے ملک میں رونما اور جلوہ پیرا ہوتے ہیں۔ اردو، جو بلا اختلافِ ملت ہم سب کی مشترکہ زبان ہے اور جس پر ہماری

ترقیوں کا انحصار ہے، اپنے مجموعۂ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا ناز کرے، بجا ہے اور اربابِ فہم وظرف جو بلا امتیازِ قوم و وطن اس خلاقِ معانی کی نغمہ سرائی اور مضمون آفرینی کے دلدادہ ہیں، اس کی جس قدر، قدر کریں، زیبا ہے، کیوں کہ اس میں کلام نہیں کہ:

از تازگی بہ دہر مکرر نمی شود
نقشے کہ کلکِ غالبؔ خونیں رقم کشد"

اس کے بعد اندر کے ٹائٹل میں یہ عبارت ہے:

دیوانِ غالبؔ جدید/ المعروف بہ/نسخۂ حمیدیہ/ مع مقدمۂ دیوان/ فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بی اے، ایل ایل بی/ بیرسٹرایٹ لاء، ڈی۔ جے/ مرتبہ خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم۔اے، منشی فاضل/ ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست بھوپال......"

اس وقت ہمارے پیش نظر دیوانِ غالبؔ نسخۂ حمیدیہ کا وہ آفسیٹ نسخہ ہے جسے ۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں کہ:

"غالبیات کا مطالعہ کرنے والوں کو دیوانِ غالبؔ کے نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت کا علم ہے۔ دیوان غالبؔ کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) سابق ریاست بھوپال کے سرکاری کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ جس سے غالبؔ کے غیر متداول کلام کی نشاندہی ہوئی تھی۔ اس خطی نسخے کو سامنے رکھ کر مفتی محمد انوار الحق نے "دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" مرتب کیا جس کی اشاعت ۱۹۲۱ء میں عمل میں آئی ...... ہر چند نسخۂ حمیدیہ اغلاط سے معمور ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جب کہ اصلی خطی نسخہ مفقود الخبر ہے۔ اسی پر اکتفا کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔"

صفحہ ۳ سے صفحہ ۲۴ تک مفتی محمد انوار الحق کا مضمون "تمہید" کے عنوان سے درج ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۱۳۹ تک ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا وہ معرکۃ آراء مقدمہ شامل کیا گیا

ہے جو انھوں نے متداول دیوانِ غالبؔ کے لیے اپنی وفات دسمبر ۱۹۱۸ء سے قبل لکھا تھا۔ بعدِ مقدمہ ایک صفحہ بالکل خالی چھوڑا گیا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ صفحہ ایک سے ۳۴۲ تک متن شامل کیا گیا ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں، آخری غزل صفحہ ۲۸۸ پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں آٹھ شعر ہیں۔ ذیل میں مطلع اور مقطع درج کیے جاتے ہیں:

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

حاشیے میں یہ عبارت درج ہے:

''یہ غزل غالبؔ نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو ''اردوئے معلیٰ'' اور دیوانِ غالبؔ مطبوعہ بدایوں کے آخر میں موجود ہے۔''

ذیل میں پہلی غزل درج کی جاتی ہے۔ پانچ شعر بھی ہیں جو خارج کر دیے گئے۔ مقابلے کے لیے مطبوعہ دیوان دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل میں پہلے اسدؔ تخلص تھا۔ بعد میں غالبؔ ڈالا گیا:

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
آتشیں پا ہوں، گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
شوخیِ نیرنگِ صیدِ وحشتِ طاؤس ہے
دام سبزے میں ہے پروازِ چمن تسخیر کا
لذتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل
نعل آتش میں ہے تیغِ یار سے نخچیر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

خشتِ پشتِ دستِ عجز و قالب، آغوشِ وداع
پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشا ہے اسدؔ
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

صفحہ ۲۸۹ سے صفحہ ۳۲۰ تک قصائد ہیں۔ ان میں ''در صفتِ انبہ'' کی مثنوی بھی شامل ہے۔
پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بہرِ ترویجِ جنابِ والیِ یوم الحساب
ضامنِ تعمیرِ قصرستانِ دلہائے خراب

قصیدے کے ابتدا میں ''فاتحہ فارسی'' جلی حروف میں لکھا ہوا ہے اور حاشیے کی عبارت یہ ہے:

''یہ فاتحہ دیوانِ غالبؔ فارسی مطبوعہ نول کشور کے صفحہ ۴۷، ۴۸، ۴۹ پر بہ اختلافِ خفیف درج ہے، لیکن چوں کہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں متعدد اشعار کی کمی وبیشی ہے، اس لیے یہاں قلمی نسخے کے اشعار کو پورا نقل کر دیا ہے اور جو شعر دو دیوانوں میں مشترک ہیں ان کو ''م'' سے ممتاز کر دیا ہے۔ بخوفِ طوالت مطبوعہ شعروں کے اختلاف دکھانے کی میں نے جرأت نہیں کی۔ اربابِ ذوق مطبوعہ دیوانوں سے مقابلہ فرما سکتے ہیں۔''

آخری قصیدہ ''در صفتِ انبہ'' ہے۔ اس میں ۳۳ شعر ہیں، پہلا اور آخری شعر درج کیے جاتے ہیں:

ہاں، دلِ درد مندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

صفحہ ۳۲۱ سے ۳۲۷ تک چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ پہلے قطعے کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے:

اے شہنشاہِ فلک منظر بے مثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

آخری قطعے کے دو شعر یہ ہیں:

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا ہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

پھر اسی صفحے سے آخری صفحے ۳۴۲ تک رباعیات ہیں۔ ان کی تعداد ۲۲ ہے۔ پہلی اور آخری رباعی پیش کی جاتی ہے:

بعد از تمام بزم عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

دیوان کے حواشی میں متعدد شعر درج ہیں۔ دوسری غزل کا دوسرا شعر متن میں اس طرح ہے:

مہِ اختر افشاں کی بہر استقبال آنکھوں سے
تماشا کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

حاشیے میں اس شعر کے پہلے مصرع کے بارے میں یہ لکھا ہے......
پہلے یہ مصرع متن میں یوں تھا:

بہ استقبالِ تمثالِ زمہ اختر فشاں شوخی

غزل کا مطلع یہ ہے:

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیر سے دودِ پسند آیا

(۱۲) شعر

مصرع ثانی یوں صحیح ہے:

''سویدا تا بلب زنجیریِ دودِ پسند آیا''

ص۳ کے متن میں شعر یوں درج ہے:

سوادِ چشمِ بسمل انتخابِ نقطہ آرائی
خرامِ ناز بے پروائیِ قاتل پسند آیا

اس شعر پر ''لا، لا'' لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبًا اسے حذف قرار دیا ہے اور اس کے بجائے حاشیے پر یہ شعر بڑھایا گیا:

روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا

نسخۂ حمیدیہ کا متن پُر از اغلاط ہے، ذیل میں چند غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے:
ص۵ غزل:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

غزل کا ایک شعر یوں ہے:

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح، موجۂ گل کو وقفِ بوریا پایا

پہلے مصرع میں خیال کے بدلے ''خرام'' درست ہے۔

ص۶ غزل:

شوق، ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا

مصرع پہلے اس طرح تھا:

عشرت ایجاد چہ بوے گل و کو دودِ چراغ

غزل کا مطلع پہلے یوں تھا:

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

شعر:

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ دل
لاکھ پردے میں چھپا پھر بھی وہی عریاں نکلا

مصرع ثانی یوں درست ہے: لاکھ پردے میں چھپا پر وہی عریاں نکلا

ص۱۱ شعر:

نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطر آگہی
میں گردِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے:

غبارِ راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

مقطع:

اسدؔ وحشت پرستِ گوشۂ تنہائی دل ہے
برنگ موجِ مے، خمیازۂ ساغر ہے دم میرا

مصرع اول میں ''ہے'' کے بجائے ''ہوں'' صحیح ہے۔

ص۱۲ مصرع:

تغافل کو نہ کر مصروف تمکیں آزمائی کا

یہاں ''مصروف'' کے بدلے ''معزول'' صحیح ہے۔

اسی طرح ذیل کا مصرع دیکھیے:

نظر بازی طلسم وحشت آباد پرستاں ہے

صحیح مصرع یہ ہے:

نظر بازی طلسمِ وحشت آباد پریشاں ہے

ص ۱۷۷، شعر:

غریب بدر جستۂ بازگشتن

سخن ہوں، سخن بر لب آوردگاں کا

مصرع اول یوں درست ہے:

غریب ستم دیدۂ بازگشتن

مصرع:

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عنا گیرِ خرام

یہاں ''عنا'' کی بجائے ''عناں'' ہونا چاہیے۔ یہ مصرع بھی ملاحظہ ہو:

شوخیِ بارش سے مہ فوارۂ سیلاب تھا

یہاں ''فوارۂ سیماب'' ہونا چاہیے۔ غزل کا مقطع یہ ہے:

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ

ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

غزل کا مطلع:

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری، دل بے تاب تھا

شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

حاشیے میں مطلع کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں دیوانِ غالبؔ شائع کردۂ مولانا حسرت موہانی اور دیوانِ غالبؔ مطبوعۂ مطبع نظامی بدایونی کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہے۔''

صفحہ ۳۸ میں پانچ شعر کی ایک غزل ہے، مطلع اس طرح ہے:

وردِ اسمِ حق سے دیدار صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

پہلا ہی لفظ ''درد'' غلط ہے، دراصل یہ ''وِرد'' ہے۔

دیوانِ غالبؔ نسخۂ حمیدیہ غالبؔ کے قلمی دیوان نسخۂ بھوپال کا جدید ایڈیشن ہے۔ مفتی انوار الحق نسخۂ بھوپال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس نادر کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان یہاں کیوں کر پہنچا، لیکن تاریخِ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیسِ وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا، چناں چہ اس کے شروع میں ایک صفحے پر یہ لکھا ہوا ہے:
>
> ''دیوانِ ہٰذا من تصنیفِ مرزا نوشہ دہلوی، المتخلص بہ اسدؔ از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوشخط۔''

خاتمے پر ذیل کا ترقیمہ ہے:

> ''دیوانِ من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسدؔ و غالبؔ سلمہم ربہم علی من الہجرت النبویہ صورتِ اتمام یافت۔''

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی میں جو اشعار ہیں یا جن اشعار کو غالبؔ نے قلم زد کیا ہے، وہ غالبؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن عرشی صاحب ان لوگوں کی آرا سے متفق نہیں ہیں۔

مرزا غالبؔ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی لوگوں کو ان کا کلام دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے اس بات کی تحقیق نہیں کی کہ یہ کلام واقعی مرزا کا ہے۔ تذکروں سے ثابت ہے کہ مرزا غالبؔ سے پہلے اور ان کے زمانے میں کئی لوگ اسدؔ اور غالبؔ کے تخلص سے لکھتے تھے۔ ہماری رائے میں ان لوگوں کا کلام مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے

نام سے غالباً پہلی مرتبہ ''مجمع الاشعار'' مطبوعہ مطبعِ نول کشور لکھنؤ میں ۱۸۷۲ء میں چھپنا شروع ہوا۔ ہمارے پاس اپریل ۱۸۷۷ء کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس کے صفحہ ۴۴ اور ص ۸۳ میں ''غزل غالبؔ'' کے عنوان سے دو غزلیں چھپی ہیں۔ پہلی غزل میں ۷ اور دوسری میں ۶ شعر ہیں۔ دونوں غزلوں کے مقطع درج کیے جاتے ہیں:

(۱)

آگے اپنے یار کے غالبؔ ہمیں معیوب ہیں
ورنہ ہے اس کو اسی عیب و ہنر کا امتیاز

(۲)

پہن کر ہووے گا خوش حال دو شالہ کوئی
ہم بھی ہیں شاد اے غالبؔ اسی عریانی میں

پہلی غزل دیوانِ جہاں بینی میں مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں تخلص غالبؔ کے نام منسوب ہے۔ ''عمدۂ منتخبہ'' (سال کتابت ۱۲۲۴ھ) میں اس غالبؔ کا سالِ انتقال ۱۲۱۸ھ دکھایا گیا ہے۔ ''چمنِ بے نظیر'' میں بھی یہ غزلیں غالبؔ کے نام سے شامل ہیں۔ یہ غزلیں بعض لوگوں نے اسد اللہ خاں غالبؔ مرزا نوشہ سے منسوب کر کے غلطی کی ہے۔

''مخزن'' لاہور کے ابتدائی پرچوں میں بھی غالبؔ کے نام سے دوسروں کا کلام چھپنے لگا۔ یہ سلسلہ ''الہلال'' کلکتہ میں جاری رہا۔ ۱۹۱۹ء میں غالبؔ کے انتقال کے پورے پچاس سال کے بعد دیوانِ غالبؔ نسخۂ بھوپال نمودار کیا گیا اور اس پر ۱۲۳۷ ہجری (۱۸۲۱ء) کا ترقیمہ دکھایا گیا۔ کس نے لکھا، کہاں لکھا گیا اور بھوپال کیسے پہنچا؟ آج تک تشنۂ تحقیق ہے۔ ترقیمے کے پورے ایک سو سال کے بعد ۱۹۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ اشاعت سے پہلے ڈاکٹر عبدالحق ''اردو'' سہ ماہی، انجمن ترقی اردو ہند، کے شمارے بابت جنوری ۱۹۲۱ء (صفحہ ۹) میں لکھتے ہیں:

> ''انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالبؔ کے اردو دیوان کا ایک نفیس صحیح، جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چناں چہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے

بطور مقدمہ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ لیکن افسوس، اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان، جو علم و اخلاق کا پُتلا تھا، بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔''

نسخۂ حمیدیہ کے پورے دس سال کے بعد مولوی عبدالباری آسی مرحوم کے یہاں ایک اور ''بیاض'' کا ظہور ہوا، جس میں مرزا غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام وافر تعداد میں دکھایا گیا۔ اردو کے مشہور ناقد جناب نیاز فتح پوری صاحب نے اپنے مشہور ماہ نامے ''نگار'' لکھنؤ، بابت فروری ۱۹۳۱ء، شمارہ ۲، (صفحہ ۶۱ تا ۶۶) میں ''نو درِ ادب: غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں آسی صاحب کے اختراع کردہ غالبؔ کے غیر مطبوعہ کلام کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔ انتخاب میں ۹ غزلوں کے ۶۷ شعر درج کیے۔ نیازؔ صاحب نے غالبؔ کے ان نام نہاد فرضی اور جعلی اشعار کو قطعیت اور یقینِ محکم کے ساتھ کلامِ غالبؔ قرار دیا، فرماتے ہیں:

''اس وقت غالبؔ کے اردو کلام کے دو مجموعے ملک میں نظر آتے ہیں۔ ایک وہ عام اور متداول نسخہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشورے سے غالبؔ نے مرتب کیا تھا اور جس میں سے زیادہ ثقیل اور دشوار اشعار نکال دیے تھے۔ دوسرا وہ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے معروف ہے، اور جس کو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کتب خانۂ بھوپال کے ایک قدیم نسخے کے موافق مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نسخے میں وہ تمام اشعار موجود ہیں جن کے حذف کرنے کے لیے بعد متداول نسخہ مرتب کیا گیا تھا۔ اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی حصہ کلامِ غالبؔ کا ایسا نہیں ہے جو شائع ہونے سے رہ گیا ہو۔ لیکن حال ہی میں ایک قلمی بیاض صدیق بک ڈپو کو دستیاب ہوئی ہے جس میں

متعدد غزلیں غالبؔ کی ایسی درج ہیں جو نہ متداول نسخے میں پائی جاتی ہیں نہ نسخۂ حمیدیہ میں۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ غزلیں واقعی غالبؔ کی ہیں یا نہیں اور دوسرا یہ کہ اگر غالبؔ ہی کی ہیں تو اس نسخے میں کیوں نہیں پائی جاتی ہیں جو بھوپال بھیجا گیا تھا۔ امرِ اول کے متعلق گفتگو فضول ہے، کیوں کہ غالبؔ کا رنگِ سخن ایسا نہیں جو چھپا رہے اور جس پر دو رائیں قائم ہو سکیں۔ رہ گیا امرِ ثانی، سو یہ ہو سکتا ہے کہ بھوپال والے نسخے کی ترتیب کے بعد غالبؔ نے اور غزلیں کہی ہوں اور ان میں سے بعض کسی نے اس بیاض سے نقل کر لی ہوں یا پھر یہ وہ غزلیں ہیں جو مختلف اوقات میں غالبؔ نے بغیر مسودہ رکھے ہوئے کسی کو سنائی ہوں اور اس نے محفوظ کر لیا ہو۔ بہرحال، بیاضِ زیرِ بحث میں جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً غالبؔ کی ہیں۔"

ایک اور معروف نقاد جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رسالے "ایوان"، بابت جنوری، ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

"میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب کہ میں پچھلے ہفتے لکھنؤ گیا اور اپنے مکرم دوست جناب مولانا عبدالباری آسیؔ کے پاس ایک قلمی بیاض جس میں علاوہ اور شعراء کے غالبؔ کی بھی چند غزلیں ہیں۔ ان میں ایک یا دو ایسی ہیں جو نسخۂ حمیدیہ اور دیوانِ غالبؔ متداولہ دونوں میں موجود ہیں۔ باقی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ بیاض یقیناً اب سے چالیس پچاس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ .. یہ غزلیں واقعی غالبؔ کی ہیں یا نہیں، اس کا ثبوت یوں تو ایک یہ بھی ہے کہ ان میں ایک دو غزلیں غالبؔ کی ہیں۔ وہی بندشِ الفاظ، وہی اختصار و بلاغت، وہی دقتِ نظر، وہی شاعرانہ جلال جس نے غالبؔ کو غالب بنا دیا ہے۔ ان غزلوں کی امتیازی شان ہے۔ یہ غزلیں قطعاً غالبؔ کے درمیانی دور کی ہیں، جب کہ ان میں توازن اور اعتدال آ چکا تھا اور جب کہ ان کے بہکنے میں دوسروں کو بھی مزا آنے لگا تھا، یعنی جب کہ ان کی پیچیدہ خیالی اور مشکل بیانی میں سلاست اور شگفتگی رونما ہو چکی تھی۔"

دراصل اس جعلی اور فرضی ''غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام'' کے خالق آسیؔ تھے۔ موصوف نے اس سے قبل غالبؔ کا الحاقی کلام مرتب کر کے دیوانِ غالبؔ (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ایک ضخیم کتاب ''مکمل شرحِ دیوانِ غالبؔ'' مرتب کی۔ اس میں اپنا کلام غالبؔ کے نام سے شامل کیا۔ کتاب ''مکمل شرحِ غالبؔ اور غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام'' کے نام سے ۱۹۳۱ء میں صدیق بک ڈپو سے شائع ہوئی۔ اس میں غالبؔ کی جو تصویر چھپی ہے وہ بھی جعلی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جناب امتیاز علی عرشی نے بھی دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی مطبوعہ ۱۹۸۷ء (انجمن ترقی اردو، ہند) میں آسیؔ کے مرتب کردہ ان جعلی اشعار کو شامل کیا۔

مرزا غالبؔ کی وفات کے پورے ایک سو سال بعد ''بیاضِ غالبؔ بخطِ غالبؔ'' کا ایک اور قلمی نسخہ معرضِ وجود میں لایا گیا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں جشنِ صد سالۂ غالبؔ سرکاری طور پر ملک کے طول و عرض میں منایا گیا۔ بیاضِ غالبؔ، جسے نسخۂ توفیق بھی کہا جاتا تھا، جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے ہندوستان میں شائع کیا تھا۔ اس کی نقل لاہور پہنچائی گئی اور ''نقوش'' کے ایڈیٹر جناب محمد طفیل نے اسے بڑے اہتمام سے ''نقوش، غالبؔ نمبر'' کے نام سے شائع کیا۔ مرتبین کا دعویٰ تھا کہ اس میں غالبؔ کا وہ کلام شامل ہے جو انھوں نے ۱۹ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں ترتیب دیا تھا۔ برصغیر کے ماہرین غالبیات جناب امتیاز علی عرشیؔ، پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام، عرشی زادہ، غلام رسول مہرؔ اور ڈاکٹر گیان چند وغیرہ نے اس کے معتبر ہونے کی توثیق بھی فرمائی تھی۔ ''ہماری زبان'' نئی دہلی اور دوسرے رسائل میں اس کی مخالفت اور حمایت میں متعدد مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین ''نقوش'' لاہور غالبؔ نمبر کے تیسرے حصے میں موجود ہیں۔ بیاضِ غالبؔ نسخۂ لاہور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے مقدمے کے ساتھ پہلے شائع ہوا تھا۔ اس میں میر امانی تخلص اسدؔ کی ایک غزل ''دم چند، غم چند'' بھی شامل کی گئی، جب کہ یہ غزل غالبؔ کی حیات میں تذکرۂ خوشگی میں میر امانی اسدؔ کے نام سے چھپ چکی تھی۔ اس زمانے میں کمال احمد صدیقی نے ''بیاضِ غالبؔ بخطِ غالبؔ'' کی رد میں ایک ضخیم کتاب ہمارے تعاون سے ''بیاضِ غالبؔ کا ایک تنقیدی جائزہ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس میں موصوف نے نسخۂ عرشی زادہ کو جعلی قرار دیا۔ کتاب کی قیمت پانچ سو روپے رکھی تھی۔ کمال صاحب کا کمال دیکھیے کہ انھوں نے غالبؔ کے رنگ میں ایک غزل اختراع

کی اور اسے دلّی کے کسی کاتب سے بخطِ غالبؔ لکھوا کر اس کا فوٹو اتروایا۔ جب یہ فوٹو راقم نے کسی مصلحت کے تحت پروفیسر آل احمد سرورؔ اور جناب مالک رام کو دکھایا تو انھوں نے اسے کلامِ غالبؔ بخطِ غالبؔ تسلیم کر لیا۔ یہ غزل کمال صاحب نے کتاب کے آخر میں شامل کی۔ تصویر کے نیچے صفحہ ۴۸۷ میں کمال کا یہ جملہ لکھا ہوا موجود ہے: ''غزل کمالؔ احمد صدیقی بخطِ اسد اللہ خاں غالبؔ''

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں دیوانِ غالبؔ نسخۂ بھوپال عرصۂ دراز سے غائب کیا گیا ہے۔ اس میں عمدۂ منتخبہ اور تذکرۂ ذکاؔ کے وہ اشعار غائب ہیں جو ترجمۂ غالبؔ میں درج ہیں۔ نسخۂ عرشی زادہ کے بارے میں اکبر علی خاں اور توفیق احمد چشتی امروہوی کے درمیان بھوپال کی عدالت میں مقدمہ بھی چل رہا تھا اور دورانِ مقدمہ یہ نسخہ بھی غائب کر دیا گیا۔ تفصیلات ''نقوش'' لاہور غالبؔ نمبر کے تیسرے حصے میں موجود ہیں۔ راقم الحروف کو دیوانِ غالبؔ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ عرشی زادہ یا نسخۂ غالبؔ (لاہور) کے بخطِ غالبؔ ہونے میں اختلاف ہے۔ دونوں نسخوں میں جو اشعار غالبؔ سے منسوب کیے گئے ہیں وہ مشکوک ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ بھی غالباً نیازؔ اور آسیؔ کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ نیازؔ اس زمانے میں بھوپال ہی میں مقیم تھے۔ قصہ کوتاہ جب تک یہ دونوں نسخے (حمیدیہ اور عرشی زادہ) اصل حالت میں باز برآمد نہیں کیے جاتے اور تحقیق کی کسوٹی پر نہیں پرکھائے جاتے اس وقت تک راقمِ حروف ان کو غیر معتبر قرار دیتا رہے گا۔ ان دونوں نسخوں میں غالبؔ کے تخلص سے متعدد غزلیں ملتی ہیں۔ جبکہ مولوی محمد حسین آزادؔ ''آبِ حیات'' (ص ۵۰۰) میں لکھتے ہیں کہ غالبؔ نے ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۸ء) میں اسد اللہ کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ یہ سچ ہے کہ غالبؔ نے اپنے دیوان کا انتخاب کیا تھا، اس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

> ''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا گیا..... دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آ گئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔''

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اس قلمی دیوان کو پھاڑ کے پھینکا تھا۔ وہ اپنے کلام کو صاف و پاک رکھنے کو فکر مند رہتے تھے۔ کسی نے ان کے سامنے میر امانی اسدؔ کا مقطع پڑھا تو انھوں نے

کہا: ''اگر یہ مقطع میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔'' ایک خط میں مرزا شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ:

''واسطے خدا کے، یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟''

مضمون کے اختتام پر اس واقعے کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ کمال احمد صدیقی جشن صد سالہ غالبؔ منعقدہ ۱۹۶۹ء کے دوران ریڈیو کشمیر سری نگر سے وابستہ تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق وزیر اعلیٰ غالبؔ کمیٹی کے صدر اور کمال صاحب سکریٹری تھے۔ انھی دنوں خواجہ صاحب کا انتقال ہوا اور کمال صاحب غالبؔ کمیٹی کے مالک ہو گئے۔ انھوں نے مجھ سے غالبؔ پر پانچ سو روپے کے عوض ایک کتاب اس شرط پر لکھوائی کہ کتاب اشاعت پذیر ہوگی۔ عرصہ گزر جانے کے بعد کمال صاحب نے مجھے ۲۴، اپریل ۱۹۹۶ء کو مطلع کیا کہ:

''آپ کو یاد ہوگا کہ سری نگر میں غالبؔ پر اپنے مضامین کا مجموعہ آپ نے دیا تھا۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ (جس کے ساتھ کمال صاحب وابستہ تھے) اسے شائع کرے، تو اس پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔''

میں نے کتاب کی اشاعت کے لیے اپنی رضامندی سے آگاہ کیا۔ جون ۱۹۹۸ء میں کمال صاحب سے میری ملاقات سری نگر میں ہوئی۔ کتاب کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ ''مسودہ چوری ہو گیا ہے۔''

میں نے یہ کتاب بڑی عرق ریزی سے لکھی تھی۔ اس کے تلف ہونے پر جو صدمہ مجھے ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بجز اس کے اور کیا کہا جائے:

''آں دفتر را گاو خورد، گاو را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔''

مضمون کی تیاری کے لیے درج ذیل کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا:

(۱) ''آبِ حیات''، مولوی محمد حسین آزاد۔

(۲) سہ ماہی ''اردو''، بابت جنوری ۱۹۲۱ء۔

(۳) سہ ماہی ''اردو''، بابت جولائی ۱۹۲۵ء۔

(۴) ''اردوئے معلّٰی''، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۸۹۹ء۔

(۵) تذکرۂ ''گلشن ہمشہ بہار''، خویشگی۔

(۶) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء۔

(۷) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ۔

(۸) ''بیاضِ غالب بخطِ غالب تنقیدی جائزہ''، کمال احمد صدیقی۔

(۹) دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ (مطبوعۂ اردو اکادمی، لکھنؤ)۔

(۱۰) شرح دیوانِ غالب، مرتبہ آسی۔

(۱۱) ''مجمع الاشعار''، مطبعِ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء۔

(۱۲) ''نقوش'' لاہور، غالب نمبر ۱، ۳۔

(۱۳) ''نگار'' لکھنؤ، بابت فروری ۱۹۳۱ء۔

(''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے''۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی۔ ۲۰۰۲ء۔ ص ۱۳۴ تا ۱۵۰)

◆◆◆

ڈاکٹر انیس سلطانہ

دیوانِ غالبؔ (قلمی نسخہ حمیدیہ) کی دریافت

غالبیات کے سلسلے میں بھوپال نے ہمیشہ ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں اہم حصہ ادا کیا ہے اس سلسلے کی پہلی کڑی نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانے سے غالب کے غیر متروک قلمی کلام کی دریافت تھی۔ نواب فوجدار محمد خاں بانی ریاست سردار دوست محمد خاں کی چوتھی پشت میں تھے۔ اور سکندر جہاں بیگم کے حقیقی ماموں تھے۔ آپ کو ہر علم وفن کی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ خود صاحب علم تھے اور ان کے صاحب زادے یار محمد خاں شوکت کے مطابق:

> ''علم ونحو وصرف ومنطق، فقہ وہیئت وجغرافیہ وعلم طب وعلم ادب میں ذی استعداد اور علم موسیقی میں استاد تھے۔'' [1]

ان کے کتب خانہ میں اردو فارسی وعربی کی تقریباً ایک ہزار اور سنسکرت کی تین سو کتابیں تھیں۔ مطبوعات کے علاوہ بڑی تعداد میں مخطوطات بھی تھے۔ جن میں سے کچھ آج بھی سینٹرل لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں میں حافظؔ، انوریؔ، رافتؔ، ظہیر فاریابیؔ، بلیغؔ، عرفیؔ، دردؔ، جعفر زٹلیؔ، جلالؔ، صائبؔ، سوداؔ، جرأتؔ، انشاؔء اور مومنؔ کے قلمی دیوان بھی شامل تھے۔

نواب فوجدار کے انتقال کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کتابوں کو قصر سلطانی میں منگوالیا جو بعد ازاں لائبریری میں منتقل کردی گئیں۔ وقت کی گرد کئی صداقتوں کو چھپادیتی ہے۔ لیکن ہوا کا کوئی جھونکا برسوں کی گرفت کو آن کی آن میں صاف کردیتا ہے۔ یہی کچھ مذکورہ قلمی دیوان غالبؔ کے ساتھ بھی ہوا۔ اگست ۱۹۱۸ء کو مولوی عبدالسلام کو بھوپال کی حمیدیہ لائبریری

(موجودہ سینٹرل لائبریری) میں یہ مکمل نسخہ نظر آیا۔ جس کی اطلاع ''معارف'' کے ستمبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں سید سلیمان ندوی کے ذریعہ اربابِ علم وادب تک پہنچی۔

غیر متروک دیوان کا ملنا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اہلِ ذوق میں اس خبر سے جوش وخروش پیدا ہوا۔ عبدالرحمٰن بجنوری اُن دنوں محکمہ تعلیم کے سربراہ تھے۔ انھوں نے اس نسخہ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور بغور اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

مولانا عبدالحق، انجمن ترقی اردو کی جانب سے پہلے ہی اہتمام وصحت کے ساتھ دیوانِ غالب چھاپنا چاہتے تھے۔ اب جو مکمل دیوان دستیاب ہوا تو انھوں نے از سرِ نو پورے کلام کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیوں کہ اہل بھوپال نے اس قلمی دیوان کو بھوپال سے باہر جانے دینا گوارا نہیں کیا۔ بجنوری کے خلاف بھی مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن بجنوری اس فخر سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ انجمن کی جانب سے سید ہاشمی بھوپال آئے اور اس کی طباعت کے سلسلہ میں بجنوری کو اپنی تجاویز سے آگاہ کیا۔ انجمن اس اشاعت کو ایک شاہکار اشاعت ثابت کرنا چاہتی تھی، بجنوری اصل نسخہ کا عکس بھی ساتھ میں شامل کرنا چاہتے تھے، اور سید ہاشمی کی وضاحت کے مطابق:

> ''ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کروانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحہ پر قلمی نسخہ کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحہ پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جا بجا سے مرزا صاحب نے خارج کر دیے تھے، مگر اس قلمی نسخہ میں محفوظ رہ گئے تھے اور مطبوعہ یا قلمی نسخہ کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا، تا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم وجدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح وتنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔ یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے۔ لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا۔'' ۲

قلمی نسخہ، بجنوری کی وفات سے کم وبیش تین ماہ قبل دستیاب ہوا تھا۔ اُن کا معرکۃ الآراء

مضمون جو بعد میں ''محاسن کلام غالبؔ'' کے نام سے مشہور ہوا، متداول دیوان کو سامنے رکھ کر لکھ گیا تھا۔ ادھر بھوپال میں نسخہ حمیدیہ کی طباعت کی تیاریاں ہو رہی تھیں، مفتی انوار الحق اس کی ترتیب میں مصروف تھے کہ انجمن ترقی اردو نے اپنے سہ ماہی رسالے ''اردو'' میں عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کو شائع کر دیا۔ مفتی انوار الحق نے ۱۹۲۱ء میں بعض جلدیں بغیر مقدمہ کے شائع کیں۔ بعد میں انھیں بجنوری کی تصویر اور مقدمہ مل گیا جسے انھوں نے بعد کی جلدوں میں شامل کیا۔

مفتی انوار الحق نے خود بھی ضروری تمہید کے ساتھ، ایک مختصر دیباچہ سپرد قلم کیا ہے، اس لیے نسخہ حمیدیہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے ناقد کی حیثیت سے مفتی انوار الحق کا نام لیا جانا چاہیے۔ چوں کہ غالبؔ کے غیر متروک کلام پر پہلی ناقدانہ نظر ڈالنے والی ذات مفتی انوار الحق کی ہی ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے سرورق کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ طبع اول دو طرح کی جلدوں پر مبنی ہے۔ ایک طرح کی جلدیں وہ ہیں جن میں مفتی انوار الحق کا مضمون اور بجنوری کا مشہور زمانہ مقدمہ شامل ہے۔ ان جلدوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ دوسری قسم کی جلدوں میں عبدالرحمٰن بجنوری کا مقدمہ اور مفتی انوار الحق کا مضمون شامل نہیں ہے۔ لیکن مطبع کے اندراج میں خفی قلم سے طباعت کا سال اوّل ۱۹۲۱ء درج ہے۔

جن جلدوں میں مقدمہ اور مضمون دونوں شامل ہیں ان کے سرورق بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک آگرہ کا چھپا ہوا ہے اور دوسرا گورنمنٹ پریس بھوپال کا۔ اس طرح نسخۂ حمیدیہ کے بیک وقت تین طرح کے سرورق پائے جاتے ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کے طبع اول کی اشاعت (۲۰×۲۶)÷۸ سائز کے کاغذ پر ہوئی تھی۔ مفتی انوار الحق کے سامنے نہ تو تدوین نو کی کوئی مثال تھی اور نہ اُن کے ساتھ کام کرنے والوں کو جدید تحقیق سے مس تھا، اس کے باوجود انھوں نے پوری دیانتداری سے اس امر کی کوشش کی کہ ''ناظرین کے سامنے غالبؔ کے کلام کا ایک مکمل نمونہ پیش کیا جائے۔'' اور یہ جب تک ممکن نہ تھا جب تک کہ متروک اشعار کے بارے میں معلوم نہ ہو نیز ترمیم شدہ الفاظ سے واقفیت بہم نہ پہنچائی جائے۔ اس لیے مفتی انوار الحق نے جو طریقہ اختیار کیا اُسے سمجھنے کے لیے ذیل کا اقتباس پڑھنا ضروری ہے:

''ہر ایک ردیف میں پہلے دونوں دیوانوں کی ہم طرح غزلوں کو لکھا ہے۔ قلمی نسخہ کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں اُن کے سامنے ''م'' لکھ دیا ہے۔ تا کہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ ابتداء یہ غزل اس طرح کہی گئی تھی اور اس میں فلاں فلاں اشعار جن کے سامنے ''م'' لکھا ہوا ہے مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد جو شعر قلمی دیوان کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کہے گئے وہ موجودہ اُن کو لکھ دیا جائے تا کہ پوری غزل پیش نظر ہو جائے۔ مشترک شعر جو قلمی نسخہ کی غزل میں اوپر درج ہو چکے ہیں اور جن کو ''م'' کے اشارہ سے ممتاز کر دیا ہے ان کو اب دوبارہ مروجہ دیوان کے بقیہ اشعار کے ساتھ لکھنا غیر ضروری تھا...... جہاں خفیف سی ترمیم ہوئی ہے وہاں ان مصرعوں کو اوپر نیچے لکھ کر سامنے ایک قوس بنا کر دوسرا مصرعہ لکھ دیا ہے اور ہر جگہ یہ التزام رکھا ہے کہ اوپر جو مصرعہ لکھا ہے وہ قلمی نسخہ کا ہے...... اس میں مصلحت یہ سمجھی ہے کہ تدریجی اصلاح کی کیفیت ظاہر ہو جائے۔ ہم طرح غزلوں کے بعد اس ردیف کی قلمی نسخے کی وہ غزلیں لکھ دی ہیں جو بالکل نئی ہیں۔ پھر ان کے بعد مروجہ دیوان کی وہ غزلیں بڑھائی گئی ہیں جو ۱۲۳۷ھ کے بعد کی ہیں۔ یوں ہر ایک ردیف کے کل شعر ایک ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں جن میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ابتدا میں غالبؔ کے دیوان کی کیا شان تھی اور بعد میں کیا ہوگئی۔'' ۳؎

بعد میں مفتی انوار الحق کی اس ترتیب پر بہت سے اعتراض کیے گئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ نسخۂ حمیدیہ ترتیب اور تدوین کے اعتبار سے ناقص ہے۔ مفتی انوار الحق نے کلام غالبؔ پر اجمالی تبصرہ کیا ہے۔ غیر متروک کلام غالبؔ کی پچیس سال کی عمر تک کہا گیا کلام ہے اور مفتی انوار الحق کا خیال ہے:

''اس لیے اس کلام میں روانی اور پختگی کی توقع نہیں کی جا سکتی جو بعد کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہے اور کہیں کہیں بندش کی چستی اور مضمون کی پستی مذاق سلیم کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ تاہم بحکم عموم ترکیبوں کی جدت، تشبیہوں کی ندرت،

خیالات کی بلند پردازی اور مضامین کی آسماں پیمائی اس میں بھی ویسی ہی نمایاں ہے جیسی بعد کے کلام میں، فرق اتنا ہے کہ نشہ شباب کی ترنگ اور نازک کلامان ایران کے رنگ نے ان شعروں کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔'' [۲]

یہ جائزہ صرف سرسری مطالعہ پر مبنی ہے ورنہ اسی دیوان میں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جو اس وقت بھی موجود تھے اور آج بھی مطبوعہ دیوان کی رونق ہیں۔

جیسے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

☆

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوائی کا
بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

☆

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

☆

وہ مری چین جبین سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب بہ بے ربطی عنواں سمجھا

☆

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

غالبؔ کا یہ دیوان صرف کلام متروک پر مشتمل نہیں ہے۔ پچیس سال کی عمر تک انھوں نے ایسے نادر اور دلکش اشعار کہہ لیے تھے جو روانی اور پختگی کی توقع نہیں کی جاسکتی'' کے دائرہ میں نہیں آتے۔ یہ اور ایسے ہی کتنے اشعار ہیں جو مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ اور اہل نظر جنھیں سرمہ نظر

سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے بھی متعدد اشعار ہیں جو صرف قلمی دیوان میں موجود ہیں اور جو حسن ادا کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں یقینی طور پر انتخاب کی قینچی کی گردن پر ان کا خون ناحق ہے:

ضعفِ جنوں کو وقت تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

☆

خود پرستی سے رہا ہے باہم دگرنا آشنا
بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۲ء تک کے کلام میں بعض وہ اشعار بھی فکر شاعری کی داد چاہتے ہیں جو بعد میں حاشیہ میں بڑھائے گئے:

ذوق سرشار سے بے پردہ ہے طوفان میرا
موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

☆

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامی نفس شعلہ یار حیف

گویا یہ سمجھنا کہ ابتدائی عمر کا تمام کلام صرف مشکل گوئی کی ذیل میں آتا ہے مناسب نہیں یہ صحیح ہے کہ غالبؔ نے بیدلؔ کا تتبع کیا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جلد ہی انھوں نے اپنے لیے نئی راہیں بھی تلاش کرلیں۔ مفتی انوارالحق ایسے متعدد اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں جہاں غالبؔ نے بیدلؔ کی رہنمائی کا اعتراف کیا ہے۔

حالیؔ کی ہمنوائی میں اس خیال کی تائید کی جاسکتی ہے کہ تمام ابتدائی کلام مشکل پسندی اور دقت آفرینی کا نمونہ تھا، لیکن جب یہ مان لیا گیا کہ قلمی دیوان ۲۵ سال کی عمر تک کا کلام ہے اور اس میں موجود سہل ممتنع کی غزلیں، غالبؔ کے اس رجحان کی چغلی کھا رہی ہیں، تب یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اس زمانے میں ان کے یہاں ایسے اشعار بکثرت موجود تھے جو صرف دقت آفرینی کے شوق کے لیے نہیں لکھے گئے تھے۔

مفتی انوار الحق غالبؔ کے اس قول سے استناد کرتے ہیں کہ:

''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے۔'' ۵

ابتدائے مضمون میں مفتی انوار الحق نے ایک جو سرسری سا خیال ظاہر کیا تھا لیکن بعد میں خود ہی اس کی نفی کر دی:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ غزل اور یہ شعر بھی اس قلمی نسخہ میں موجود ہے اور اسی عہد شباب کی یادگار ہے اور اس سے اُس زمانے کے اور صدہا شعروں سے ثابت ہوتا ہے باوجود دِقت پسندی، جب صاف گوئی اور واقعہ نگاری پر آجاتے تھے تو اس نو مشقی میں بھی، ان کا کلام سہل ممتنع ہو جاتا تھا۔

مفتی انوار الحق تمام و کمال کلام غالبؔ کی اشاعت کے سلسلے میں مخالفین کا نظریہ بتانے کے بعد اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں:

''یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس قلمی نسخے کے مل جانے سے ہم کو غالبؔ جیسے مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد کی شاعری کے درجہ بدرجہ نمونے نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اس کے اشعار کا کیا رنگ تھا اور اس میں رفتہ رفتہ کیا تغیر ہوا۔'' ۶

شاعری کے ارتقائی مدارج طے کرنا اور اس روشنی میں شاعر کے مزاج سمجھنا، یقیناً یوروپین طریق تنقید کی دین ہے۔

حالیؔ دیوانِ غالبؔ کے انتخاب اور شعری رویہ کی تبدیلی کو ان کی سلامتیِ طبع سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن مفتی انوار الحق اسے بھی ان کی جدّت طرازی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یادگارِ غالبؔ سے انفرادیت کے متعلق ایک طویل اقتباس دے کر لکھتے ہیں:

''یہی جدّت طرازی اور ندرت پسندی تھی جس نے اس وقت غالبؔ کو اپنے

اشعار کے حذف واسقاط پر مجبور کیا تھا اور یہی ہے جس نے ان کے منتخب کلام کو اردو کا مایہ ناز بنادیا ہے۔" ۷

مفتی انوار الحق نے تصوف کے معاملہ میں بجنوری سے اختلاف کرتے ہوئے اسلامی تصوف پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے اور ایک بار پھر سے یہ اختلاف اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ اسے الگ سے ایک مضمون کا متبادل سمجھا جا سکتا ہے۔

مفتی انوار الحق کا خیال ہے کہ یہ دیوان اضافے کے لیے وقتاً فوقتاً غالبؔ کے پاس جاتا رہتا تھا، اور یہ کہ حاشیوں پر جو اضافے اور ترمیمات ہیں وہ بخطِ غالبؔ ہیں۔ قلمی دیوان کو دیکھنے والوں میں ڈاکٹر عبداللطیف بھی تھے جنھوں نے ان اضافوں کو بخطِ غالبؔ ہونے سے انکار کیا ہے اور مفتی انوار الحق چوں کہ کوئی سند پیش نہیں کر سکے، اس لیے یہ بات مان لینا چاہیے کہ یہ اشعار غالبؔ کے ضرور ہیں لیکن غالبؔ کی تحریر میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی ریویو بابت جنوری ۱۹۲۹ء سے ترجمہ کیا گیا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ نے اسی مضمون سے استفادہ کیا ہے اور ترمیم و حذف شدہ عبارت کو غالبؔ کا ماننے سے انکار کیا ہے۔

بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے تعلق سے متعدد ماہرین غالبیات نے مضامین سپردِ قلم کیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اُسے "صحیفہ منسوخ" کا نام دیا، ان مضامین میں ناقدین نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور سے وہ ناقدین جنھوں نے مذکورہ نسخہ کو بچشم خود دیکھا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ نسخۂ بھوپال ۱۹۲۱ء میں متداول دیوان کے ساتھ نسخۂ حمیدیہ کی شکل میں شائع ہوا اور کچھ عرصہ بعد اصل نسخہ سینٹرل لائبریری بھوپال سے غائب ہو گیا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے جو انھوں نے "نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر عبداللطیف" میں ظاہر کیا ہے:

> "اس سلسلہ میں پہلا اہم بیان مفتی انوار الحق کا ملتا ہے۔ اس کے اختصار اور تشنگی کی بہت کچھ تلافی مولانا امتیاز علی عرشی کی اس تحریر سے ہوتی ہے جو دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے دیباچے کا ایک جزو ہے مگر جو پہلو دونوں حضرات نے لیے ہیں ان میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔" ۸

ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب "غالبؔ" میں دیوان مذکورہ پر ثبت مہروں کا ناپ بھی درج

کیا ہے اور نسخۂ بھوپال کے صفحات کی تعداد بھی بتائی ہے۔ نیز اس خیال سے بھی انکار کیا ہے کہ بعد کے اضافے اور اصلاحیں غالبؔ کے خط میں تھیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف انھیں مختلف تحریروں میں لکھا ہوا ثابت کرتے ہیں۔

بعد میں اسی تحریر کی روشنی میں نسخۂ بھوپال اور ''نسخہ بھوپال بخط غالب'' جس کی دریافت غالبؔ صدی کے دوران ہوئی بہت سے نتائج اخذ کیے گئے۔ ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ اور ڈاکٹر حامد حسین نے محکمہ آثار قدیمہ کے نادرات کے ریکارڈ کی چھان بین کی اور ۱۹۲۸ء تک اس کا کتب خانہ میں موجود ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بعدازاں یہ قلمی نسخہ جو یقیناً بوسیدہ ہو چکا تھا، بجائے ''نادرات'' میں شمار ہونے کے ''گم شدہ'' کی فہرست میں آ گیا۔

ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ ''نسخۂ بھوپال چند انکشافات'' میں لکھتے ہیں:

> ''نسخۂ بھوپال کے گم یا تلف ہونے کا قیاس جس نسبت سے کمزور ہوتا ہے اسی نسبت سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ مخطوطہ یا تو نواب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے یا انھیں کے توسط سے کسی اور کے قبضہ میں چلا گیا۔'' ۹

بعض غلط فہمیاں مفتی انوار الحق کے سرسری بیانات نے بھی پیدا کر دی تھیں، انھیں بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ نے غالبیات کے چند مباحث میں اور ڈاکٹر حامد حسین نے مفتی انوار الحق اور نسخۂ حمیدیہ میں ان پر روشنی ڈالی اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔

نسخۂ حمیدیہ سے متعلق جو غلط فہمیاں عام تھیں ان میں بجنوری کو اس کا مرتب قرار دیا جانا، ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' کا غیر متروک کلام کو سامنے رکھ کر لکھا جانا اور دیوانِ مذکور کا غالبؔ کی تحریر میں ہونا...... اس سلسلے میں بہت چھان بین کی گئی۔ بعض غلط فہمیاں خود مفتی انوار الحق کے بیان سے پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ نے تلاش و تحقیق جاری رکھی اور اس سلسلہ میں جو مضامین سامنے آئے انھوں نے بہت سی غلط فہمیوں کو دور ہی نہیں کیا بلکہ غالبیات کے سلسلہ میں نئی تلاش و جستجو کو جگہ دی۔ نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ بجنوری کا مقدمہ اس لیے اہم نہیں ہے کہ اسے قلمی دیوانِ غالبؔ کے مقدمہ ہونے کا فخر حاصل ہے، اسے یہ اہمیت دراصل اس کی انفرادی نوعیت نے عطا کی۔

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت جن حالات میں ہوئی، وہ بجنوری کی وفات کے بعد کا نتیجہ ہے بجنوری دیکھ رہے تھے کہ دیوانِ غالبؔ کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے تھے، لیکن کوئی بھی ان کی نفاست پسند طبیعت کو پسند نہ تھا۔ کوئی اشاعت اس معیار تک نہ پہنچتی تھی جسے وہ عالمی ادبیات کے مقابلہ پر رکھ سکیں۔ خود غالبؔ کی زندگی میں ہی دیوان غالبؔ پانچ بار اشاعت کی منزل سے گزر چکا تھا:

۱۔ پہلا ایڈیشن مطبوعہ مطبع سید الاخبار دہلی، ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء
۲۔ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ مطبع دارالسلام دہلی ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۴۷ء
۳۔ تیسرا ایڈیشن مطبوعہ مطبع احمدی، ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء
۴۔ چوتھا ایڈیشن مطبوعہ مطبع نظامی کانپور، ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء
۵۔ پانچواں ایڈیشن مطبوعہ مطبع مفید خلائق آگرہ، ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء

اشاعتوں کی اتنی تعداد یقیناً غالبؔ کے فن کی قدردانی کا ثبوت تھی۔ وہ غالبؔ جسے شکوۂ زمانہ بھی تھا اور ناسخن فہمی کا گلہ بھی۔ اس ذہنی ناآسودگی کے باوجود زمانہ نے غالبؔ کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کی، کہیں ان کا مکمل کلام محفوظ تھا تو کہیں قلمی بیاضوں میں محفوظ کر لیا گیا تھا چناں چہ نسخۂ حمیدیہ کے قلمی دیوان کے علاوہ غالبؔ کا جو کلام جا بجا دستیاب ہوا اس کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔

زمانی تقدم بے شک نسخۂ حمیدیہ کے متن کو حاصل ہے۔ ایک جائزہ کے مطابق:

۱۔	نسخۂ حمیدیہ بھوپال	مکتوبہ	۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء
۲۔	نسخۂ شیرانی	مکتوبہ	۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء
۳۔	نسخۂ گلِ رعنا	مکتوبہ	۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء
۴۔	نسخۂ رام پور قدیم	مکتوبہ	۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۳ء
۵۔	نسخۂ بدایوں	مکتوبہ	۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۳۸ء
۶۔	نسخۂ پٹنہ	مکتوبہ	۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء
۷۔	نسخۂ لاہور	مکتوبہ	۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء
۸۔	نسخۂ رام پور جدید	مکتوبہ	۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء

۹۔ انتخاب غالبؔ مکتوبہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۲ء

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت غالبؔ کی وفات کے پورے پچاس سال بعد عمل میں آئی اور یہ امر یقینی ہے کہ اس میں غالبؔ کا سب سے قدیمی کلام موجود ہے۔ یہی اس کے افتخار کا سبب ہے۔ بجنوری کا مقدمہ قلمی دیوان غالب کے لیے نہ تھا، لیکن اس کے ساتھ شائع ہونے سے ایک عام خیال یہ پیدا ہوا کہ بجنوری نے یہ مقدمہ اسی دیوان کے لیے لکھا تھا۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ یار محمد خاں شوکت۔ ''تذکرہ فرح بخش''۔ مکتبہ نظامی، کانپور۔ ۱۹۷۱ء۔ ص ۴۲۔

۲۔ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۶۱ء۔

۳۔ مفتی محمد انوار الحق۔ ''دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ۔ مفید عام پریس، آگرہ۔ ۱۹۲۱ء، ص ۱۰۔ ۱۱۔

۴۔ مفتی محمد انوار الحق۔ محولۂ بالا۔ ص ۱۰۔ ۱۱۔

۵۔ مفتی محمد انوار الحق۔ محولۂ بالا۔ ص ۱۴۔

۶۔ مفتی محمد انوار الحق۔ محولۂ بالا۔ ص ۲۲۔

۷۔ مفتی محمد انوار الحق۔ محولۂ بالا۔ ص ۲۶۔

۸۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ''غالبیات کے چند مباحث''۔ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ص ۶۷۔

۹۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ محولۂ بالا۔ ص ۲۳۔

(''بھوپال میں اُردو تحقیق وتنقید کا ارتقاء''۔ ۲۰۰۸ء۔ ص ۷۸ تا ۸۸)

◆◆◆

ظفر احمد صدیقی

نسخۂ حمیدیہ: دریافت، گمشدگی، بازیافت

غالبؔ نے اگرچہ اپنے کلام میں جا بجا اپنے بختِ خفتہ کا رونا رویا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعرانہ شہرت و قبول کے لحاظ سے عموماً اور اپنے کلام کے نادر و نایاب قلمی نسخوں کی اچانک دستیابی کے لحاظ سے خصوصاً نہایت بیدار بخت واقع ہوئے تھے۔ اس سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۱۸ء میں مولانا عبدالسلام ندوی نے کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال میں غالبؔ کے قدیم مسترد دیوان مکتوبہ ۱۸۲۱ء کی موجودگی کا انکشاف کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ ''معارف'' ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات کے ذریعے علمی و ادبی حلقوں کو اس گوہرِ بے بہا سے مطلع کیا۔ سید صاحب نے یہ اطلاع ان الفاظ میں دی تھی:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی 'شعرالہند' کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانۂ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا۔ یعنی مرزا غالبؔ کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا حذف و انتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مُطلّا نسخہ ہے۔ کسی خوش مذاق کے ہاتھ وہ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ بھی لکھ دیا ہے۔
>
> یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے۔ موصوف آج کل دیوانِ غالب کی خدمت گزاری میں مصروف

ہیں اور عنقریب ان کے نتائجِ فکر انجمن ترقی اردو کے ذریعے منظرِ عام پر آئیں گے۔
ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرین
معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔" ۱

ڈاکٹر ابو محمد سحؔر کی اطلاع کے مطابق اس مخطوطے کے دریافت ہوتے ہی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی زندگی میں سید ہاشمی فرید آبادی نے اسے خصوصی طور پر بھوپال آکر دیکھا تھا جس کا بیان ہاشمی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس نایاب کلام کے مل جانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو نہایت خوشی ہوئی اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے اس خاکسار نے بھوپال جا کر اس قلمی نسخے کی زیارت کی جو ۱۲۳۷ھ میں (جبکہ مرزا غالب کی عمر صرف پچیس برس کی تھی) تحریر کیا گیا تھا۔ لوح اور خاتمہ کتاب کی عبارت نیز اشعار پر ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ مرزا غالبؔ مرحوم ہی کا کلام ہے اور چوں کہ بالکل ابتدائی زمانے میں نقل کرایا گیا تھا لہٰذا گو بعد کی غزلیں اس نسخے میں نہیں درج ہوئیں، تاہم وہ ابتدائی کلام تمام و کمال محفوظ رہ گیا جسے مرزا نے دیوان چھپواتے وقت خارج اور تلف کر دیا تھا۔" ۲

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے ایک مضمون "نسخۂ بھوپال: چند انکشافات" میں یہ اہم اطلاعات بھی فراہم کی ہیں کہ کتب خانۂ حمیدیہ کے قدیم ریکارڈ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ:

"اس مخطوطے کو ڈاکٹر بجنوری نے حمیدیہ لائبریری سے ۴، اگست ۱۹۱۸ء کو مستعار لیا تھا۔ ان کے انتقال (۷، نومبر ۱۹۱۸ء) کے بعد سرکاری طور پر یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب کے لیے مفتی انوار الحق ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس رہا اور پھر ۹، مارچ ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر بجنوری ہی کے نام پر واپس کیا گیا۔ اس کے بعد ۳، نومبر ۱۹۲۷ء کو ماسٹر ولی محمد نے اس کو جیسا دیگر حوالوں سے معلوم ہے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو حیدر آباد بھیجنے کے لیے کتب خانے سے اخذ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد ۲۱، جنوری ۱۹۲۸ء کو کتب خانے میں واپس کر دیا۔" ۳

ڈاکٹر عبداللطیف کے بعد اس نسخے سے استفادہ کرنے والوں میں سب سے اہم نام پروفیسر حمید احمد خاں کا ہے۔ اس لیے یہاں ان کے بعض مشاہدات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مرتبہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مفتی محمد انوار الحق کا نسخہ شائع ہوا تو یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مطبوعہ نسخہ، قلمی نسخے کی صحیح نقل نہیں ہے۔ اس بارے میں شاید سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے نسخے میں کئی جگہ حاشیے کے اندراجات اور متن کے درمیان ضروری امتیاز قائم نہ رہ سکا۔ چناں چہ صحیح صورت حال کی دریافت کے لیے قلمی نسخے کا مطالعہ ضروری ہوگیا۔ اواخر اگست ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک سفر سے واپس لاہور آتے ہوئے بھوپال ٹھہر گیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ نہ رکھنے سے قطع نظر مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے..... یہ صورت حال دیکھ کر میرے لیے لازم ہوا کہ میں اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھوں، اول یہ کہ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب متعین کروں اور دوم یہ کہ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان جہاں جہاں اختلاف ہے اس کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لوں۔ افسوس ہے کہ وقت کی کوتاہی کے باعث میرے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ مخطوطے کے ہر شعر اور مصرع کو لفظ بہ لفظ دیکھ لیتا۔'' ۴

پروفیسر حمید احمد خاں کے بعد نامور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ۱۹۴۴ء میں مذکور الصدر نسخے کا مطالعہ کیا۔ چناں چہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی'' کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے اجلاس ناگپور (منعقدہ ۱۹۔۲۰۔۲۱ جنوری، ۱۹۴۴ء) سے واپسی میں خاص اس نسخے کو دیکھنے کے لیے بھوپال میں دو دن قیام کیا تھا۔ اس مختصر مدت میں اس گوہرِ بے بہا کی حالت بھی دیکھی اور جہاں تہاں سے اصل اور مطبوعہ نقل کا مقابلہ بھی کیا۔'' ۵

قلمی نسخے سے مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے تقابل کے بعد مولانا عرشی نے یہ رائے قائم کی کہ مفتی صاحب تصحیح کا حق ادا نہ کر سکے اور اس میں ہر طرح کی غلطیاں راہ پا گئیں۔ اس ضمن میں مولانا نے جس طرح کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ نسخۂ بھوپال کے بہت سے اشعار چھوڑ دیے ہیں۔

۲۔ متداول دیوان میں شعر موجود ہے مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

۳۔ نسخۂ بھوپال کے حاشیے میں شعر موجود ہے، مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

۴۔ نسخۂ بھوپال کا لفظ چھوڑ کر صرف متداول لفظ نقل کیا۔

۵۔ نسخۂ بھوپال میں شعر نہیں ہے اور پھر بھی اسے نسخۂ بھوپال کا ظاہر کیا ہے۔

۶۔ محل اصلاح غلط بتایا ہے۔

۷۔ نسخۂ بھوپال کی صحیح قرأت کو غلط چھاپ دیا ہے۔

۸۔ متداول قرأت کچھ ہے اور چھاپ کچھ دی گئی ہے۔

۹۔ کاپی نویس کی غلطیوں کی اصلاح نہیں ہو سکی ہے۔ ۶

جنوری ۱۹۴۴ء کے بعد کسی نے اس نسخے کا مطالعہ کیا ہو، اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں انضمام ریاست بھوپال کے بعد اس کی گمشدگی کی اطلاع ملتی ہے۔ چناں چہ مولانا عرشی لکھتے ہیں:

> ”ریاست بھوپال کے ہندوستان میں انضمام کے بعد یہ گوہرِ بے بہا کتب خانۂ حمیدیہ سے گم ہو گیا۔ میں نے جب اس کے متعلق لائبریرین سے خط لکھ کر دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ حمید اللہ خاں صاحب نواب بھوپال نے انضمام سے پہلے اسے اپنے پاس طلب کر لیا تھا۔ خود نواب صاحب مرحوم سے جناب آصف فیضی کی معرفت معلوم کیا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ نسخہ کتب خانے سے غائب ہو گیا۔“ ۷

اسی طرح اس نسخے کی بابت ایک استفسار کے جواب میں مولانا عرشی نے اپنے مکتوب

مورخہ ۸، مارچ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ کو لکھا:

''نواب صاحب مرحوم سے میں نے ان کے ایک دوست کے ذریعے معلوم کرایا تھا تو انھوں نے اس نسخے کے اپنے پاس ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ خود میرا علم بھی یہی ہے کہ مَر جُر کی افراتفری میں کسی نے وہاں سے پار کر دیا۔ اب اللہ جانے کہ وہاں سے کہاں گیا۔ وہاں کے لائبریرین نے لکھا تھا کہ نواب صاحب نے منگا لیا تھا۔ اگر اس کا کہیں پتہ چل جائے تو مجھے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ مجھے اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بہت سے الفاظ کی تعیین کر سکوں گا۔'' ۸

ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ نے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر حمیدیہ کالج بھوپال میں اپنے رفیق کار سید حامد حسین کے ساتھ اس کی تلاش کا ایک سنجیدہ منصوبہ بنایا۔ اس مشترکہ چھان بین کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوا کہ نسخۂ بھوپال دیگر نادر مخطوطات کے ساتھ حمیدیہ لائبریری میں الماری نمبر ۴۷ میں رکھا ہوا تھا اور جہاں تک مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال میں جائزہ لیا جا سکا ان میں سے اب کوئی مخطوطہ اس لائبریری میں موجود نہیں۔ اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''چوں کہ اس سارے ذخیرے کے گم ہونے یا تلف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور یہ زبانی روایت پہلے سے موجود ہے کہ ''نادرات'' نواب صاحب مرحوم نے حمیدیہ لائبریری سے واپس لے لیے تھے۔ اس لیے راقم الحروف کی ناقص رائے میں نسخۂ بھوپال کے گم یا تلف ہونے کا قیاس جس نسبت سے کمزور ہوتا ہے، اسی نسبت سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ مخطوطہ یا تو نواب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے یا انھیں کے توسط سے کسی اور کے قبضے میں چلا گیا۔'' ۹

نسخۂ بھوپال کو دوبارہ دریافت کرنے کی تمام کوششوں کی ناکامی کے باوجود ڈاکٹر ابومحمد سحرؔ مرحوم نے لکھا تھا:

''اگر یہ مخطوطہ تلف نہیں ہو گیا ہے تو اس طویل و عریض دنیا میں کسی فرد یا ادارے کے پاس سے کبھی نہ کبھی ضرور برآمد ہوگا۔ لیکن فی الحال اس کی حیثیت ہم بے خبروں کے طاق نسیاں کے ایک گل دستے سے زیادہ نہیں۔'' ۱۰

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ۲۰۱۵ء میں اس گمشدہ نسخے کی بازیافت ہوگئی۔ اس بازیافت کا سہرا اولاً شہاب احمد اور ثانیاً ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی کے سر جاتا ہے۔ مہر اس نسخے پر اپنے تعارف میں لکھتی ہیں:

''یہ نسخہ مجھے شہاب احمد کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ شہاب نے اسے لندن میں نایاب کتابوں کے ایک بیوپاری سے حاصل کیا تھا۔''

اس مخطوطے پر مہر افشاں کا تعارف مفصل اور مبسوط ہے۔ انھوں نے متعدد اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے حل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس مخطوطے کو اس کی اصل شکل میں شائع کرا دیا ہے۔

شہاب احمد نے اصل مخطوطے کی ڈیجیٹل شکل تیار کی ہے۔ وہ اس نسخے پر اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ایک مجلد مخطوطے سے ڈیجیٹل کاپی تیار کرانا تکنیکی طور پر آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس بات کی پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ مخطوطے کو جس حد تک ممکن ہو اس کی اصل شکل و شباہت، جسامت اور حالت میں پیش کیا جائے۔ ہم نے جان بوجھ کر مخطوطے کے اندر پائی جانے والی کتنی خرابیوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خوش قسمتی سے یہ مخطوطہ ہر طرح کے حالات سے گزر کر ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ (شہاب احمد، ڈھاکہ، اکتوبر ۲۰۱۵ء)

راقم الحروف کو اس مخطوطے کا ڈیجیٹل شکل میں شائع شدہ ایک نسخہ ۲۰، مارچ ۲۰۱۶ء کو ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی کی عنایت سے قیمتاً حاصل ہوا ہے۔ میں نے اس مخطوطے کی ابتدائی پانچ غزلوں کا تقابلی مطالعہ مفتی انوار الحق، پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی کے مطبوعہ متون سے کیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس سے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

مخطوطے کی پہلی غزل کا مطلع نہایت مشہور ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اصل نسخے میں یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں کا متن اور اشعار کی ترتیب اصل کے مطابق ہے۔ مولانا عرشی نے ''گنجینۂ معنی'' میں صرف چار متروک شعر نقل کیے ہیں۔ اس غزل کا مقطع اس طرح ہے:

وحشتِ خواب عدم شورِ تماشا ہے اسدؔ
جو مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اصل مخطوطے میں مصرع ثانی کا پہلا لفظ ''جو'' ہے۔ تینوں مرتبین دیوانِ غالب نے بھی ''جو'' ہی لکھا ہے۔ لیکن بیاضِ غالبؔ بخطِ غالبؔ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صحیح لفظ ''جُز'' ہے اور ''جو'' سہوِ کاتب ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ صحیح لفظ کی طرف مولانا عرشی کا ذہن بھی منتقل نہ ہوسکا۔

قلمی نسخے میں چھ اشعار پر مشتمل دوسری غزل کا مطلع اس طرح ہے:

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سویدا تا بہ لب زنجیری دودِ سپند آیا

اس شعر کے مصرع ثانی میں غلط قرأت کے سبب مفتی انوار نے ''زنجیری'' کو ''زنجیرے'' لکھ دیا ہے۔ پروفیسر حمید نے بھی اس غلطی کی پیروی کی ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے اصل کے مطابق صحیح لفظ ''زنجیری'' لکھا ہے۔

اس غزل کا پانچواں شعر اصل نسخے میں اس طرح ہے:

عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی
خرامِ ناز، برقِ خرمنِ سعی سپند آیا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بھی غلط قرأت کے سبب مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں نے ''سعی سپند'' کو ''سعیِ پسند'' لکھ دیا ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے اصل کے مطابق صحیح متن کا اندراج کیا ہے۔ قلمی نسخے کے مطابق تیسری غزل کا مطلع ہے:

عالم جہاں بہ عرضِ بساطِ وجود تھا
جوں صبح چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

اصلاً یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ مفتی انوار کے مرتبہ دیوان میں اس غزل کا تیسرا شعر شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ پروفیسر حمید نے بھی انھی کی پیروی کی ہے۔ البتہ مولانا عرشی کے یہاں یہ شعر موجود ہے جو اس طرح ہے:

عالم طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سربسر
یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا

چوتھی غزل چھ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اس غزل کا چوتھا شعر اصل میں اس طرح ہے:

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ پر محمل پسند آیا

اس شعر کے مصرع ثانی میں بھی غلط قرأت کے سبب مفتی انوار اور پروفیسر حمید دونوں نے ''پر'' کو ''بر'' لکھ دیا ہے۔ البتہ مولانا عرشی نے یہاں بھی صحیح متن یعنی ''پر'' لکھا ہے۔

پانچویں غزل سات اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا مطلع حسب ذیل ہے:

تنگی رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

اس غزل کا مقطع اس طرح ہے:

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گذارشِ ذوقِ سجود تھا

مفتی انوار، پروفیسر حمید اور مولانا عرشی تینوں نے اس شعر کے مصرع ثانی میں لفظ 'گزارش' کو 'ز' سے لکھا ہے۔ حالاں کہ اصل قلمی نسخے میں یہ لفظ ''ذال'' سے لکھا ہوا ہے۔ مفتی انوار اور مولانا عرشی دونوں کا خیال ہے کہ زیر بحث نسخہ غالبؔ کے لیے لکھا گیا تھا یا ان کی نگاہ سے ایک سے زائد بار گزرا تھا۔ اس لیے اس نسخے میں ''گذارش'' کا ذال سے لکھا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس نسخے کے

سالِ کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ تک غالبؔ نے فارسی الفاظ میں ذال کے انکار کا موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ ان حقائق کے پیش نظر بہتر یہی تھا کہ اس شعر میں ''گذارش'' کو اصل کے مطابق ذال سے لکھا جاتا۔ واضح رہے کہ اس مخطوطے میں نیز بیاضِ غالب بخطِ غالب میں ''گذشتن'' اور اس کے مشتقات کو بھی ہر جگہ ذال ہی سے لکھا گیا ہے۔ اس سے بھی ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے جادۂ راہ
گذشتگاں اثرِ انتظار رکھتے ہیں

☆

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

☆

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گذشتن ہے
کہ یہاں ہر یک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

حاصل کلام یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی بازیافت اور اصل شکل میں اس کی اشاعت ہمارے عہد کا ایک عظیم الشان ادبی واقعہ ہے۔ اس سے مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح میں مدد ملے گی اور غالبؔ کے غیر متداول کلام سے متعلق بحث و تمحیص کے نئے دروازے کھلیں گے۔

آخر میں اہل علم کو اس طرف متوجہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد نظم طباطبائی نے اپنے ایک شاگرد عبدالرزاق راشدؔ کی درخواست پر ''اصلاحاتِ غالب'' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ غالبؔ نے اپنے اشعار میں جوڑ دو بدل کیا ہے اور دیوان سے جو اشعار خارج کیے ہیں تو اس کی وجوہ کیا ہیں؟ اس کتاب کی اشاعت طباطبائی کی وفات کے بعد ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے دیوان کی پہلی غزل میں ایک شعر اس طرح کہا تھا:

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یہاں زنجیر کا

بعد میں رد و بدل کر کے اسے انھوں نے یوں کر دیا:

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اس اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے طباطبائی لکھتے ہیں:

''آتشیں پا اور آتش زیر پا کا ایک ہی مطلب ہے۔ ان میں کا ایک لفظ حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ بنانے کے لیے کافی تھا۔ پھر گدازِ وحشتِ زنداں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس سے معنی میں الجھن پیدا ہوگئی تھی کہ آیا حلقۂ زنجیر کو آتشیں پا ہونے سے موئے آتش دیدہ کا وصف حاصل ہوا ہے یا گدازِ وحشت کے سبب سے۔ مصنف نے گدازِ وحشت کو نکال ڈالا۔ اب مطلب صاف ہوگیا۔''

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کا غیر متداول کلام بھی کیسا لائقِ توجہ ہے۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۔

۲۔ غالبیات کے چند مباحث، ص ۶۵، بہ حوالہ دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) تبصرہ از سیّد ہاشمی، اورنگ آباد، سہ ماہی اردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴۔

۳۔ غالبیات چند مباحث، محولۂ بالا ص ۹۱۔۹۲۔

۴۔ حمید احمد خاں، مقدمہ نسخۂ حمیدیہ (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۹ء) ص ۲۰۔۲۱۔

۵۔ مقدمہ، دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، طبع دوم، ص ۸۶۔

۶۔ محولۂ بالا، ص ۴۹۔۵۰۔

۷۔ محولۂ بالا، ص ۹۲۔

۸۔ غالبیات چند مباحث، ص ۶۴۔

۹۔ محولۂ بالا، ص ۸۷۔۹۳۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۴۔

مآخذ:

۱۔ سحر، ابومحمد، غالبیات چند مباحث، (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، مئی ۱۹۸۲ء) طبع اول۔

۲۔ غالب، اسداللہ خاں، بیاض غالب بخطِ غالب، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مشمولہ نقوش، غالب نمبر (حصہ دوم)، لاہور: ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۸۴ء۔

۳۔ ......دیوانِ غالب جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) مرتبہ مفتی محمد انوار الحق، بھوپال، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء، طبع دوم عکسی۔

۴۔ ..... دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ، پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء، طبع دوم۔

۵۔ ......دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، دہلی: انجمن ترقی اردو، ہند ۱۹۸۲ء، طبع دوم۔

۶۔ .... نسخۂ حمیدیہ (اصل مخطوطۂ دیوان کی ڈیجیٹل شکل) مع تعارف از مہر افشاں فاروقی، پیش لفظ، شہاب ستار، مورخہ اکتوبر ۲۰۱۵ء، سنہ و مطبع ندارد۔

۷۔ ندوی، سید سلیمان، شذرات، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء۔

۸۔ نظم طبا طبائی، اصلاحاتِ غالب، مرتبہ عبدالرزاق راشد، حیدرآباد، اعجاز پریس، ۱۹۶۶ء۔

۹۔ ہاشمی، سیّد، (مبصر) دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ)، مشمولہ اردو، اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۲۲ء۔

(سہ ماہی ''اُردو'' ۔ کراچی ۔ ۲۰۱۳ء ۔ ص ۲۵ تا ۳۵)

◆◆◆

ملیحہ ہاشمی

غالب کے گمشدہ مخطوطہ دیوان کی دریافت

غالب کا گمشدہ اصل مخطوطہ دیوان ''نسخۂ حمیدیہ'' دریافت

۱۸۲۱ء میں سپرد قلم کیے گئے غالب کے اشعار پر مبنی اس نسخے کی پچاس برس قبل گمشدگی کے بعد اسے معدوم تصور کیا جا چکا تھا

لندن (اپنے ذرائع سے) مرزا اسد اللہ خان غالب کے چاہنے والوں کے لیے یہ اطلاع کسی سنسنی خیز خوشخبری سے کم نہ ہوگی کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کا اصل مخطوطہ دریافت کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اور فسادات کے دوران اس نسخے کی گمشدگی کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اردو زبان میں کی گئی مستند اور خوبصورت ترین شاعری کے حامل ۱۸۲۱ء میں تحریر کیے گئے اس نسخے کو نواب فوجدار محمد خان کے لیے مخطوطہ کیا گیا تھا جبکہ خطاطی کے ضمن میں معروف خطاط حافظ معین الدین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

اس معجزاتی دریافت کے پس پشت ''حسینی آرٹس ڈاٹ کام'' کے نام سے معروف آن لائن آرٹ گیلری اور عجائب گھر کی کوششیں کارفرما ہیں۔ اس حوالے سے ویب سائٹ سے وابستہ ترجمان کا کہنا تھا کہ ''یہ بجا طور پر ایک ناقابل یقین دریافت ہے اور ہم بہت پر جوش ہیں کہ اب ہم اصل مخطوطہ پڑھ سکیں گے، جو کہ اب تقریباً دو سو برس قدیم ہو چکا ہے۔ اردو شاعری سے محبت کرنے والے اس خبر سے شادمان ہوں گے کہ اب نسخۂ حمیدیہ کے اصل متن کو بھی غالب کی

تصنیفات میں شامل کیا جاسکے گا"

انھوں نے مزید کہا کہ طویل عرصے تک اس خبر پر یقین رکھنے کہ اصل مخطوطہ ضائع ہو چکا ہے اور ترمیم وتبدیل شدہ نسخوں کو ہی ''مستند'' سمجھنے کے بعد اب آخر کار ہم غالب کی اس ذہنی پرواز کو جان سکتے ہیں جس کے تحت یہ تحریر کیا گیا۔

یہ مخطوطہ دیوان غالب کے نو معروف مخطوطات میں سے اولین اور اس وقت مخطوطہ کیا گیا جب غالب کی عمر محض ۲۴ برس تھی۔ دانشور حضرات اور اشاعت کنندگان کا کہنا ہے اصل مخطوطے میں تقریباً ۱۸۰۰ سو اشعار تھے۔ یہ تعداد ۱۸۴۱ء میں شائع ہونے والے ''مستند'' نسخے میں موجود اشعار کے مقابلے میں تقریباً دوگنا ہے۔ ان اضافی اشعار کی دریافت بہت اہم ہے۔ اس دیوان سے منہا کیے جانے والے اشعار کو غالب نے اشاعت کے لیے موزوں تصور نہیں کیا تھا تاہم شاعری کے اصل شائق اس حذف کیے گئے متن کو پڑھنے کے مشتاق تھے۔ اس سے قبل ۱۹۲۱ء غالب کے انتقال کے تقریباً پچاس برس بعد مفتی انوار الحق نے اس مخطوطے کو اہل ذوق کی خاطر دوبارہ سے شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا تاہم انھوں نے اصل مخطوطے میں موجود کلام کو خالص نہ رہنے دیا بلکہ حاشیے بھی متن کا حصہ بنا دیے۔ حالاں کہ یہ امر واضح نہ تھا کہ حاشیے آیا غالب نے ہی تحریر کیے تھے یا کسی اور نے۔

بعد ازاں، ۱۹۶۹ء میں، پروفیسر حمید احمد خان نے تحریر کیا کہ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اصل مخطوطے کا جائزہ لیا تھا تاہم انھوں نے حذف شدہ حصے کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت نہیں کی، بعد میں انھوں نے شاعری کا ''درست'' متن شائع کیا تھا۔ جس وقت شاعری کا یہ ''درست شدہ'' متن شائع ہوا، اصل مخطوطہ غائب ہو چکا تھا، اس کی گمشدگی فرض کر لی گئی تھی یا ممکنہ طور پر ۱۹۴۷ء میں پاک بھارت تقسیم کے دوران ضائع ہو گیا تھا۔ اصل متن کی بطور ثبوت موجودگی نہ ہونے کے سبب قارئین کو تا حال پروفیسر خان کے شائع کردہ متن کو ہی مستند تسلیم کرنا پڑا۔ اصل نسخہء حمیدیہ جلد منظر عام پر لایا جائے گا اور مستقبل قریب میں اس کا فیسیملی ایڈیشن (Facsimile Edition) بھی شائع کیا جائے گا اور وہ تمام حضرات جو اردو شاعری کے

مداح ہیں، جلد ہی اس متن کو پڑھ سکیں گے کہ جس کو غالب نے انیسویں صدی کی اشرافیہ کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے تحریر کیا اور پھر خود ہی مسترد کر دیا۔ اصل مخطوطے کی دریافت سے تخلیقی گروہوں میں جشن کا سا سماں ہے بالخصوص وہ محققین جو مرزا غالب پر تحقیق کر رہے ہیں، ان میں سے بہت سے اس بنا پر پرجوش ہیں کہ اب تاریخ میں ترمیم و تبدیل شدہ متن کو حتمی شاعری کے طور پر جگہ نہیں مل سکے گی۔

(https://hamariweb.com/articles/51548)

◆◆◆

مہر افشاں فاروقی

ترجمہ: ملیحہ ہاشمی (لاہور)

نسخۂ حمیدیہ:
غالب کا زمانۂ جوانی میں تحریر کردہ دیوان

نوٹ: گزشتہ مضمون میں ہم نے آپ کو خبر دی تھی کہ غالب کا نسخہء حمیدیہ حسینی آرٹس کے تعاون سے دریافت ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی جو کہ ماہر غالبیات اور ورجینیا یونیورسٹی کی پروفیسر بھی ہیں، انھوں نے اس نسخے کا جائزہ لینے کے بعد قارئین اور غالب کے چاہنے والوں کے لیے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ذیرِ نظر مضمون ان کے اسی تبصرے کا ترجمہ ہے۔

☆......☆......☆

1918 میں، غالب کی وفات کے کم و بیش پچاس برس بعد، ریاست بھوپال کے حمیدیہ کتب خانہ سے ایک مخطوطہ دریافت ہوا جو بنا کسی شک وشبہے کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کا دیوان تھا۔ اشاعت کنندگان کے علامتی نشان (کولوفون) کے مطالعے سے یہ انکشاف ہوا کہ یہ کتاب (۱۲۳۷ ہجری، ۱۸۲۱ عیسوی) میں حافظ معین الدین نے مخطوطہ کی تھی۔ خطاط نے غیر مبہم الفاظ میں لکھا ہے کہ:

''دیوان من تصنیفِ مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلہم ربہم علی

یدالعبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۳۲۱ ۷ من الہجرت النبویہ صورت اہتمام یافت''۔

یہ مخطوطہ یا نسخہ (جیسا کہ ہم اردو میں کہتے ہیں) نہایت خوشخط ہے اور متن سرخ، سنہرے اور نیلے رنگ کے حاشیوں سے گھرا ہوا ہے۔ دیوان تحریر کرنے کے مروجہ طریقے کے مطابق غزل سے دیوان کا آغاز کرنے کی بجائے یہ نسخہ فارسی زبان کے ایک ''قطعہ'' سے شروع ہوتا ہے جس کے بعد اردو زبان میں دو قصیدے ہیں۔ وہ صفحہ جس پر بطور پہلی غزل کے ''نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا'' درج ہے، اس صفحے کو تفصیلاً نیلے اور سنہری رنگ سے سجایا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مخطوطہ دیوان اپنی دریافت کے فقط دو اڑھائی دہائی کے بعد ہی یہ ایک بار پھر حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو گیا تاہم اب اسے ایک بار پھر دریافت کیا جا چکا ہے۔

دیوانِ غالب، جسے ہمیں متداول یا موجودہ دیوان کہنا چاہیے، ان کی زندگی میں پانچ بار شائع ہو چکا تھا۔ پانچواں ایڈیشن جو کہ ۱۸۶۳ میں آگرہ سے شائع ہوا، اس میں کل ۱۷۹۵ اشعار ہیں۔ غالب کی وفات کے پچاس برس کے عرصے میں ان کے موجودہ دیوان کے ممکنہ طور پر متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہوں گے۔ میں دو تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں، ان میں سے ایک ۱۸۸۳ اور دوسرا ۱۸۸۷ میں معروف اشاعتی ادارے منشی نوال کشور پریس، لکھنؤ نے شائع کیے تھے۔ چھاپے گئے (متداول) دیوان کی بڑے پیمانے پر تقسیم نے غالب کو بلاشبہ اردو زبان کے شاعروں میں عظیم ترین ثابت کیا ہے، لیکن اس کی بنا پر ہر کوئی یہ بھی بھول گیا کہ یہ دیوان محض ایک انتخاب تھا اور ان کی اصل شاعری اس سے کئی گنا زیادہ مقدار میں تھی۔ غالب نے متداول دیوان میں شامل ۱۸۰۰ اشعار سے کہیں زیادہ تحریر کیا تھا۔ اس نسخہ حمیدیہ کی دریافت اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کی مدد سے ان اشعار کی بڑی تعداد منظر عام پر آئی ہے جو کہ دیوان غالب میں شامل نہیں تھے۔ نسخہ حمیدیہ میں شامل ۱۹۰۰ اشعار میں سے صرف ۷۰۰ اشعار کو دیوان میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۰۰ اشعار میں ۱۸۸۳ غزلوں کے اشعار ہیں۔

نسخہ حمیدیہ کے بارے میں اشاروں کنایوں میں پہلی بار سید سلیمان ندوی نے ذکر کیا تھا جنھوں نے اسے عبدالرحمٰن بجنوری کی ملکیت میں دیکھا، جو کہ اسے انجمن ترقی اردو کے لیے شائع

کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بجنوری ایک دانشور اور غالب کے عظیم مداحوں میں سے ایک تھے۔ ان کے معرکتہ الآرا مضمون ''محاسنِ کلامِ غالب'' کا آغاز دیوان غالب کو مقدس وید کے ہم پلہ قرار دینے سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب''۔ بجنوری کی اچانک وفات نے اس نسخے کی ایڈیٹنگ کی ذمہ داری ناتجربہ کار مفتی محمد انوارالحق کے کاندھوں پر چھوڑ دی، جو کہ ریاست بھوپال میں افسر برائے تعلیم تھے۔ حق کی نگرانی میں ۱۸۲۱ میں شائع ہونے والا یہ ایڈیشن غلطیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ادارتی غلطیاں تو قابل اعتراض تھیں ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حق کی جانب سے نسخے کے اصل ہونے کے بارے میں نکالا گیا نتیجہ بھی قابل بحث تھا۔ حق کا دعویٰ تھا کہ اس نسخے کو میاں فوجدار محمد خان کے لیے تحریر کیا گیا تھا، ان کی مہر مخطوطے کے متعدد صفحات پر نمایاں دیکھی جا سکتی ہے تاہم اس دعوے کو مولانا امتیاز علی خان عرشی نے رد کیا ہے۔ فوجدار محمد خان کی مہر پر تاریخ ۱۲۴۸ ہجری اور ۱۲۶۱ ہجری درج ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں مہریں مختلف اوقات میں لگائی گئیں۔ پس نسخہ ۱۸۲۱ میں مکمل ہو گیا تھا لیکن فوجدار صاحب کے کتب خانے کی اس تک پہنچ ۱۸۳۲ میں ممکن ہوئی تھی۔ اس نسخے کی تکمیل اور اس کے حصول کی تاریخوں میں گیارہ سال کا فرق یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ اس عرصے کے دوران کسی اور کے قبضے میں تھا۔ گو کہ ممکن ہے کہ یہ نسخہ بالخصوص فوجدار محمد خان کے لیے تیار نہ کیا گیا ہو تاہم انھوں نے اس نسخے کی ملکیت کے سبب خوب تعریف سمیٹی۔ نسخہ ءحمیدہ کے صفحہ نمبر ۲ پر موجود نواب کی تفصیلی اور پر آرائش مہر یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خان کے قیمتی اثاثوں میں شامل تھا۔

مولانا عرشی کے مطابق یہ نسخہ غالب کے ذاتی استعمال کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ غالب امکان ہے کہ جب اس کی دوسری کاپی تیار ہو گئی تو یہ ایک شاگرد کو دے دیا گیا۔ یہ ممکن ہے کہ غالب نے گل رعنا (۱۸۲۸) کے لیے غزلوں کے انتخاب کے بعد یہ نسخہ کسی کو دے دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے حفاظت کی غرض سے ایک اور نسخہ (نسخہ ءشیرانی ۱۸۲۶) بنوا کے کسی کو دیدیا ہو جبکہ وہ خود نسخہ ءحمیدیہ کے ہمراہ سفر کلکتہ پر روانہ ہوئے۔ اس نسخہ کا ایک متنازع پہلو حاشیے میں غزلوں کا اضافہ ہے جسے تحریر کرنے والے کے ہاتھ میں اگرچہ روانی ہے تاہم صفائی نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ: یہ اضافے کس نے کیے؟ مولانا عرشی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ غالب کا طرزِ تحریر ہے۔ کچھ دانشوروں کی رائے میں اس لکھائی میں وہ نفاست نہیں جو کہ غالب کی لکھائی میں ہونی چاہیے۔ گیان چند جین کے مطابق نسخۂ حمیدیہ میں درستگی اور اضافے نسخۂ شیرانی کے جاری ہونے کے بعد اس وقت کیے گئے جب یہ نسخہ غالب کے ہاتھ میں نہ رہا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے میں موجود نئی غزلیں اور پرانی غزلوں میں اشعار کے اضافے شیرانی سے نقل کیے گئے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کے اختتام پر چند خالی صفحات تھے، ان صفحات کو ''یہ'' کی ردیف میں تحریر کی گئی سات نئی غزلیں تحریر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ (۲ حاشیے میں تحریر کی گئی تھیں)۔ نقل کرنے والے لاپرواہ لوگ تھے۔ انھوں نے دو ایسی غزلیں بھی نقل کر ڈالیں جو کہ پہلے ہی نسخۂ حمیدیہ میں موجود تھیں جبکہ وہ غزلیں جو کہ شیرانی میں تھیں اور حمیدیہ میں نہ تھیں، وہ نقل کرنے والی کی نظروں سے اوجھل رہیں۔

اس نسخے کا ایک اور دلچسپ پہلو کہیں کہیں دکھائی دینے والا درست کا نشان ہے جو کہ شعر کے سامنے حاشیے میں لگایا گیا ہے۔ یہ نشانات مندرجہ ذیل اصحاب کی جانب سے لگائے گئے ہیں۔ عبدالاعلیٰ، عبدالصمد مظہر اور آغا علی۔ مثال کے طور پہلی غزل کے پہلے شعر کو ''ص'' سے نشان زدہ کیا گیا ہے اور اس پر عبدالاعلیٰ کے دستخط ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان افراد نے اس نسخے کو مستعار لیا ہو، یا پھر جیسا کہ مولانا عرشی کا تبصرہ ہے کہ نسخہ درستگی اور اضافے کے لیے غالب تک واپس پہنچا تھا۔ حقیقت جو بھی ہو، امرِ واقع یہ ہے کہ غالب اپنے کام پر نظرِ ثانی اور اس میں اضافہ کرتے رہے۔

یہ سوالات اتنے الجھا دینے والے نہ ہوتے اگر نسخۂ حمیدیہ حوالے کے لیے دستیاب ہوتا۔ نسخہ آخری بار ۱۹۴۴ء میں مولانا عرشی نے دیکھا تھا۔ بھارت کی تقسیم کے دوران پیش آنے والے بدامنی کے واقعات کے دوران اصل نسخہ کھو گیا۔ فی الحال جو چھپی ہوئی شکل میں دستیاب نسخہ ہے، وہ ۱۹۶۹ء کا حمید احمد خان صاحب کا ہے جسے انھوں نے ان یادداشتوں کی مدد سے تحریر کیا تھا، جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اس نسخے کے ساتھ ساتھ نسخۂ شیرانی اور مفتی انوار الحق کے جاری کردہ ایڈیشن کی مدد سے مرتب کیے تھے۔ اصل نسخۂ حمیدیہ کا تقریباً پچھتر برس بعد دوبارہ منظرِ عام پر آنا غالب کے چاہنے والوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حسینی آرٹ گیلری کی جانب سے فراہم

کردہ سکین شدہ نسخے کی جانچ کے نتیجے میں، میں اس امر کی قائل ہوں کہ درحقیقت یہی اصل نسخہ حمیدیہ ہے۔

میری معلومات کے مطابق غالب کے ابتدائی دیوانوں کی محض دو نقول جن میں سے ایک ۱۸۱۶ء کے دیوان کا ایڈیشن اور ایک نسخہ شیرانی ہے، دستیاب ہیں۔ ۱۸۱۶ء میں تحریر کیا گیا دیوان غالب کی اپنی لکھائی میں ہے اور اسے مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے: نسخہ بھوپال (کیوں کہ یہ بھوپال میں پایا گیا تھا)، نسخہ امروہہ (اس نسخے کو خریدنے والا تقسیم کار امروہہ سے تعلق رکھتا تھا) اور نسخہ عرشی زادہ (اسے ۱۹۶۹ء میں اکبر علی خان عرشیزادہ نے چھاپا)۔ ۱۸۱۶ء میں تحریر کیا گیا اصل دیوان غائب ہو چکا ہے۔ نسخہ شیرانی جو کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں محفوظ ہے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا تھا تاکہ وسیع پیمانے پر اس کی دستیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔ نسخہ حمیدیہ ہی وہ پہلا وہ مخطوطہ ہے جو کہ غالب کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا ہے اور جو ۱۸۲۱ء تک غالب کی اردو زبان پر عبور کا مظہر بھی ہے۔ اس نسخے کی دریافت نے نئے نسخوں کی دریافت کی راہ کھول دی ہے۔ تاریخی اور فنی لحاظ سے اس کی اہمیت کو مزید بڑھا چڑھا کے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ نسخے کی تازہ ترین نقول کی دستیابی بلاشبہ غالب کے حوالے سے علم کی دنیا میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگا۔

مضمون نگار مہر افشاں فاروقی ماہر غالبیات اور ورجینیا یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات وثقافت برائے مشرق وسطیٰ وجنوبی ایشیا میں اردو اور جنوبی ایشیائی ادب کے مضمون کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

(https://hamariweb.com/articles/51989)

مہر افشاں فاروقی

ترجمہ: ظفر سید

تعارف: دیوانِ غالب ۱۸۲۱ء، مخطوطے کی ڈیجیٹل شکل

سخن دراصل ہما نابود سیہ خونے
کہ کاغش زرگ کلکِ مشکبار کشد
کشد چہ رنج سخنور کہ نقشہائے بدیع
زبہر آنکہ گذاردبہ یادگار کشد

اسداللہ خاں غالب

اگر غالب کے ابتدائی دواوین کے قلمی نسخے دریافت نہ ہوتے تو قارئین ان کے نصف کے قریب کلام سے محروم رہتے۔ ان میں سے قدیم ترین مخطوطہ غالب کی وفات کے تقریباً پچاس سال بعد ۱۹۱۸ء میں بھوپال سے دریافت ہوا تھا [۱] یہ نسخہ غالب نے ۱۸۲۱ء میں اس وقت مکمل کیا تھا جب ان کی عمر ۲۴ برس تھی۔ اسے نسخۂ بھوپال یا نسخۂ حمیدیہ کہا جاتا ہے۔ تکنیکی طور پر نسخۂ حمیدیہ غالب کے دیوان کی طبع شدہ شکل ہے [۲] اس نسخے کی تاریخ خاصی پیچ دار ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وہ بحث ہے جو اس نسخے کے متن، کلام میں ترامیم واضافہ، حواشی، مکمل غزلوں کے اضافے اور مسودے کے آغاز اور اختتام پر اضافی متن کی شمولیت پر ہوئی ہے۔ ان موضوعات

پر ماہرین غالبیات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مخطوطے پر کی جانے والی بحث فیصلہ کن یا سیر حاصل نہیں ہے، کیوں کہ کئی مسائل حل طلب چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فسادات کے دوران اس مخطوطے کی گمشدگی کے بعد صورت حال مزید گنجلک ہوگئی۔ ایک مجہول ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا [۳] اس کے بعد آنے والے ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی اصلاح کی غرض سے شائع کروائے گئے، جن میں ان محققین نے اپنے تاثرات کا اضافہ کیا جنھوں نے اس مخطوطے کا اس کی گمشدگی سے قبل مطالعہ کیا تھا [۴]

یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا، جو ریاست بھوپال کی حکمران نواب سکندر جہان بیگم کے سب سے چھوٹے ماموں تھے۔ سکندر بیگم کا ۲۱ سال دور اقتدار (۱۸۴۷ء تا ۱۸۶۷ء) بھوپال کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ ان کی حکومت فعال اور اصلاح پسند حکام پر مشتمل تھی۔ اپنے مشیروں کے دباؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے سکندر بیگم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی مشکلات کی خبر سن کر انھوں نے غالب کو بھوپال منتقل ہونے کی دعوت دی۔ غالب نے یہ دعوت تو قبول نہیں کی۔ تاہم بظاہر بیگم بھوپال نے اپنے ماموں فوجدار محمد خاں کے ہاتھ انھیں رقوم بھجوائی تھیں۔ سلیم احمد رضوی اپنی تاریخ بھوپال میں ایک قرین قیاس (لیکن غیر مصدقہ) دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسے ہی کسی دورے کے دوران فوجدار محمد خاں نے غالب سے یہ نسخہ حاصل کیا تھا۔ [۵] وہ (نواب بیگم سکندر) کبھی کبھار اپنے ماموں میاں فوجدار محمد خاں کو رقوم دے کر غالب کے ہاں بھجواتی رہتی تھیں۔ اسی آمد و رفت کے دوران غالب نے فوجدار خاں کو اپنے اصل دیوان کا ایک نسخہ پیش کیا، جسے انھوں نے خود اپنے قلم سے درست کیا تھا۔ یہ نسخہ فوجدار کے کتب خانے کا جھومر بن گیا۔

فوجدار محمد خاں (متوفی ۱۸۶۵ء) پڑھے لکھے اور جامع العلوم شخصیت تھے جو صرف ونحو، عروض، منطق، فقہ، ریاضی، طب یونانی اور جغرافیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ ادب کے پارکھ تھے اور ان کی موسیقی پر بھی گہری نظر تھی۔ انھیں کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ [۶] یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ غالب کے دیوان کا ایک نسخہ ان کے کتب خانے میں ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ فوجدار غالب کے کلام کے معترف تھے اور بظاہر دونوں کی آپس میں خط و کتابت بھی تھی،

تاہم اس بات کے ثبوت کے لیے کوئی خط دریافت نہیں ہو سکا۔ فوجدار محمد خاں کے صاحب زادے نواب یار محمد خاں (۱۸۲۳ء تا ۱۹۱۳ء) کو ادب سے رغبت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ جب وہ بڑے ہوئے تو فوجدار محمد خاں انھیں دہلی لے گئے اور غالب سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنی شاگردی میں لے لیں۔ غالب اس وقت خاصے معمر ہو چلے تھے۔ انھوں نے اپنے اس خصوصی شاگرد کو قبول کر لیا، لیکن اس مشورے کے ساتھ کہ وہ اپنی تخلیقات مولانا محمد عباس رفعت کو دکھایا کریں۔ ۷ نواب کو غالب کی شاگردی تو نصیب نہ ہو سکی، تاہم وہ عمدہ شاعر بن کر ابھرے اور ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ۸

قلمی نسخے کے حصول کی کہانی دلچسپ ضرور ہے لیکن نسخے کی تصدیق کے لیے ضروری نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں جا بہ جا فوجدار محمد خاں کی ہشت پہلو مہر ثبت ہے۔ اس مقصد کے لیے دو مہریں استعمال کی گئی ہیں جن میں سے بڑی مہر زیادہ منقش ہے اور اس کے گرد نیلے، سبز، سرخ اور سنہرے رنگوں میں روایتی سا ڈیزائن ہے۔ اس پر ۱۲۶۱ ہجری (تقریباً ۱۸۴۸ء) درج ہے۔ چھوٹی مہر پر اس سے پرانی تاریخ ہے۔ ۱۲۴۸ ہجری (۱۸۳۲ء)۔ خوش قسمتی سے نسخے پر ایک مکمل ترقیمہ درج ہے جس میں نسخے کی تکمیل کی تاریخ ۱۲۳۷ ہجری درج ہے، جو نومبر ۱۸۲۱ء کے مطابق ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ فوجدار محمد خاں کی ثبت مہر سے گیارہ برس قبل مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی بنیاد پر قیاس آرائیاں کی گئی ہیں کہ یہ نسخہ فوجدار خاں کے کتب خانے میں پہنچنے سے پہلے کہاں تھا۔ کیا یہ غالب کے پاس تھا یا کہیں اور؟ میں اسی باب میں بعد ازاں اس کی تفصیل میں جاؤں گی۔

بھوپال ہی سے ۱۹۶۹ء میں غالب کا ایک زیادہ پرانا اور بعض لحاظ سے زیادہ اہم نسخہ دریافت ہوا۔ غالب کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے اس سال کئی ادبی کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور کتابیں لکھی گئیں۔ یہ نسخہ بظاہر غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اسے ۱۸۱۶ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ یہ دونوں نسخے بھوپال سے برآمد ہوئے تھے اس لیے ان کے نام الجھن کا سبب بن سکتے ہیں۔ آسانی کی خاطر ان کی شناخت سالِ تکمیل سے کی جا سکتی ہے، نسخہ ۱۸۲۱ء اور نسخہ ۱۸۱۶ء، لیکن چوں کہ اول الذکر موخر الذکر سے پہلے دریافت ہوا تھا اس لیے یہاں بھی الجھن کا احتمال ہے۔ نسخہ ۱۸۲۱ء کو طبع شدہ شکل میں نسخۂ حمیدیہ کہا جاتا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کا نام نواب حمید اللہ خاں کے نام پر رکھا گیا جو حمیدیہ کتب خانے سے نسخے کی دریافت کے وقت ریاست بھوپال کے نواب چیف سیکریٹری تھے۔ ۹ نواب حمید اللہ نے اس کی اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ معروف نقاد عبدالرحمٰن بجنوری انجمن ترقی اردو کے لیے غالب کے مروج دیوان کا مشرح ایڈیشن تیار کر رہے تھے۔ انھوں نے کلام کی صحت کی تصدیق کے غالب کے دیوان کے متعدد ایڈیشن اکٹھے کر رکھے تھے، اور وہ اس وقت زیادہ نایاب ایڈیشنوں اور قلمی نسخوں کی تلاش میں تھے جب انھیں معلوم ہوا کہ بھوپال کے کتب خانہ حمیدیہ سے غالب کے ایک اولین دیوان کا نسخہ دریافت ہوا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں اس دریافت کا سہرا مولانا عبدالسلام ندوی کے سر جاتا ہے۔ ۱۰

اس دریافت کا اعلان اعظم گڑھ سے چھپنے والے رسالے معارف میں ۱۹۱۸ء میں کیا گیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بجنوری کو اس نئے دیوان کی تدوین کی دعوت دی۔ بجنوری اس سے قبل محاسنِ کلام غالب کے نام سے ایک طویل مضمون لکھ چکے تھے، جسے وہ شاید دیوانِ غالب کے ایڈیشن کے ساتھ چھپوانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ ۱۹۱۸ء میں صرف ۳۱ برس کی عمر میں اس وقت فلو کی وبا کی نذر ہو گئے جب انھوں نے ابھی کام کا آغاز کیا تھا۔

نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ مفتی محمد انوار الحق، مطبوعہ ۱۹۲۱ء

بجنوری کے بے وقت موت سے نسخے کی تدوین و تعارف کا کام مفتی محمد انوار الحق (۱۸۵۵ء تا ۱۹۴۰ء) کے کندھوں پر آن پڑا ۱۱ وہ ریاست بھوپال کے ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم تھے۔ وہ مورخ تھے اور ادب اور سائنس دونوں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور انھوں نے ان دونوں موضوعات پر قابل ذکر مضامین لکھے ہیں۔ تاہم اس پیچیدہ نسخے کی تدوین کا کام کسی ایسے شخص کے لیے خاصا مشکل تھا جس کی لسانیات میں تربیت نہ ہو۔ ۱۲

نسخۂ حمیدیہ کا پہلا ایڈیشن دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا، اس ایڈیشن پر کڑی تنقید ہوئی کہ اس میں متن کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس پر کتابت کی اغلاط مستزاد ہیں۔ جب تک میں نے یہ نسخہ خود نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت تک میں بھی دوسرے

ناقدین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے مفتی انوار الحق پر خاموشی سے الزام دھرتی رہی کہ انھوں نے عالمانہ تدوین کی نزاکتوں کی پاسداری نہیں کی۔ تاہم ان کا لکھا ہوا تعارف پڑھ کر میرا تاثر بدل گیا۔ مفتی صاحب ایک اہم مفسرانہ سوال اٹھاتے ہیں کہ غالب کے ابتدائی کلام کی اشاعت سے کیا حاصل ہوگا۔ ۱۳؎ بظاہر غالب کے ایسے کلام کی اشاعت کے خلاف خاصی مخالفت موجود تھی جسے غالب نے خود شائع نہ کیا ہو۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک صاحب اس قدر سیخ پا ہوئے کہ وہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کو ''مہملات غالب'' کہتے تھے۔ مفتی صاحب کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انھوں نے اس نو دریافت شدہ کلام کی اشاعت کے حق میں ٹھوس دلائل دیئے۔ ان کے خیال میں غالب کے اولین کلام کی اشاعت سے ان کے شاعرانہ تخیل اور تکنیک کے ارتقا کا پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے تصحیح و ترمیم کے اس عمل کا بھی سراغ ملتا ہے جو تمام نسخے میں عیاں ہے اور جو شعر کو بہتر بنانے کے ''مرحلہ وار'' عمل کا حصہ ہے۔ ۱۴؎ مفتی صاحب غالب کے اولین کلام کے بارے میں اپنے دلائل کو حالی کے خیالات نقل کر کے مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ ۱۵؎

''مرزا صاحب کا ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرہ سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں ان کی انفرادیت اور غیر معمولی اُپج کا سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطری اور غیر معمولی قابلیت اور استعداد پر شہادت دیتی ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ اگرچہ غالب نے منتخب دیوان کی اشاعت کے وقت کئی مبہم اشعار نکال باہر کیے، ان کے دیوان میں اب بھی کئی مبہم اشعار موجود ہیں لیکن خود اپنی شاعری کو مسترد کرنا خاصا تکلیف دہ عمل رہا ہوگا۔ ۱۶؎

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنیٰ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا نے نہایت جانکاہی اور جگر کاری سے سرانجام کیے ہوں گے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا۔

مفتی محمد انوار الحق کے تعارف میں غالب کی ابتدائی کلام کی اشاعت کے دفاع میں کئی عاقلانہ اور معتبر دلائل موجود ہیں۔ ۱۷؎

میرے خیال میں غالب کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے ہی کلام کو مسترد کر دیں۔ جو انھیں پسند

تھا وہ انھوں نے رکھا اور جو پسند نہیں تھا اسے کاٹ دیا۔لیکن ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔ جب تک ان کا نسخہ نہیں ملا تھا تب تک صورت حال مختلف تھی۔ غالب کو اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پر کس قدر اذیت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

اس متنازع سوال پر کہ یہ مخطوطہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں کس طرح پہنچا، مفتی محمد انوار الحق کا موقف سیدھا سادا، لیکن غیر مصدقہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نسخہ نواب کے لیے تیار کیا گیا تھا، اور بعد کے برسوں میں اسے غالب کو تصحیح کے لیے بھیجا گیا۔ مفتی صاحب کے خیال کے مطابق متن کی تصحیح اور حواشی خود غالب نے لکھے تھے، کیوں کہ خود شاعر کے علاوہ اور کس میں اتنی جرات ہوسکتی ہے کہ شاعری میں ترمیم و اضافہ کر سکے؟ وہ یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ یہ نسخہ ایک سے زائد بار غالب کے پاس تصحیح کے لیے بھیجا گیا۔ تاہم مفتی صاحب اس واضح طور پر مختلف سواد خط (ممکنہ طور پر ایک سے زیادہ) کا ذکر نہیں کرتے جو نسخے میں جا بجا موجود ہے۔ اگر ہم یہ مفروضہ تسلیم کرلیں کہ یہ نسخہ نواب فوجدار محمد خاں نے تیار کروایا تھا اور اسے غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا گیا، تو اس امر کی وضاحت نہیں ہوتی کہ اس پر فوجدار کی ۱۸۳۲ء کی مہر کیوں ثبت ہے۔ مفتی صاحب اس پر بحث نہیں کرتے کہ ۱۸۲۱ء میں مکمل ہونے والے نسخے پر فوجدار خاں کی ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۸ء کی مہریں کیوں موجود ہیں۔

مفتی محمد انوار الحق نے ایک اہم لیکن متنازع ادارتی فیصلہ کیا۔ انھوں نے نسخۂ حمیدیہ میں متداول دیوان کا کلام بھی شامل کر دیا اور دیوان کی ترتیب مروج اصول کے مطابق ردیف وار رکھی۔ دوسرے الفاظ میں جو ایڈیشن شائع کروایا اسے غالب کا مکمل "غیر مدون" دیوان کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مروج دیوان کے اندر نو دریافت شدہ اشعار کا فرق ظاہر کرنے کے لیے مصرعوں کے درمیان حرف م (مروج) استعمال کیا۔ جہاں ترامیم تھیں۔ وہاں انھوں نے حواشی میں متبادل صورت لکھی۔ اگر ایک مصرعے کی ایک سے زیادہ شکلیں موجود تھیں تو انھوں نے وہ سب شکلیں درج کیں۔ جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ ۱۸۲۱ء کے نسخے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بعض جگہوں پر حواشی میں مکمل غزلیں درج تھیں۔ مفتی صاحب کے ایڈیشن میں حواشی اور اصل متن کی تقسیم کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سب کو متن میں شامل کر دیا گیا جس سے تحریر کی تاریخی ترتیب گڈمڈ ہوگئی۔

اس تعارف کی ایک کارآمد چیز اس کا اشاریہ ہے جس سے ایک نظر میں یہ پتہ چل سکتا ہے کہ غالب نے اپنے مطبوعہ دیوان میں کیا شامل کیا اور کیا نہیں۔ ۱۸

مفتی محمد انوار الحق بجنوری کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے اس ایڈیشن میں محاسن کلام غالب بطور مقدمہ شامل کرنا چاہتے تھے۔ ایک مجلد اور ایک غیر مجلد دیوان تیار کیا گیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر پر تاریخ اشاعت درج نہیں۔ ۱۹۲۱ء میں شائع ہونے والے پہلے ایڈیشن میں بجنوری کا طویل مضمون شامل نہیں اور اس کا سرورق بھی مختلف ہے۔ یہ مضمون ایک اور ایڈیشن میں شامل کیا گیا جو غالباً ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس ضخیم ایڈیشن کی قیمت زیادہ رکھی گئی تھی۔ ۱۹

مقدمے کا تعارف پیش کرتے ہوئے مفتی محمد انوار الحق لکھتے ہیں کہ وہ کس قدر چاہتے تھے کہ بجنوری کو اس بڑے کام کے لیے خراج پیش کیا جائے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس مضمون کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑنا کس قدر مشکل کام تھا۔ بجنوری کے اس اہم مضمون پر مفتی صاحب کا تعارف ایک اہم ذاتی زاویہ فراہم کرتا ہے۔

عبداللطیف حیدرآبادی کا نامکمل ایڈیشن، ۱۹۲۸ء

نسخۂ حمیدیہ اشاعت کے فوراً بعد جن لوگوں کی نظروں سے گزرا ان میں سید ہاشمی اور ڈاکٹر عبداللطیف شامل تھے۔ سید ہاشمی انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھوپال گئے تاکہ نسخہ خود ملاحظہ کرسکیں ۲۰ ڈاکٹر لطیف غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر لطیف کا بیشتر کام اشاعت کے دوران ایک حادثے کی نذر ہوگیا۔ صرف پروف کا ایک حصہ بچا ۲۱ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب انھوں نے ۱۹۲۸ء میں نسخۂ حمیدیہ دیکھا تو وہ کس حالت میں تھا۔ ۲۲

جلد اس قدر مجہول ہے کہ اوراق آسانی سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ متن ۷۵ صفحات پر محیط ہے۔ ہر صفحہ ۷ ضرب ۱۱۱/۲ انچ ہے۔ آغاز و انجام پر مرکزی متن جیسے چار اوراق کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کاغذ دستی اور ہندوستانی ساختہ لگتا ہے۔ دونوں طرف لگائے گئے چار اوراق کے علاوہ

دونوں طرف دو انگریزی کاغذ بھی لگائے گئے ہیں۔ مخطوطے کے آغاز میں یہ کاغذ صفحہ نمبر تین اور چار کے بیچ میں ہیں۔ ہر صفحے پر دس سے گیارہ ابیات ہیں جو چینی روشنائی سے خوشخط نستعلیق میں رقم کیے گئے ہیں۔ پہلے چار قصائد ہیں، اس کے بعد ۲۷۶ غزلیات، آخر میں ۱۱ رباعیاں ہیں۔ اوراق کو لاجوردی اور سنہرے رنگ سے مزین کیا گیا ہے۔ تمام مخطوطے میں متن کے گرد سنہرا حاشیہ ہے۔

عبداللطیف نے ایک اور ایڈیشن چھپوانے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم انھوں نے مخطوطے کی خصوصیات، خاص طور پر اس کے حواشی پر کئی مضامین لکھے۔ ۲۳

نسخۂ حمیدیہ، مرتب حمید احمد خاں، مطبوعہ ۱۹۶۹ء

مفتی محمد انوار الحق کے مرتب کردہ ایڈیشن نے نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں لوگوں میں خاصی دلچسپی اور تجسس پیدا کر دیا۔ تاہم چوں کہ اس ایڈیشن میں غالب کے متداول اور نئے کلام کو گڈ مڈ کر دیا گیا تھا اس لیے نسخہ اور دیوان دونوں کی ترتیب درہم برہم ہوگئی۔

بعض محقق جو چاہتے تھے کہ انھیں نسخہ اپنی اصل شکل میں ملے، انھیں خاص طور پر بھوپال جانا پڑتا تھا۔ مولانا عرشی اور حمید احمد خاں نے مختلف مواقع پر وہاں جا کر نسخہ دیکھا اور نوٹس لیے۔ حمید احمد خاں ۱۹۳۸ء میں بھوپال گئے۔ ۲۴ انھوں نے نسخے کا معائنہ کیا اور خاص طور پر وہ غزلیں دیکھیں جو حواشی میں لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ غزلیں نسخہ مکمل ہونے کے بعد تحریر کی گئی تھیں۔ انھوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ غزلیں ۱۸۲۱ء کے بعد کی تحریر کردہ ہیں۔ مفتی محمد انوار الحق نے غزلوں کی توقیت کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حمید احمد خاں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ان میں تقسیم برقرار رکھی جائے۔ انھوں نے لکھا کہ حواشی پر مختلف لکھائیوں کی درجہ بندی کچھ یوں کی جا سکتی ہے: ۱) باریک قلم سے باریک خوشخط لکھائی۔ ۲) موٹے قلم سے خط شکستہ میں تحریر۔ ۳) باریک قلم سے خط شکستہ میں تحریر۔ ان تین میں سے موٹے قلم سے شکستہ خط غالب کی لکھائی سے ملتا جلتا ہے اور یہ ان کی تحریر ہو سکتی ہے۔

حمید خاں نے دیکھا کہ مجلد نسخے کے آغاز میں دو اوراق چسپاں کیے گئے ہیں، اور ان پر

بدخط تحریر رقم ہے۔ کسی نے غالب کا مولوی محمد فضل حق کو لکھا گیا خط وہاں نقل کیا ہے۔ یہ خط فارسی زبان میں لکھا گیا تھا اور یہ صنعت تعطیل میں ہے (یعنی غیر منقوطہ ہے) ۲۵ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل اس نسخے پر کام کرنے والے کسی محقق (بشمول اس کے مرتب مولوی محمد انوار الحق) نے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔

مفتی صاحب نے نسخے کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر نہیں کیا، اور یہ ہے کہ بعض اشعار پر صاد کا نشان لگایا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا نشان پہلی غزل کے دوسرے شعر پر ہے۔ حاشیہ میں ایک نام واضح طور پر پڑھا جا سکتا ہے: عبدالعلی، ایک اور صفحے پر حاشیے پر عبدالصمد مظہر لکھا ہوا ہے۔ حمید احمد خاں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ افراد غالب سے وابستہ ہو سکتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر عبداللطیف کہتے ہیں کہ عبدالعلی نے باریک قلم میں حاشیہ تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے عبدالعلی اور عبدالصمد نسخے کے قارئین رہے ہوں اور انھوں نے کہیں کہیں حاشیہ آرائی کی ہو۔

حمید احمد خاں بجا طور پر مفتی صاحب کی اس مفروضے پر سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے لیے تیار کیا گیا تھا اور اسے ترامیم اور اضافے کے لیے ایک سے زائد بار دہلی بھیجا گیا تھا۔ حمید احمد خاں مزید کہتے ہیں کہ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حاشیہ میں درج غزلیں ۱۸۳۲ء کے بعد لکھی گئیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ غزلیں ۱۸۲۱ء اور ۱۸۳۲ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ان ۱۱ برسوں میں یہ نسخہ غالب کے پاس رہا اور ترامیم و اضافہ کے بعد بھوپال پہنچا۔ حمید احمد خاں کہتے ہیں کہ اگر ہم نسخۂ حمیدیہ کا تقابل نسخہ شیرانی سے کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ حمیدیہ میں جو غزلیں حاشیے میں لکھی گئی تھیں وہ نسخۂ شیرانی کے اصل متن میں شامل ہیں۔ نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء کے لگ بھگ غالب کی کلکتہ روانگی سے قبل معرض تحریر میں لایا گیا تھا۔ ۲۶ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب نیا نسخہ (شیرانی) تیار ہو گیا تو غالب نے پرانا نسخہ (حمیدیہ) تحفہ میں دے دیا۔ حمید احمد خاں یہ صراحت نہیں کرتے کہ آیا غالب نسخہ حمیدیہ اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے تھے یا نہیں۔

امتیاز علی خاں عرشی کا نسخہ حمیدیہ کے بارے میں بیان (۱۹۵۸ء)

انجمن ترقی اردو کی ۱۹۴۴ء میں ناگپور میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد

واپسی پر مولانا عرشی نسخۂ حمیدیہ دیکھنے کے لیے خاص طور پر بھوپال گئے۔ انھوں نے اپنے تاثرات خاصی تفصیل سے رقم کیے ہیں۔ [۲۷] جن کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

اس کی لمبائی چوڑائی ۲۲×۲۹/ ۸ ہے۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا کشمیری ساختہ ہے۔ متن ۷۵ اوراق پر محیط ہے اور ہر صفحے پر ۱۱ سطریں ہیں۔ آغاز اور اختتام پر اضافی سادہ دیسی کاغذ چسپاں کیے گئے ہیں جنھیں نسخے کی تکمیل کے بعد لگایا گیا ہے۔ پہلے دو سادہ صفحوں پر غالب کے فارسی خط کی نقل درج ہے۔ اس کے بعد دو انگریزی کاغذ کے بنے اوراق ہیں۔ ان میں سے پہلے پر فوجدار محمد خاں کی منقش مہر ہے۔ دوسرے پر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر ہے جس میں ۱۲۶۱ ہجری رقم ہے۔ اصل متن کے پہلے صفحے پر دو چھوٹی مہریں ہیں جن پر ۱۲۴۸ ہجری لکھا ہوا ہے۔ متن کے آخری صفحے پر ترقیمہ درج ہے جس ۱۲۳۷ ہجری کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ اس کے نیچے فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر ہے جس پر ۱۲۴۸ ہجری لکھا ہوا ہے۔

نسخے میں جا بجا ترامیم و اضافہ موجود ہیں۔ سواد خط، سیاہی اور قلم کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں لکھا۔ بعض اصلاحات میں خط غالب کی لکھائی سے ملتا جلتا ہے، جب کہ بعض دوسری جگہوں پر کی گئی ترامیم واضح طور پر غالب کی لکھائی میں نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کے آغاز میں لفظ ''غلط'' لکھا ہوا ہے۔ بعض جگہوں پر یہ لفظ کچھ یوں لکھا گیا ہے کہ غلط کا غ مطلعے کے دو مصرعوں کے درمیان لکھا ہوا ہے۔ [۲۸] یہ غزلیں نسخہ شیرانی میں شامل نہیں گئیں۔ بعض غزلوں کے حواشی پر ''مکرر نوشتہ شود'' (دوبار لکھی گئی) درج ہے۔ وہ یہ غزلیں ہیں جن میں دو ہم طرح غزلوں سے اشعار منتخب کر کے اور ان کی ترتیب بدل کر لکھا گیا ہے۔ نسخے کے آخر میں سادہ اوراق پر وہ غزلیں رقم ہیں جو بعد میں لکھی گئی تھیں لیکن وہ سب یا کی ردیف میں ہیں۔ یہاں کی لکھائی حواشی کی ''بدخط'' تحریر سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ غزلیں غالب کے ایما پر لکھی گئی تھیں۔ [۲۹]

مولانا عرشی اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے نسخے میں غزلیں نہیں گنیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مفتی محمد انوار الحق کی دی گئی گنتی مبہم ہے کیوں کہ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا انھوں نے نسخے کے اختتام پر درج غزلیں گنی ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی گنتی میں دوسری اغلاط بھی ہیں کیوں کہ

انھوں نے حواشی میں درج غزلوں کو اصل متن کی غزلوں کے ساتھ ملا دیا تھا۔ ۳۰ مولانا عرشی نے اپنے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۵۸ء) میں شیرانی اور گل رعنا کے نسخوں کی مدد سے گنتی کی اغلاط درست کر دیں۔ ۳۱ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی میں کی گئی ترامیم شیرانی اور گل رعنا کی تکمیل کے بعد یا اس کے دوران کی گئیں۔ ۳۲ مولانا عرشی کا یہ نتیجہ کچھ زیادہ ہی عمومی اور غیر مصدقہ ہے۔ گل رعنا کلکتے میں تیار کیا گیا تھا جب کہ نسخۂ شیرانی وہ دیوان ہے جسے غالب نے حفاظت کی غرض سے باندا میں رکھ چھوڑا تھا۔

مولانا عرشی کی بیان کردہ یہ تفصیل وہ آخری تحریر ہے جو ۱۸۲۱ء کے اس نسخے کے بارے میں تحریری شکل میں ملتی ہے۔ اس کے بعد اب یہ نسخہ مجھے شہاب ستار کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ شہاب نے اسے لندن میں نایاب کتابوں کے ایک بیوپاری سے حاصل کیا تھا۔

۱۸۲۱ء کے نسخے کی ڈیجیٹل شکل

مجھے ۱۸۲۱ء کے دیوان بازدریافت شدہ دیوان کو سکین کر کے ہائی ریزولوشن میں پیش کرتے ہوئے خوشی اور فخر محسوس ہو رہا ہے۔

اس دیوان کی ایک رنگارنگ تاریخ ہے۔ جس کے خاص خاص نکات میں اوپر پیش کر دیے ہیں۔ میں کچھ حل طلب مسائل کو حل کرنے کی کوشش کروں گی۔ وضاحت کے نقطۂ نظر سے یہ مسائل کچھ یوں پیش کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ دیوان نواب فوجدار کے کتب خانے میں مندرج ہونے سے قبل ۱۱ برس تک کہاں تھا؟

۲۔ حواشی میں موجود غزلیں کس نے لکھیں؟ کیا خود غالب نے؟

۳۔ موجودہ نسخے میں کتنے مختلف سواد خط موجود ہیں؟

۴۔ غالب کا مولانا فضل حق کے نام صنعت تعطیل میں لکھا گیا فارسی خط کس نے نقل کیا؟ کیا غالب نے؟

۵۔ نسخے کے اختتام پر ردیف یا کی سات غزلیں کس نے شامل کیں؟ کیا غالب نے؟

۶۔ آخری صفحے پر غزلوں کے نیچے یہ تحریر درج ہے: دیکھ تو عکس قد یار لب جو پر سے۔ تمام

شد۔ کارمن نظام شد۔ رب یسر وتمم بالخیر۔ یہ تحریر اسی خط میں ہے جس میں غزلیں لکھی گئی ہیں۔ نقل کردہ مصرع خاصا بامعنی ہے، خاص طور پر اس لیے کہ یہ نسخہ ''بہر ترویج'' تھا۔

۷۔ نسخے میں حک و اضافہ کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ کئی غزلوں پر ''ولہ'' درج ہے (یعنی اسے آگے لے جایا جائے گا)۔

۸۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے غالب اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے تھے؟ کیا انھوں نے گل رعنا اور اپنے منتخب دیوان کے لیے کلام اسی نسخے سے لیا تھا؟

۱۸۲۱ء کے نسخے کی چیدہ چیدہ خصوصیات

جب مولانا عرشی نے ۷۰ برس قبل اس نسخے کا جائزہ لیا تھا اس کے بعد سے اس کی دوبارہ جلد بندی کی گئی ہے۔ یہ نئی جلد سرخ چمڑے کی ہے اور اس کے تمام صفحے سلامت اور ترتیب سے ہیں۔

متن چکنے دستی کاغذ پر لکھا گیا ہے، جس نے زمانے کی دست برد کا بڑی اچھی طرح مقابلہ کیا ہے۔ آغاز اور اختتام پر دو کسی حد تک بھدے کاغذ پر ''بدخط شکستہ'' لکھائی میں کیے گئے اضافے ہیں۔ فوجدار محمد خاں کی جانب سے نسخے کے حصول کے بعد دو سفید انگریزی اوراق کا اضافہ کیا گیا۔

پہلے نئے ورق پر سنہرے رنگ سے ایک کسی حد تک بھونڈا نمونہ بنا ہوا ہے، جس کے اندر نیلے رنگ کا پھولدار ڈیزائن ہے جس کے اندر لکھا ہوا ہے۔

دیوان ہذا من تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتبخانۂ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبال، قلمی، خوشخط

(مندرجہ بالا تحریر میں غالب کو ''مرزا نوشہ دہلوی'' جو تخلص اسد سے جانے جاتے ہیں، کہا گیا ہے)۔

اعلیٰ معیار کے کاغذ، منقش ابتدائی صفحات، نفیس حاشیے اور خوش خط کتابت سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اس نسخے کو خصوصی احتیاط سے تیار کیا گیا تھا۔ اس نسخے کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے۔ شروع میں چار فارسی قصائد منقبت کی شکل میں موجود ہیں۔ قصائد کا حصہ ترامیم اور اضافہ سے پاک ہے۔ حواشی غزلوں کے حصے کے پہلے صفحے سے شروع ہوتے ہیں۔ میں نے چار مختلف سواد خط دریافت کیے ہیں:

۱۔ خوشخط بہت نفیس لکھائی جو کسی تربیت یافتہ کاتب کی ہو سکتی ہے۔

۲۔ شکستہ، غالب کے لکھائی سے مشابہ۔

۳۔ شکستہ، باریک قلم سے تحریر شدہ نفیس لکھائی۔

۴۔ شکستہ، جو موٹے قلم سے لکھی گئی ہے اور جسے ''بدخط'' کہا گیا ہے۔ مجھے یہ غالب کی جلدی میں لکھی گئی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ غالب ۱۸۲۱ء کے نسخے کو بطور نوٹ بک استعمال کر رہے تھے۔ شاید یہ ہر وقت ان کے پاس رہتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے مروج دیوان اسی سے انتخاب کیا تھا۔ ممکن ہے انھوں نے فالتو اوراق کو خط کا مسودہ لکھنے کے لیے استعمال کیا، اور انھی نے آخری اوراق پر نئی غزلیں لکھیں۔ میرے خیال میں باریک قلم سے نفیس شکستہ تحریر نسخے کے فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں آنے کے بعد لکھی گئی۔ ممکنہ طور پر عبدالعلی نے اپنے پسندیدہ اشعار پر ص کا نشان لگایا۔

مجھے صنعت تعطیل میں غالب کے فارسی خط کی نقل پر کئی لحاظ سے الجھن ہے، پہلی بات یہ ہے کہ کسی نے خط کی نقل کیوں کی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خط کی نقل ہو بہو بمطابق اصل نہیں ہے۔ میں نے اس نسخے میں موجود خط کا تقابل دو مختلف شکلوں سے کیا جو۔ ۱) پنج آہنگ میں شائع ہوئی۔ ۲) جو گل رعنا کے خاتمے میں موجود ہے۔ گل رعنا کے ہر ایڈیشن میں موجود خط میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ نسخے میں موجود نقل کی مندرجہ بالا شکلوں سے بڑا فرق ہے۔ خط کے متن میں نفی تراکیب شامل کی گئی ہیں، سطریں اور الفاظ غائب ہیں، اور املا کی کئی اغلاط بھی در آئی ہیں۔ ایک خاص بات وہ فالتو سطر ہے جو خط کے آخر میں اضافہ کی گئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ آخری سطر صفحے پر آخری سے پہلی سطر کی نقل ہے۔

ودام مدعا دل سداد مثل طرح اساس وداد کردہ وسلک گوہر دعا در عرصہ وراد یہ سطر کسی اور نقل

میں نہیں پائی جاتی اور یہ ممکن ہے کہ کاتب نے اس غلطی کی نشاندہی کے لیے اسے الگ سطر میں دوبارہ لکھ دیا ہو۔

میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ غالب کے دستخط میں محمد اسد اللہ لکھا ہوا ہے اور اسد اللہ کی املا غلط ہے۔ غالب کبھی کبھار اپنے نام کے ساتھ محمد لکھا کرتے تھے۔ یہاں اس کا اضافہ دلچسپ ہے کیوں کہ کسی اور مطبوعہ شکل میں ان کا دستخط موجود نہیں ہے۔ آخری چند الفاظ بہر ترویج جناب نسخے کے پہلے قصیدے کے ابتدائی الفاظ بھی ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے۔ کیا اس کا مقصد اس بات کی نشان دہی کرنا تھا کہ قصیدہ یہاں سے شروع ہوتا ہے؟ پھوہڑپن سے لکھی گئی تحریر، املا کی اغلاط اور دوسری غلطیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی لاپروا کاتب کی تحریر ہے۔ ممکن ہے غالب نے اسی شخص کو کتاب کے آخر میں شامل مواد اور خط نقل کرنے کو کہا ہو کیوں کہ تحریر میں مماثلت موجود ہے۔

ترقیمہ

ترقیمہ سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اور اس میں درج ہے: دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلیم ربہم علی بدالعبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۳۷ ہجری من الہجرہ النبویہ صورت اتمام افت۔

(مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد اللہ غالب، تحریر کردہ حافظ معین الدین، تکمیل پانچ صفر ۱۲۳۷ ہجری) اس میں خاص بات غالب کا نام ہے، جسے ''مرزا صاحب، جنھیں اسد اور غالب کے تخلص سے جانا جاتا ہے'' لکھا گیا ہے۔

ایک حل طلب مسئلہ اس نسخے کی شناخت ہے جسے غالب اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے تھے۔ ایس۔ اے۔ آئی ترمذی نے ایک اہم مضمون لکھا ہے جس میں اس پیچیدہ مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۳۳ غالب نے لکھا ہے کہ ان کی کلکتہ آمد سے پہلے ہی ایک شخص وہاں پہنچ گیا اور سرکاری حکام کو کہا کہ غالب ناقابل اعتبار اور بدنام شخص ہے۔ جس نے اپنا نام اور تخلص بھی بدل دیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے غالب نے اپنا وہ دیوان پیش کیا جو سات برس قبل مکمل ہوا تھا اور جس پر ان

کی مہر درج تھی جس میں اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، ۱۲۳۱ ہجری (۱۸۱۶ء) درج تھا: ۳۴

''دیوان ریختہ کہ گرد آوردن ان بیش از ہفت سال گزشتہ ومعز امہری از مواپیر ایں رو سیاہ کہ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ نقش نگین وجلونہ سال یک ہزار ودوصدی و یک ہجری طرز دامن وآستینش ہود پر خاتمہ اوراق آن سفینہ رقم آخر زباں بندی اعداد وداشت، بہ خدمت سرحلقۂ افراد دفتر کدہ بہ شہادت فرستادم۔''

[میں نے اپنا ریختہ کا دیوان بھیجا جو سات سال قبل مکمل ہوا تھا اور اس دیوان کے آخر میں استین کی جھالر کی طرح اس روسیاہ کی مہروں میں سے ایک مہر لگی ہوئی تھی جس پر سال ۱۲۳۱ ہجری درج تھا۔ اسے بطور شہادت دفتر میں پیش کیا گیا۔]

اس تحریر کا ترجمہ کرنا مشکل تھا کیوں کہ یہ کم از کم میرے لیے خاصی مبہم ہے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ آیا ۱۲۳۱ والی مہر ترقیمے کے نیچے تھی یا نسخے کے ساتھ بھیجی گئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ دیوان ۱۸۲۱ء والا نسخہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ ایک الجھن ''مہر'' کا ذکر ہے۔ غالب کے پاس ۱۲۳۱ ہجری کی دو مہریں تھیں۔ ایک اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اور دوسری اسد اللہ غالب۔ ۳۵

۱۸۲۱ کے نسخے میں ترقیمے کے نیچے کوئی مہر نہیں ہے۔ غالب نے اپنی شاعری کے بارے میں خطوط میں لاپروایانہ باتیں لکھی ہیں۔ یادداشت بھی کبھی کبھار دھوکہ دے جاتی ہے۔ ممکن ہے غالب ترقیمے میں درج تاریخ کو مہر کی تاریخ کو خلط ملط کر بیٹھے ہوں۔ بہر حال، ماہرین غالبیات نے اس بارے میں مختلف آرا قائم کی ہیں۔ یہ تنازع ۱۸۲۱ کے نسخے کی توقیت سے گہرے طور پر منسلک ہے۔ غالب کے ۱۸۱۶ کے قدیم ترین دیوان کے مرتب اکبر علی خاں کو یقین ہے کہ غالب نے خود اپنے ہاتھ سے ۱۸۱۶ کے نسخے کی ایک تازہ نقل تحریر کی تھی جو ۱۸۲۰ء کے قریب مکمل ہوئی۔ ۳۶ ۱۸۱۶ کے دیوان کی نقل ضرور تیار ہوئی تھی لیکن یہ بات جاننے کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آیا وہ ۱۸۲۱ والا نسخہ ہی تھا یا دو نقلیں تیار کی گئی تھیں۔ ایک ۱۸۲۰ء اور دوسری ۱۸۲۱ء میں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ دو متواتر برسوں میں دو نقلیں تیار کی گئیں۔ غالب کو نسخہ اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے تھے وہ اسے دیوان دوم کہتے ہیں۔

جب تک ہمیں ۱۸۲۰ء کا کوئی ایسا دیوان نہ ملے جس پر ۱۲۳۱ ہجری کی مہر ثبت ہو، میں سمجھتی

ہوں کہ غالب نسخۂ حمیدیہ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس مفروضے کی کئی وجوہات ہیں۔ غالب کے سفر سے قبل ایک تیسرا دیوان تیار ہو چکا تھا۔ یہ ۱۸۲۶ کا وہ دیوان ہے جسے نسخۂ شیرانی کہا جاتا ہے۔ ۱۸۲۶ کا یہ دیوان حفاظت کی خاطر باندہ والے مولانا محمد علی خاں کے پاس رکھوایا گیا تھا۔ سفر کے دوران غالب کا مولانا سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا اور وہ سفر کے دوران لکھی گئی غزلیں بھی انھیں بھیجا کرتے تھے۔ ۱۸۲۶ء کے نسخے میں یہ غزلیں حواشی میں ہوئی ہیں۔ ۱۸۲۱ء کا نسخہ واضح طور پر خاصا عرصہ غالب کے پاس رہا۔ اس کا اندازہ غزلوں میں کی گئی ترامیم سے ہوتا ہے۔ جو صرف غالب ہی کر سکتے تھے۔ تمام ماہرین غالبیات متفق ہیں کہ یہ ترامیم خود غالب نے کی ہیں۔ ''غلط''، ''ولہ'' اور ''مکرر نوشتہ شد'' بھی غالب کے قلم سے ہیں۔ یہ تمام شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر خود انتخاب کر رہا ہے۔ نسخے میں وقتاً فوقتاً ترامیم کی جاتی رہی ہیں اور زیادہ تر ترمیم غالب ہی کی کی ہوئی لگتی ہیں۔

گل رعنا کے لیے انتخاب ۱۸۲۸ء کے دوران کیا گیا تھا۔ یہ بات بہت قرین قیاس ہے کہ اس کی بنیاد ۱۸۲۱ء والا نسخہ تھا۔ چوں کہ غالب گل رعنا کے بعد بھی حک واضافہ کرتے رہے، اس لیے یہ بات بھی دل کو لگتی ہے کہ یہی اس منتخب دیوان کی بنیاد بھی تھا جو ۱۸۳۲ء تک تیار ہو چکا تھا۔ ممکن ہے کہ جب منتخب دیوان تیار ہو گیا تو غالب نے یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کو دے دیا۔

نسخۂ شیرانی، مطبوعہ ۱۸۲۶ء، اور اس کی عکسی نقل مطبوعہ ۱۹۶۹ء

اگرچہ نسخۂ شیرانی کا ترقیمہ نہیں ہے لیکن شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ نسخۂ حمیدیہ کے بعد ترتیب دیا گیا۔ غالباً یہ ۱۸۲۶ء کے لگ بھگ تیار ہو چکا تھا۔ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور اس کا نام حافظ محمود شیرانی کے نام پر رکھا گیا ہے کیوں کہ ان کے قلمی نسخوں کے ذخیرے سے برآمد ہوا تھا۔ ۳۷ اس سے نسخۂ حمیدیہ کی تصدیق واصلاح میں مدد ملتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں اس نسخے کی عکسی نقل شائع ہوئی جس سے محققین کا کام آسان ہو گیا۔ ۳۸ حمیدیہ کے برخلاف یہ نسخہ قصائد سے شروع نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ اوراق کے کناروں کو پانی سے نقصان پہنچا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دوبارہ جلد

بندی کی گئی ہے۔خیال ہے کہ صفحات کی ترتیب بدلی گئی ہے۔شاید رباعیاں اس میں سے نکال دی گئی ہیں کیوں کہ آخری چند اوراق بہت خستہ حالت میں ہیں۔اس نسخے میں چند حواشی موجود ہیں۔مولانا عرشی کے مطابق متن میں کئی جگہ غالب کی لکھائی میں کی گئی ترامیم موجود ہیں۔

نسخۂ شیرانی میں حمیدیہ کے مقابلے پر کم اشعار ہیں، جس کی بڑی وجہ یہ کہ قصائد اور رباعیات والا حصہ خستہ حال ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ذیل میں مختصر تقابل پیش ہے:

حمیدیہ: غزلیات کے اشعار (بشمول حواشی اور اختتام پر) ۲۱۸۸

قصائد کے اشعار: ۲۰۶

رباعیات کے اشعار: ۲۲

کل اشعار: ۲۴۱۶

شیرانی: غزل کے اشعار (بشمول حواشی) ۲۰۱۵

قصائد کے اشعار: ۶۳

کل اشعار: ۲۰۷۸

صرف غزل کے اشعار ہی کا تقابل کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ غالب نے ۱۳۲ اشعار مسترد کر دیے تھے۔ان اشعار کی شناخت ان غزلیات کے اشعار کے طور پر کی گئی ہے جن پر نسخۂ حمیدیہ میں ''غلط'' لکھا ہوا تھا۔مولانا عرشی نسخۂ شیرانی کو نسخۂ حمیدیہ کی صاف نقل (مبیضہ) سمجھتے تھے۔یہ بات درست نہیں ہے کہ کیوں کہ نسخۂ شیرانی کے متن میں کئی اضافے بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ دونوں مخطوطوں میں غزلوں کی ترتیب خاصی مختلف ہے۔اس کے باوجود دونوں مخطوطوں میں ایک متحرک رشتہ ضرور موجود ہے۔

یہ عین ممکن ہے کہ جب نسخۂ شیرانی تیار ہو گیا تو کسی نے نسخۂ حمیدیہ میں نیا مواد شامل کر دیا۔ایک ہی شخص کی لکھائی میں اختتام پر سات، اور ردیف یا میں دو غزلوں کے اضافے سے عندیہ ملتا ہے کہ یہ کام کسی کی ایما پر یا ذاتی دلچسپی سے کیا گیا ہے کیوں کہ صفحے کی پیشانی پر درج ہے: بہتر ترویج، کاتب کی اختتامی سطر ہے: تمام شد کار من نظام شد تمام بالخیر، یعنی مکمل ہو گیا۔میرا کام مکمل ہو گیا۔کام خیر خود ہی سے مکمل ہوا۔ ۳۹

ایک غزل کا ارتقا ۱۸۲۱ء کے نسخے سے ۱۸۲۶ء کے منتخب دیوان تک

مندرجہ ذیل غزل ۱۸۲۱ء کے نسخے سے لی گئی ہے اور اس کے اوپر ولا ہو درج ہے۔ اس میں سات اشعار ہیں:

کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتوسے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نا مہربان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
دہلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
بے چارہ چند روز کا یاں میہمان ہے

۱۸۲۶ء میں دو اشعار کا اضافہ کیا گیا:

حالاں کہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹادیا
کس سے کہوں کہ ''داغ'' جگر کا نشان ہے

آخری شکل میں شعر نمبر ۸ نکال دیا گیا ہے۔ شعر نمبر ۵ سے ایک نیا مقطع بنایا گیا ہے:

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

اس نئی غزل میں وہ مقطع نکال دیا گیا ہے جو خود ترحمی سے لبریز تھا، اور اس بات کی سمجھ آتی ہے کہ اس کی جگہ ترمیم شدہ مقطع کیوں ڈالا گیا ہے۔ تاہم بعض اوقات اشعار کے نکالے جانے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ مجموعی طور پر میں مفتی انوار الحق کی اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ غالب کے ''سخن فہم'' اور ''قدر دان'' قارئین ہونے کے باعث ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم غالب کے ''جگر کے ٹکڑوں'' کو دوبارہ رائج کر دیں جنھیں غالب نے بڑی مصیبت سے، یا شاید بادل ناخواستہ اپنے منتخب دیوان سے نکال دیا تھا۔

۱۸۲۱ء کے اس دیوان کی عکسی نقل کی اشاعت سے ایسے کئی تنازعات ختم ہو جائیں گے جو پہلی طباعت کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے ہمیں غالب کے ادارتی عمل تک براہ راست رسائی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں ۱۹ ویں صدی میں اردو کی ثقافتی سیاست کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

حوالہ وحواشی:

۱۔ عوامی یادداشت تشویش ناک حد تک مختصر ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگ یہ بات بھول چکے ہیں کہ غالب کے مطبوعہ دیوان کے علاوہ بھی ان کا اردو کلام موجود ہے۔ ۱۸۴۱ء میں اپنے دیوان کی اشاعت کے بعد غالب خود اپنے پرانے دیوانوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ قیاس آرائی بہت دلچسپ ہے کہ یہ نسخہ ۱۹۱۸ء ہی میں کیوں دریافت ہوا۔ اس سے قبل کیوں نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حال ہی میں کسی ذاتی ذخیرے سے عوامی کتب خانے میں منتقل ہوا تھا۔ یہ نکتہ اٹھانے کے لیے میں رچرڈ کوپن کی ممنون ہوں۔

۲۔ نسخۂ حمیدیہ (۱۹۲۱ء) تکنیکی طور پر ۱۸۲۱ء کے نسخے کی مطبوعہ شکل ہے، لیکن میں نے دونوں نام بلا امتیاز استعمال کیے ہیں کیوں کہ عام طور پر نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۱ء کے مخطوطے ہی کو کہا جاتا ہے، نہ کہ شائع شدہ دیوان کو۔

۳۔ مفتی انوار الحق، دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ، آگرہ ۱۹۲۱ء۔

۴۔ سب سے مستند ایڈیشن حمید احمد خان کا مرتب کردہ ہے۔ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۵۔ سلیم احمد رضوی: اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، بھوپال، علوی پریس، ۱۹۶۵ء، ص ۰۷، مجھے یہ بات ماننے میں تامل ہے کہ غالب نے فوجدار صاحب کو اپنا دیوان پیش کیا ہوگا۔

۶۔ محمد یوسف قیصر اپنے مضمون نسخۂ حمیدیہ اور فوجدار محمد خاں "فروغ اردو" غالب نمبر، مرتبہ نادم سیتاپوری، منقولہ عبدالقوی دسنوی، بھوپال اور غالب، بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۶۹ء ص ۱۶ میں فوجدار کے کتابیں جمع کرنے کے شوق کی تصدیق کرتے ہیں۔

۷۔ رضوی کے مطابق اس کا مفصل ذکر نواب کے رسالے شہنشاہ نامہ ص ۱۵ پر موجود ہے، عبدالقوی دسنوی بھوپال اور غالب میں لکھتے ہیں کہ جب نواب بیگم سکندر جہاں جب ۱۸۶۶ء میں وائسرائے سے ملنے دہلی گئیں تو نواب یار محمد خان ان کے ہمراہ تھے۔ نواب صاحب غالب سے ملنے بھی گئے۔ جنھوں نے انھیں اپنی شاگردی میں لے کر شوکت تخلص تجویز کیا۔ ص ۳۵ میں نے شہنشاہ نامہ نہیں دیکھا لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ نواب یار محمد خاں شوکت ۱۸۶۶ء میں ۴۳ برس کی عمر میں غالب سے ملنے کے بجائے نسبتاً کم عمری میں ملے ہوں گے۔

۸۔ نواب یار محمد خاں شوکت کا کلام دیوان شوکت کے نام سے کانپور سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا تھا انھوں نے تاریخ فرخ بخش نامی کتاب بھی لکھی۔

۹۔ حمیدیہ کتب خانہ اب مولانا آزاد سینٹرل لائبریری کہلاتا ہے۔

۱۰۔ دیکھیے، ابو محمد سحر کا مضمون ''غالب'' نسخہ حمیدیہ، چند انکشافات، ہماری زبان علی گڑھ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء ص ۳۔

۱۱۔ مفتی انوار الحق نامور عالم مفتی عبداللہ ٹونکی کے صاحب زادے تھے۔ وہ ٹونک میں پیدا ہوئے تھے فارسی میں ایم۔اے کرنے کے بعد مفتی نے راولپنڈی میں گارڈن مشن کالج میں اور پھر ولسن کالج بمبئی میں پڑھاتے رہے۔ ان کی بطور استاد شہرت نواب سلطان جہاں بیگم کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے انھیں بھوپال بلوا کر ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم مقرر کر دیا۔ مفتی حق کی قیادت میں لڑکیوں کی تعلیم اور نصابی کتب کی تیاری میں اہم پیش رفت ہوئی۔

۱۲۔ سید حامد حسین کے مضمون ''مفتی انوار الحق۔ مرتب نسخہ حمیدیہ'' میں مفتی انوار الحق کے پس منظر کے بارے میں دلچسپ تفصیل رقم کی گئی ہے۔ دیکھیے ہماری زبان ۸ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۴۳۔

۱۳۔ ان ابتدائی مشقوں کو شائع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

۱۴۔ انوار الحق، ص ۱۸۔

۱۵۔ انوار الحق، ص ۱۹۔۲۰۔ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، نئی دہلی، غالب انسٹیٹیوٹ، ۱۹۸۶ء ص ۱۱۴۔

۱۶۔ انوار الحق، ص ۲۲، حالی، ص ۱۱۱۔

۱۷۔ انوار الحق، ص ۲۲۔

۱۸۔ ان چارٹ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ انھوں نے مسودے کے اختتام پر لکھی گئی غزلیں بھی گنی ہیں۔ یا نہیں زیادہ امکان ہے کہ نہیں گنیں۔

۱۹۔ ان ایڈیشنوں کے بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے۔ گیان چند جین کا مضمون ''نسخۂ عرشی طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات'' میں ص: ۴۸۔

۲۰۔ عبدالقوی دسنوی ''سید ہاشمی اور نسخہ حمیدیہ، سب رس غالب نمبر ۱۹۶۹ء منقولہ دہلوی نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی۔ بھوپال ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۔

۲۱۔ اس کا ذکر مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے دیوان غالب، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۳۷ کے تعارف میں کیا ہے۔

۲۲۔ ابو محمد سحر، نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر عبدالطیف ہماری زبان مئی جولائی ۱۹۶۹ء ص ۴۔۵۔

۲۳۔ عبداللطیف اور حواشی میں کی گئی ترامیم کے تنازعے پر دیکھیے گیان چند جین کا مضمون ''نسخۂ حمیدیہ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے''، شائع شدہ رموزِ غالب، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ۱۹۷۶ء ص ۱۱ تا ۲۹۔

۲۴۔ حمید احمد خاں، مرتب دیوان غالب، نسخۂ حمیدیہ، لاہور ۱۹۶۹ء، اوائل اگست ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک سفر سے واپس لاہور آتے ہوئے میں بھوپال ٹھہر گیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کا مقابلہ کرتا رہا، اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ خاطر نہ رہنے سے قطع نظر مطبوعہ نسخے ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہوگئی ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے لیے یہ لازم ہوا کہ میں اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھوں اول یہ کہ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب معین کروں اور دوم یہ کہ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لوں۔ ص ۲۰۔۲۱۔

۲۵۔ حمید احمد خاں، ص ۱۸۔

۲۶۔ ایضاً ص ۱۹۔۲۰۔

۲۷۔ دیوان غالب، نسخہ عرشی، انجمن ترقی اردو، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۸۶۔۹۲۔

۲۸۔ عرشی، ص ۸۸۔

۲۹۔ عرشی، ص ۸۹۔ نوٹس خاصے تفصیلی ہیں۔ مثال کے طور پر عرشی چند املا کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب یہ غلطیاں نہیں کرسکتے تھے، اس لیے یہ تحریر غالب کی نہیں ہوسکتی۔

۳۰۔ عرشی، ص ۹۰۔

۳۱۔ گل رعنا غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے جو غالب نے اپنے دوست سراج الدین احمد کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔ یہ ستمبر ۱۸۳۲ء میں تیار ہو چکا تھا۔ اس کے مطبوعہ ایڈیشن کے لیے دیکھیے، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۳۲۔ عرشی، ص ۹۱۔۹۲۔۹۳۔

۳۳۔ یہ دستاویز ان خطوط میں شامل ہے جنھیں نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی نے شائع کروایا ہے۔ دیکھیے۔ ایس۔ اے۔ آئی ترمذی، نامہ دریائے فارسی غالب، نئی دہلی، ایشیا پبلشنگ ہاؤس اینڈ غالب اکیڈمی ۱۹۶۹ء ص ۱۰۲، ۱۰۳ ضمیمہ ا۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ دیکھیے غالب کی ۱۲۳۱ والی مہر کی اہمیت پر مالک رام کی بحث۔

۳۶۔ اکبر علی خاں، دیوان غالب بخطِ غالب، رامپور، ادارہ یادگارِ غالب ۱۹۶۹ء ص ۲۶۔

۳۷۔ حافظ محمود شیرانی اردو اور پنجابی کے نامور محقق ہیں جن کی ابتدائی اردو پر تحریریں بے بہا ہیں۔

۳۸۔ دیوان غالب نسخۂ شیرانی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۹ء۔

۳۹۔ نسخۂ حمیدیہ کا آخری ورق اختتامی سطروں کے اوپر ایک مصرع ہے دیکھ تو عکس فریادلب جو پر سے یہ سطر خاصی دلچسپ ہے۔

◆◆◆

قارئینِ شعر و سخن نے "دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" کا ذکر تو سنا ہوگا، مگر اُسے دیکھنے، چھونے، پڑھنے اور اُس سے استفادہ کرنے کا موقع شاید بہت کم اہلِ علم و ادب کو ملا ہو۔ "نسخۂ حمیدیہ" کلامِ غالبؔ کے ۱۸۲۱ء کے اس قلمی نسخے کی مطبوعہ شکل ہے جسے مفتی انوار الحق نے ۱۹۲۱ء میں غالب کے دیگر مطبوعہ کلام کو شامل کر کے شائع کرایا۔

غالبؔ کے ۱۸۲۱ء کے اِس قلمی نسخے کو اُن کے تمام قلمی نسخوں میں خاص اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس نسخے میں اُن کا قریب وہ تمام کلام شامل ہے، جو انھوں نے پہلے دیوان کی اشاعت کے وقت خارج کر دیا تھا۔ اس نسخے کی اشاعت سے جہاں ایک طرف غالب کا ابتدائی کلام سامنے آیا تو دوسری جانب اُن کی شاعری کے ارتقائی مراحل کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے تمام قلمی نسخوں میں جتنا اس نسخے پر لکھا گیا ہے۔ اتنا کسی اور قلمی نسخے پر نہیں لکھا گیا۔

ڈاکٹر داؤد عثمانی کی تحقیقی و تالیفی کاوشیں، تصانیف و تالیفات، مضامین و مقالات کی صورت میں اکثر ہماری نظروں کے سامنے سے گزرے ہیں، جن کی روشنی میں، مَیں اُنھیں ایک محقق سمجھتا ہوں اور اُن کی تحقیق کو بہتر اور مستند مانتا ہوں۔

اس بار ڈاکٹر صاحب نے غالبؔ کے قلمی دیوان ۱۸۲۱ء پر ایسا تالیفی کام کیا ہے جس سے نہ صرف اُردو ادب کا دامن مالا مال ہُوا ہے بلکہ غالبیات کے مطالعے میں بھی ایک اہم اور بیش قیمت اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں غالبؔ کے اس قلمی مخطوطے پر تحریر کردہ تحریروں کو جو اس گوہرِ نایاب کی دریافت سے لے کر گم شدگی و بازیابی اور اشاعت پر مشتمل ہیں، ان سب کو یک جا کر دیا ہے۔ کون سا ایسا محقق و ناقد ہے جس نے غالبؔ کے اس قلمی دیوان کے بارے میں نہ لکھا ہو اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی تحقیق کو اس میں شامل نہ کیا ہو۔ یہ کتاب غالبؔ فہمی اور غالبؔ شناسی کے باب میں ایک نئی آواز ہے۔ یہ کتاب ایک طرف غالبؔ کے قلمی دیوان کی کہانی بیان کرتی ہے تو دوسری جانب "دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" کی بھی داستان سناتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تہذیب پر ڈاکٹر داؤد عثمانی قابلِ مبارک باد اور اُن کا یہ کام لائقِ صد تحسین ہے۔

شاعر علی شاعر

Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.
0345-2610434 0336-2085325
021-32761100 0300-2054154
rangeadab@yahoo.com /rangeadab

Rs: 3000/-

9 789697 451616